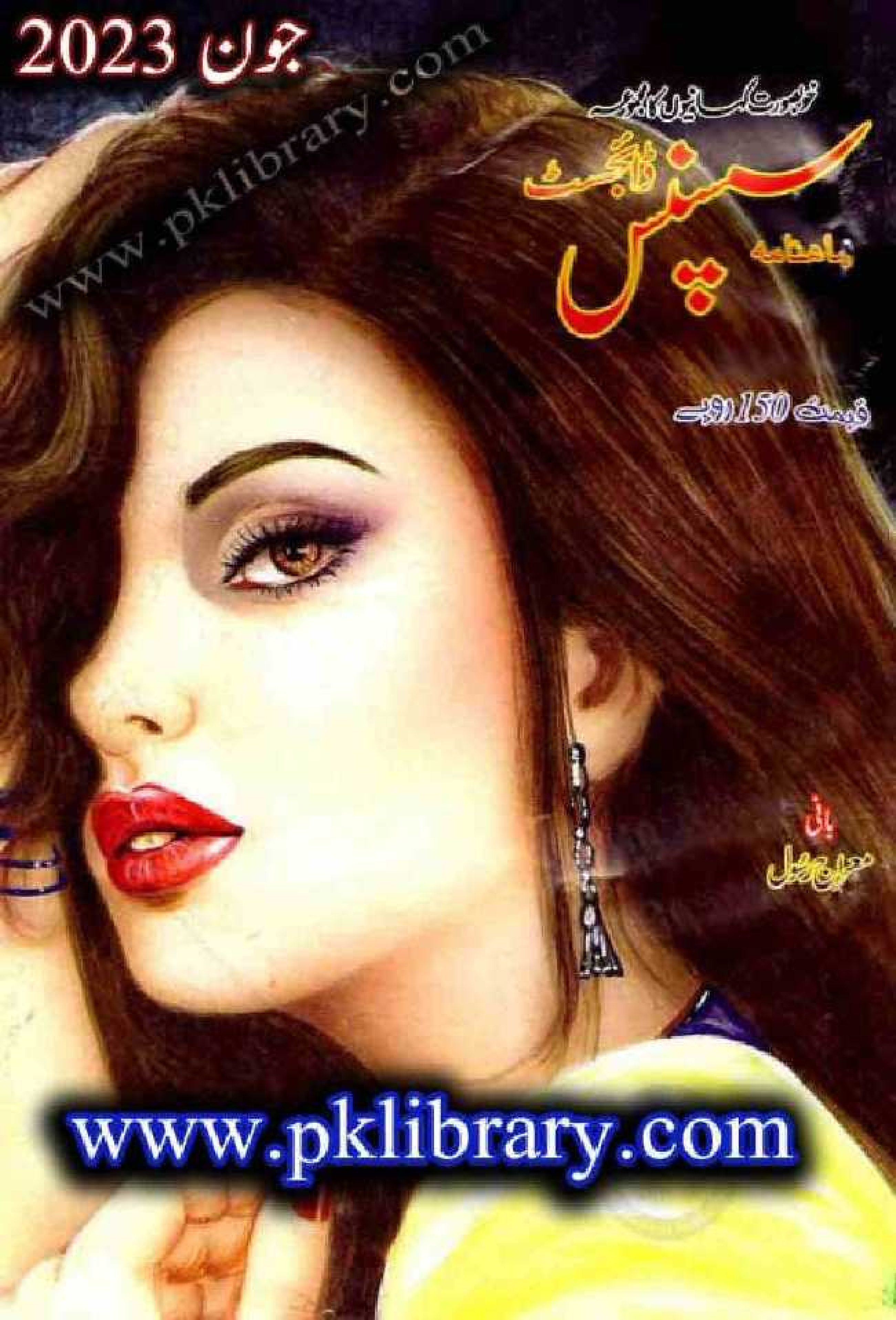


جون 2023
www.pklibrary.com
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
قیمت 150 روپے
بانی
معراج رسول
www.pklibrary.com

سسپنس ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
یمنیٰ احمد

نائب مدیر
اطہر حسین

مارکیٹنگ و سرکولیشن منیجر
محمد شہزاد خان
0333-2256789

جلد 52 • شمارہ 06 • جون 2023 • زرِ سالانہ 2400 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 180 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: [illegible] مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز ٹو ایکس ٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

اندازہ

جو سماج افلاس اور جہالت کے دردناک عذاب میں مبتلا ہو وہ زندگی کا کوئی صحت مند خواب نہیں دیکھ سکتا اور نہ شاید اس کا حق ہی رکھتا ہے۔ ہم بار بار تعمیر و ترقی کا ذکر کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ تعمیر و ترقی کی باتیں اسی قوم کو زیب دیتی ہیں جو معاشی استحکام اور تعلیمی ترقی کے ایک خاص نقطے تک پہنچ چکی ہو۔ اس سے پہلے تعمیر و ترقی کے امکانات پر غور کرنا دماغی عیاشی اور ذہنی بدکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ہم قومی حیثیت سے افلاس اور جہالت کے جس نقطے پر کھڑے ہیں، وہاں سے تعمیر و ترقی کی منزل اتنی دور ہے، اتنی دور ہے کہ اس کے بارے میں سوچنا بھی اپنے آپ کو بہت شکستی اور زبوں ہمتی کے آزار میں مبتلا کرنا ہے۔ ہم اپنی اس پسماندگی و درماندگی کے سلسلے میں قابلِ ملامت بھی ہیں، قابلِ رحم بھی اور ایک حد تک قابلِ معافی بھی کیونکہ ہماری موجودہ زندگی کے پس منظر میں صرف غلامی ہی کی ایک صدی نہیں، سماجی، اخلاقی، معاشی اور تعلیمی انحطاط کی بھی کئی صدیاں شامل ہیں اور ہمیں ماضی کے اس زبردست نقصان کی تلافی کے لیے جو مہلت ملی ہے وہ یقیناً بہت مختصر ہے اور اس مختصر مہلت میں ہمیں صدیوں اور نسلوں کے قرضے چکانا ہیں لیکن اس معقول عذر کے باوجود ہم اپنی غیر ذمے داریوں کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے۔ یہ عذر صرف اسی صورت میں قابلِ سماعت تھا جب ہم نے اپنے فرائض کو پوری طرح ادا کیا ہوتا، اصلاحِ حال کے لیے ہر وہ کوشش کی ہوتی جو ممکن تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ یہی نہیں بلکہ قوم کے بعض طبقوں نے تو اس نازک دور میں وہ طرزِ عمل اختیار کیا اور اختیار کیے ہوئے ہیں جس کو سہہ لینا ایک پسماندہ اور پریشان حال قوم کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

اس موقع پر کس کس سے مواخذہ کیا جائے۔ کس کس کا نام لیا جائے کہ یہ سیاہ نامہ بہت طویل الذیل ہے مگر ایک خاص طبقے کا ذکر کیے بغیر چارہ بھی نہیں۔ ہمارا اشارہ قوم کے دولت مند طبقے کی طرف ہے۔ ہمارے اس رعایت یافتہ اور برگزیدہ طبقے نے آزادی کے بعد جس مجنونانہ اور مجرمانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ ان حضرات نے لکھ پتی سے کروڑ پتی بننے کی جو شاندار مہم تھوڑے ہی عرصے میں سر کر لی ہے، اسے دوسرے شاید صدیوں میں بھی سر نہیں کر سکتے۔ پاکستان میں اگر کسی طبقے نے ایسی غیر معمولی اور قابلِ رشک صلاحیتوں سے دنیا کو مبہوت کر ڈالا ہے تو وہ یہی طبقہ ہے۔ اس کی موجودگی میں جو لوگ علمی و ادبی، تہذیبی اور سماجی میدانوں میں پاکستانی قوم کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں، ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ غلطی پر ہیں اور انہیں اس ہونہار قوم کا کوئی عرفان حاصل نہیں۔ اگر اس قوم کی استعداد اور کارکردگی کا اندازہ لگانا ہے تو اس کے لیے دولت کشی اور منفعت اندوزی کے شعبے کا انتخاب کرنا چاہیے کہ یہی تو ایک شعبہ ہے جس میں ہماری قوم نے حیران کن فتوحات انجام دی ہیں اور محیر العقول معجزے دکھائے ہیں۔ سماج کا یہی وہ ادارہ ہے جس کے حوصلہ مند ناخداؤں نے ایک ایک رات میں بنجر زمینوں سے محل اگائے ہیں اور ایک ایک دن میں دولت و ثروت کی فصلیں کاٹی ہیں۔ یہ بات انہی لوگوں نے ثابت کی کہ آزادی ایک نعمت ہے اور غلامی ایک لعنت۔ اگر یہ ارجمندانِ دولت نہ ہوتے تو پاکستان میں کوئی بھی آزادی کی نعمتوں اور برکتوں کا قائل نہ ہوتا۔ ہمیں اس موقع پر عبارت آرائی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس ضمن میں پوری متانت اور سنجیدگی سے کام لیں۔ اس گروہ نے سماج کی صحت مند قدروں کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ یہ لوگ "زرگری" اور زر پرستی کے علاوہ کوئی قدر نہیں مانتے۔ ان کا صرف ایک نصب العین ہے یعنی دولت کھینچو، قوم جہنم میں جائے۔ انہیں تو اپنے کام سے کام ہے۔ زندگی میں ان کا سب سے بڑا ہتھیار دولت ہے اور سب سے مضبوط سپر جہالت۔ ان کے نزدیک تعمیر و ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ کوٹھیوں کے نئے نئے ڈیزائنوں اور کاروں کے نئے نئے ماڈلوں کے ذریعے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی جائے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ پاکستان کی فاقہ کش، فلاکت زدہ اور درماندہ قوم ان مجنونانہ حرکات اور مجرمانہ تقاضات کی آخر کہاں تک متحمل ہو سکتی ہے۔ واقعی ہمیں اپنی قوتِ برداشت کا اندازہ لگانا چاہیے۔

☆ ☆ ☆

عزیزانِ من!

السلام علیکم!

جون 2023ء کا شمارہ..... آدھے سال کے گزر جانے کا احساس دلاتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ مئی اور جون نہ صرف گرمیوں کی شدت اپنے ساتھ لاتے ہیں بلکہ سیاسی سرگرمیوں کا بھی پردہ چاک کرتے ہوئے بجٹ جیسے اہم کی تیاری کاریوں کا بھی احساس دلاتے ہیں..... پچھلے وقتوں میں شاید بجٹ کے حوالے سے عوام کے درمیان سکون کی لہریں اٹھتی ہوں گی مگر اب یہ حوالہ پوری قوم کے لیے ڈراؤنا خواب بن کر رہ گیا ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ ہر سال آنے والا بجٹ سب کے لیے فکر و پریشانی کے علاوہ اور کچھ نہیں لاتا۔ تمام وسائل کے باوجود قوم کے گرد مسائل کا گھیرا اس قدر تنگ کر دیا گیا ہے کہ اب سوائے دم گھٹنے کے کسی اور بات کا احساس نہیں ہوتا..... جبکہ سوشل میڈیا کے باعث عوام ان حقائق سے بھی باخبر رہتی ہے جنہیں اسکرین پر چھپایا جاتا ہے۔ جیسے کہ قرض لینے والے حکومتی اہلکار..... اور اتارنے والے عوام..... سہولتوں سے فیض یاب ہونے والے وزرا اور ٹیکس ادا کرنے والے عوام..... طبقہ اشرافیہ کے بچے ملک سے باہر اعلیٰ تعلیمی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جبکہ قوم کے بچے معمولی تعلیم کے لیے بھی مشقت کی چکی میں پس جاتے ہیں۔ کبھی قرض کی مد میں قوم کی کمائی سے..... کبھی ترقیاتی کاموں کے نام پر..... کبھی انصاف کے نام پر پچھلی حکومت کے وزرا کو میسر سہولتوں کی داستانوں کا کھلنا..... [illegible] کے حساب کتاب کے نام پر دولت جمع کرنا اور قوم کی ہمدردی سمیٹنا..... اور پھر کچھ عرصے بعد سارے نعرے جانے کہاں دفن کر دیے جاتے ہیں۔ اس گمشدہ رقم..... کی وصولیابی کا ثمر عوام تک کیوں نہیں پہنچ پاتا..... قرض اتارنے کی جنگ میں مسلسل برسرپیکار رہنے کے باوجود کیوں پاکستان کا بچہ بچہ مقروض ہے؟ ہم کب تک حالات کی ڈگڈگی پر معصوم قوم کے جذبوں سے کھیلتے رہیں گے۔ گرمی کی آمد پر ایک مرتبہ پھر بجلی اور گیس کی مد میں عوام سے بے دردی سے لوٹ کھسوٹ جاری ہے..... گھر میں چاہے راشن نہ ہو مگر ان کے بے حساب بلوں کا حساب ادا ہونا چاہیے ورنہ بے حساب لوڈشیڈنگ کے بعد عوام کو بجلی اور گیس سے بھی محروم کرنے کی دھمکیاں..... نہ صرف دھمکیاں بلکہ ان پر بڑی تندہی سے عمل بھی کر لیا جاتا ہے۔ ان تمام تلخ حقائق سے آگاہی سب کو ہے مگر بے بسی کے ہاتھوں یہ قوم آنسو بہانے پر مجبور ہے..... جانے یہ سیاسی کھیل کب ختم ہوں گے..... حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں..... ہے کوئی ایسا بااختیار جسے قوم کی ان مشکلات کا احساس ہو۔ اللہ پاک ہم سب پر اپنا خاص فضل و کرم کرے۔ ان ساری مشکلات کو آسان کرے جنہیں اب سہنا مشکل ترین ہو گیا ہے (الٰہی آمین)..... اور اسی امید بھری دعا کے ساتھ اب رخ کرتے ہیں اپنی محفل کا..... جہاں شاید کچھ نئے ساتھیوں نے دھمال ڈالا ہوا ہے۔

⁂ جنید علی، ملتان سے چلے آ رہے ہیں۔ ”شائقینِ سسپنس کو سسپنس کی محفل میں سلام! کیسے ہیں آپ تمام؟ ہمارا شمارہ لوگوں کے سامنے ہے جو عید سے قبل موصول ہو گیا تھا۔ صفحات کا معیار اور پرنٹنگ اس بار بھی اعلیٰ ہے۔ سرورق ظفر صاحب نے عید کی مناسبت سے بہت ہی دلکش بنایا ہے۔ سرورق دیکھ کر گانا ”کتنا سوہنا تجھے رب نے بنایا..... جی کرے دیکھتا رہوں“ ذہن میں آ رہا ہے۔ ظفر صاحب، فہرستی صفحے کا ڈیزائن ہر بار یکسانیت کا شکار ہے۔ اف مثبت تنقید کچھ زیادہ ہی ہو گئی مگر عادت سے مجبور کہ مثبت تنقید اور قابلِ تعریف امر پر حوصلہ افزائی ریڈرز کی طرف سے ضروری ہے۔ خطوط کی محفل اس قدر ہرا دل کی طرح سکڑی ہوئی کہ سارے سسپنس پڑھنے والوں کے ہی خطوط وقت گزرنے کے بعد آفس کی دہلیز پار کرتے ہیں۔ تبصرے سے پہلے ایک ضروری بات کہ اکثر لوگوں سے یا فیس بک پر پڑھنے کو ملتا ہے کہ ”اب وہ بات نہیں رہی اور رسائل کا معیار نہیں رہا“ جن لوگوں کا یہ خیال ہے تو شاید معیار تھا جب تک ہی تھا جب آپ پڑھتے تھے اور جیسے ہی شاید حالات کی ستم ظریفی کے تحت یا سوشل میڈیا اب مطالعہ کی جگہ آپ کی ترجیح بن چکا ہے تو آپ یہ کہتے ہیں کہ معیار نہیں رہا۔ مانا کہ مایہ ناز مصنفین جواب نہیں ہیں ان کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے مگر ایسا بھی ہرگز نہیں کہ نئے لکھنے والوں میں ٹیلنٹ نہیں۔ نئے لکھنے والے بھی اچھا اور معیاری لکھ رہے ہیں اور ادارہ بھی نئے ٹیلنٹ کو پالش کر رہا ہے۔ یہ دنیا کا اصول ہے کہ پہلے آپ تھے پھر آپ کی اولاد۔ تو اسی طرح پرانے لوگوں کی جگہ نئے لوگ لے لیتے ہیں اور معیار اب بھی موجود ہے تب ہی تو نصف صدی سے یہ چاروں رسائل قائم ہیں۔ بس اب آپ کی ترجیح کچھ اور ہے تو یہ کہنا چھوڑ دیں کہ اب معیار نہیں یا پہلے والی بات نہیں۔ ذرا آگے چلتے ہیں تو ”ابتدائیہ“ میں جون ایلیا اپنی مثبت و تعمیری گفتگو فرما رہے ہیں۔ سسپنس کے اپنی منفرد طرز کے تاریخی سلسلے میں اس بار ”عشق وفا“ کی آخری قسط میں مسلمانوں کی فتح اور تاتاریوں کی عبرتناک شکست اور عمش و نفیسہ کا آخر میں ملنا دیکھ کر خوشگواریت کا احساس

ہوا۔ ہلاکو خان کے تینوں بیٹے اپنے باپ کی ہی طرح شاطر تھے مگر مسلمانوں کے ہاتھوں منہ کی کھانی پڑی کہ ایک تو پہلے ہی جہنم واصل ہوا تو دوسرے کو تیسرے بھائی تیکودار نے قید خانے کے لیے ہی زہر دے کر اگلے جہاں پہنچا دیا پھر کس قدر ڈرامے بازی سے تیکودار نے جیش اور اس کے ساتھیوں کو محل میں قید کیا مگر آخر میں اپنے مقصد میں کامیاب پھر بھی نہ ہو سکا۔ بہت زبردست تحریر تھی جو اے آر راجپوت نے لکھی اور مجھے تو ان کی قسط وار منظر تحریر "رنگ آسمان" ابھی تک یاد ہے۔ کاش الیاس سیتاپوری کی پرانی ترین تاریخی تحریریں پہلے کی طرح اب بھی ہمیں سسپنس میں شروع میں پڑھنے کو ملیں۔ شاہ زین رضوان کی معیاری تحریر "انسان" میں مطلب پرست اوگا اور ڈیوڈ کی مختصر کہانی پڑھنے کو ملی جو بہتر رہی۔ دونوں مطلب پرست ایک دوسرے سے ہی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور آخر میں جب ایک دوسرے سے کچھ حاصل نہ ہوا تو شیطانی دماغ سے چالان بنا کر اپنا مطلب پورا کر ہی لیا۔ آگیں دو اقساط وار سلسلے "شہ زور" میں بھی دیکھ لیتے ہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ معاذ کو پھر سے کسی مشن پر بھیجنے کی تیاری کی جا رہی ہے تو ناول مزید طویل ہو سکتا ہے مگر تحریر ہے کہ دائرہ معرکی سے ہر ماہ گھوم رہی ہے اور تحریر میں روانی بھی موجود ہے تو اگر مزید طویل بھی ہو تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ہاں، مگر اعظم والا معاملہ اب حل ہو ہی جانا چاہیے۔ کیسا ایسا انسان جو کبھی اپنی بیماری کی وجہ سے اپنے بیٹے سے بھی مل ہی نہ سکے جو حالات اب ہیں۔ موبی اب نہیں رہا۔ افسوس ہوا۔ عائشہ تبسم اگرچہ معیاری لکھتی ہیں مگر ہر بار زبردست تحریر ہی کیوں؟ اور دوسرا کرداروں کے نام اس قدر مشکل ہوتے ہیں کہ سمجھ ہی نہیں آتی کون کس کا کیا لگتا ہے۔ "جنگ باز" اب پسندیدگی کی منزل عبور کر چکی ہے مگر حمل صاحب بھی قابل داد ہیں کہ ایک … میڈیکل کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ ناول ایک الگ ہی انداز میں اچھے لکھ رہے ہیں۔ سہراب کے اصل پہلے … ہو چکے اور اب رانگا اور کالی بہری کی شیطانی کارستانیوں کے سبب ہیرو کو کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر ہیرو کی بہادری بھی کمال کی تھی۔ چنچل اور اس کی والدہ سہراب کی محسن تھیں اور یہ صحت یاب ہو کر جلد ہی ان ماں بیٹی کو دشمنوں سے چھٹکارا دلا دے دے گا۔ تسلیم شیخ کی مختصر تحریر میں عائشہ کی والدہ نے محض اپنی ضد اور انا کی خاطر اپنی بہن کے بیٹے کو زہر دے دیا مگر آخر میں اپنی بیٹی کی صورت میں مکافات عمل بھی دیکھنا پڑا۔ … شروع میں ہی اپنی دی ہوئی "زبان" پوری کرتی تو بیٹی خوش رہتی۔ ناہید سلطانہ اختر کی تحریر میں بھی معاشرے کے ایک اور تلخ پہلو کی نشاندہی کی گئی اور ایسے مردودوں کو کاش عقل آجائے اور پھر ایسے مردود نہ کہلائیں۔ ملک صفدر حیات اس بار بھی اچھے سے حالات و واقعات بیان کر رہے ہیں مگر … پڑھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اکبر کا قاتل کون ہے اور وہی ہوا۔ تیر سسپنس و جاسوسی دو ایسے ڈائجسٹ ہیں جو گورنمنٹ … اور تھانوں میں … ہونے چاہئیں کہ جرائم کے خلاف کارروائی کرنے والے اداروں اور ان کا عملہ ان ڈائجسٹ سے استفادہ حاصل کر کے بہت … ہے۔ جہاں "محفل شعر و سخن" میں اشعار معیاری تھے، وہیں ڈائجسٹ میں کاردار کو مشتری نے لطف دوبالا کر دیا۔ جاوید بسام کی … انداز میں لکھی گئی تحریر ذاتی طور پر بہت ہی پسند آئی کہ تحریر میں سسپنس بہت زیادہ ہی تھا اور اس تحریر کا … بھی تحریر کی مناسبت سے کیا خوب بنایا ہوا تھا۔ اب آتے ہیں آخری قسط وار تحریر کی جانب یعنی "شاکا" جو اپنے نام اور … ٹائٹل سے بہت ہی منفرد لگ رہی تھی۔ پہلی قسط زبردست رہی۔ منظر کشی اور … معلومات بھی رائٹر نے بہتر انداز میں تحریر کیں۔ ویسے تو تمام ہی حالات و واقعات اچھے تھے مگر ووسٹوک ریسرچ سینٹر روس میں … جوشوا شمشیر، ہیری اور جیکال کے کرداروں کے سین زیادہ دلچسپ رہے کہ ریسرچ سے متعلق تھے جو امید ہے آگے … کے عنصر کی وجہ بنیں گے۔ جوشوا کی ریسرچ اور محنت دیکھتے ہیں کیا رنگ لاتی ہے۔ ضرور کچھ انوکھا ہی ہو جائے گا اور … کام ہی ہوں گے یا نہیں بھی ہو سکتے ہیں۔ … آغاز بہت اچھا ہے۔ امام شامل کی ایمان افروز داستان کی دوسری قسط بھی معلوماتی رہی۔ اسلام کی خاطر ہمارے اجداد نے کتنی قربانیاں دیں، کتنی مشکلیں برداشت کیں تب ہی تو تاریخ میں ایسی مثال آپ ہیں۔ بس اللہ پاک ہمارے ملک پر بھی رحم و کرم فرمائے۔ آخری کہانی جو فاروق انجم صاحب نے لکھی اور پڑھ کر ایک الگ ہی لطف آیا کہ بہت ہی روانی سے تحریر کو قلم بند کیا گیا۔ واقعی سارے کردار دولت کے لالچ میں مجبور تھے۔ واقعی انسان دولت کی ہوس میں کس قدر اندھا ہو جاتا ہے اور خطرے کے عزائم سے اجتناب نہیں کرتا اور آخر میں صرف پچھتاوا ہی رہ جاتا ہے۔ ویسے مقتول کمال کے ساتھ اچھا ہی ہوا۔ راجی اور تیموری دولت کے لیے سازش تو وہی، مارسٹر اور جی کا بیان اور ساتھ ہی موٹی کردار … کا کارنامہ۔ تمام ہی کے کردار اپنے حساب سے اچھے لکھے گئے اور انجام بھی رائٹر نے اچھا ہی کیا۔ تبصرہ شاید ہمارے … کے مطابق تھوڑا سا اور ایڈیٹر کے مطابق اچھا خاصا طویل ہو گیا ہے تو چلیں اب اجازت۔"

⊕ روبینہ اشعر کی کراچی سے آمد۔ "مئی 2023 کا شمارہ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ جلد ہی مل گیا۔ فہرست پر نظر ڈالتے ہوئے جون ایلیا کے انتخابیہ "آخری المیہ" سے مستفید ہوئے جس میں جون ایلیا نے قوم کے شعور کو جگانے کی جستجو کی۔ خطوط کی محفل میں چند ہی تفصیلی تبصرے پسند آئے۔ محمد جبار، ملک وحید، شیراز خان اور سید گل الدین کی حاضری بھی بھرپور رہی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اے آر راجپوت کی تاریخی کہانی "مثل وفا" کا دوسرا اور آخری حصہ پڑھا۔ جیش اور تیمور کی محبت کی اپنے انتقام کو پہنچی اور جیش انتقیہ کے مرنے کے بعد

بالوں کے سایۂ الفت میں اپنے دن گزارنے لگا۔ بہت خوبصورت اندازِ تحریر۔ ویلڈن۔ اس بار نازیہ کامران کی نئی سلسلے وار تحریر ”شاکا“ پڑھی۔ عفریتوں کے بارے میں سترھویں صدی کی اندھیری راتوں سے جنم لینے والی ایک لرزہ خیز داستان۔

انٹرو پڑھ کر معلوم ہوا کہ عفریتوں کے خاتمے کے لیے شاکا بھیس پُراسرار طاقت نے ایک دنیا سے دوسری دنیا کا سفر کیا تھا۔ چار صدیوں پر پھیلی یہ کہانی بار بار دہرائی جاتی رہی جس کے بعد چند سائنس دانوں کی ایک بھیانک غلطی نے اس دنیا کو ایک بہت بڑے خطرے سے دوچار کر دیا تھا۔ کہانی کا پہلا حصہ تو بہت زبردست اور دلچسپ رہا۔ آگے دیکھتے ہیں کیا کیا واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ناول کا پلاٹ، کردار نگاری و منظر نگاری پر مصنف کی جو گرفت ہے وہ واقعی زبردست تعریف کی مستحق ہے۔ ویلڈن۔ ناہید سلطانہ اختر کی ”مردود“ زبردست تحریر تھی۔ قدیم دور کی بعض جاہلانہ روایت ابھی تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے جس میں ایک بیٹی کی پیدائش پر اللہ کی رحمت سے ناشکری اور ماتم کرنے کی جاہلانہ روایت ترقی کے اس دور میں بھی زندہ رکھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی تحریر ”جنگ باز“ نئے موڑ میں داخل ہوگئی ہے مگر سہراب کے پرانے دشمنوں کی جگہ نئے دشمنوں نے لے لی ہے۔ شاہ ستان کی تحریر ”طریقۂ واردات“ بھی خوب رہی۔ شریف النفس، ملنسار طبیعت کے حامل چور کی واردات کا طریقۂ واردات خوب رہا جو چوری بھی بہت اچھے طریقے سے کرتا اور ہیرا پھیری کی واردات میں بھی وقار قائم رکھتا تھا۔ ملک صفدر حیات کی ”دو عملی“ اچھی تحریر تھی جس میں ملک صفدر حیات کی کڑی تفتیش کے باعث اکبر کا قاتل رفیق گرفتار ہو کر اپنے انجام کو پہنچا۔ شاہ زین رضوان کی ”فسادی“ عمدہ تحریر تھی۔ اوتگا اور ایڈو ایک دوسرے سے اپنی اصلیت چھپاتے ہوئے جھوٹ پر جھوٹ بولتے ہیں اور بالآخر ایک دوسرے پر ان کی اصلیت واضح ہو جاتی ہے۔ عائشہ نصیر کی کہانی ”وعدہ معاف گواہ“ اچھی تحریر تھی۔ تسلیم شیخ کی تحریر ”زبان“ بھی زبردست رہی۔ رشتوں کے نازک بندھن میں بندھی عائشہ کی زندگی ماں کی ضد اور انا کی وجہ سے گھٹن ہوگئی۔ زندگی کے اہم معاملات میں زبان سے مکر جانے والوں کے بارے میں اچھی تحریر تھی۔ محمد فاروق انجم کی تحریر ”اسیر“ زبردست رہی۔ یہ راز ہی رہا تھا کہ اپنی بیٹی کے لیے انقاہی نے کمال کو قتل کیا تھا۔ خاندانی ملکیت پر قبضہ کرنے کی ایک بھونڈی سازش کا احوال جاوید بسام کی تحریر ”سایہ“ میں پڑھنے کو ملا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر ”چیچنیا کا عقاب“ کا دوسرا حصہ پڑھا جس میں امام شامل کی زندگی کے حالات و واقعات پڑھنے کو ملے۔ محفل شعر و سخن میں اپنی حاضری دیکھ کر خوشی ہوئی۔ محفل میں تمام احباب کا انتخاب خوب رہا۔ کترنیں بھی پسند آگئیں۔“

✽ ملک وحید کا تبصرہ کراچی سے۔ ”مئی 2023ء کا شمارہ اس بار تھوڑا لیٹ ملا۔ ٹائٹل اچھا رہا۔ خطوط کی محفل خوب تھی۔ جون ایلیا کے انشائیے سے مستفید ہوئے اور پھر نئے سلسلے وار ناول ”شاکا“ کو پڑھا۔ نازیہ کامران نے عفریتوں کے بارے میں بہت عمدہ کہانی لکھی ہے۔ امید ہے آگے بھی عفریتوں کے بارے میں بہت دلچسپ اور سنسنی خیز واقعات پڑھنے کو ملیں گے۔ اس کے بعد اے آر راجپوت کی کہانی ”منگل وفا“ کا دوسرا اور آخری حصہ پڑھا۔ کہانی کا اختتام خوب رہا۔ شاہ زین رضوان کی ”فسادی“ کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ عائشہ نصیر کی ”وعدہ معاف گواہ“ اچھی تحریر تھی۔ ملک صفدر حیات کی ”دو عملی“ بھی خوب رہی۔ تسلیم شیخ کی کہانی ”زبان“ رشتوں کے نازک بندھن میں بندھی تحریر اچھی رہی۔ ناہید سلطانہ اختر کی کہانی ”مردود“ بیٹی کی پیدائش پر ماتم کرنے والوں کے منہ پر طمانچہ ہے۔ جاوید بسام کی ”سایہ“ کچھ خاص نہیں لگی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ”جنگ باز“ سسپنس اور ایکشن کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ شاہ ستان کی تحریر ”طریقۂ واردات“ بھی خوب رہی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر ”چیچنیا کا عقاب“ میں امام شامل کے حالاتِ زندگی کے بارے میں آگاہی ہوئی۔ محمد فاروق انجم کی ”اسیر“ زبردست رہی۔ محفل شعر و سخن اور کترنیں بھی خوب ہی رہیں۔“

✽ آبان احمد کا میرپورخاص سندھ سے مختصر خط۔ ”سسپنس ڈائجسٹ کا ریڈر تو میں کافی عرصے سے ہوں۔ وجہ اسما قادری کا ناول ہے اور پھر فرح بخاری کی تحریروں نے بھی کئی بار قلم اٹھانے پر مجبور کیا لیکن میری ازلی سستی کے کیا ہی کہنے لیکن اس بار مئی 2023ء کے سسپنس ملنے اور پڑھنے کے بعد میں اپنے آپ کو روک نہیں پایا۔ نازیہ کامران...... کے ناول ”شاکا“ کا چرچا کئی دن سے فیس بک پر تھا۔ ڈائجسٹ ہاتھ آتے ہی سب سے پہلے ان کی تحریر پر ہاتھ صاف کیا۔ جی ہاں بھئی، نازیہ جی کی تحریریں ایسے ہی پڑھی جاتی ہیں۔ اب آگے کیا ہوگا...... سوچتے ہوئے لیکن قسط طویل سہی لیکن تھی تو پہلی ہی قسط۔ نازیہ میم کے ناول ہمیشہ کتاب میں ہی پڑھے ہیں اس لیے قسط وار پڑھنا تھوڑا مشکل کام ہے۔ خیر، ناول کی شروعات کیا شاندار ہے۔ نازیہ جی کے ناول کے پلاٹ تو جاندار ہوتے ہی ہیں لیکن کردار نگاری و منظر نگاری پر مصنفہ کی جو گرفت ہے وہ واقعی قابلِ تعریف ہے۔ ابھی تو پہلی ہی قسط آئی ہے اس لیے اندازہ تو کوئی لگا نہیں۔ دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔“

✽ رابعہ ملک شعیب کا پہلا خط کراچی سے۔ ”سب سے پہلے تو اردو ادب کے فروغ کے لیے سسپنس ڈائجسٹ کی کاوشوں کو

سلام۔ ادارہ ہمیشہ سے ہی خوبصورت اور منفرد سلسلے لاتا رہا ہے۔ چاہے شعر و سخن ہو یا حقیقی قصے، پُرتجسس فکشن ہو یا فکری تحاریر۔ ادب سے لگاؤ رکھنے والے ہر قاری کے لیے یہاں کچھ نہ کچھ ضرور موجود رہتا ہے۔ یہی سسپنس ڈائجسٹ کی وجہ مقبولیت ہے۔ سلسلہ ''نقشِ وفا'' میں موجود واقعات یقیناً کافی سبق آموز تھے اور زندگی کے کئی مراحل سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ جہاں ''فسادی'' میں موجود حسینہ کی تیزی نے ہوش اڑا دیے تو محفلِ شعر و سخن کے عمدہ انتخاب نے اس ماہ کے شمارے کو چار چاند لگا دیے۔ ''شاکا'' کی شروعات نے تو حیران کر دیا۔ سب سے پہلے تو کہانی کا پلاٹ بالکل منفرد اور پُرتجسس ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر بہت سے سائنسی اور کائناتی معلومات سموئے ہوئے ہے جس سے لکھاری کی محنت بہ خوبی ظاہر ہوتی ہے۔ منظر نگاری کی بات کی جائے تو حالات و واقعات کی مناسبت سے جگہوں کے نام دماغ میں ایک تصویر بنا دیتے ہیں اور قاری اپنے آپ کو اس منظر میں موجود محسوس کرتا ہے۔ مکالمے انتہائی سہل اور سادہ ہیں جس سے کہانی کی بُنت سمجھنے میں بہت آسانی رہتی ہے اور آخری مگر سب سے اہم ہے کردار نگاری۔ ہر کردار کا تعارف اس کے خواص کے ساتھ کروایا گیا ہے تاکہ قارئین اپنے ذہن میں ایک شبیہ بنا لیں۔ اب جیسے روسی لیب کے محققین ہوں یا منگول کے انوکھے باسی، سب کی اہمیت اپنی جگہ قائم بھی ہے اور پھر بھی شاکا کا کردار اپنی پوری آب و تاب سے جگمگا رہا ہے۔ یہ میرا پہلا خط ہے۔ امید ہے یہ سلسلہ قائم رہے گا اور سسپنس ڈائجسٹ کے توسط سے اس محفلِ خطوط میں حاضری لگتی رہے گی۔ اس امید کے ساتھ کہ یہ خطوط اشاعتی مراحل میں ضرور پہنچیں گے۔''

✪ عفیرہ محمود کی کراچی سے پہلی کاوش۔ ''سسپنس ڈائجسٹ کی ایک پرانی لیکن خاموش قاری ہوں۔ شادی اور بچوں کے بعد گھرداری میں مصروفیت کی بنا پر کچھ عرصہ یہ سلسلہ رک گیا لیکن کچھ سال قبل یہ ناتا وہیں سے جوڑا جہاں سے روک دیا تھا۔ اس سے قبل کبھی کسی رسالے میں خط لکھنے کی ہمت نہیں کی۔ پہلی بار خط لکھنے کی وجہ بنا ہے نازیہ کامران...... کا ناول ''شاکا''...... یوں تو شازہ زرین رضوان کا ''فسادی'' بھی پسند آیا اور عائشہ نصیر کا ''وعدہ معاف گواہ'' بھی بہترین لکھے گئے ہیں لیکن ''شاکا'' کی اولین قسط نے جیسے اپنے سحر میں جکڑا ہے تو ایک ماہ کا انتظار بھی مشکل لگ رہا ہے۔ تحقیقات پر مبنی ناول ہمیں ہمیشہ سے ہی پُرکشش لگتے ہیں اور ہر لکھاری ہی بڑی محنت اور لگن سے اپنے کام کو آگے بڑھاتا ہے لیکن اسے قارئین کے دماغوں میں ایسے بٹھا دینا جیسے وہ بھی اسی مقام پر موجود ہیں یہ خاصہ سب کے پاس نہیں ہوتا۔ باقی ابھی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے لیکن یہ تعریف شاکا کا حق تھی جسے اپنے تک رکھنا ناانصافی ہوتا۔ دعا ہے کہ یہ پہلی ہی کاوش شائع ہو جائے۔ ڈائجسٹ اور تمام لکھاریوں کے لیے نیک تمنائیں۔''

✪ ثمرین مسعود، کراچی سے۔ ''پہلی بار خطوط کی محفل میں شامل ہو رہی ہوں حالانکہ سسپنس ڈائجسٹ سے تعلق بہت پرانا ہے مگر جناب کیا کیجیے خط لکھنے میں ہم ازلی چور ہیں۔ لیکن اس بار عید نمبر نے واقعی ہمارا دل جیت لیا۔ ایک سے بڑھ کر ایک کہانیاں اور مستقل سلسلے تو ہیں ہی بہت خوب۔ پہلے بات کرتے ہیں محفلِ شعر و سخن کی۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے وہیں کا رخ کیا اور خوبصورت کلام سے اپنے شعری ذوق کی تسکین کی۔ پھر ہم اسیر ہوئے فاروق انجم کے قلم سے لکھے گئے ''اسیر'' کے۔ شاہ ستان کا ''طریقۂ واردات'' واقعی حیران کر گیا۔ جنگ باز، سایہ اور مردود تو بہت ہی مگن ہو کر ایک ہی نشست میں پڑھیں اور آج خطوط کی محفل میں شامل ہونے کا اصل مقصد پہلی بار سسپنس ڈائجسٹ کی محفل میں شامل ہوتی نازیہ کامران...... کے ''شاکا'' کی پہلی قسط تھی۔ ایک انتہائی مشکل موضوع پر قلم اٹھایا ہے انہوں نے اور شروعات میں ہی اندازہ ہو گیا ہے کہ کہانی پر ان کی گرفت کتنی مضبوط ہے۔ وہ یقیناً مکمل تحقیق کر کے کہانی لکھ رہی ہیں۔ اس دنیا کے ساتھ ساتھ ہی اصل یونیورس کا جائزہ، Vostok research centre اور capiz شہر کے بارے میں اتنی مکمل اور عمدہ معلومات، کسی خاتون لکھاری کے قلم سے پہلی بار اس طرح کا مواد پڑھنے کو ملا ہے۔ ہمیں اور گھر والوں کو شاکا کی اگلی قسط کا بہت انتظار ہے۔ اس بار ہمت کر لی ہے تو آگے بھی یقیناً سسپنس کی خطوط کی محفل میں شامل ہوتی رہوں گی (ان شاء اللہ)...... امید ہے یہ پیار بھرا ساتھ تا دیر قائم رہے گا۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے

غلام نبی، لاہور۔ راجا احتشام، جہلم (بی گھر مالا)۔ ریاض الدین، میرپور خاص۔ سلطان احمد سلطان، گھوٹکی۔ محمد ارشد، لیہ۔ قمر شہزاد قمری، لاہور۔

اطلاع

تمام مصنفین کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ مسترد شدہ کہانیاں محفوظ رکھنا ادارے کے لیے ممکن نہیں ہے۔
اس لیے کہانیوں کی نقول وہ اپنے پاس رکھیں کیونکہ مسترد کہانیاں تلف کر دی جاتی ہیں۔

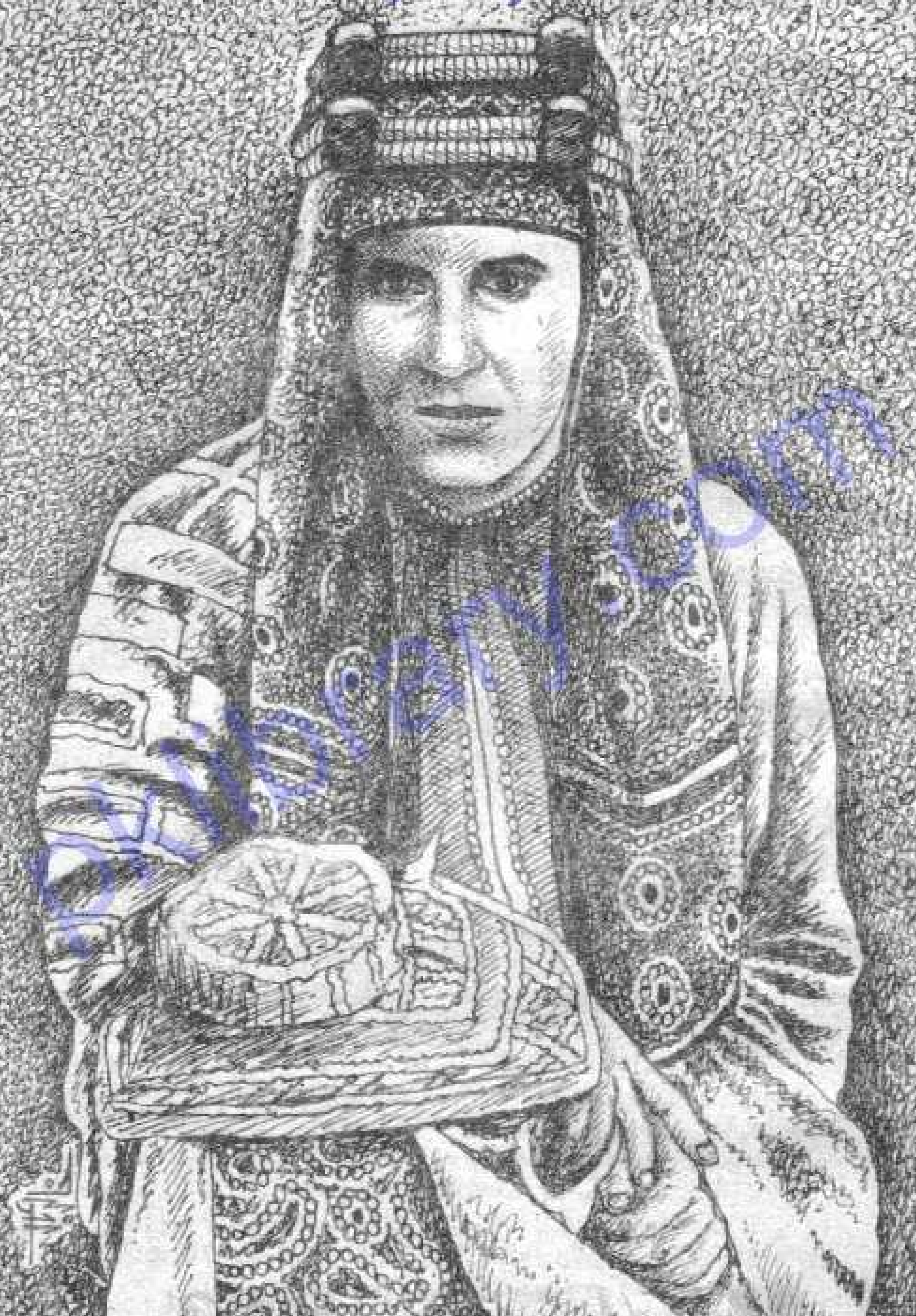
فتنہ پرور

زویا صفوان

وہ جسمانی طور پر انتہائی کمزور تھا مگر اس کے دماغ کی طاقت دنیا نے دیکھی... جو عرب دنیا کو اپنے تابع کرکے ترکوں کو شکستِ فاش دے کر اپنی قوم کی برتری ثابت کرکے خود کو بہت بڑا فاتح ثابت کرنا چاہتا تھا... اور کسی حد تک اپنے اس خواب کی تعبیر پانے میں کامیاب رہا بھی... مگر اسے آگے بڑھانے والے اس کی رسّی کھینچ لینے پر بھی قادر تھے... حال کا ہر گزرتا لمحہ ماضی کا حصہ بن جاتا ہے مگر ماضی کا ہر پل تاریخ میں رقم نہیں ہوتا... اور جو تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے وہ ہر دور میں اپنی یادوں کے اثرات چھوڑ دیتا ہے اور آنے والی نسلیں اپنی قابلیت اور اپنی نظر سے دیکھتے ہوئے ان سے مستفید ہوتی ہیں۔ اس کی فتنہ پرور شخصیت پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے جوش، ولولے اور حوصلے کی یہ داستان اسے تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات





برطانوی فوج کی اعلیٰ انتظامیہ بے حد غصے کا شکار ہو چکی تھی۔ چند افسران اور سیاسی راہنما ایک خصوصی اجلاس میں بیٹھے کافی تناؤ زدہ دکھائی رہے تھے۔

"کرنل لارنس کی موت نے تو عجیب پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔" جنرل ایلن بائے نے کہا۔

"ہاں، مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کی موت ہمارے سروں پر لٹکتی تلوار ہمیشہ کے لیے دور کر دے گی لیکن یہاں تو معاملہ ہی بالکل برعکس ثابت ہوا۔" جنرل کلے ٹن نے جواب دیا۔ "اس نے ایک بار پھر اپنے بارے میں میرے ہر اندازے کو باطل ثابت کر دیا۔"

"اس کی زندگی ہی کیا کم آزار تھی جو اب موت کے بعد بھی اخبارات نے ناک میں دم کر دیا ہے۔" موجودہ حکومتی جماعت کے ایک راہنما ولیم نے ناگواری سے کہا۔

"اخبارات تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ اس کی موت حادثہ نہیں، ایک سازش تھی۔" دوسرے راہنما جارج ڈرائیڈن نے دانت پیسے۔

"کہنے دیجیے جو بھی کہتے ہیں۔ ہم نے اس کے کارناموں کو پہلے بھی کب تسلیم کیا تھا۔ وہ ایک خفیہ اہلکار تھا اور کسی بھی خفیہ اہلکار کے عسکری کارنامے اور کامیابیاں تسلیم کر لینا فوج کی اپنی ساکھ متاثر کیا کرتا ہے۔" جنرل ایلن بائے نے متانت سے جواب دیا۔

"لیکن برا جو بھی ہے، ہمیں ایک بات تو تسلیم کرنا ہو گی کہ کرنل لارنس کی صلاحیتوں نے ہی ہمیں ترکی کو زک پہنچانے اور سلطنت عثمانیہ میں دراڑ ڈالنے کے قابل بنایا تھا۔" کرنل نیوکامب کہنے لگا۔ وہ لارنس کا ایک قریبی ساتھی تھا۔

"اگر یہ کام کرنل لارنس نہ کرتا تو کوئی اور کر لیتا۔ عسکری امور میں انتظامیہ کے پاس بہتر اور بہترین انتخابات ہوا کرتے ہیں۔" جنرل کلے ٹن نے کروفر سے جواب دیا۔

"بہر حال، اس معاملے کو سنجیدگی اور ذمے داری سے نمٹایا جائے۔ کرنل لارنس کے کسی بھی کارنامے کو اس کی ذات سے منسوب نہیں کیا جائے گا۔ اسے ایک عام فوجی اہلکار بنا کر ہی پیش کیا جائے۔" ولیم نے اس بحث سے اکتا کر کہا۔ "اور ہمیں کرنل لارنس کی مکمل فائل فراہم کی جائے۔ حکومتی ایوان میں طلب کی گئی ہے۔"

کرنل نیوکامب نے اس کی فرمائش پوری کر دی۔ اس معاملے پر مزید چند نکات زیر بحث لانے کے بعد یہ اجلاس ختم کر دیا گیا۔ دونوں سیاسی راہنما عمارت کی عقبی سمت سے باہر نکلے اور اپنی گاڑیوں میں سوار ہو گئے۔ ولیم نے وقت گزاری کے لیے کرنل لارنس کی فائل کا مطالعہ شروع کر دیا۔

☆☆☆

وہ دبلا پتلا لڑکا کھیل کے میدان میں ایک گوشہ سنبھالے بیٹھا تھا۔ اس کا ایک تہائی سے زائد چہرہ کتاب کے عقب میں پوشیدہ تھا۔ اس کے اردگرد ہم عمر لڑکوں کا بے پناہ شور اور کھیل کود کی مخصوص ہڑبونگ طاری تھی لیکن وہ ان سب سے بے نیاز، مکمل انہماک سے کتاب کے مطالعے میں مگن تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک گیند اس کے پاس آ گری۔ گیند کے گرتے ہی شور ایک نئے تناسب سے بڑھ گیا۔

"اے تھامس! گیند ہماری جانب پھینک دو۔" ایک لڑکے نے باآواز بلند کہا۔

تھامس نے ایک نگاہ غلط اس کی جانب دوڑائی اور دوبارہ کتاب میں مگن ہو گیا۔

"ارے، سنائی نہیں دے رہا کیا؟" ایک طویل قامت اور قدرے درشت طبیعت کے مالک لڑکے نے اسے مخاطب کیا۔ اسے تھامس کی بے نیازی اپنی ہتک محسوس ہوئی تھی۔

"چھوڑو بھی۔ اس کتابی کیڑے کو پکارنا دیواروں سے سر ٹکرانے کے مترادف ہے۔" دوسرے لڑکے نے برائن سے گھورتے ہوئے کہا۔

"اس کی یہ مجال۔ اسے ہماری بات ماننا ہو گی۔" طویل قامت نے ایک بار پھر درشتی جتائی۔

"ہم خواہ مخواہ اس پر یونہی وقت ضائع کر رہے ہیں؟" ایڈم نامی اس لڑکے نے جھنجلاتے ہوئے تھامس کی ولدیت کے متعلق چند نازیبا الفاظ کا اضافہ کیا۔

"ارے ہاں بھئی، میں تو بھول ہی گیا تھا کہ یہ بے چارہ ذہنی طور پر بہت زیادہ مشقت میں مصروف ہو گا۔" طویل قامت برائن نے تیزی سے کہا۔ وہ ان تمام لڑکوں سے عمر میں بڑا اور ضرورت سے زیادہ ہی "باعلم" تھا۔

"تو کیا ہم نے اس کے متعلق جو باتیں سن رکھی ہیں، وہ درست ہیں؟" ایڈم نے بھولپن سے پوچھا۔

"بالکل درست ہیں میرے دوست! اتنی ہی درست جتنی تمہاری اور میری یہاں موجودگی۔" برائن نے جتاتی ہوئی نظروں سے تھامس کو دیکھا جو ہنوز بے نیاز اور کتاب میں منہمک دکھائی دے رہا تھا۔

"آہ بے چارہ تھامس۔ یعنی اس کے والدین نے ابھی تک شادی ہی نہیں کی اور یہ ان کے ناجائز مراسم کا

شناخسانہ ہے۔" ایڈم نے تاسف سے کہا۔

"ہاں بھئی، یہ زمیندار "تھامس تھیمسن" اور اس کی ملازمہ "سارہ جونز" کی ناجائز اولاد ہے۔ اس کی والدہ خود بھی لارنس نامی ایک انگریز امیر کی غیر قانونی بیٹی ہی تھی اسی لیے خود کو سارہ لارنس کہلوایا کرتی ہے۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اس کی پیدائش سے پہلے سارہ نے زمیندار کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے حقیقی بیوی بچوں کو آئرلینڈ میں ہی چھوڑ کر انگلستان چلے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ انہوں نے یہاں آ کر خود کو مسٹر اور مسز لارنس تو کہلوانا شروع کر دیا ہے لیکن قانونی شادی بھی نہیں کی۔ ان کے ہاں تھامس کے بعد بھی پانچ عدد غیر قانونی بچوں کی پیدائش ہو چکی ہے۔" برائن نے نہایت تفصیل سے اپنے ساتھیوں کو چٹخارا لیتے ہوئے حقائق سے آگاہ کیا۔

تھامس کا چہرہ غصے سے سرخ تر ہونے لگا تاہم اس نے کسی بھی ردعمل کا مظاہرہ نہ کیا۔ وہ خاموشی سے کتاب بند کر کے اٹھا اور اس شیطانی ٹولے کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک جانب بڑھ گیا۔ اس کے انداز میں واضح بے نیازی اور ذاتی وقار تھا۔ وہ ان کی باتوں کو چٹکیوں میں اڑا دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اسے ان لڑکوں کی ہرزہ سرائی اور تضحیک ہمیشہ مثبت اعصابی مضبوطی کی طرف مائل کرتی تھی۔ ہم عمر لڑکے اسے بزدل اور ڈرپوک بھی گردانتے مگر حقیقت تو یہی تھی کہ وہ ان القابات کی ابجد سے بھی واقف نہ تھا۔ تھامس ایڈورڈ لارنس اپنی نوعیت میں ایک منفرد لڑکا تھا۔ اسے کھیل کود سرے سے پسند ہی نہ تھے۔ مطالعے میں اس کی جان تھی۔ مطالعے سے جو وقت ملتا اس میں وہ مختلف "دریافتوں" کے درپے ہو جاتا۔ یہ دریافتیں عام طور پر ندی نالے کے کنارے چلتے اس کے منبع کو سراغ لگاتا ہوتا تو کبھی خاک کے تودوں اور پرانے کھنڈروں کے معائنے میں گھنٹوں صرف ہو جاتے۔ یہ کھنڈرات عام طور پر قدیم برطانوی باشندوں اور رومی فاتحین کا صدیوں پرانا پڑاؤ ہوا کرتے تھے۔ تھامس ان شکستہ در و دیوار میں ان عظیم فاتحین کی گرد کھوجنے کی کوشش کرتا جو اب ماضی کا حصہ بن چکے تھے۔ جولیس سیزر، مارک انطونی، آکٹیوین جیسے عظیم الشان رومی فاتحین کے نادیدہ ہیولوں کا احساس اسے عجیب سنسنی آمیز گدگداہٹ میں ملوث رکھتا۔ وہ ایک کیمرا کندھے پر لٹکائے اپنی سائیکل پر سوار ہوتا اور نہایت خاموشی سے قدیم قلعوں، کلیساؤں اور محلات کی جانب نکل کھڑا ہوتا۔ ان عمارتوں کی منفرد زاویوں سے تصویریں لینا اسے بے حد مرغوب تھا۔ وہ مختلف پتھروں میں ماضی کے نقوش تلاش کرتا۔ ان عمارات میں جاگتی آنکھوں سے مختلف خوابناک مناظر تراش لیتا۔

تھامس کی یہ سرگرمیاں ہم عصر لڑکوں اور اپنے دیگر بھائیوں سے بالکل مختلف تھیں۔ اس کے بھائی وقتاً فوقتاً اسے کھیل کود میں حصہ لینے کی ترغیب بھی دیا کرتے۔ بھائیوں کے محبت بھرے اصرار پر وہ اس دھما چوکڑی کا حصہ تو بن جاتا تاہم اناڑی پن سے خاصے آزار میں بھی مبتلا ہو جایا کرتا۔ اسے کھیل کود کے رموز اور قواعد سے آشنائی ہی نہ تھی اسی لیے ایک روز چوٹ کے نتیجے میں اس کا پاؤں ہی ٹوٹ گیا۔ یہ حادثہ تھامس کے لیے بہت مصائب کا باعث بنا۔ اس کی جسمانی نشوونما رک گئی اور قد اپنے بھائیوں کی نسبت محض پانچ فٹ چار انچ سے زیادہ بڑھ ہی نہ سکا۔

اس دائمی آزار کے بعد تھامس کا رجحان مطالعے اور تحقیق کی جانب مزید بڑھ گیا۔ قدیم تاریخ کے اسرار اسے اپنی جانب شدت سے مائل کرتے۔ اسی دوران ایک روز تھامس کو کہیں سے آکسفورڈ کا قدیم نقشہ ملا جس کی رو سے وہاں گیس کے کارخانے کے قریب "قالی برج" میں زمین دوز نہر تھی۔ تھامس کی افتادِ طبع مچل اٹھی۔ وہ کارخانے کے عقب سے ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار ہوا تاکہ نہر کے راستے پر چلتا ہوا قالی برج کے سرے تک پہنچ جائے۔ کشتی نہر میں ڈالتے ہی اس کے ساتھیوں نے تمسخر اڑانا شروع کر دیا۔ تھامس انہیں نظر انداز کر کے زمین میں گھس گیا۔ اس کے غیاب سے ساتھی الجھن میں مبتلا نظر آنے لگے۔

تھامس اب زمین کے تحت اندھیرے میں تھا۔ ایک گز سے آگے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا۔ اس نے اپنے حواس پر کمال ضبط قائم کیا ہوا تھا۔ مہارت سے کشتی کھیتا ہوا وہ بالائی حصے سے آنے والی مدھم آوازوں پر بھی توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا۔ انہی آوازوں سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ ایک گلی کے نیچے عازم سفر ہے۔ تھامس کی یہ مسافت اگلے نصف گھنٹے تک جاری رہی۔ ٹریفک کے جھٹکے کی مدھم آوازوں، گھوڑوں کی ٹاپوں اور پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ سے اسے راہ سفر کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔

اس تاریک اور صوتی سفر کا اختتام ایک مدھم روشنی پر ہوا۔ اس کی دھڑکنیں تیز تر ہونے لگیں۔ اس کی وہ ننھی سی کشتی بالآخر قالی برج کے قریب تیر رہی تھی۔ باہر آتے ہی اس کی نظر اپنے ساتھیوں پر پڑی جو حق چہروں اور متحیر آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ آگے بڑھ کر بے اختیار اس سے

لپٹ گئے۔ انہیں تھامس کی اس مہم کا پس منظر اور اصل مقصد جاننے کی بے تابی لاحق تھی۔ لارنس نے انہیں مختصراً سب کچھ بتا کر جان خلاصی کروانا ہی مناسب سمجھا۔ ساتھی جانتے ہی کہاں تھے کہ یہ تھامس کی مہمات کا نقطۂ آغاز تھا۔

☆☆☆

برس دبے قدموں بیتتے گئے۔ تھامس کی شخصی خوبیاں جوں کی توں برقرار رہیں۔ اسے ہنوز کھیلوں اور اسکول میں پڑھنے سے عدم دلچسپی تھی۔ کتب کا مطالعہ البتہ اسے ہنوز مرغوب تھا۔ تعطیلات کے دوران وہ برطانیہ اور فرانس کے دیہاتی علاقوں کی خاک چھان کر سیکڑوں برس قدیم تاریخ کھوجنے لگتا۔

بچپن اب شباب کی وادی میں پڑاؤ ڈال چکا تھا۔ اس کی جسمانی ساخت اور ظاہری شخصیت نمایاں ہونے لگی تھی۔ وہ زیادہ طویل قامت نہ تھا۔ پانچ فٹ چار انچ قد اور قدرے کم وزن نے شخصیت کو زیادہ پراثر نہ بنایا تھا البتہ عادات اور فطرت نے اسے کافی مقبول بنا دیا تھا۔ اسکول کی پڑھائی مکمل کر کے اب وہ "جیسز کالج" میں زیر تعلیم تھا۔ کالج میں اس کی ترجیحات مطالعہ کتب اور مضمون نویسی ہی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ سائیکل رانوں کی جماعت اور "آکسفورڈ آفیسرز ٹریننگ کیمپ" کا سرگرم رکن بھی تھا۔ اس کی گفتگو مقابل کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیا کرتی۔

کچھ وقت مزید گزرا تو تھامس کی "اثریات" میں دلچسپی بڑھنے لگی۔ اس نے بھرپور لگن و محنت سے شام اور فلسطین میں صلیبی سپاہ کے تعمیر شدہ قلعوں پر ایک خصوصی مضمون تحریر کیا۔ تھامس نے ان قلعوں کے متعلق کتب کا مطالعہ کر رکھا تھا لیکن مضمون تحریر کرنے کے بعد اس کی تشنگی اور عدم اطمینان برقرار رہا۔ دل میں خواہش مچلنے لگی کہ ان علاقوں کو بنفسِ نفیس دیکھ کر مضمون کو پراثر بنایا جائے۔ اسی سال تھامس کی یہ تمنا اسے 1909ء میں شمالی شام کے سفر پر لے گئی۔ اس سفر کے لیے تھامس کے پاس سو پاؤنڈز سے زیادہ زادِ راہ نہ تھا۔ تھامس کے ذہن میں ایک مبہم خاکہ موجود تھا جس کے باعث وہ سفری اخراجات بہ آسانی برداشت کر لیتا۔ وہ اپنے وسیع مطالعے کے باعث ان علاقوں کے باشندوں کی عادات و فطرت کے متعلق اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے اہلِ شام و فلسطین کی مہمان نوازی سے خوب لطف اٹھایا اور اپنی تحقیق مکمل کر کے جب واپس انگلستان پہنچا تو رقم کا ایک کثیر حصہ اس کے پاس محفوظ تھا۔

تھامس کی تحقیق و جستجو کی یہ پیاس ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس نے فلسطین سے نکل کر قدیم اڈیسہ (موجودہ عرفہ) کا رخ کیا۔ اپنی چشم تصور سے وہ مسیحیت اور مسلمانوں میں تین صدیوں تک جاری رہنے والی جنگوں، مصر کے سلاطین، مغل شہنشاہوں اور شاہانِ فارس کے نقوش تلاش کرتا وہ ایک نئے جہان میں گم ہو چکا تھا۔ ملک شام تقریباً پانچ سو سال سے ترکوں کے زیر تسلط تھا۔ یہ حقیقت تھامس کے دل میں خلش پیدا کرنے لگی کہ صلیبی سپاہ کی سلطنت اب ہلال کی حکمرانی تلے دب چکی تھی۔ اس خلش کو دل میں کسی نہ کسی طرح دبائے اس نے "قلعہ سیہون" اور "انٹی اوک" میں سینٹ پال کے زمانے کے ویرانے بھی دیکھے۔ ان ویرانوں میں وہ ایک بار پھر اپنی چشم تصور سے ماضی کے مناظر دیکھتا رہا۔ اس نے سینٹ اوک کی دیوار کے گرد و نواح کا اندازہ لگایا جو زمانۂ جنگ میں شہر کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اس دیوار پر چار گھوڑے بیک وقت دوڑ سکتے تھے۔ وہ صلیبی سپاہ کو سرفروشی سے لڑتے دیکھ کر مسرور ہوتا رہا۔

اس کے بعد وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے ان کھنڈرات کا جائزہ لیتا رہا جو اب صحرا کی ریت میں دفن ہو چکے تھے۔ اس سفر کے دوران بھی تھامس نے اپنی سادہ روی برقرار رکھی۔ وہ بدوؤں میں گھل مل کر ان کے طعام میں بھی شریک رہا۔ اسے علم تھا کہ بدوی کسی بھی ایسے شخص کو نقصان نہیں پہنچاتے جو ان کا شریکِ طعام رہ چکا ہو۔ تھامس کی مہارت اور اس کا علم تھا کہ اس نے عرب اور جلتی ہوئی صحرا نوردی کے اس مشکل سفر کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کے سفر کا آخری پڑاؤ دریائے فرات کے کنارے جا کر مکمل ہوا۔ اسی دوران ایک اور انکشاف نے اس کی خلش میں مزید اضافہ کر دیا کہ اڈیسہ کے قدیم گرجے مساجد میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ کئی قلعے اور میناروں میں عرب اپنے مویشیوں اور بچوں سمیت رہائش پذیر تھے۔ کئی ایک مقامات کو چوروں اور راہزنوں نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ ان مشاہدات نے تھامس کو اپنا مضمون از سرِ نو مرتب کرنے میں بھرپور مدد کی جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ماہرین آثاریات بھی اس نوجوان کی مہارت اور محنت کے قائل ہو گئے۔

تھامس کی قابلیت نے اپنی دھاک بٹھائی کہ برطانوی عجائب گھر انتظامیہ اس سے رجوع کرنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ عجائب گھر ان دنوں مختلف کھدائیوں میں مشغول تھا تاکہ قدیم دارالحکومت "ہیتی" کے کچھ عجائبات ہاتھ لگ سکیں۔

ان کی کھدائی کا مرکز ریت کا ایک ٹیلا تھا جو صدیوں کی مار سہنے کے بعد اس قدر بلند ہو گیا تھا کہ عمارتوں کے نشان ہی چھپ گئے تھے۔ چالیس سال قبل کچھ چٹانیں کسی انہدام کے باعث نمایاں ہوئیں تو ماہر آثار قدیمہ اس ریت کے پہاڑ کو مکمل طور پر مسخر کرنے پر تل گئے۔

تھامس نے اس شمولیت کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہوئے مکمل پیشہ ورانہ مہارت سے کام کا آغاز کیا تو سن رسیدہ ماہر اس کی علمیت اور جانفشانی سے متاثر دکھائی دینے لگے۔ تھامس نے اپنے لیے نئی مصروفیات بھی ڈھونڈ لی تھیں۔ وہ دن بھر کام مکمل کرتا اور شام ہوتے ہی دیہاتی علاقوں کی جانب نکل جاتا۔ مقامی افراد کی طرح زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھ کر ان سے گفتگو کرتے، ان کے ہنسی مذاق کا چٹکلوں سے جواب دیتے وہ انہیں بھی بہت متاثر کر چکا تھا۔

دیہاتی اس پست قامت، بزلہ سنج اور حسین صورت شخص سے ایک عجیب انسیت محسوس کرنے لگے تھے۔ اپنے کام میں ایمان داری سے منسلک تھامس کے لیے واحد ناگواری ان جرمن انجینئرز کا رویہ تھا جو کھنڈرات کے قریب ہی بغداد کی ریلوے لائن پر کام میں مصروف تھے۔ ان دنوں وہ ایک ندی پر پل کی تعمیر کر رہے تھے۔ ان کا رویہ بے حد درشت اور متعصبانہ ہوتا تھا۔ تھامس اپنی ناپسندیدگی کا برملا اظہار کرنے لگا۔ نتیجتاً جرمن بھی اس سے نفرت اور بیزاری محسوس کرنے لگے۔ اس دوطرفہ بیزاری نے جلد ہی صورت حال مخدوش کر دی۔

ایک روز مقامی ملازم متوحش انداز میں تھامس کے پاس چلا آیا۔ تھامس اس وقت اپنے ایک ہم پیشہ دوست "وولی" کے ساتھ موجود تھا۔

"جناب! پولیس آپ کو گرفتار کرنے آئی ہے۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"کیوں بھئی...... میں نے کون سا خزانہ چرایا ہے یا کسی کو قتل کر دیا ہے؟" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

اسی اثنا میں ایک بھاری بھرکم جسامت کا حامل پولیس اہلکار اپنے روایتی کر و فر سے گھر میں داخل ہو گیا۔

"تم پر قیمتی پتھر چرا کر جرمنوں کو ترک پاؤنڈ میں فروخت کرنے کا الزام ہے۔ اس جرم میں تمہیں گرفتار کیا جاتا ہے۔"

اہلکار کی اس بات پر تھامس کی پیشانی ٹھنکی۔ اس نے کچھ روز قبل ہی نفرت اور ناپسندیدگی کے باوجود کھنڈرات سے نکلے پتھر اور ملبا سڑک کی تعمیر کے لیے جرمنوں کے حوالے کیے تھے۔ اس کا یہی عمل اب گلے پڑتا دکھائی دے رہا تھا۔ تھامس نے ہلکے پھلکے انداز میں اہلکار سے کہا۔

"جن پتھروں کو تم قیمتی کہہ رہے ہو وہ محض ملبا تھے جو میں نے ان جرمنوں کو سڑک کی تعمیر کے لیے دیے تھے۔"

"جرم بہرحال جرم ہے جس کی سزا بھی یقینی ہے۔"

اہلکار نے اس کی بات کا کوئی اثر نہ لیا اور تھامس کو گرفتار کر لیا۔

وولی اس صورت حال پر سراپا احتجاج اور تھامس ہنوز غیر سنجیدہ تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اہلکار اسے ایک کھچا کھچ بھری عدالت میں لے گیا جہاں سرخ چہرے والا طیش چھلکاتا ایک مجسٹریٹ بھی موجود تھا۔ فرد جرم پیش کرنے کے بعد ثبوت پیش ہوئے تو تھامس کو اندازہ ہوا کہ ترک اپنا موقف زبردستی منوا لینے پر تلے ہیں۔ یہ ممکن تھا کہ انہیں جیل بھی بھجوا دیا جاتا۔ تھامس اور وولی کی ہر دلیل رد کی جا رہی تھی۔ انہیں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت مل گئی۔ وولی نے تھامس پیشہ ورانہ انداز میں اس صورت حال کا پس منظر تحریری انداز میں واضح کر دیا لیکن ترکوں نے ایک بار پھر ان سنی کر دی۔

ایک ہفتے کی مہلت مکمل ہوتے ہی انہیں دوبارہ عدالت میں پہنچا دیا گیا۔ مجسٹریٹ نے وولی کی تحریر کردہ یادداشتیں اپنے قبضے میں کر لیں۔ وولی اور تھامس کو یقین ہو گیا کہ نامعلوم وجوہات کی بنا پر ان کی گرفتاری اور قید طے شدہ ہے۔ وولی سخت برافروختہ تھا۔ اس نے ایسی ہی کسی صورت حال سے نمٹنے کے لیے پہلے ہی اپنے لباس میں ہتھیار چھپا رکھا تھا۔ وولی نے سرعت سے تھامس کو ایک مبہم اشارہ کیا اور ہتھیار نکال کر حاضرین کو بزور طاقت ساکت ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ ماہرانہ انداز میں اپنا ہتھیار ہر طرف لہرا رہا تھا۔ تھامس اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کٹہرے سے باہر کودا اور عدالت کے عقبی حصے سے دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس نے مجسٹریٹ کے کمرے سے وولی کے تحریر کردہ کاغذات بھی برآمد کر لیے۔ اس برآمدگی کے بعد وہ دوبارہ کمرۂ عدالت کی طرف آیا اور وولی کو باہر آنے کا اشارہ کر دیا۔ طویل القامت وولی اپنے ہتھیار سے ہر ایک کو للکارتا فاتحانہ انداز میں باہر آیا اور تھامس کی معیت میں کامیابی سے فرار ہو گیا۔

اس واقعے نے تھامس کی زندگی پر بہت دور رس اثرات مرتب کیے۔ وہ ترکوں سے ایک عجیب نوعیت کی نفرت محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ جرمنوں کے لیے

جذبات بھی شدید منفی نوعیت اختیار کر گئے۔ تھامس نے انہیں مزہ چکھانے کے لیے ایک منفرد منصوبہ تشکیل دے لیا۔ وہ اگلی شام لوہے کا پائپ گھسیٹ کر ٹیلے پر لے گیا اور اس انداز میں دھکیل کر آگے تک لے آیا کہ سرے زیر تعمیر سڑک اور پل کی جانب نشانہ لگاتے محسوس ہونے لگے۔ شام کے دھندلکے میں پائپوں کی ہیئت بندوق سے مشابہ معلوم ہونے لگی۔ جرمن سخت خوفزدہ ہو گئے۔ انہوں نے ہنگامی تار بھجوانے کے اقدامات شروع کر دیے۔ لارنس ان کی بڑبونگ اور انتشار پر سکون محسوس کرنے لگا۔ یہاں آمد کے بعد وہ اپنے مزاج میں مختلف تبدیلیاں محسوس کر رہا تھا۔ اس نے پرانی بوتلیں اور ٹن نصب کر کے ایک بڑے پستول سے نشانہ بازی کی مشق کا آغاز کر دیا۔ ٹینس کی قمیص، نیکر اور آکسفورڈ کے رنگین کوٹ میں ملبوس پستہ قامت تھامس ایڈورڈ لارنس بے نیازی اور اعتماد سے موسم کی ہر سختی کا مقابلہ کرتا تھا۔ عجب تربات یہ بھی تھی کہ اس پر دھوپ کی تمازت بھی اثر انداز نہ ہوتی تھی۔ اس کی ہمہ جہت شخصیت اور اعتماد سے ساتھی ہی نہیں، مقامی لوگ بھی مرعوب رہا کرتے۔ وہ اب اسے لارنس کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔

لارنس بھی مقامی افراد سے بہت گھل مل گیا تھا۔ کام سے فراغت کے بعد وہ ان کے ساتھ طویل نشستیں جماتا، گلستان کے قصے سناتا اور ان کی روایات سے واقفیت حاصل کرتا۔ وہ ان افراد اور ان کی قومیت کے پس منظر کی بابت خاصا متجسس رہتا تھا۔ عربوں کے مذہبی پیشوا محمد ﷺ کی تعلیمات، عربوں کے عروج، وسیع سلطنت کے قیام، ہیئت، طب، ریاضی میں کاملیت، مقناطیسی سوئی کی ایجاد اور جہازرانی میں مہارت کے متعلق پڑھے گئے حقائق بھی اسے مسحور رکھتے تھے۔ مسیحی سپاہ اور مسلمانوں میں صدیوں تک جاری رہنے والی کشمکش اور مسلمانوں کا غلبہ بھی ایک اٹل حقیقت تھی۔ اس کے بعد صدیوں کی مزید مسافت اور امتداد زمانہ نے حالات کی نوبت یہاں تک پہنچا دی تھی کہ ترک تین براعظموں پر قابض تھے۔ ابتداً یہ وسیع حکومت عدل وانصاف اور مساوات پر مبنی تھی لیکن اب موجودہ حکمرانوں کا شعار مختلف تھا۔ وہ ظلم وجبر کی طرف مائل ہو چکے تھے۔

ان علاقوں میں رہتے ہوئے لارنس پر کئی ایک نئے حقائق بھی آشکار ہوئے۔ عرب قبائل کی وفاداطاعت کا مرکز اب جداگانہ حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ وہ ہم قوم ہونے کے باوجود باہمی نفرت کا شکار تھے۔ رائفل اور چھروں سے جنگ لڑتے، مختلف کاروانوں پر چھاپے مار کر اونٹوں اور غلاموں پر قابض ہو جاتے۔ پہاڑی علاقوں میں مقیم افراد رات ہوتے ہی میدانوں میں آتے اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتے۔ لارنس نے اپنی سیاحت اور ان بھی مقامی افراد سے ملاقاتوں کے دوران گزشتہ عروج کے بحال اور ترکوں کی غلامی سے نجات کا شش دیکھا تھا۔ ترکوں سے نفرت لارنس اور عربوں کے درمیان مشترکہ پہلو تھا۔

اس احساس کے بعد لارنس نے عربوں سے روابط مزید بڑھا دیے۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے سنہری بالوں، نیلگوں آنکھوں اور دھوپ سے سرخ ہو جانے والی رنگت کے باعث وہ عرب قبائل کی نفرت اور لوٹ مار کا نشانہ بھی بن سکتا ہے لیکن اس کی خوش گفتاری اور حکمت عملیوں نے ایسا ممکن نہ ہونے دیا۔ اس نے انگلستان لوٹتے ہی اپنے تجربات، مشاہدات اور ریت میں مدفن قدیم شہروں کی تفصیلات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ اس کی تحاریر نے انگلستان کے ماہر آثار قدیمہ میں ایک ہلچل برپا کر دی۔ انہیں لارنس کی صورت میں ایک بہترین ماہر آثاریات دکھائی دے رہا تھا۔

دوسری جانب لارنس اپنے قلم و کاغذ میں الجھا تحقیق کو نئی سمت عطا کرنے کی راہیں ڈھونڈنے میں بے طرح مشغول تھا کہ اسی دوران پہلی جنگ عظیم نے عالمی افق کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جس نے لاکھوں افراد کی طرح لارنس کی زندگی بھی یکسر تبدیل کر دی۔

☆☆☆

جا رحیت کا آغاز تھا۔ حکومت مصر کو سینا کے فوجی نقشے کی اشد ضرورت تھی۔ اس کام کے لیے کرنل نیو کامب کا تقرر کیا گیا لیکن ترک حکومت نے کسی بھی پیمائش کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ برطانوی انتظامیہ کے لیے یہ انکار ذاتی تازیانہ ثابت ہوا۔ انہیں ترک حکومت کی یہ ”سرکشی“ ایک آنکھ نہ بھائی۔ انہوں نے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیتے ہوئے اپنی ذہانت وعیاری سے ترکوں کو دھوکا دینے کی حکمت عملی تیار کر لی۔

اس بار ترک حکومت سے آثار قدیمہ کی حد تک پیمائش کرنے کی درخواست کی گئی۔ ان کی توقعات کے عین مطابق ترکوں نے یہ درخواست قبول کر لی۔ برطانوی حکومت نے اس کام کے لیے کرنل نیو کامب کے ساتھ لارنس اور وولی کو روانہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان تینوں کی معاونت نے اشد ی نقشہ مختصر عرصے میں ہی حاصل کر لیا۔

ان کی واپسی کے کچھ ہی عرصے بعد گرما کا آغاز ہوا تو جنگ کا طبل بج گیا۔ اس موقعے پر ہنگامی حالات میں کئی اہم

دفاتر اور شعبے بھی قائم ہوئے۔ دفترِ جنگ کے شعبۂ نقشہ کشی میں کرنل نیوکامب کی فرانس میں موجودگی بری طرح کھلنے لگی۔ اس غیر موجودگی کے باعث کسی اور ماہر کی مستقل موجودگی ناگزیر تھی۔ لہٰذا انتظامیہ نے لارنس کی خدمات حاصل کرلیں۔ بے نیاز اور بے پروا لارنس نے شہری لباس میں اپنے فرائض کی انجام دہی شروع کردی۔ شعبۂ نقشہ کشی کے افسران اس عجوبۂ روزگار شخص کے اطوار پر بہت حیران تھے۔

''مسٹر لارنس! اپنے اطوار میں تبدیلی پیدا کیجیے۔ فوجی لباس میں نقشہ خانہ آیا جایا کیجیے۔'' ایک اعلیٰ افسر جارج نے اسے ایک روز ٹوکا۔

''لباس سے کیا فرق پڑتا ہے سر؟'' اس نے بے نیازی سے دلیل دی۔

''فوج میں نظم و ضبط اور قواعد و ضوابط کی پابندی ہی سب سے اہم ہوتی ہے۔ تم عظیم برطانیہ کی فوج کا ایک حصہ ہو اور تمہیں اس کے شایانِ شان نظر بھی آنا چاہیے۔'' جارج نے ایک بار پھر ٹوکا۔

''اوہ اچھا۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ فوج میں وفاداری سب سے اہم ہوتی ہے لیکن خیر آپ اتنا اصرار کررہے ہیں تو تسلیم کرلیتا ہوں اور فوجی وردی پہن لیا کروں گا۔'' لارنس نے نہایت سکون سے چوٹ کی۔

جارج تلملا کر رہ گیا۔ اس کے بعد لارنس نے انتظامیہ کے مسلسل اصرار پر سیکنڈ لیفٹیننٹ کی وردی زیب تن کرنا شروع تو کردی البتہ اس کی ہیئت تا حال عسکریت کے منافی تھی۔ مزاج کے لاابالی پن کا یہ عالم تھا کہ ہر شانے پر موجود رہنے والا ابھرا تمغہ بھی اپنے اصل مقام پر موجود نہ رہتا۔ لارنس کی یہ بدسلیقگی فوجی افسران کو بہت کھٹکتی۔ وہ اسے اپنے اطوار سدھارنے پر ٹوکنے کے لیے مجبور ہوجاتے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ لارنس کے دل میں فوج کے اس جبری نظم و نسق کے لیے ناپسندیدگی پروان چڑھنے لگی۔

اگلے برس کے آغاز میں کرنل نیوکامب کی فرانس سے انگلستان واپسی ہوئی تھی۔ اس وقت مصر میں ہنگامی کمک اور چند ایسے عہدیداروں کی اشد ضرورت تھی جو مقامی زبان سے بھی واقفیت رکھتے ہوں۔ کرنل نیوکامب نے لارنس اور وولی کو اپنے ہمراہ رکھنے کی تجویز پیش کردی جسے منظور بھی کرلیا گیا۔

لارنس حالات کی اس نئی کروٹ پر بہت خوش تھا۔ اسے اپنے مزاج کے مطابق کام اور کھل کر کھیلنے کا موقع مل گیا تھا۔ لارنس ہر نقشے کا باریک بینی سے مطالعہ کرتا۔ کسی معمولی کمی بیشی کی صورت میں وہ ان پر تصحیح کردیتا اور زیادہ غلطیاں نظر آنے پر وہ نقشہ ہی پرزوں میں تبدیل کردیتا۔

''لیفٹیننٹ لارنس! تمہارا یہ عمل سراسر غیر فوجی ہے۔ تم نقشہ جات کو پرزوں میں تبدیل کرنے کے بالکل مجاز نہیں ہو۔'' ایک اعلیٰ افسر مائیکل نے اسے ٹوکا۔

''میں معذرت خواہ ہوں سر! لیکن میں کسی کے بھی ٹوکنے، سمجھانے یا سرزنش کرنے کے باوجود اس بار اپنی یہ روش بالکل تبدیل نہیں کروں گا۔'' اس نے دوٹوک جواب دیا۔

''کیا تم اس کے انجام سے واقف ہو لیفٹیننٹ لارنس؟'' مائیکل نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا۔

''نہیں..... اور مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ میں نقشہ جات میں کسی بھی معمولی سی تبدیلی کے انجام سے بخوبی واقف ہوں۔ موجودہ حالات و واقعات میں ہم کسی معمولی غلطی کے متحمل بھی نہیں ہوسکتے۔ ریگستانی علاقے ایسی غلطیاں کبھی معاف ہی نہیں کرتے۔ کسی بھی چشمے کے تعین میں معمولی فرق، صحرا میں پھیلی بیسیوں وادیوں میں سے کسی ایک کے نام میں معمولی ترین فرق راہ بھٹک جانے کے بعد عبرت ناک موت کی طرف لے جاتا ہے۔ صحرا ایک درندہ ہے..... خونخوار درندہ۔ اس کی بھوک کبھی ختم نہیں ہوتی۔'' لارنس نے سپاٹ انداز میں کہا۔

لارنس کی یہی پیشہ ورانہ صلاحیت اس کے اعلیٰ افسران کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کردیتی تھی کہ وہ بظاہر بے سلیقہ اور غیر فوجی انسان ہے لیکن اس کا ہنر اور مہارت کسی عظیم ترین جرنیل سے کسی صورت بھی کم نہیں۔ لارنس کو اگلی مہم کے لیے بھی منتخب کرلیا گیا۔

☆☆☆

انتظامیہ نے لارنس کو بصرہ روانہ کردیا تھا۔ یہ مہم اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں بے حد اہم ثابت ہوئی۔ اس نے بصرہ میں اہلِ زبان کی طرح عربی بولنا سیکھی۔ ایک ہوٹل میں جاسوسی کا ادارہ قائم کیا اور دو عرب نوجوانوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ بصرہ میں اس کی ملاقات ایک یہودی خاتون ''مس گرٹروڈ بیل'' سے ہوئی جو بعد ازاں بہت سنسنی خیز بھی ثابت ہوئی تھی۔ وہ مشہور سیاسی پس منظر سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی نزاکت اور دلکشی دیکھ کر یہ اندازہ لگانا محال تھا کہ اس نے جنگ سے قبل شام اور عربستان کے دور دراز، قدرے گمنام علاقوں کی خاک بھی چھان رکھی ہے۔ وہ اپنے علم و مہارت سے زمانۂ جنگ کے علاوہ دورِ امن میں بھی برطانوی

حکومت کی مدد کرتی رہی تھی۔ وہ بصرہ میں عرب نوجوانوں کو اپنی دلشوں کا اسیر کرکے ان کے دلوں میں قوم پرستی کے جذبات پروان چڑھاتی تا کہ انہیں ترکوں کے خلاف اپنے وسیع تر قومی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکے۔

لارنس نے اس خاتون سے ایک بار ملاقات کی اور پھر بار بار ملنے کی تمنا کرنے لگا۔ وہ اپنی ہر ملاقات میں پرانی ریگستانی مہمات اور کھنڈرات کی یادیں تازہ کرتے۔ مس گرٹروڈ بل بلاشبہ لارنس کی زندگی میں آنے والے یادگار ترین افراد میں سے تھی پھر مس گرٹروڈ بل کی رخصتی کا وقت آ گیا تھا۔ لارنس نے اسے بہت پرجوش انداز میں رخصت کیا۔ وہ اس خاتون کے شخصی اوصاف سے حقیقتاً متاثر ہوا تھا۔

اس کے بعد لارنس کے ذمے یہ مہم سونپی گئی کہ وہ برطانیہ کو برلن سے بغداد جانے والی ریلوے لائن سے متعلق اطلاعات فراہم کرے اور ایسے ضمیر فروش افراد کی تلاش بھی جاری رکھے۔ ان دنوں عراقی ریلوے لائن دریائے فرات تک پہنچ چکی تھی اور دریا پر پل باندھنے کا کام جاری تھا۔ اس نے آثارِ قدیمہ کے نگران اعلیٰ کا روپ دھار کر کھدائی شروع کروادی اور اس آڑ میں ترکوں، جرمنوں کی ہر خبر لندن پہنچانے لگا۔

صورتِ حال کچھ اس طرح تھی کہ برطانوی فوجی افسران کی ایک جماعت ''کٹ کرنا'' سے دست برداری کے متعلق ابتدائی بات چیت کا آغاز کرچکی تھی۔ سپاہ کی بے پناہ کوششوں کے باوجود کٹ کرنا چھوڑنے یا ترکوں سے چند شرائط منوانے کے سوا کوئی راہ نہ بچی تھی۔ لارنس کو یہاں چند تنقیدی ذمے داریاں بھی سونپی گئی تھیں۔ وہ انگریز زخمیوں کی منتقلی میں تعاون کرتا رہا۔ اس نے کئی روز خندقوں میں بھی بسر کیے جہاں فوجی افسران سے گفتگو کے دوران لاشوں کی ہولناک بدبو سے کثیف ہوا میں سانس لینا بھی ایک بھیانک مرحلہ تھا۔ غذا کا عالم اس سے بھی ہولناک تھا۔ ہر لحظہ یہی خدشہ لاحق رہتا کہ اشیائے خورد و نوش مکھیوں اور مختلف الانواع کیڑوں سے محفوظ رکھی جاسکیں۔ اس انتشار اور تعفن نے لارنس کو بخار میں مبتلا کردیا۔ نقاہت نے بھی بدن کو آدبوچا البتہ اس نے اپنی قوتِ ارادی سے ہر مرحلے میں کامیابی حاصل کرکے اپنے فرائض کی انجام دہی جاری رکھی۔ اس نے شہر سوئز پر ہونے والی لڑائی کے بعد ترکوں کی لاشوں کی تصاویر حاصل کیں۔ تقریباً دو سو گز کی مسافت طے کی تو بھیانک ترین مناظر نے اس کا استقبال کیا۔ لاشوں کے ڈھیر لہو آلود کٹے پھٹے جسم ہوا میں تحلیل کرتا تعفن ہر لحظہ اس پر بری طرح غالب آچکا تھا۔ وہ انقلابی لمحات تھے۔ لارنس کی فطری لطافت اور اذیت رسانی سے گریز ہیجان میں تبدیل ہوگئے۔ ان لمحات میں لارنس کے ذہن میں ایک نئی سوچ کلبلانے لگی کہ اقوام کی تاریخ میں جنگ ناگزیر ہو جائے تو اسے جانی زیاں سے گریز کرتے ہوئے فنِ حرب کی حکمت عملی سے بھی فتح حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس جنگ عظیم کے ابتدائی مرحلے میں بظاہر ترک کامیاب دکھائی دے رہے تھے۔ لارنس کی حب الوطنی اور ترکوں سے نفرت دل کے کسی کونے میں سسکتی رہتی۔ اسے ہوائی فوٹوگرافی کے ذریعے نقشے بنانے کے امکانات پر رپورٹ مرتب کرنا تھی۔ اس نے کام کی تکمیل کے بعد اپنی تزویراتی سوچ اور حکمت عملی کے متعلق بھی چند تجاویز اس رپورٹ کے ساتھ منسلک کردیں۔ اس نے اعلیٰ افسران کو یہ باور کروایا کہ ان کی کامیابی کے روٹھنے کی وجہ محض یہ ہے کہ تمام تر کارروائیاں قدرے غلط اور بے وقت ہیں۔ اس کے بعد لارنس نے چند اہم غلطیوں کی نشاندہی کی جن کی رو سے کشتیوں کی ساحل پر آمد و رفت کے طریقے، ان کشتیوں سے سامان اتارنے کے مراحل ناقص اور وقت کا زیاں ثابت ہوئے تھے۔ ریلوے کی حدود میں بھی منظم انداز کی کمی تھی۔ وہاں موجود اسباب محض اس وجہ سے ضائع ہو رہا تھا کہ عہدیداران ان کے مصرف سے واقف ہی نہ تھے۔

یہ رپورٹ روانہ کرتے وقت اسے سندِ قبولیت کی زیادہ امید نہ تھی۔ اس نے اپنی ذاتی تسکین کے لیے یہ تجاویز روانہ کی تھیں۔ اعلیٰ افسران اسے طلب کرتے تو وہ وہاں سے اپنی اذیت [illegible] رکھتا تھا۔ مشرق میں [illegible] جنگ کے عمیق مطالعے سے وہ باعلم تھا کہ ترک افواج نے اتحادیوں کو کن مقامات پر روک رکھا ہے۔ فلسطین کی سرحد میں انگریز سپاہ کو درپیش مزاحمت سے بھی اسے آگاہی تھی۔

اس کے بعد لارنس کی نظریں عالمی افق کا ایک مضطرب گوشہ بھی دیکھ رہی تھیں۔ یہ وہی گوشہ تھا جس کے مکینوں سے ماضی قریب میں اسے کافی انسیت بھی رہی تھی۔ یہ وہی پہلو تھا جو ترک حکومت کی غلطیوں کے باعث قدرے کمزور ہوگیا تھا اور اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بغاوت کے لیے بند توڑ دیا جاتا تو خلافتِ عثمانیہ کی بلند و بالا دیواروں میں شگاف بھی پیدا ہوسکتے تھے۔ لارنس نے اپنی بھاگ دوڑ سے ایک ترک سلیمان فاکری کو جھانسے میں لاکر برطانوی عزائم کے لیے استعمال کرنا چاہا لیکن فاکری نے اس سے درشت رویہ اختیار کرکے دھکے مار کر باہر نکالا۔ اس لیے

لارنس کے دل میں ترکوں سے نفرت مزید گہری ہوگئی۔

سلیمان فائزی کے تجربے سے محتاط اور مایوس ہوکر لارنس نے اپنا لائحہ عمل تبدیل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اسی دوران اسے علم ہوا کہ لارڈ کچنر نے شریف مکہ حسین کو اپنی روایتی عیاری اور ''مخصوص ہتھیاروں'' کے استعمال سے دام میں الجھا کر ترکوں کے خلاف بغاوت پر راضی کرلیا ہے جو کہ لارنس کے لیے کافی خوش آئند بات تھی۔ علم ہوا کہ شریف مکہ کے دل میں بھی برسوں سے ''شاہ حجاز'' بننے کی تمنا موجزن تھی۔

لارنس کی خوش قسمتی ہم رکاب تھی۔ اسے عسکری اقدامات کے خفیہ امور میں مددگار دوست ''مرو حسن'' اور سیکنڈ کمانڈر ''ڈی جی ہوگارتھ'' کی معاونت بھی میسر آگئی۔ وہ دونوں ہی عرب کے اس سیکٹے میں خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ لارنس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگی صورت حال پر تبادلۂ خیال کیا تو کئی اہم انکشافات اور انقلابی پہلو سامنے آئے۔

''سرزمین حجاز ترک تسلط میں ہونے کے باوجود ان کے لیے بے حد مقدس مقام ہے۔'' ہوگارتھ نے پرسوچ انداز میں کہا۔

''ہاں، حجاز، ترک ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے لیے مذہبی ہدایت اور امداد کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ مسلمانوں کے پیغمبر کی شریعت اور محبت نے عالم اسلام کو ایک وحدت میں پرو دیا ہوا ہے۔ وہ غیر مذہب سے ہونے والی ہر لڑائی میں شامل ہونا اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس صورت میں انہی مسلمانوں کے مرکز ''مکہ'' میں ہی جنگ کا طبل بج جائے تو دنیا کی دیگر متمدن اقوام میں لڑائی کا نقشہ ہی تبدیل ہوکر رہ جائے گا۔'' لارنس نے چٹخارا لیا۔

''لیکن اس صورت حال میں ایک خدشہ بھی لاحق تو ہوگا کہ برطانوی سلطنت میں شامل مسلم ممالک بھی ان کے خلاف صف آرا ہوسکتے ہیں۔ یہ امر اگر اتحادی افواج کے لیے کافی تشویش ناک ہوگا تو دوسری جانب ترک اور جرمن انتظامیہ اس سے خاطر خواہ فوائد حاصل کرسکتے ہیں۔ وہ دیگر اسلامی ممالک کو یہ باور کرواسکتے ہیں کہ ایک عظیم الشان مسلم سلطنت کے قیام میں وہ ان کی خاطر خواہ مدد کرسکتے ہیں۔ ترک اور جرمن افواج کے لیے ایسی کوئی بھی کمک یا گٹھ جوڑ اتحادیوں کے لیے مہلک ثابت ہوگا۔'' ہوگارتھ نے تجزیہ کیا۔

''اس تمام تر صورت حال میں شریف مکہ کا کردار ہی سب سے اہم ثابت ہوگا۔'' لارنس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اس شخص کے بارے میں میری ذاتی تحقیق یہ کہتی ہے کہ وہ اپنے خوابوں کے زیر اثر وجود، قومیت، ملی حمیت اور اپنا عظیم الشان منصب تک فراموش کرچکا ہے۔ اگر برطانیہ اسے مشرق وسطیٰ میں شامل ممالک پر مشتمل ایک عظیم سلطنت کے قیام کا وعدہ کرے تو وہ ہر ممکن مدد کے لیے تیار ہوجائے گا۔ ایک ایسی سلطنت جو اپنی حیثیت میں عباسی حکومت سے کسی بھی طور کم نہ ہو۔''

''میں تمہاری یہ تجاویز ذاتی طور پر بھی انتظامیہ تک پہنچا دوں گا۔ بس تم ایک بات کا خیال رکھو کہ اعلیٰ افسران کو کسی شکایت کا موقع نہ دیا کرو۔'' ہوگارتھ نے اسے سمجھایا۔

''اوہ، چھوڑو بھی۔ مجھے ان کی ناراضی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' لارنس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''تمہیں فوج بدر بھی کیا جاسکتا ہے۔'' اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

''تو اس صورت میں وہ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ میرا تو کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔'' وہ کندھے اچکا کر مسکرایا۔

ہوگارتھ بے بسی اور تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

لارنس ایک میز پر نقشہ جات پھیلائے نہایت انہماک سے کسی جائزے میں مگن تھا۔ کمرے کا طول و عرض زیادہ نہیں تھا۔ اس پر مستزاد مختلف النوع سامان مزید تنگی کا پتا دیتا۔ لارنس نقشے کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک قلم سے مختلف مقامات پر نشان لگا دیتا۔ کچھ لمحوں بعد اس کی دائیں سمت موجود کھڑکی سے غیر مانوس سے شور نے اس انہماک میں خلل پیدا کردیا۔ اس نے قدرے تکدر سے اپنا سر اٹھایا اور گہری سانس بھرتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا جہاں مخصوص انداز میں سجے چند اونٹ گزرتے دکھائی دے رہے تھے۔

لارنس کے قریب ہی بیٹھا مائیکل جارج یہ منظر نہایت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ لارنس کے نتھنوں سے ان جانوروں کی مخصوص باس ٹکرائی تو وہ اپنے ہاتھ میں قلم تھماتے ہوئے کہنے لگا۔

''کبھی کبھی مجھے اس تنگ، بدبودار اور نیم تاریک کمرے میں بہت گھٹن محسوس ہوتی ہے۔''

''لیکن مجھے تو ایسا بالکل محسوس نہیں ہوتا۔'' جارج نے جواب دیا۔ ''کسی گھٹن زدہ، تاریک، بدبودار خندق سے تو یہ جگہ ہزار درجے بہتر ہے۔''

''تم جیسی قناعت شاید مجھ میں کبھی پیدا نہ ہوسکے۔

لارنس نے گہری سانس بھری۔

اسی اثنا میں اسے اپنے عقب میں سیٹی بجنے کی خوشگوار آواز سنائی دی تو اندازہ ہو گیا کہ ''ولیم پوٹر'' کی آمد ہوئی ہے۔ لارنس یکدم پُرجوش ہو گیا۔ ولیم کی آمد کا مطلب تھا کہ وہ اس کا مطلوبہ اخبار ''نجم مصر'' بھی لے آیا ہے۔ ولیم نے خوشدلی سے اسے اخبار تھمایا اور مائیکل سے محوِ گفتگو ہو گیا۔

لارنس کی تمام تر توجہ اب اس مقامی اخبار پر مرکوز تھی۔

''کیا کوئی خاص خبر شائع ہوئی ہے؟'' مائیکل اس کی دلچسپی دیکھ کر استفسار کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''ہاں، خاص الخاص۔'' لارنس نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ ''عرب بدوؤں اور ترکوں میں جھڑپیں ہونے لگی ہیں۔''

''لیکن ''دی ٹائمز'' میں تو ایسی کوئی اطلاع نہیں۔'' مائیکل کو اچنبھا ہوا۔

''ہو بھی نہیں سکتی۔ وہ عوام کو اتنا ہی باخبر رکھتے ہیں جتنا انہیں ضروری محسوس ہوتا ہے۔'' لارنس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

اسی اثنا میں ایک اردلی وہاں چلا آیا۔ اس نے کاغذ کا ایک پرزہ لارنس کو تھما دیا۔

''میرے سگریٹ لائے ہو یا نہیں؟'' لارنس نے ولیم سے دریافت کیا۔

''جی ہاں، لے آیا ہوں۔'' ولیم نے کہا اور جیب سے مخصوص برانڈ کا سگریٹ نکال کر لارنس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

''اب اسے سلگا بھی دو۔'' اس نے قدرے تساہل سے کہا۔

''میں نے تم جیسا عجیب شخص کبھی نہیں دیکھا۔'' مائیکل نے کہا۔

''اور کبھی دیکھو گے بھی نہیں۔'' وہ بے نیازی سے مسکرایا اور اردلی کے لائے کاغذ پر درج پیغام پر نظر دوڑا کر یکدم مستعد ہو گیا۔ اس نے ایک جانب رکھی اپنی بندوق کی پیٹی اٹھائی اور اسے مخصوص انداز میں کمر کے گرد باندھنے لگا۔ وہ اپنی وردی کے معاملے میں ہنوز خاصا بے پروا تھا۔

''میں جنرل صاحب سے ملاقات کے لیے جا رہا ہوں۔ امید ہے جلد واپسی ہو جائے گی۔'' اس نے ولیم اور مائیکل سے کہا اور عجلت میں آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

لارنس بے پروائی اور عجلت سے چلتا ایک وسیع ڈرائنگ ہال میں پہنچ گیا تھا جہاں مختلف افسران اپنی فراغت کے لمحات متفرق تفریحات میں صرف کر رہے تھے۔ کوئی چائے نوشی میں مصروف تھا تو کوئی اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔

''لیفٹیننٹ لارنس! ذرا رکیے۔'' اسے اسنوکر کی میز پر مصروف ایک افسر کی صدا سنائی دی۔

لارنس ٹھٹک کر رکا اور اسی بے پروائی سے میز کی جانب چلا آیا۔

''کیا فوج میں ٹوپی پہننے کا طریقہ بدل گیا ہے یا آپ کو کوئی الگ طریقہ سکھایا گیا تھا؟'' اس نے خشمگیں نگاہوں سے لارنس کو گھورا۔

لارنس نے اپنی نظریں اٹھا کر ٹوپی دیکھنے کی کوشش کی اور اس کا رخ تبدیل کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''میرا تو خیال ہے کہ لباس کے تمام لوازمات سے زیادہ وفاداری اور خلوص اہم ہوتا ہے۔'' اس نے اسنوکر کی ایک گیند تھام کر باقی گیندوں پر ضرب لگا کر انہیں منتشر کیا اور افسران کی ناگواری کو خاطر میں لائے بغیر پلٹ گیا۔

☆☆☆

عسکری انتظامیہ نے صلاح مشورے کے لیے ایک اجلاس طلب کیا ہوا تھا جہاں لارنس کے نئے فرائض کے متعلق بحث کا آغاز جاری تھا۔

''تھامس ایڈورڈ لارنس عربوں کے لیے خاصا باعث توقیر ہے۔'' ایک افسر نے اپنی تجویز دی۔

''بلاشبہ ایسا ہی ہو گا لیکن اب وہ ایک ایسی سرزمین پر جا رہا ہے جہاں غیر مسلم افراد کا داخلہ ہی بند ہے۔ وہ وہاں کیونکر داخل ہو پائے گا؟'' دوسرے افسر نے خدشہ بیان کیا۔

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ وہ اپنے مذہب کی تبدیلی کا فرضی اعلان بھی کر سکتا ہے۔ عرب کسی بھی ایسے شخص کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ پیدا کر لیتے ہیں جو ان کے مذہب میں نووارد ہو۔'' پہلے افسر نے رائے دی۔

''مناسب تجویز ہے۔'' تیسرے رکن نے بے ساختہ جواب دیا۔ ''لیکن لارنس وہاں کیا فرائض سرانجام دے گا اور تم لوگ یہ کیوں بھول رہے ہو کہ وہ ماضی قریب میں اپنی بدنظمی اور بدسلیقگی کے باعث خاصے مسائل کا شکار رہا ہے۔''

''لارنس کے فرائض تو طے شدہ ہیں۔'' ایک اور افسر نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ''وہ سب سے پہلے ایک ایسے شخص کو تلاش کرے گا جو بہترین قائد ثابت ہو سکے۔ لارنس اس شخص کو باور کروائے گا کہ عرب قبائل باہمی جنگ و جدل کے

بجائے سبھی اختلاف بھول کر متحد ہو جائیں تو ترکوں کو اپنی سرزمین سے بے دخل کر سکتے ہیں۔ لارنس انہیں بتائے اور سمجھائے گا کہ ترکوں نے ان کے ملکی وسائل کو بے دردی سے لوٹ کر ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا ہے۔'' پہلے افسر نے تفصیل سمجھاتے ہوئے توقف کیا۔ ''باقی رہی بات لارنس کے مزاج اور بد سلیقگی کی...... تو یہی پہلو ہمارے لیے سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوگا۔ ایسے شخص کے بارے میں کوئی بھی شبہ نہیں کر سکے گا کہ وہ کسی خفیہ خدمت کے عسکری محکمے کی خدمات پر متعین ہے۔''

''حجاز پر ترکوں کی گرفت بہت مضبوط ہے۔'' ایک اور افسر نے تشویش جتائی۔ ''اس ملک میں ایک ہی ریلوے لائن ہے اور وہ بھی ان ترکوں کے قبضے میں ہے۔ ان کی چوکیاں مستحکم ہیں اور مسافت کا یہ عالم ہے کہ تہ سلہ راکش کی مار سے بھی کم ہے۔ بندوقیں اور رائفلیں بھی جدید ہیں۔''

''یہ مسئلہ بھی حل ہو لیکن عربوں کی فطرت کا کیا کیا جائے گا؟ میں نے بنیادی طور پر انہیں قبائلیت کی طرف مائل دیکھا ہے۔ وہ کوئی بھی جنگ لوٹ مار کے ارادے سے کرتے ہیں۔ اس قدر وسیع پیمانے پر جنگ اور منظم ترکوں سے پنجہ آزمائی کرنا ان کے لیے سہل نہ ہوگا۔ وہ تو لوٹ مار اور آتش زنی میں ہی طاق ہیں۔ جنگ کیسے لڑیں گے؟'' عربوں کے ہتھیاروں کی تفصیل بتانے والے افسر نے نکتہ اٹھایا۔

''تو یہی لارنس کا اصل کام ہوگا۔ وہ عرب قبائل کو متحد کر کے انہیں فنون حرب سکھائے گا اور تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ مسلم قوم جبلی طور پر ہی جنگجو ہے۔ عرب تو ان میں سر فہرست ہیں۔ ان کے پاس اپنے خدا اور نبی کے وہ احکامات ہیں جن سے انہیں شہادت کا تصور ملتا ہے اور یہی تصور انہیں خود سے کئی گنا بڑے دشمن کا مقابلہ کرنے کی طاقت بھی دیتا ہے۔ لارنس کو ان کی یہی خوابیدہ صلاحیتیں اجاگر کرنا ہیں۔''

اس تجویز کے بعد کسی کے پاس بحث یا مزید تحفظات کی گنجائش نہ تھی۔ لارنس کو اکتوبر 1916ء میں عرب روانہ کیا گیا تو اس کے پاس اپنے خوابوں اور فولادی ارادوں کا بھرپور زادِ راہ تھا۔

☆☆☆

لارنس کے نئے سفر کا آغاز ہو گیا۔ وہ سوئز سے روانہ ہوا تو اپنے خیالات اور سینہ منصوبوں میں مگن رہنے کے علاوہ کوئی مشغلہ نہ تھا۔ ملاحوں اور دیگر مسافروں کی کوششوں کے باوجود ان سے مختصر گفتگو پر ہی اکتفا کرتا۔ اس سفر میں واحد دشواری شدید گرمی تھی جس کے باعث سانس لینا بھی دوبھر تھا۔ رات کے اوقات میں کچھ سکون میسر آ پاتا تھا۔

لارنس کی منزل جدہ تھی جہاں پہنچنے سے ایک روز قبل ہی موسم میں تغیرات نے انہیں ایک اور اذیت میں مبتلا کر دیا۔ ہوا کی شدت کے علاوہ سمندر میں تلاطم سے پانی کے تھپیڑوں کا عرشے پر آنا بھی کسی امتحان سے کم نہ تھا۔ اگلے روز وہ جدہ پہنچ گئے۔ کشتی میں تلخ تجربہ عبور کرتے ہوئے لارنس کو بخوبی اندازہ تھا کہ شمالی عربستان کی گرمی ان کے لیے ایک اور اذیت ناک امتحان ثابت ہوگی۔ خشکی پر پہنچ کر جب وہ انگریز قونصل کے مکان کی سمت روانہ ہوئے تو وہی بازار سے متفرق بدبو کی آمیزش ہوا ان کے لیے نئی آزمائش تھی۔ جدہ ایک عجیب النوعیت شہر تھا۔ گلیاں بے حد تنگ و تاریک تھیں۔ ان کے دونوں سروں تک چھتوں پر چوبی پل بنائے گئے تھے۔ لارنس کو یہ شہر تضادات کا مجموعہ محسوس ہو رہا تھا۔ ایک جانب چوبی پل لرزتے ہوئے شہر کا تاثر دیتے تو دوسری جانب پاؤں تلے ریت کی تہیں اس قدر موٹی تھیں کہ چلتے وقت آواز بھی بہت کم پیدا ہوتی۔

اسی شہر میں لارنس کی ملاقات ایک مقامی شخص سے ہوئی جس نے ذاتیات میں ملوث ہونے کے بجائے اسے مطلوبہ مقام تک پہنچانے کی ہامی بھر لی۔

☆☆☆

زمین کے وسیع و عریض سینے پر تا حد نگاہ ریت اور مختلف ٹیلوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ لارنس اپنے اس مقامی راہنما کے ساتھ پر اعتماد انداز میں عازم سفر تھا۔ یہ راہنما درمیانی عمر اور مضبوط کاٹھی کا حامل شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں طراری کی مخصوص چمک تھی۔ وہ لارنس کے ہر ایک انداز و اطوار کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بھانپ چکا تھا کہ مقابل کوئی معمولی انسان نہیں ہے۔

اس اندازے پر مہر تصدیق اس وقت ثبت ہوئی جب طلوع آفتاب کے بعد ایک مخصوص مسافت طے کرنے کے بعد اس نے لارنس سے کہا۔

''اب تم پانی پی سکتے ہو۔''

لارنس نے پانی کی چھاگل اتار لی۔

''صرف چند ایک گھونٹ...... اس سے زیادہ مت لینا۔'' اس نے تنبیہ کی۔

''تم پانی نہیں پیو گے؟'' لارنس نے دریافت کیا۔

''نہیں، میں ایک بدو ہوں اور پیاس سے لڑنا ہماری گھٹی میں شامل ہوتا ہے۔'' اس نے فخر سے جواب دیا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔ یہ بھوک پیاس میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔"

لارنس کے اس پُراعتماد جواب پر بدو نے دلچسپی سے اسے دیکھا اور خاموشی سے سفر رواں رکھا۔ اس سفر میں تعطل غروبِ آفتاب کے بعد تاریکی کے پھیلنے سے ہوا۔ بدو نے اپنے پاس موجود بچھونے ریت پر بچھا دیے۔ لارنس کی نگاہیں تاروں بھرے شفاف آسمان پر مرکوز تھیں۔ چاند کے جلو میں ستاروں کی یہ محفل بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی۔

"کیا تم ایک برطانوی ہو؟" اس نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد لارنس سے دریافت کیا۔

"ہاں، میرا تعلق آکسفورڈ شائر سے ہے۔" لارنس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"ملازمت کے سلسلے میں قاہرہ رہے تھے کیا؟ وہاں سے اتنی مسافت طے کر کے یہاں کیسے آئے بھلا؟" بدو نے اپنے تجسس کی تسکین کے لیے دریافت کیا۔

"ہاں، قاہرہ سے ایک کشتی میں مسافت طے کی تھی۔" لارنس نے اپنی مخصوص بے نیازی سے بتایا۔

"کیا برطانیہ ایک صحرائی ملک ہے؟" بدو نے پوچھا۔

"نہیں، وہ ایک زرخیز ملک ہے۔ وہاں کے رہائشی طویل قامت اور فربہ اندام ہوا کرتے ہیں۔"

"لیکن تم تو ایسے نہیں ہو۔" اس نے لارنس کی منحنی جسامت اور پستہ قامتی کا ایک بار پھر بغور جائزہ لیا۔

"ہاں، میں ایک منفرد شخص ہوں۔" وہ ہلکے سے مسکرایا اور اپنے لباس سے ہتھیار الگ کر کے ایک جانب رکھنے لگا۔

بدو کی نگاہ اس کے پستول پر ٹھہر گئی۔ آنکھوں کی چمک مزید گہری ہو گئی تھی۔ لارنس نے اس کی دلچسپی محسوس کرتے ہوئے وہ پستول اسے تھما دیا۔

"یہ میری جانب سے تم رکھ لو۔"

"ارے نہیں۔ میں یہ کیسے رکھ سکتا ہوں؟" وہ ہڑبڑا گیا۔

"تحفہ سمجھ کر رکھ لو بھئی۔" لارنس مصر ہوا۔

"تمہیں منزل پر پہنچانے کے بعد لے لوں گا۔" وہ ہچکچا کر بولا۔

لارنس اس تذبذب میں پوشیدہ نیم رضامندی بھانپ گیا۔ اس نے وہ پستول بدو کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پستول کے آہنی لمس نے بدو کی دلچسپی فزوں تر کر دی۔ تلواروں اور نیزوں کے استعمال کرنے والے بدو کے لیے یہ لمس بہت مسحور کن تھا۔ اس نے شکر گزاری کے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے پاس موجود کھجوروں پر مشتمل مخصوص کھانا لارنس کو پیش کر دیا۔ لارنس نے ایک کھجور تھام لی جو لذت میں بے مثال تھی۔ وہ رات یونہی باتوں اور آرام میں کٹ گئی۔

اگلی صبح وہ دونوں ایک بار پھر سفر کے لیے تیار تھے۔ کچھ دور تک مسافت طے کرنے کے بعد اب وہ ٹیلے کے پاس چلے آئے تھے۔ بدو اونٹ سے اترا اور لارنس کو کندھے سے لگی دوربین آنکھوں پر لگانے کا اشارہ کیا۔ لارنس کے دوربین لگانے کے بعد وہ کہنے لگا۔

"یہاں سے حارث کے علاقے کی سرحد کا آغاز ہوتا ہے لیکن میں حارث سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوا۔"

"ہاں، مجھے علم ہے۔ بنی سالم کا حازمی بہت نڈر ہے۔ وہ کسی سے خوفزدہ ہو ہی نہیں سکتا۔" لارنس نے معنی خیزی سے جواب دیا۔

بدو حیرانی اور قدرے بے یقینی سے لارنس کو دیکھنے لگا۔ اس نے سفر کے آغاز سے اب تک لارنس کو اپنے نام اور قبیلے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ لارنس کی ان مصدقہ معلومات نے اسے ایک بار پھر متاثر ہونے پر مجبور کر دیا۔

"تو چلو پھر سفر کا آغاز کرتے ہیں۔" حازمی نے ایک عزم سے کہا اور پھر ایک توقف سے گویا ہوا۔

"دانش مندی یہی ہے کہ ہم یہ علاقہ جلد از جلد عبور کر لیں۔ اس اونٹ پر اپنے دائیں پاؤں کی گرفت مضبوط کرو اور اپنا بایاں پاؤں دائیں سے منسلک کر لو۔ اونٹ کو تیز بھگانے کے لیے مخصوص صدا لگاؤ اور پھر کمال دیکھو۔"

لارنس نے اس کی ہدایت پر من و عن عمل کیا۔ اونٹ کی رفتار میں یکدم تیزی آ گئی۔ حازمی بھی پوری رفتار سے اس کے عقب میں لپکا۔ یہ مسافت کچھ دیر بعد ایک کنوئیں پر منتج ہوئی۔ حازمی نے کنوئیں سے پانی نکالا اور لارنس کے ساتھ جی بھر کر پینے کے بعد منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو گیا۔

پانی پینے کے دوران انہیں ایک سمت میں گرد و غبار کا طوفان اٹھتا محسوس ہوا۔ حازمی کی حسیات مکمل چوکنا ہو گئیں۔ کچھ ہی لمحوں بعد اسے ایک سیاہ پوش اپنی جانب بڑھتا محسوس ہوا۔ حازمی متذبذب کھڑا اس وارد کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ لارنس بھی مکمل چوکس دکھائی دینے لگا۔

سیاہ پوش اب کافی نزدیک آ چکا تھا۔ حازمی کے وجود میں یکدم برق سی کوند گئی۔ وہ اپنے اونٹ کی طرف لپکا اور لارنس کا دیا گیا پستول نکال لایا۔ لارنس حیرانی سے یہ سب منظر دیکھ رہا تھا۔ حازمی نے فوراً پستول سیدھا کیا اور سیاہ پوش کا نشانہ لے لیا تاہم مقابل اس سے کہیں زیادہ پھرتیلا

ثابت ہوا۔ آن ہی آن میں بندوق کا زوردار دھماکا سنائی دیا اور حازم تیورا کر زمین بوس ہو گیا۔ اس کے گرتے ہی زمین پر لہو کا تالاب سا بننے لگا۔

”یہ کیا کر دیا تم نے؟“ لارنس حیران ہوا۔ اسے اس قتل کی کوئی معقول وجہ دکھائی ہی نہیں دی تھی۔

”بنی سالم کے افراد میرے کنوئیں پر پانی پینے کے مجاز نہیں ہیں اور یہ بات حازم اچھی طرح جانتا تھا۔“ نووارد نے بے نیازی سے جواب دیا اور اپنے چہرے پر مخصوص انداز میں بندھا کپڑا کھول دیا۔ وہ گہری رنگت، موٹے نقوش اور مضبوط جسامت کا حامل تھا۔

”وہ مجھے یہاں سے لے جا رہا تھا۔ میرے کہنے پر یہاں رکا تھا۔“ لارنس نے دانت پیسے۔

”تو تم برطانوی ہو؟“ اس نے لارنس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے دریافت کیا۔

”ہاں...... لیکن میں قاہرہ سے یہاں آیا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”آہ...... قاہرہ...... خوب یاد دلایا۔ میں نے اپنی تعلیم وہیں سے حاصل کی تھی۔“ وہ فخر سے بولا۔

”تعلیم؟ کیا تم نے واقعی تعلیم حاصل کر رکھی ہے؟“ لارنس نے حازم کے مردہ وجود پر ایک نظر ڈال کر کہا۔

”ہاں، میں تعلیم یافتہ ہوں لیکن روایات تو بہرحال روایات ہیں اور ان کی پاسداری بہرصورت ضروری ہے۔ میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں منزل تک پہنچا دوں گا۔“ اس نے پیشکش کی۔

”نہیں، اب میں اپنی منزل پر کسی سہارے یا تعاون کے بغیر ہی پہنچوں گا۔“ لارنس نے اپنے قطب نما پر ایک نگاہ دوڑائی اور حارث کو نظرانداز کرتے ہوئے اونٹ پر سوار ہو گیا۔ اس سرزمین پر آتے ہی اسے مقامی باشندوں میں باہمی نفرت، کینہ اور وحشت دکھائی دی تھی۔ اسے انہی جذبات کو مطیع بنا کر ترکوں کو زک پہنچانا تھی۔ انہی خیالات میں غلطاں وہ اپنی منزل تک پہنچ گیا جہاں اس کی سب سے پہلی ملاقات عبداللہ سے ہوئی۔ عبداللہ نے اس سے بہت تپاک اور ملنساری سے گفتگو کی۔

”اس لڑائی میں عرب کن مسائل کا شکار ہیں؟“ لارنس نے بات برائے بات استفسار کیا۔ وہ اس گفتگو سے عبداللہ کی شخصیت اور ذہانت کا تجزیہ کرنا چاہتا تھا۔

”بے حد اور بے حساب۔“ عبداللہ کہنے لگا۔ ”ترکوں کو متواتر امداد مل رہی ہے۔ مجھے تو یہی اندیشہ ہے کہ وہ بہت جلد حملہ کر کے سمندر برد کر دیں گے۔“

”عربوں کی جوابی کارروائی کا کیا عالم ہے؟“ اس نے مزید دریافت کیا۔

”وہ اپنا سارا گولہ بارود پھونک چکے ہیں۔ بندوقیں تو پہلے ہی بے کار تھیں۔ اب غذا کی مقدار بھی تیزی سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔“

ان انکشافات نے لارنس کو سوچ میں مبتلا کر دیا۔ ہتھیار اور غذا کی کمی کسی منظم فوج کو بھی اپنے ملک کی حفاظت کے لیے محدود کر سکتی تھی جبکہ یہاں اسے منتشر قبائل کو متحد بھی خود ہی کرنا تھا۔ دوسری جانب وہ عبداللہ کی ذاتی شخصیت سے بھی غیر مطمئن تھا۔ عبداللہ بنیادی طور پر ایک زندہ دل اور ہنس مکھ شخص تھا۔ ایسا انسان بہترین دوست بننے کی صلاحیت سے تو مالامال ہوتا ہے البتہ وہ بہترین قائد ہرگز نہیں بن سکتا۔

عبداللہ کے مزاج سے مایوس ہو کر لارنس کی نگاہ فیصل پر جا ٹھہری۔ وہ ایک کمان دار تھا۔ لارنس نے اس سے متعارف ہونے کے لیے شریف مکہ سے ایک خصوصی خط حاصل کیا اور دوسرے ہی دن ایک خصوصی کشتی کے ذریعے رابغ کی بندرگاہ روانہ ہو گیا جہاں پہنچنے کے لیے اسے اسی میل کی مسافت طے کرنا تھی۔

رابغ میں اس کی ملاقات سب سے پہلے شریف مکہ کے ایک اور لڑکے شریف علی سے ہوئی۔ شریف علی اس نووارد کی وضع اور اطوار دیکھ کر کافی حیران تھا۔ لارنس کو مزید مسافت طے کرنے سے قبل ایک رات تھول میں بسر کرنا تھی۔ شریف علی نے اسے زیب تن کرنے کے لیے عربوں کا مخصوص سرپیچ اور عبا بھی فراہم کی تاکہ اس کی شناخت پوشیدہ رہ سکے۔ اس کے بعد سواری کے لیے اپنا ذاتی اونٹ اور دو خصوصی محافظوں کو بھی بطور رہبر ساتھ کر دیا۔ لارنس نے یہ سب ”مراعات“ بلا تامل قبول کر لیں اور ان محافظوں کے ساتھ اپنی اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ گرمی اور موسم کی شدت ناقابل برداشت تھی۔ سورج کی تپش چہرہ ہی نہیں جھلساتی تھی بلکہ آنکھوں میں بھی سخت اذیت پیدا کر دیتی۔ سفر کی یہ سختیاں برداشت کرتے ہوئے مسافت اپنے اختتام کو پہنچی تو ایک اونٹ پر کوئی اجنبی دکھائی دینے لگا۔ لارنس اس شخص کی اچانک آمد اور اپنے اونٹ کے ساتھ سفر کرنے کی دانستہ کوشش پر ٹھٹک گیا۔ نووارد نے اس سے بات چیت کا آغاز کر دیا۔ موضوع گفتگو بے معنی اور ہلکے پھلکے معاملات ہی تھے۔ اس شخص کی

حتی الامکان یہی کوشش تھی کہ اس پستہ قامت شخص کی اصلیت سے آگاہ ہو سکے۔ وہ ایک ایسے خوش نما اور اعلیٰ نسل کے اونٹ پر سوار تھا جو عام طور پر شاہی خاندان کے افراد کے لیے ہی مخصوص ہوا کرتے ہیں۔ کجاوہ بھی زرق برق اور چھوٹی گدوں سے مزین تھا۔ قیمتی اور پُرتکلف کمبل کے کناروں پر مختلف رنگوں کے جھالروں کی آرائش سے بھی عیاں تھا کہ لارنس کوئی معمولی شخص ہرگز نہیں ہے۔

لارنس کا حلیہ بھی قدرے منفرد تھا۔ اس کا سرپوش چہرے پر سختی سے بندھا تھا۔ واحد نمایاں شے صرف آنکھیں تھیں جسے چہرے کی ٹوپی چڑھا کر ان کی رنگت پوشیدہ رکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔ نوواردنے آخری کوشش کے طور پر لارنس سے عربی میں گفتگو کا آغاز کر دیا۔ لارنس نے بھی اسی زبان اور لہجے میں اسے جوابات فراہم کیے۔ اس کے بعد خلال نامی اس اجنبی نے یکلخت ہی لہجہ تبدیل کر کے شمالی شام کا سا انداز اختیار کر لیا۔ لارنس کے لیے یہ لب و لہجہ اپنانا بھی مشکل نہ تھا۔ یہ ایک الوہی جنگ تھی جس میں ذرا سی لغزش بھی لارنس کا بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ خلال نے خوش آئند انداز میں گفتگو ختم کر دی اور اپنی منزل کی جانب گامزن ہو گیا۔ بعدازاں لارنس کو علم ہوا تھا کہ خلال ترکوں کا ایک تنخواہ دار جاسوس تھا جو بالآخر اس کی عیاری اور احتیاط سے دھوکا کھا گیا تھا۔

اس سفر کا اختتام راس وادی حمرا میں ٹیلے کی چوٹی پر ہوا جہاں لارنس کو درختوں کے بیچ عربوں کے سفید، بھورے اور سیاہ خیمے دکھائی دے رہے تھے۔ دھوئیں کے پیچ و خم کھاتے ستونوں کی ہوا میں بلندی، آتش جلائے قریب ہی بیٹھے عربوں کی دید اس کے لیے ہیجان انگیز تھی۔ دل و دماغ میں ایک ہی اضطراب برپا تھا کہ اسے انہی لوگوں کے ہمراہ اپنے مقاصد حاصل کرنا تھے۔ یہ احساس اپنی نوعیت میں خوش کن بھی تھا جس سے محظوظ ہوتے لارنس کو ایک ایسی عمارت میں لے جایا گیا جس کی چھت قدرے طویل اور پست تھی۔ اس مکان کے سامنے کھڑے محافظ کے کندھے پر لٹکی تلوار کا قبضہ نقرئی تھا۔ دوسرے محافظ نے سرگوشیانہ انداز میں اسے کچھ کہا اور لارنس کو اندر بھیج دیا گیا۔

قصرِ شاہی کے اندرونی حصے میں لارنس کو ایک طویل قامت، مضبوط جسم اور چھریرے بدن کا مالک شخص دکھائی دیا۔ اس نے سفید رنگ کی ایک طویل خلعت زیب تن کر رکھی تھی۔ سر پر بھورے رنگ کا سرخ نارنجی اور سنہری ڈوریوں سے بندھا تھا۔ سیاہ داڑھی چہرے پر خوب کھلتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہی شخص امیر فیصل تھا جو پہلی ہی نظر میں لارنس کو اپنے مقصد کے لیے بھا گیا تھا۔ فیصل اچھے میزبان کو اندرونی کمرے کی جانب لے گیا جہاں دیواروں کے اطراف میں بہت سے آدمی خاموشی سے پاؤں سمیٹے بیٹھے تھے۔ وہ گہری نظروں سے اس اجنبی مہمان کا جائزہ لینے لگے۔

”سفر کیسا گزرا معزز مہمان؟“ فیصل نے قدرے پست اور سرگوشیانہ انداز میں دریافت کیا۔

”شدید گرمی کے سوا تو کوئی بھی دقت نہ تھی۔“ لارنس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”اس سرزمین پر اجنبی ہونے کے باوجود تمہارے سفر کی تیز رفتاری قابلِ ستائش ہے۔“ وہ کافی متاثر دکھائی دے رہا تھا۔

لارنس نے تعظیمی انداز میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

”تمہاری یہاں آمد کا کیا مقصد ہے برطانوی؟“ اس نے استفسار کیا۔

”شریف مکہ کی امداد۔“

”کس قسم کی مدد کرنا چاہتے ہو؟ برطانیہ کو اس سرزمین کی مدد میں آخر کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟“ فیصل نے نکتہ اٹھایا۔

”کچھ باتیں نفع نقصان کے پیشِ نظر نہیں کی جاتیں۔ برطانیہ ایک عظیم ملک ہے اور ہمیشہ سے ہی عظمت کا دلدادہ رہا ہے۔ ہمیں علم ہے کہ عرب سرزمین ماضی میں علم و فن کا گہوارہ تھی۔ یہاں کے گلی کوچے اس وقت بھی علم کی روشنی سے منور تھے جب اندلس جہالت اور غیر تمدن کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم نے عربوں کی تحقیق اور تمدن سے بہت کچھ سیکھا ہے اور ہمیں اس بات کا شدید افسوس بھی ہے کہ ترکوں کے غلبے نے عرب سے اس کی عظمت چھین لی۔ ہم اس عظمت کے دوبارہ حصول میں عربوں کے مددگار بننا چاہتے ہیں۔“

لارنس کی اس وضاحت اور مسحور کن انداز سے فیصل کی آنکھوں میں خوابوں کے جگنو جگمگانے لگے۔ لارنس کو بھی اس کی یہی کیفیت درکار تھی۔

”برطانوی فوج نے کرنل ناس کو بھی یہاں عسکری مشیر بنا کر روانہ کیا تھا۔“ فیصل نے ایک توقف کے بعد بتایا۔

”اوہ ہاں۔ میں انہیں جانتا ہوں۔ ان کا طریقۂ جنگ اور سوچ خاصی مختلف رہی ہے۔“ لارنس نے جواب دیا۔

”ہاں، اس کی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ وہ کہتا ہے کہ برطانوی عظمت صرف نظم و ضبط کی وجہ سے برقرار ہے جبکہ ہمارا موقف یہ ہے کہ برطانیہ بری اور بحری

فوج کے علاوہ جدید ہتھیاروں سے بھی لیس ہے اور یہی ہتھیار اس کی اصل قوت ہیں۔"

"بے شک آپ کی بات بالکل درست ہے۔ ترکوں کو زیر کرنے کے لیے جدید ہتھیار اہم بھی ثابت ہوں گے۔ نظم و ضبط اور شجاعت تو یوں بھی عرب قوم کی گھٹی میں پڑی ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ عرب ایک بہادر، غیور اور منظم قوم رہی ہے۔ میں ان ہتھیاروں کے حصول اور جدید عسکری تربیت میں ہر قدم پر آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔" لارنس نے اسے یقین دلایا۔

"کیا تم یہیں قیام کے خواہش مند ہو؟" فیصل نے پوچھا تو لارنس نے ایک بھرپور گہری نظر اس پر ڈالی اور نرمی سے گویا ہوا۔

"دمشق کی مسافت تو یہاں سے بہت طویل ہے۔"

لارنس کا یہ جملہ جرأت اور بے باکی کا ایک عکس تھا۔ اس نے فیصل سے اتنی بات کہہ کر ایک خطرہ مول لیا تھا۔ مقابل اس جملے کو ایک توہین بھی سمجھ سکتے تھے اور اگر دانش مند ہوتے تو اپنی نئی منزل کا بھرپور اندازہ لگا لیتے۔ فیصل اس برطانوی شخص کو اپنے مزاج اور وجدان کے مطابق لمحہ بھر میں ہی جانچ گیا۔ اسے لارنس کی متانت اور سنجیدگی میں اپنے ادھورے خوابوں کی تعبیر دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے لمحاتی توقف کے بعد لارنس سے کہا۔

"درست کہا۔ دمشق کی مسافت طویل ہے لیکن ایک حقیقت تو یہ بھی ہے کہ ترک اس سے کافی قریب ہیں۔"

فیصل کے اس جواب نے لارنس کے اعصاب پرسکون کر دیے۔ وہ مقابل کو اپنا اصل مدعا سمجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"تم ایک دلچسپ اور سودمند انسان معلوم ہوتے ہو۔ تمہارے لیے ایک خیمہ تیار کروا دیا جائے گا۔ جلد ہی تمہاری ملاقات ہمارے اہم ترین شیوخ سے ہوگی۔" فیصل نے کہا۔

اگلے دو روز امیر فیصل اور اس کے اہم ترین شیوخ لارنس سے اس ممکنہ بغاوت کے ہر پہلو کی بابت گفتگو کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ لارنس کے ذہن میں مستقبل کا مکمل نقشہ واضح ہو گیا۔ اس نے حالیہ حالات کا بھی مکمل جائزہ لے لیا تھا۔ صورت حال کچھ یوں تھی کہ ترکوں کے پاس جدید اسلحہ اور وسائل تھے۔ ان کے مقابلے میں عربوں کی تیاری اور لوازمات صفر کے مساوی تھے۔ ان کا قدیم اسلحہ بوجھ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس پر مستزاد وہ جنگ کی اصل منزل اور مقصد

کیریاں

☆ شادی خودکشی کا انسداد کرتی ہے اور خودکشی شادی کا۔

☆ ان کا خاندان اتنا بدصورت ہے کہ وہ اپنے خاندانی البم میں صرف بیک گراؤنڈ لگاتے ہیں۔

☆ غربت واحد چیز ہے جس کی قیمت کبھی نہیں بڑھتی۔

☆ مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ ایک روپیہ بچانے میں دو روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔

☆ وہ اپنے پاسپورٹ میں لگی ہوئی تصویر سے بھی زیادہ بدصورت ہے۔

مشہور

اداکارہ الزبتھ ٹیلر نے فلم "قلوپطرہ" میں 65 لباس زیب تن کیے تھے۔ یہ ایک فلم میں زیادہ سے زیادہ لباس پہننے کا عالمی ریکارڈ ہے۔

فلم "قلوپطرہ" کے یہ تمام لباس آئرن شیرف نے ڈیزائن کیے تھے اور ان پر ایک لاکھ 30 ہزار ڈالرز لاگت آئی تھی۔

رنگ ڈھنگ

انگریز جب ٹرین سے اترتا ہے تو چلتے وقت مڑ کر ڈبے میں ضرور دیکھتا ہے کہ کہیں اس کا کچھ سامان تو سیٹ پر نہیں رہ گیا ہے۔

امریکی جب ٹرین سے نیچے اترتا ہے تو پیچھے دیکھے بغیر ہی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اسکاٹ لینڈ کا باشندہ جب ٹرین سے نیچے اترتا ہے تو چلتے وقت مڑ کر اس لیے دیکھتا ہے کہ کہیں کسی اور شخص کا سامان تو ٹرین میں نہیں رہ گیا ہے۔

(مرسلہ: شاہین تبسم، ملتان)

زہر

"سانپ کا زہر کینچلی میں اور بچھو کا دم میں ہوتا ہے۔ بھڑ کا زہر ڈنک میں ہوتا ہے اور پاگل کتے کا زبان میں۔ انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر دل میں رکھتا ہے۔"

(مشتاق احمد یوسفی کی کتاب "آبِ گم" سے اقتباس)

(مرسلہ: مہتاب احمد، حیدرآباد)

سے بھی لاعلم تھے۔ ان کے پاس ایک مصری توپ خانہ بھی تھا جس کا اسلحہ کم از کم دو دہائی پرانا تھا۔

ان حالات کا جائزہ لیتے ہوئے لارنس کو عربوں کے اندازِ حرب کا بھی اندازہ ہوا۔ وہ خاندانوں کے خاندان مل کر جنگ کرتے۔ اکثر ہتھیاروں کی کمی کے باعث باپ اور بیٹے یکے بعد دیگرے ایک ہی بندوق سے لڑائی کا میدان سنبھالتے۔ ماضی قریب میں ان قبائل کو بادشاہ کی جانب سے یہ پیغام بھی دیا گیا کہ وہ اپنے باہمی جھگڑے پسِ پشت ڈال کر ترکوں کے خلاف متحد ہو جائیں۔ بادشاہ کی یہ التجا سونے اور بھرپور غذا کی موجودگی تک کارگر رہی لیکن اب صورتِ حال یہ تھی کہ دونوں ترغیبات کا ہی تیزی سے خاتمہ ہو رہا تھا۔ انھیں ترکوں جیسے ہتھیار میسر آ جاتے تو دشمن کی صفوں میں ہلچل پیدا ہو سکتی تھی۔ مزید برآں تربیت اور تکنیک کا فرق بھی بہت اہم تھا۔ لارنس قدرے پُراعتماد تھا کہ وہ عربوں کو بنیادی تربیت فراہم کر کے منظم کر دے تو نتائج اپنے حق میں موڑ سکتا ہے۔

ان حالات و واقعات کا جائزہ لے کر وہ ایک بار پھر جدہ روانہ ہوا جہاں اس کی ملاقات امیر البحر ویمز سے ہوئی۔ ویمز نے اس بغاوت میں عملی طور پر حصہ لے کر ترکوں پر بمباری بھی کر چکا تھا۔ ویمز سے گفتگو اور مستقبل کی بابت منصوبہ بندی نے لارنس کو کافی تقویت دی۔ اس کے بعد وہ بحیرۂ قلزم میں سفر کرتے سوڈان کے گورنر ریجنالڈ ونگیٹ سے ملاقات کے لیے خرطوم پہنچا اور اسے بھی اپنے مقاصد اور ممکنہ منزل کے لیے خوب ترغیب دلائی۔

☆☆☆

لارنس کی منزل دمشق تھی لیکن اس سے قبل بھی اسے بہت سے پڑاؤ پار کرنے تھے۔ اسے "مدینہ" میں سکون قائم رکھ کر "وجہ" کو تسخیر کرنا تھا۔ لارنس جانتا تھا کہ ان کوششوں اور مقامی رنگ میں ڈھل جانے کے باوجود اس کی پستہ قامتی اور نیلگوں آنکھیں اسے کسی کو بھی عرب تسلیم کرنے نہ دیں گی لہٰذا انھیں مزید مرعوب کرنے کے لیے اونٹ کی سواری، موسم کی بے پناہ سختی کی برداشت، ہتھیاروں کے استعمال اور مقامی زبان میں روانی و فصاحت سے گفتگو کر کے خود کو ان کا ہمسر ثابت کر کے اپنا تاثر مزید گہرا کر لیا۔ اسی دوران اسے ایک ایسا موقع میسر آیا جس نے عربوں کو ذہنی اور جذباتی طور پر اس کا مطیع کر دیا۔

اس سفر کے دوران موسم کی سختی عروج پر تھی۔ تند ہوائیں ریت کی ایسی دیوار بناتیں کہ بعض اوقات حدِ نگاہ صفر ہو کر رہ جاتی۔ اسی کشمکش میں دو افراد اس قافلے سے بچھڑ گئے۔ لارنس کو علم ہوا تو وہ ان کی بازیابی کے لیے بے کل ہو گیا۔

"ایسی حماقت نہ کرو لارنس! یہ قافلہ واپس نہیں جا سکتا۔ دو افراد کے لیے ان درجنوں سپاہیوں کی زندگی داؤ پر لگانا کہاں کی دانش مندی ہے؟" شریف علی نے اسے گھورا۔

"میرے لیے اس قافلے کا ایک ایک فرد اپنی زندگی کی طرح اہم ہے۔" لارنس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "قافلہ یہیں پڑاؤ ڈالے گا۔ جاسم اور عبداللہ کو میں خود تلاش کروں گا۔"

لارنس کا یہ سفر کٹھنائی سے ہی سہی لیکن کامیاب رہا۔ اس نے قطب نما کی مدد سے مسافت طے کی اور پیاس و موسم کی سختی سے نیم جان ہو چکے ان دونوں افراد کو اگلی رات اپنے ہمراہ قافلے تک لے آیا۔ شریف علی حیرت و مرعوبیت سے اسے دیکھتا رہا۔ عرب سپاہی اس کی بہادری، خلوص اور اپنے ساتھیوں کی یوں حفاظت و واپسی پر فلک شگاف نعرے بلند کرنے لگے۔ وہ بھی لارنس کو کسی "مسیحا" کی طرح دیکھ رہے تھے۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ انسان اپنی ہمت اور کوشش سے ہر دعوے کو بھی مات دے سکتا ہے۔" لارنس نے ہانپتے ہوئے کہا اور تھکاوٹ سے چور بدن کو آرام دینے کے لیے وہیں دری اور بچھونے پر ڈھیر ہو گیا۔

شریف علی کچھ لمحوں تک لارنس کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ ایک جانب رکھی اپنی دری کی جانب متوجہ ہوا اور اسے الاؤ میں پھینک دیا۔ اگلی صبح اسے مخصوص عرب لباس فراہم کر دیا گیا۔ پاجامہ نما پتلون پر طویل عبا ریشم سے تیار ہوئی تھی۔ سر پیچ کی ساخت چوڑی اور پیشانی سے پیچھے موڑ کر رسی کی مدد سے اپنے مقام پر قائم رکھا گیا تھا۔ سر پیچ کی اس رسی کی شان بھی نرالی تھی۔ اس وقت تک اور جاسم و عبداللہ کی بازیابی سے وہ مقامی شیوخ پر اپنا بہترین تاثر قائم کر چکا تھا اور یہی تاثر اس کے نزدیک نصف جنگ جیت لینے کے مترادف تھا۔

ان سرگرمیوں کے بعد لارنس غیر محسوس طریقے سے عربوں کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا اور اب وقت آ گیا تھا کہ اپنی منزل کی جانب پہلا قدم بڑھایا جائے۔

☆☆☆

وہ جنوری 1917ء کے ابتدائی ایام تھے۔ عرب دستہ وجہ کی طرف کوچ کے لیے بالکل تیار تھا۔ قافلے کے

اونٹ زرق برق کجاووں سے آراستہ اپنے جبلی کروفر سے رواں دواں تھے۔ اس فوج کے دونوں سروں میں نغمہ وسرود کی لہریں بھی ہلکورے لینے لگیں۔

اونٹوں کی رفتار تیز ہوتے ہی عربوں کے قرمزی جھنڈے بھی فضا میں بلند ہو کر ایک بھرپور اور ہیجان انگیز منظر پیدا کرنے لگے۔ اس قافلے نے کچھ ہی مسافت طے کی تھی کہ لارنس کو دو سوار آتے دکھائی دیے۔ ان میں ایک شخص مقامی جبکہ دوسرا ایک ”میجر ان کن وید“ تھا۔ لارنس نے اس شخص کو پہچان لیا تھا۔ اس کے جذبات میں تلاطم برپا ہو گیا۔ وہ اس کا دیرینہ ساتھی کرنل نیوکامب تھا۔ وہ دونوں بے حد تپاک سے ملے۔ کرنل نیوکامب کی آمد سے لارنس اپنے وجود میں ایک عجیب تقویت محسوس کرنے لگا تھا۔

قافلہ ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ مقامی قبائل کی شرکت سے فوج کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ ایک جانب وہ ترکوں سے اپنے سابقہ حسابات چکتا کرنے کے لیے پرعزم تھے تو دوسری سمت سفر کی مشکلات سے قدرے ہراساں بھی۔ قافلے کے ہزاروں اونٹوں اور لشکریوں کے لیے غذا اور پانی کی سہولیات ناکافی تھیں۔ پیاس کی شدت اموات کا باعث بھی بن رہی تھی۔ اس سفر کے ہر پڑاؤ میں مختلف سمتوں میں بھٹکے عربی بھی اپنے شیخ کے ساتھ امیر فیصل کے پاس چلے آتے۔ وہ لارنس اور فیصل سے وفاداری کا حلف اٹھا کر ترکوں کے خلاف اس مہم کا حصہ بننے میں خوشی و جوش محسوس کرتے تھے۔

”یہ رستہ بے حد کٹھن ہے میرے عزیز!“ فیصل اپنی مخصوص متانت سے گویا ہوتا۔

”ترکوں کی غلامی سے زیادہ کٹھن تو نہیں ہوگا۔“ ہر نووارد کا جواب ملتا۔

اس کثرت تعداد کے باعث قافلے کی رفتار میں کمی تو آئی تاہم وجھ کے مقام پر پہنچتے ہی ایک بڑی خبر ان کی منتظر تھی۔ یارڈنگ نامی جہاز نے اپنے ملاحوں اور عربوں کی ایک متحد جماعت کی مدد سے وجھ کو فتح کر لیا تھا۔ لارنس اس خبر پر خوشگوار حیرت میں مبتلا اور تفصیل جاننے کے لیے بے تاب تھا۔

”ہم نے ملاحوں، جہاز رانوں اور کشتی رانوں کی جماعت کے علاوہ وجھ پر بندوقوں سے آتش زنی کی تھی۔“ کیپٹن ہال نے اسے بتایا۔ ”سپاہیوں نے البتہ شہر میں گھس کر دشمن کا صفایا کیا تھا۔“

”یہ دست بدست لڑائی یقیناً بہت ہولناک ہوگی۔“

اصل وجہ

شادی کی تقریب میں رخصتی کے وقت ایک لڑکی دلہن سے بھی زیادہ رو رہی تھی۔ ایک صاحب نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”تم اتنی بری طرح کیوں رو رہی ہو۔ شادی تمہاری تو نہیں ہو رہی۔“

”اسی لیے تو رو رہی ہوں۔“ لڑکی نے روتے ہوئے جواب دیا۔

(مرسلہ: مہتاب احمد، حیدرآباد)

لارنس نے چٹخارا لیا۔

”ہاں، مقامی فوج کو صرف ایک نقصان برداشت کرنا پڑا تھا کہ شاہی بحری اور ہوائی سروس کے ایک لیفٹیننٹ کو بحری بیڑے کے لیے جگہ تلاش کرنے کے دوران گولی لگی اور وہ مشین کو ساحل پر اتارنے سے پہلے ہی جاں بحق ہو گیا۔“

”ترکوں کا کیا ردعمل تھا اس دوران؟“ اس نے دریافت کیا۔

”ترکوں کے محافظ دستے بھی جانفشانی سے لڑے لیکن فتح بہرحال عربوں کا ہی مقدر ٹھہری۔“

”یہ تو صرف آغاز ہے۔ ترکوں سے اس سرزمین کا ہر ایک ذرہ آزاد کروا لیں گے۔“ اس نے تفاخر سے سر جھٹکا۔

قافلے کے ساتھ آنے والی سپاہ کے لیے یہ فتح گویا نعمت غیر مترقبہ تھی۔ انہوں نے اپنے مزاج سے مغلوب ہو کر مفتوحہ علاقوں میں لوٹ مار کا آغاز کر دیا۔ اگلے چند گھنٹوں میں انہوں نے بھرپور جوش سے ہر گھر قیمتی اشیا سے خالی کر دیا۔ ان کا مزاج کچھ ایسے ہی قالب میں ڈھل چکا تھا کہ لڑائی قدرے کم اور مال غنیمت اسی قدر زیادہ مقدار میں حاصل ہو۔ لارنس کو جب علم ہوا کہ عرب کچھ عرصہ وجھ میں ہی ٹھہر کر اس مقام کو بطور مستقر استعمال کرنا چاہتے ہیں تو اس نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنی اس کامیابی سے قاہرہ میں جنرل کلے ٹن کو مطلع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ مصری عسکری انتظامیہ سے دور مار کرنے والی توپیں، غذا اور رقم بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا یہ مطالبہ پورا ہو جاتا تو وہ اپنی حکمت عملی سے ترکوں کو حجاز کی سرزمین سے مکمل بے دخل کر دیتا۔

”عربوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کیا ہیں؟“ اس نے دریافت کیا۔

''وہ مکمل طور پر میرے مطیع ہو چکے ہیں۔ میری کوئی بھی بات رد نہیں کر سکتے۔'' لارنس نے فخر سے جواب دیا۔

''حیران کن۔ عرب قوم کسی کی تابعداری اتنی جلد قبول کیا تو نہیں کرتی۔'' کلے ٹن کے انداز میں لارنس کے لیے ذاتی ناپسندیدگی واضح تھی۔

''ہر کوئی تھامس ایڈورڈ لارنس بھی تو نہیں ہوا کرتا جسے ہر ناممکن کو ممکن میں ڈھالنا آتا ہو۔'' اس نے بھی بھرپور جوابی چوٹ کی۔

''تو ٹھیک ہے۔ اپنا یہ سفر جاری رکھو۔ یہاں آنے کا کیا مقصد ہے؟ اوہ ہاں—— ویسے میں ایک بات بتانا بھول گیا کہ انتظامیہ نے تمہیں میجر کے عہدے پر فائز کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔'' کلے ٹن نے بظاہر سپاٹ سے انداز میں بتایا تاہم اپنے بغض اور حسد کو پوشیدہ نہ رکھ سکا۔

''مجھے دور مار کرنے والی توپیں، غذا اور رقم درکار ہے۔'' اس نے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''کس لیے؟'' کلے ٹن نے بھویں اچکا ئیں۔

''میں ان وسائل سے ترکوں کو حجاز کی سرزمین سے مکمل طور پر بے دخل کر دوں گا۔ میرے ذہن میں اس وقت ترکوں کو زک پہنچانے کے کئی منصوبے ہیں۔''

''اتنے ہتھیاروں کا مطالبہ کرنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ انتظامیہ فلسطین کی مشکلات میں اس قدر الجھی ہوئی ہے کہ عرب کے معاملات میں دخل دینا اپنے وسائل بڑھانے کے مترادف ہے۔ برطانوی صرف ایک خطے کے لیے فلسطین اور دیگر محاذوں کو نظر انداز کرنے کی حماقت نہیں کرے گی۔ تم فی الحال اپنے عربوں کی اطاعت سے ہی کام چلاؤ۔''

کلے ٹن کے اس جواب پر لارنس کو محسوس ہوا کہ وہ فی الوقت اس بغاوت کی اصل نوعیت سمجھ ہی نہیں پا رہا ہے یا شاید اس کی ذاتی انا، بغض اور حسد اسے تعاون کے لیے آمادہ نہیں ہونے دے رہے۔ ان حالات میں مقابل کو قائل کرتے رہنے کی مزید کوششیں وقت کے زیاں کے سوا کچھ بھی نہ تھیں۔ لارنس نے فیصل کے پڑاؤ میں لوٹنے کا فیصلہ کر لیا تاکہ اپنے دستیاب وسائل کو بھرپور انداز میں استعمال کر کے مہم کو مزید آگے بڑھایا جا سکے۔

لارنس اور فیصل کی نشستیں کئی گھنٹوں پر محیط ہوا کرتی تھیں۔ لارنس اسے عسکری تکنیک سمجھاتا تاکہ وہ اپنے لشکریوں کی لوٹ مار، آتش زنی کی برسہا برس کی عادات پر قابو پا کر فطری جنگجوانہ صلاحیتوں کو بھرپور انداز میں استعمال کر سکے۔ لارنس کے ہی ایما پر فیصل وجہ میں مزید قیام کے لیے راضی ہو گیا تاکہ دمشق اور شمالی علاقوں کے بڑے قبائل بھی اس بغاوت میں اپنی امداد اور وفاداری لیے ان سے آملیں۔ قسمت لارنس اور فیصل کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ قاصدین کے ذریعے ملنے والے پیغامات کے نتیجے میں کئی شیوخ فیصل سے ملاقات کے لیے آئے۔ فیصل ان کا بھرپور تپاک سے خیر مقدم کرتا اور ان سے قرآن پاک پر حلف لیتا کہ اپنے سابقہ مقامی جھگڑے فراموش کر کے وسیع تر ''قومی مفاد'' میں متحد ہو کر حجاز کی آزادی میں اپنا بھرپور حصہ ڈالیں۔ لارنس اپنے انتخاب پر بے حد خوش اور مطمئن تھا۔

صحرائی قبائل کے اتفاق اور غیر مشروط وفاداری کے بعد لارنس ہتھیاروں کی مرمت کی طرف متوجہ ہوا۔ عربوں کے ہتھیار کسی عجوبے سے کم نہ تھے۔ رائفلیں اس قدر قدیم کہ انہیں بحال رکھنے کے لیے ڈال پر دشمن کے پتھر مارنے پڑتے۔ صحرائی قبائل کے شیوخ کی تلواریں بھی مرمت کے لیے لائی گئیں۔ یہ تلواریں خوبصورتی اور زیبائش میں تو اپنی مثال آپ تھیں البتہ جنگی مقاصد میں کارآمد ہونے سے وہ کوسوں دور تھیں۔ اس کے علاوہ ہتھیاروں میں خنجر، تلواریں اور بھالے شامل تھے۔ لارنس کو انہی ''وسائل'' سے ترکوں کی منظم فوج کا مقابلہ کرنا تھا۔

اس موقع پر فیصل کے مشیروں نے بھی کچھ مسائل ابھارے۔ وہ مدینہ پر براہ راست حملہ کر کے ریلوے جنکشن پر قبضہ کرنا چاہتے تھے تاہم لارنس اس عمل کے حق میں نہ تھا۔ وہ مدینہ کے قریب ہی ایک مختصر فوج رکھنا چاہتا تھا تاکہ محصور ترکوں پر حملہ کرنے کی نوبت ہی نہ آ سکے۔ اس صورت میں نقصان کا تناسب بھی کم سے کم ہی رہتا۔

اس دوران ایک خوش آئند بات یہ بھی ہوئی کہ برطانوی عہدیداروں نے اسے چند ہتھیار بند موٹریں اور مصری پیادہ بھجوا دی۔ اس امداد کے ساتھ کرنل جوائس جیسے باحکمت شخص کی آمد بھی خاصی باعث تقویت تھی۔ لارنس فیصل سے اسی امداد اور کرنل کی شخصی خوبیوں کے متعلق ہو گفتگو تھا کہ ایک محافظ نے آ کر ''اعدا'' نامی کسی شخص کی آمد کی اطلاع دی۔ متین اور بردبار فیصل یکدم ہی خوشی اور جوش سے کھل گیا۔

''واللہ! اس وقت تو میں کچھ اور بھی مانگتا تو مل جاتا۔ میں ابھی اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اعدا کی آمد اور شمولیت کے لیے تو میں کب سے متمنی تھا۔''

''لیکن اعدا کی ضد اور ہٹ دھرمی بھی ذہن میں رکھیے گا امیر!'' شریف علی نے دبے لفظوں میں کہا۔

"جب کوئی اس قدر بہادر اور باہمت ہو تو قدرت بھی اس کے لیے ہتھیار ثابت ہوا کرتی ہے۔" فیصل نے جواب دیا۔

لارنس بھی اس شخص کے سابقہ کارناموں اور بہادری سے واقف تھا۔ وہ شخص اپنی ذات میں ہی ایک فوج سے کم نہ تھا۔ اس نے فیصل ہی کی طرح اس قد آور، وجیہہ، ڈاڑھی بردار اور مخصوص نوعیت کی خشمناک مونچھوں کے حامل شخص کا خوش دلی سے استقبال کیا۔

"ترکوں کو اس سرزمین سے بے دخل کرنے کی جنگ اب ہم مل کر لڑیں گے۔" اعدا نے تلوار کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

"ہم ایسا ہی کریں گے۔" فیصل نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر جواب دیا۔

"اس سرزمین پر ایک بھی ترک سلامت نہ رہنے پائے۔" اس نے نفرت سے کہا۔

"یہی ہوگا۔" فیصل مسکرایا۔

اعدا ایک منفرد شخص تھا جس کی ذاتی اور قومی زندگی دلچسپ پہلوؤں پر مشتمل تھی۔ پچاس سالہ اعدا مہمان نواز اور کثیر الاولاد تھا۔ اس کی ازدواج کی تعداد اٹھائیس تھی۔ اس نے ترکوں کی تعداد بھی شمار ہی نہ کی تھی کیونکہ وہ انہیں سرے سے انسان ہی نہ سمجھتا تھا۔ غصیلی فطرت کا مالک اعدا الحیروں کے ایک گروہ کا سردار بھی تھا۔ وہ اپنے دشمن کو دوسرا سانس فراہم کرنے کے حق میں بھی نہ تھا۔

"اب کہاں کوچ کرنے کا ارادہ ہے؟ ترکوں کو کس مقام پر چوٹ پہنچانا ہے اب؟" اعدا نے دریافت کیا۔

"عقبہ..... ہماری اگلی منزل عقبہ ہے۔" لارنس نے جواب دیا۔

اعدا نے اسے گہری نظروں سے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

عقبہ رومیوں کے عہد کی ایک قدیم بندرگاہ تھی۔ یہیں سے تمام کاروان مختلف ممالک تک جایا کرتے۔ اس کی فتح کا مطلب ترکوں کو ریلوے سے بے دخل کرنا تھا۔ یہ عزائم اور خواب بے حد خوش کن تھے لیکن وہ اس حقیقت سے بھی غافل نہ تھے کہ یہ فتح اس قدر آسان ثابت بھی ہوگی۔ ترک اس خطے کی اہمیت اور حفاظتی اقدامات سے بھی غافل نہ تھے۔ یہ صورت حال مایوس کن تھی لیکن لارنس بالآخر ایک راہ نکالنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس نے جنگ عظیم سے

بارش میں بھیگتے ہوئے ایک صاحب نے دور سے ٹیکسی آتے دیکھی تو لپک کر بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر اسے روکا لیکن اس وقت ان کے غصے کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے عقب سے ایک خاتون نے آگے بڑھ کر ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیور کے برابر بیٹھ گئیں۔

"یہ تو بڑی ڈھٹائی ہے۔" وہ صاحب غصے سے بولے۔ "ٹیکسی کو میں نے روکا تھا۔"

"روکا ہوگا۔" خاتون مسکراتے ہوئے بولیں۔ "لیکن ڈرائیور سے شادی تین سال پہلے میں نے کی تھی۔"

(مرسلہ: عاصم علی، ملتان)

قبل اس خطۂ زمین کے متعلق جو تحقیق کی تھی، آج وہی اس کے لیے سودمند ثابت ہو رہی تھی۔ اسے عقبہ کے نواحی پہاڑی سلسلوں میں ایسی پگڈنڈیوں کا بھی علم تھا جو پہاڑی کی چوٹی تک جاتی تھیں۔ لارنس وہاں ایک خفیہ راستے سے بھی واقف تھا جو اب متروک ہو چکا تھا۔

ان عوامل کو مدنظر رکھتے ہوئے لارنس نے ایک نیا منصوبہ مرتب کیا جس کے مطابق وہ ترک فوج سے بچ کر اس سے پیچھے عقب میں سیکڑوں میل کی مسافت طے کرتے اور اندرونی راستوں سے ہوتے ہوئے عقبہ تک رسائی حاصل کر لی جاتی۔ یہ مسافت بھی آسان بہرحال نہ تھی۔ پانچ سو میل طے کر کے مطلوبہ مقام تک پہنچنا کمزور اعصاب اور کم حوصلہ سپاہ کے لیے ناممکن تھا۔ لارنس کو مضبوط قوت ارادی کے حامل افراد درکار تھے۔ یہ مسافت کامیابی سے طے ہو جاتی تو ترک فوج کے لیے اعصاب شکن ثابت ہوتی۔ ان کی نظریں سمندری راستے پر مرکوز ہوتیں جس میں ہزاروں عرب اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتے تھے۔ عقبہ سے حملے کی بابت انہوں نے کبھی گمان ہی نہ کیا ہوتا۔

فیصل یہ منصوبہ سن کر نیم رضامند دکھائی دینے لگا۔

اسے عرب سردار اعدا کی امداد سے بہت سی خوش گمانیاں لاحق تھیں۔ اس کے ساتھ بسر ہونے والے وقت میں لارنس کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ مستقبل میں اس کا بہترین ساتھی ثابت ہوگا۔

☆☆☆

دشوار کوچ کا آغاز مئی 1917ء کو ہوا۔ غیر آباد اور بنجر سرزمین کا یہ سفر حدت سے بھرپور تھا۔ ڈھلوان بلندی پر چڑھائی ایک اور امتحان ثابت ہوئی۔ وہاں راستہ اس قدر

تنگ تھا کہ بکری جیسا مختصر الوجود جانور ہی بہ مشکل گزر سکتا تھا۔ چڑھائی کے لیے اونٹوں سے اتر کر انہیں اوپر کھینچنا اور دھکیلنا ضروری تھا۔ اس دھکم پیل میں کئی اونٹ اپنا توازن کھو بیٹھے۔ کئی ایک کے پاؤں ٹوٹ گئے تھے لہٰذا انہیں فوری طور پر ذبح کر کے اسی مقام پر گوشت بھی ٹکڑوں میں تقسیم کرنا پڑا تاکہ سفر میں غذا کی کمی نہ ہو سکے۔ ڈھلوان بلندی کے بعد دوسری جانب کٹھن سفر کا اختتام ہوا تو لارنس نے تھکی ہاری سپاہ کو ایک گہری سایہ دار وادی میں پڑاؤ کا مشورہ دے دیا۔

اگلے روز قافلے کی قیادت اعدا نے سنبھال لی۔ ایک طویل اور پُر پیچ مسافت کے بعد اعدا انہیں ایسے مقام پر لے آیا جہاں بلندی سے اگلی جانب ریل کی طویل پٹری دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی قسمت نے یاوری کی اور ریل کے مقام کا جائزہ لیتے انہیں چند سوار آتے دکھائی دیے۔ ان سواروں میں بعد ازاں لارنس کی ملاقات انگریز عہدیدار ہارن بائے سے ہوئی۔ ہارن بائے کی آمد صحرا میں کسی نخلستان جیسی تھی۔ وہ شخص ریلوے کو ڈائنامیٹ سے اڑانے میں ماہر تھا اور اس مقام پر ان کے لیے خاصا سود مند ثابت ہو سکتا تھا۔ لارنس اپنے قافلے کے ہمراہ اگلے روز ریلوے تک جا پہنچا۔ ہارن بائے نے اپنی مہارت بروئے کار لاتے ہوئے ایک حصے کو اڑانے کی مکمل تیاری کر لی۔ اگلے چند لمحوں میں قرب و جوار سرنگوں کے اڑنے، ریل کی پٹریوں کے فضا میں بلند ہونے اور اعدا کے خوشی و دیوانگی سے معمور قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ لارنس اپنی اس کامیابی پر بہت خوش تھا۔

ان کامیابیوں اور خوشیوں سے قطع نظر سفر اور مقام کی مشکلات ہر قدم پر حوصلے آزما رہی تھیں۔ ان کے پاس پانی کی شدید کمی تھی۔ لارنس نے صحرائے الہول کے پُرخطر اور ہولناک سفر سے قبل چاہ کو مشکیں بھر لینے کی ہدایات دیں۔ اگلے دو روز وہ نیند کی کمی کا شکار بھی رہے۔ سپاٹ زمین، گرم و خشک ہوا چہروں پر الگ ہی مینا کاری کرتی رہی۔

ریلوے لائن اور سرنگوں کو تباہ کیے پندرہ روز بیت چکے تھے۔ سفر کسی نہ کسی طور جاری ہی تھا کہ ایک دن شام ہوتے ہی ریت کا طوفان ان کی مزاج پرسی کے لیے چلا آیا۔ کپڑوں سے گزر کر بدن میں گھستی ریت جسم پر سیکڑوں ننھی چیونٹیوں کی طرح چبھتی ان کے حوصلے آزما رہی تھی۔ اس کٹھنائی کا خاتمہ ہوا تو پانی کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔ زمین دوز کنوؤں کی تلاش نے انہیں وادی سرحان کے شمالی جانب بڑھنے پر مجبور کر دیا جہاں ترکوں نے ایک ٹیلے کے عقب سے گولیوں کی بوچھاڑ سے ان کا استقبال کیا۔ لارنس کے لیے یہ حملہ غیر متوقع سہی تاہم اس نے اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے اہلِ کاروان کو فوری طور پر اونٹوں سے اترنے کی ہدایات دیں۔ اس ہڑبونگ میں ان کا ایک ساتھی سر میں گولی لگنے سے جاں بحق ہو گیا۔ لارنس نے سپاہ کی کمان سنبھال کر قریبی ٹیلے کا محاصرہ کر لیا۔ عربوں کی تعداد اور تیور دیکھ کر ترک حملہ آوروں کے لیے فرار میں ہی عافیت تھی۔ اس کامیاب وقوع کے بعد لارنس انہیں کنوؤں تک لے آیا تاکہ پانی کے زیادہ سے زیادہ ذخائر جمع کیے جا سکیں۔

☆☆☆

سفر کے پہلے حصے کا اختتام ہو چکا تھا۔ اب عقبہ کے محاصرے کی مہم درپیش تھی۔ نئے سفر پر روانگی سے پہلے اس نے فیصل کو وادی سرحان کے حاکم شیخ کو اپنا ہم نوا بنانے کا مشورہ دیا۔ شیخ سے ملاقات کے لیے لارنس نے اعدا کو ایک کجاوے کے تھیلوں میں سونے کی چند تھیلیاں بھر کر بھیجا تاکہ ترغیب زیادہ موثر ثابت ہو سکے۔

اعدا کی روانگی کے بعد انہیں اپنے قیام میں سانپوں کے خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ قیام کا بیشتر وقت لکڑیاں تھامے پست جھاڑیوں میں سانپوں کے شکار میں ہی گزر گیا۔ جون کے آغاز میں اعدا کی واپسی ہوئی اور لارنس کو یہ جان کر اطمینان حاصل ہوا کہ ترکوں کے پڑاؤ کے چند مقامات کے علاوہ حجاز کی باقی سرزمین ان کے لیے باہیں وا کیے منتظر ہے۔

یہ اطلاع خوش آئند تھی لیکن اس کے ساتھ لارنس کو چند تحفظات بھی درپیش تھے۔ وہ عقبہ پر حملے سے قبل اس بات کا یقین کر لینا چاہتا تھا کہ میسوپوٹیمیا کی سرحدوں تک تمام علاقہ ترکوں کو شکست دینے میں تعاون فراہم کرنے کو تیار ہیں۔ اس یقین دہانی کے لیے اسے تقریباً دو ہفتے کا سفر اور تحقیق درکار تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ عرب ایک لمحے کے لیے بھی اس کا غیاب برداشت نہ کر سکتے تھے۔ لارنس اپنی قوتِ ارادی بروئے کار لاتے ہوئے جون کی تین تاریخ کو خاموشی سے چہل قدمی کے سے انداز میں خیمے سے نکلا اور ایک نئے سفر پر روانہ ہو گیا۔

اگلے پندرہ روز تک وہ مختلف علاقوں میں گشت کرتا رہا۔ اس سفر نے لارنس پر بہت سے حقائق آشکار کیے۔ اسے علم ہوا کہ ترک گرفتار شدہ جاسوسوں سے معلومات حاصل کرنے کے لیے انہیں سخت ایذا رسانی کے بعد پھانسی یا قتل سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔ وہ مختلف بھیس بدل کر

جرمن عہدیداروں اور ترکوں سے گھل مل گیا۔ جرمن اور ترک اس بہروپ سے دھوکا کھا گئے اور اسے اپنا ہم نوا سمجھتے ہوئے اس "چاند" کے متعلق بھی خیالات کا وہ انکشاف اظہار کرتے جو عربوں کے ساتھ مل کر انہیں زک پہنچانے کا سبب بن رہا تھا۔ لارنس بھرپور خلوص اور اعتماد سے انہیں یقین دلاتا کہ وہ ایسا کرنے میں صد فیصد کامیاب ہو جائیں گے اور اس عمل میں وہ بھی انہیں بھرپور ذاتی تعاون فراہم کرے گا۔ لارنس نے دمشق میں قلعے کے تاجر کا بھیس بدلا۔ دروزی کے روپ میں مختلف علاقوں کی خاک چھانی۔ ترکوں کے ایک کیمپ سے معلومات لینے کے لیے نسوانی روپ بھی دھارا۔ سولہ روز تک پانچ سو میل کی مسافت میں اس نے بہت قیمتی معلومات حاصل کی تھیں جو عقبہ کی مہم میں اس کے بے حد مددگار بھی ثابت ہوئیں۔

انتہا درجے کو اس طویل سفر سے واپسی کے بعد اس نے آرام کرنے کے بجائے اگلے ہی روز نئی مسافت کا آغاز کر دیا اور ... پانچ سو ... اونٹ سوار صحرا میں بے جگری سے لڑنے کو تیار تھے۔ اس سفر کے آغاز سے ہی ناخوشگوار ... کا سامنا کرنا پڑا۔ "..." تک پہنچنے کے بعد علم ہوا کہ ترک افواج نے دو کنوؤں کو روڑے ڈال کر بند کر دیا ہے اور ... مردہ اونٹ پھینک کر زہر آلود کر دیا ہے۔ جنوبی سمت البتہ کنوؤں کو جزوی نقصان پہنچا تھا۔ صحرا میں زندگی کا انحصار کلی طور پر پانی پر تھا۔ لارنس نے وقت ضائع کیے بغیر ان کی مرمت کا کام شروع کروا دیا۔ ان کنوؤں میں ڈائنامائٹ کی طاقت سے اڑا کر کوڑا کرکٹ اور پتھر جمع ہو چکے تھے۔ سخت محنت سے صفائی کے بعد پانی کا حصول ممکن ہوا تو انسانوں ہی نہیں بلکہ جانوروں کی بھی جان میں جان آ گئی۔

سفر کا یہ تعطل اور اضافی مشقت لارنس کی ذاتی انا پر ایک اور تازیانہ ثابت ہوئی۔ ترکوں سے سابقہ نفرت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے جوابی کارروائی کے طور پر ایک فوری حملے کا فیصلہ کر لیا تاکہ ترکوں کی توجہ صحرا کے عربوں سے ہٹا دی جائے۔ وہ لارنس کے عزائم پر ... اور اس میں فوری طور پر پیچ بچاؤ کرتے منصوبوں کی نوعیت سے آگاہ ہی نہ تھے کہ اس نے کس قدر برق رفتاری سے ان عربوں کو پانی کے ذخائر تک پہنچا دیا تھا۔

اس کے بعد لارنس کے لیے آرام گویا حرام تھا۔ اس نے عزیز امج کے ریلوے اسٹیشن پر بھی ناقابل یقین رفتار سے رسائی حاصل کی۔ اس مقام پر تعینات دستہ عربوں کی یورش سے حواس باختہ ہو گیا۔ لارنس نے اپنے دستے کی مدد سے دو... پلوں اور ان کے درمیان واقع ریلوے لائن کے لیے ڈائنامائٹ پھیلا دیا۔ کچھ ہی لمحوں بعد وہاں ایک اور قیامت برپا ہو گئی۔ پتھروں اور گرد و غبار کا طوفان لارنس کی خوشی اور شمال و جنوب میں ترک چوکیوں کی بدحواسی میں یکساں اضافہ کر رہا تھا۔

اس کامیابی کے بعد لارنس کی خود اعتمادی ایک نئی بلندی کو چھونے لگی۔ اس نے دو حملوں پر اپنے خیموں میں خوابیدہ ترکوں پر عرب فوج کی ٹکڑیوں سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ اس چاند ماری میں اعراب نے دیوانہ وار جوش سے حصہ لیا۔ سورج طلوع ہوتے ہی چٹانیں گرم ہو گئیں تو عربوں کے لیے گرم دھاتی ہتھیار تھامنا بھی محال

ہونے لگا۔ اعدا اسی بے جگری سے لڑا کہ پستول کے غلاف میں گولیوں کے سوراخ نظر آنے لگے۔ اس نے اپنے گھوڑے کے ہلاک ہونے پر پیادہ لڑائی جاری رکھی تھی۔ اس کے لباس میں کئی گولیوں کے سوراخ بھی تھے لیکن حیران کن طور پر اسے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا۔ اس حملے میں عرب سپاہ کو لباس اور ہتھیاروں کے طور پر بے شمار مال غنیمت حاصل ہوا۔

یہ اہم محاذ سر ہونا بلاشبہ بہت اعتماد کا باعث تھا تاہم آخری پیش قدمی میں حائل چوکی سر کرنا بہت جوکھم کا کام تھا۔ یہ چوکی ایک تنگ وادی میں پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھی جہاں نصب مشین گن کسی بھی حملہ آور کی دھجیاں اڑا کر رکھ سکتی تھی۔ لارنس کے بھی ہمراہی اس مرحلے پر گھبراہٹ اور عدم اعتماد کا شکار تھے۔ لارنس البتہ قدرے پُرسکون تھا۔ وہ اپنے "علم" کی بنا پر جانتا تھا کہ اس رات چاند "گرہن" کا شکار ہوگا لہٰذا تاریکی میں پیش قدمی بالکل مشکل نہ ہوگی۔

"ترکوں کی مشین بہت مہلک ہے لارنس! ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔" شریف علی نے کہا۔

"مشین واقعی بے حد مہلک ہے لیکن وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔" لارنس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کیسے...... یہ کیسے ممکن ہوگا آخر؟" اعدا جھنجلا اٹھا۔

"میں تم لوگوں کو بتا رہا ہوں امیر فیصل! یہ شخص ہمیں کسی چوہے دان میں پھنسائے گا۔"

"آج رات چاند کی روشنی تاریکی نگل لے گی۔ تاریکی میں ترک ہمیں کیسے دیکھ پائیں گے بھلا؟" اس نے دانستہ طور پر پُراسرار انداز اختیار کیا۔

"چاند کو تاریکی نگل لے گی۔" اعدا نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا گویا اس کی ذہنی حالت پر مشتبہ ہو۔ "اس شخص کی بہکی ہوئی باتوں پر مجھے تو اب اعتبار نہیں ہے۔"

"ہاں، تم لوگ خود ہی دیکھ لینا۔ اپنی تیاریاں بہرحال مکمل رکھو۔ جیسے ہی تاریکی چھائے گی، ہم پیش قدمی کا آغاز کریں گے۔" لارنس نے بے نیازی سے بتایا۔

اگلے ایک گھنٹے میں صورت حال بالکل تبدیل ہوگئی۔ زمین گردش کرتی ہوئی چاند اور سورج کے درمیان حائل ہوگئی تھی۔ تعلیم اور تحقیق سے کوسوں دور سپاہ نے اس انہونی کو لارنس کا "کرشمہ" سمجھ لیا۔ اس لمحے وہ یکسر بھول گئے تھے کہ ان کا تعلق ایک ایسے مذہب سے ہے جو تعلیم و تحقیق پر ہی سب سے زیادہ زور دیتا ہے اور انہی معاملات سے دوری نے انہیں غلامی و ذلت کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ دوسری جانب ترکوں پر بھی اس گرہن نے بہت منفی اثرات مرتب کیے۔ ان کا گمان تھا کہ آسمان سے کوئی آسیب چاند کی روشنی چھیننے کے لیے اترا ہے۔ اس تاریکی کے اصل حقائق سے باعلم لارنس وقت ضائع کیے بغیر اپنی سپاہ کے ساتھ محتاط انداز میں وادی اتھم سے گزر گیا۔

لارنس کی یہ کامیابی بہت بروقت اور اہم تھی۔ اس کی شہرت پہاڑی خانہ بدوشوں تک پہنچ گئی تھی اور وہ بھی اس "پُراسرار" شخص کے قافلے میں شمولیت اعزاز سمجھنے لگے اور عقبہ باآسانی فتح ہوگیا۔ لارنس نے اس فتح پر جشن کے بجائے اپنی سپاہ کی خوراک کا بندوبست کرنا ضروری خیال کیا۔ وہ ایک طویل اور پُرپیچ مسافت کے بعد اسمعیلیہ پہنچا جہاں سے اسے قاہرہ جانے کے لیے گاڑی ملنا تھی۔ امیر البحر ویمزے بھی قاہرہ جانے کے لیے اسی مقام پر محافظوں کے ساتھ گاڑی کا منتظر تھا۔ اپنے لٹے پٹے حلیے کے باعث ویمزے سے ملاقات کٹھن تو ثابت ہوئی البتہ کامیابی ہی نصیب ٹھہری۔

"یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟" ویمزے نے اس کی جھلسی ہوئی رنگت اور خاک آلود عبا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس وقت جس مہم پر ہوں، وہاں یہی حلیہ میرا معاون ثابت ہو رہا ہے۔" اس نے بے نیازی سے بتایا۔

"ویسے تمہاری مہم کی تازہ ترین صورت حال کیا ہے؟" ویمزے نے دریافت کیا۔

"ہم نے عقبہ فتح کرلیا ہے۔" لارنس سادگی سے مسکرایا۔

"اس مٹھی بھر عرب سپاہ کے ساتھ؟" ویمزے ہنوز حیرت زدہ تھا۔

"ہاں، اس مٹھی بھر عرب سپاہ کے ساتھ۔ سلطنت عثمانیہ کی بلند و بالا دیواریں اب رخنہ زدہ ہونے لگی ہیں۔" وہ فخر سے مسکرایا۔

"تم مجھ سے اب کیا چاہتے ہو؟" اس نے گہری سانس بھری۔

"چاہتا تو بہت کچھ ہوں۔ ہتھیار، توپیں، اناج۔ آپ بتائیں، مجھے کیا فراہم کرسکتے ہیں؟"

"میں تمہیں غلے سے بھرا ایک جہاز پہنچا دوں گا۔ اس سے زیادہ فی الحال میں کچھ نہیں کرسکتا۔" ویمزے نے صاف گوئی سے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے۔" لارنس نے ہونٹ بھینچے۔

اس کامیابی کے بعد لارنس ایک اور اہم کام کی طرف

متوجہ ہوا۔ اسے قاہرہ میں جرنیل کلے ٹن سے ملاقات کر کے اپنی ''عسکری قابلیت'' کا ثبوت فراہم کرنا تھا۔

☆☆☆

مصر میں لارنس کی ان مہمات کا چرچا پھیلا تو اعلیٰ افسران کا ردعمل بھی کم و بیش ویسا ہی تھا۔ لارنس کی کلے ٹن سے تو ملاقات نہ ہو سکی البتہ دیگر ملاقاتوں اور کوششوں کا نتیجہ بہرحال اتنا ہی برآمد ہوا کہ مصری انتظامیہ نے تین ماہ تک عقبہ میں ضروری اشیا کی فراہمی اور سپاہ کی تربیت کے انتظامات کی ہامی بھر لی۔ اس کے بعد لارنس ایک بار پھر مختلف بھیس بدل کر ترکوں کی صفوں میں گھس گیا جہاں اسے اپنی ذات کے متعلق سازش کی کھوج اور ہلاکت کے اسباب کا علم ہوا۔ ان انکشافات نے اسے مزید جنون میں مبتلا کر دیا۔ اس نے ترکوں کو زک پہنچانے کے لیے نئی راہیں تلاش کرنے کا آغاز کر دیا۔

اس مشن میں لارنس نے پہلا تجربہ ''رغذاورا'' کی ریلوے لائن پر کیا۔ اس نے بارودی سرنگ بچھا کر اس لائن کو عین ریل گاڑی کی آمد کے موقع پر اڑا دیا۔ لارنس کے اس پے در پے تازہ ترین کارناموں کے بعد ترکوں نے ریل گاڑیوں کی حفاظت کے لیے طلایہ فوج تشکیل دے دی۔ چوکیوں کی حفاظت کے لیے محافظ دستوں میں بھی اضافہ کیا گیا۔ طلایہ فوج ہر گاڑی کے آگے ریلوے لائن کے دونوں جانب مشتبہ نشان تلاش کر کے ریل گاڑیوں کی حفاظت کے لیے ہلکان رہتی۔ ان کی یہ سرگرمیاں ریتیلے ٹیلے کے عقب میں خاموش بیٹھے لارنس کو بہت محظوظ کرتیں۔ اس نے ترکوں کو زچ کرنے کے لیے ایک اور فتنہ پرور منصوبہ بنایا۔ وہ اپنے قاصدوں کو دانستہ طور پر جھوٹی اطلاعات کے ساتھ ترک علاقوں میں روانہ کرتا۔ یہ قاصد گرفتاری کے بعد تشدد سہنے سے بچاؤ کی اداکاری کرتے ترکوں کو لارنس کی سکھائی گئی یہ ہدایات فرفر سنا دیتے کہ وہ فلاں مقام پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہا ہے۔ ترک یہ خبر ملتے ہی فوری طور پر اپنی چھاؤنیوں سے لشکر روانہ کر دیتے جن کے ''استقبال'' اور خاطر مدارات کے لیے لارنس اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہلے ہی گھات لگائے موجود ہوتا تھا۔

لارنس کی خود اعتمادی اور فتوحات کی سرشاری اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ بے خوفی سے ترک علاقوں میں جاسوسی کے لیے جانے لگا۔ انہی دنوں اسے درہ دانیال کے قریبی علاقے میں جاسوسی کی ضرورت پیش آئی۔ یہاں اسے چند مہلک کارروائیاں عمل میں لانا تھیں۔ لارنس نے اپنے ایک عرب ساتھی کے ہمراہ اسی جیسا لباس حاصل کیا اور اپنا ذاتی لباس ایک چٹان کے نیچے چھپا دیا۔ وہ پراعتماد تھا کہ اپنے نئے بھیس سے حسبِ سابق ترکوں کی آنکھوں میں دھول جھونک دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔

وہ چہل قدمی کرتے ہوئے ایک گلی میں داخل ہوا اور غیر نمایاں سے انداز میں بستی میں بڑھتا چلا گیا۔

''رکو، کہاں جا رہے ہو؟'' اسے اپنے عقب میں ایک للکار سنائی دی۔ لارنس کے دل میں فرار کی خواہش پیدا ہوئی لیکن اس نے کچھ سوچ کر اپنے ساتھی کو بھی روک لیا۔

اگلے چند لمحوں میں وہ دو ترک سپاہیوں کے نرغے میں تھے۔ انہوں نے آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ لارنس نے اعتماد اور احتیاط سے بھی سوالات کا بھرپور جواب دیا لیکن وہ مطمئن نہ ہو پا رہے تھے۔ انہوں نے مقامی شخص کو رہا کر دیا اور لارنس کو جبراً اپنے کمانڈر کے پاس لے گئے۔

''کون ہو تم...... کیا کرتے ہو...... کہاں سے آئے ہو؟'' کمانڈر نے ترکی اور عربی زبان میں سوالات جاری رکھے۔ وہ تقریباً پچاس برس کا ایک تندخو اور کرخت نقوش کا حامل شخص تھا۔

''مسافر ہوں آفندی۔ روزگار کی تلاش میں آیا ہوں۔'' لارنس نے بھی اس کے استفسار کا نہایت مخلصی انداز اور مختلف زبانوں میں ہی جواب دیا۔ اسے کمانڈر کی نظریں سخت الجھن میں مبتلا کر رہی تھیں۔

''جھوٹ کہتے ہو تم۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایک جاسوس ہو۔'' وہ غرایا۔

''نہیں آفندی! بالکل نہیں۔ میں جاسوس کیسے ہو سکتا ہوں؟'' لارنس مسکین سی صورت بنا کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''عمر کیا ہے تمہاری؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''ستائیس سال۔'' لارنس نے بتایا۔

''ایک اور جھوٹ۔'' کمانڈر نے اس کی آنکھوں کے گرد جھریوں کے مخصوص جال کو دیکھ کر کہا۔

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا آفندی؟''

''اچھا تو اپنی ان نیلگوں آنکھوں کے بارے میں کیا کہو گے؟'' کمانڈر نے سرد مہری سے کہا۔

''یہ تو خدا کی دین ہیں آفندی۔ روزِ محشر ہی خدا سے پوچھ کر بتا سکوں گا۔'' لارنس نے اطمینان سے کہا۔

کمانڈر کے اشارے پر ایک اہلکار نے لارنس کا

سر بیچ اتار دیا۔ اس کے سنہری بال دیکھ کر کمانڈار کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے تندی سے لارنس کی عبا اتار دی۔

"تو تم ایک برطانوی ہو؟" وہ اس کی شفاف رنگت دیکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں آفندی! کیسے یقین دلاؤں آپ کو؟" اس نے بے بسی سے کہا۔

اگلے ہی لمحے یہ بے بسی طیش میں ڈھل گئی۔ کمانڈار نے اس کے ساتھ ایک نہایت غیر اخلاقی حرکت کی تھی۔ اس کی نگاہوں میں ایک واضح "پیغام" نے لارنس کو سپاہیوں کی گرفت میں مچل کر کمانڈار پر تھوک دینے پر مجبور کر دیا۔

"یہ ایسے نہیں مانے گا۔ اس کی زبان اپنے طریقے سے کھلواؤ۔" کمانڈار نے اپنے اہلکاروں کو حکم دیا۔

اس کے ماتحتوں نے اپنی بساط بھر کوشش کا آغاز کر دیا۔ لارنس کو لکڑیوں، لاٹھیوں اور دیگر ہتھیاروں سے وحشت ناک ضربات لگائی جا رہی تھیں۔ وہ ان ضربات کے نتیجے میں بے دم ہو کر زمین بوس ہوا تو ایک بار پھر اسے ٹھوکروں کی زد میں رکھ لیا گیا۔

"میں جاسوس نہیں ہوں۔ میں بھی انگریزوں سے اتنی ہی نفرت کرتا ہوں۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے ایک قوی اندام اور مضبوط ترک اہلکار نے اسے اپنے پاؤں تلے دبوچا اور اپنے جوتے کی ایڑی سے اس کا سر پیسنے لگا۔ لارنس کا چہرہ سرخ اور اذیت سے نقوش مسخ ہو کر رہ گئے۔

"کیا معلومات حاصل کرنے آئے تھے یہاں؟" اس نے اپنی ایڑی کا زور مزید بڑھایا۔

"میں ایک غریب مسافر ہوں۔ مجھے بھی عربوں سے اتنی ہی نفرت ہے۔" لارنس کے لیے سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔

قوی اندام اہلکار اب اس کھیل سے اکتا گیا تھا۔ اس نے لارنس کا زخموں سے چور وجود ایک بھرپور ضرب سے پیچھے دھکیلا اور سپاہیوں کو اسے ایک کوٹھری میں لے جانے کا حکم دے دیا۔ وہ رات بھر اس کوٹھری میں ہوش و حواس سے بیگانہ رہا۔ اگلی صبح اس کے بدن کا ہر عضو ٹوٹ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد چند اہلکار اسے ایک بار پھر گھسیٹتے ہوئے عقوبت خانے میں لے آئے اور نئی سزاؤں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لارنس کی خاموشی اور ہٹ دھرمی جوں کی توں برقرار تھی۔ کمانڈار اس تشدد اور لارنس کی قوت ارادی پر جھنجلا کر رہ گیا۔ اس کے حکم پر سپاہی اسے دوبارہ کوٹھری میں لے گئے۔

لارنس کے حواس رات ڈھلے بحال ہوئے تو وہ ڈگمگاتے قدموں سے کھڑکی کے قریب چلا آیا۔ کھڑکی سے زمین کا فاصلہ چند فٹ تھا۔ اسے گلی کے انتہائی کونے پر ہموار چال سے پہرا دیتا ایک سنتری دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا وجدان گواہی دے رہا تھا کہ رات ڈھلے کے باعث سنتری کی بصارت و سماعت کھڑکی اور یہاں سے برآمد ہونے والی کسی آواز پر مبذول نہیں ہوگی۔ اس نے اپنے دکھتے بدن اور ہر جنبش سے دھماکوں کی زد میں آتے سر کی اذیت کو نظرانداز کرتے ہوئے کھڑکی کی چوکھٹ میں پاؤں لٹکائے اور نشیب میں کود گیا۔ گردن میں تکلیف کی ایک شدید لہر اٹھی اور وہ چند لمحوں تک حرکت کرنے کے قابل بھی نہ رہا۔

"شکر ہے خدایا! آپ زندہ ہیں۔ مجھے تو ان ترکوں کے تیور سے خوف ہی آ رہا تھا کہ کہیں ----" چند لمحوں بعد اسے اپنے قریب اسی ساتھی کی آواز سنائی دی جسے ترکوں نے رہا کر دیا تھا۔

"میں اتنی آسانی سے نہیں مروں گا۔ میرے وجود پر لگے ہر ایک زخم کا حساب دینا ہوگا انہیں۔" لارنس نے سفاکی سے کہا۔

اس کے بعد وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ ڈگمگاتے قدموں سے اندھیری رات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عمارتوں کی آڑ لیے شہر سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ترکوں کے دشمنوں میں ایک اور ناقابل معافی گناہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی ذات سے ترکوں کو بھی ایک انتقام کا مزہ چکھانے کا عہد کرتے ہوئے شہر پر الوداعی نظر ڈالی اور منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

لارنس کے مزاج میں در آنے والی نفرت کی اس لہر کو اپنے اخراج کی کوئی نہ کوئی راہ درکار تھی۔ تشدد کے باعث اب وہ قدرے جھک کر چلنے پر مجبور تھا۔ ترکوں کو زیادہ سے زیادہ زک پہنچانے کی تمنا شدید تر ہونے لگی۔ اس دوران موسم بھی تیزی سے تبدیلی کی جانب گامزن تھا۔ اگلے ایک دو ماہ میں برف باری، ژالہ باری اور بارشوں کے باعث مہمات میں تعطل بھی پیدا ہو سکتا تھا۔

لارنس نے اس عرصے میں مصروفیت کا ایک نیا پہلو تلاش کر لیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑوں میں چھپ کر ترکوں کو پلوں کی مرمت کرتے ہوئے دیکھا کرتا۔ ترک کاریگر تختے جمانے کے بعد پٹریاں از سر نو بچھا کر ریلوں کی آمد و رفت کے قابل بناتے۔ ان کا یہ کام انتہائی

مراحل تک پہنچتے ہی لارنس عربوں کے ساتھ فوری دھاوا بول دیتا۔ محافظوں کے قتل کے بعد تعمیر شدہ حصے ایک بار پھر ڈائنامائیٹ سے اڑا دیے جاتے۔

اس مہم جوئی کے علاوہ بری اور بحری راستوں سے مصر میں آمد ورفت بھی بلاتعطل جاری تھی۔ وہ اپنے ہر ایک منصوبے پر ممکنہ خامی کی تلاش تک باریک بینی سے جانچ کرتا۔ اس آمد ورفت سے وقت ملتا تو وہ چھاؤنی کے قریب عہدیدار کیپٹن مارشل کے خیمے میں "موریٹ آرتھر" کے مطالعے میں مگن رہتا۔ اسے موسم کی تبدیلی کا بے تابی سے انتظار تھا۔

1918ء کا آغاز ہو چکا تھا۔ لارنس کی نظریں اب بحر مردار کے جنوبی سرے پر واقع "طفیلہ" پر مرکوز تھیں۔ ترکوں کے زیر تسلط یہ مقام اس کے مزید منصوبوں کے لیے بہت خطرناک تھا۔ اس نے حملے کی تیاری مکمل کر کے "ترف" نامی قریبی ریلوے اسٹیشن کو قبضے کے بعد تباہ کر دیا گیا۔ مزید پیش قدمی کا آغاز ہوا ہی تھا کہ موسم کی کروٹ نے ناموافقت اختیار کر لی۔ ستم ظریفی یہ بھی کہ فوجی صدر مقام کی انتظامیہ نے عربستان سے اپنی ناواقفیت کی بنا پر گرم کپڑوں، کمبلوں اور خیموں کا مناسب بندوبست ہی نہ کیا تھا۔ وہ اس گمان میں مبتلا رہے تھے کہ حجاز ایک گرم سرزمین ہے جہاں ریگستان اور آگ برساتے سورج کے سوا کوئی موسم کروٹ ہی نہیں لیتا۔ لارنس اور اس کی سپاہ کے لیے موسم کی یہ شدت جھیلنا بہرحال آسان نہ تھا۔ وہ سطح سمندر سے تقریباً پچاس ہزار فٹ بلندی پر تھے۔ انسانوں کے ساتھ اونٹ بھی اسی اذیت میں مبتلا تھے۔ وہ آگے قدم بڑھانے کی صورت میں اپنا توازن ہی کھو بیٹھتے۔ سپاہ کے لیے سردی سے شل انگلیوں کے ساتھ رائفل چلانا ہولناک مرحلہ تھا۔

ترکوں کو بھی اس دستے کی آمد کا عندیہ مل چکا تھا۔ انہوں نے اپنی چوکیوں پر محافظوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا۔ ترک عہدیداران اس شخص کو دیکھنے اور خاتمے کے شدید متمنی تھے جس نے عربوں کی منتشر قوت یکجا کر کے ان کے لیے مسائل کا کوہ گراں کھڑا کر دیا تھا۔ طفیلہ میں گھمسان کا رن پڑا۔ اس لڑائی میں لارنس کو بھی ایک سو بیس افراد کی ہلاکت کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ یہ جنگ ختم ہوتے ہی برف باری کا آغاز ہوا اور لاشیں منوں برف اوڑھے روپوش ہو گئیں۔

موسم بہار کی آمد ہوئی تو لارنس نے بڑی کمی سے تشویش

زدہ دکھائی دینے لگا۔ خوش قسمتی ایک بار پھر مددگار ثابت ہوئی اور سفر کے پہلے ہی پڑاؤ میں کرنل جوائس کی جانب سے پچاس ہزار پاؤنڈز سونے کی امداد نے اسے پرسکون کردیا۔ اب اسے جرنیل ایلن بائے سے ایک خصوصی ملاقات کرنا تھی۔ وہ اپنے مخصوص انداز اور راستوں سے ہوتا مصر و فلسطین کی جانب روانہ ہوگیا۔

''تمہاری مہمات کا کیا حال ہے میجر لارنس؟'' ایلن بائے نے خوش دلی سے دریافت کیا۔

''ہر گزرتا دن ترکوں کو ایک نیا زخم دیتا ہے۔'' وہ زیرِ خند ہوا۔

''خوب..... بہت خوب۔ امید ہے تمہاری یہ مہمات کامیابی سے ہمکنار ہوتی رہیں گی۔'' اس نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔

''یہاں برطانوی فوج اور اتحادیوں کی کیا صورتِ حال ہے؟'' لارنس نے استفسار کیا۔

''خوش آئند نہیں ہے بہرحال۔'' ایلن بائے نے گہری سانس بھری۔ ''اتحادی مشرقی محاذ پر سود مند اقدامات سے قاصر ہیں۔''

''جرمنی کی ترکی کی معاونت و تائید نے ہی ان مسائل سے دوچار کر رکھا ہے۔'' لارنس جزبز ہوا۔

''ان گنت مسائل کہو۔'' ایلن بائے نے ایک بار پھر بوجھل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ہم ان گنت مسائل کا شکار ہیں۔''

''تو پھر ترکوں کو زک پہنچانے کے لیے عربوں کو امداد فراہم کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کبھی کبھی چھوٹے محاذ پر فتح بہت بڑے نتائج لایا کرتی ہے۔'' لارنس نے اپنا اصل مدعا بیان کیا۔

جنرل ایلن بائے کچھ لمحات کے لیے خاموش ہوا پھر پرسوچ انداز میں کہنے لگا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارے لیے ہتھیار، اونٹوں اور غذا کی فراہمی کا کوئی بندوبست کردیتا ہوں۔''

''بہتر..... تو پھر آپ بے فکری سے مغربی محاذ سنبھالیں۔ مشرقی محاذ پر ترکوں کی تباہی میری ذمے داری۔ مجھے اچھی طرح علم ہے کہ عربوں سے کس طرح کام لینا ہے۔'' وہ اعتماد سے بولا۔

ایلن بائے نے آسودگی سے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

☆☆☆

برطانوی محاذ پر جنگ نقشوں کے مطابق انجام نہ پارہی تھی۔ مسائل اس قدر تھے کہ جرنیل ایلن بائے کو دو تین ماہ کے لیے جنگ روکنا پڑی۔ یورپ میں جنگ شدید تر ہونے سے وہ مصر سے کمک طلب کرنے لگے تھے۔ اس دباؤ نے ایلن بائے کو مزید کمزور کردیا۔ اس کے لیے اب قوت کے بجائے چال بازی سے کام لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دھیرے دھیرے حالات ایسی نوعیت اختیار کرگئے کہ وہ اتحادی افواج جو انقلابِ عرب کو معمولی اور بے سود سمجھ کر نظر انداز کرتی رہی تھیں، اب یک لخت ہی بے حد اہمیت اختیار کرگیا۔

لارنس کو ان حقائق کا علم ہوا تو اس کا زرخیز دماغ نت نئے منصوبے تیار کرنے لگا۔ افواج کو تجاویز پیش کرتے اس کے دل و دماغ میں ہنوز مشرق کی ''کلید'' دمشق فتح کرنے کا خواب سجا تھا۔ انہی دنوں اسے علم ہوا کہ ترکوں نے اسے زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر ''دس ہزار پاؤنڈز'' کا اعلان کیا ہے۔ لارنس کا سر فخر و غرور سے بلند ہوگیا۔ اسے اپنی دو سالہ محنت کے انعام نے بہت محظوظ کیا تھا۔

ان حالات و واقعات سے لطف اندوز ہوتے لارنس نے ایک مخلوط فوج تیار کی جس میں اونٹوں کے ساڑھے چار سو دستے تھے۔ سپاہی خاصے تربیت یافتہ ہی نہیں، تجربہ کار بھی تھے اور بے تحاشا اسلحہ دسترس میں تھا۔ انگریزی ہتھیار بند موٹریں اور ان کی ایندھن گاڑیاں، مصری و ہندوستانی اونٹ سواروں کا ایک ایک دستہ اور دو طیارے بھی تھے۔ سپاہیوں کی تعداد ایک ہزار سے کم ہی تھی۔ انہیں خود سے دس گنا بڑی ترک فوج کا سامنا تھا جن سے نفرت اور بیزاری ہی ان کی اصل قوت تھی۔ وہ اپنی کامیابی کے تصور سے مکمل سرشار دونوں طیاروں کی پرواز دیکھ کر نعرہ تحسین بلند کررہے تھے جو پڑاؤ کی سرزمین کے اوپر ''مرفی'' اور ''جونز'' کی قیادت میں چکر کاٹ رہے تھے۔ لارنس ان کی ہر ایک جنبش پر گہری نظر رکھتا تھا اور کسی بھی تغیر کی صورت میں اپنی چرب زبانی سے معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹانے کی بھرپور کوشش کرتا۔

اگلے روز شمالی سمت میں پیش قدمی شروع ہوئی۔ اب وہ ایک ایسے خطے کی جانب گامزن تھے جو عربوں اور ترکوں میں سے کسی کی بھی ملکیت نہ تھا۔ دروزیوں کے علاقے کی پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے ایک افتاد نے انہیں گھیر لیا۔ اگلے پڑاؤ سے خبر رساں سپاہیوں کی ہیجان انگیز چیخوں اور مخصوص اشاروں نے انہیں بوکھلا دیا۔ وہ خبر رساں ایک جرمن ہوائی جہاز کی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ یہ نظارہ انوکھا ہی نہیں، تشویش ناک بھی تھا۔ لارنس کے لیے یہ

سمجھنا دشوار نہ تھا کہ اس جرمن جہاز کی نچلی پرواز کا مقصد اس قافلے کی حقیقت جاننا ہے۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو بلاتامل بکھر کر پھیل جانے کا حکم دیا تاکہ جرمن ہواباز کم سے کم لوگ دیکھ سکے۔

لارنس کی خوش قسمتی یہاں بھی اس کے خوب کام آئی۔ مرفی نے دو نشستوں والے اس جدید طیارے کی آمد بھانپ لی تھی۔ مرفی کے پاس قدرے پرانی ساخت کا بی۔ای 12 طیارہ تھا جو رفتار میں جرمن طیارے سے بہت بہتر تھا۔ مرفی نے اپنا جہاز جرمنوں سے بلند تر کیا اور ایک خطرناک غوطہ لگا کر عقبی حصے پر ضرب لگانے کے درپے ہوگیا۔ جرمن ہواباز نے مرفی کو اپنی سمت آتے دیکھا تو اس نے بھی غوطے سے بچنے کی بھرپور کوشش کی۔ مرفی کا گرجتا ہوا جہاز جب ایک جانب سے نکلا تو جرمنوں نے اسے نشانے پر رکھ لیا۔ لارنس طیارے کی لڑکھڑاہٹ دیکھ کر دل تھامنے پر مجبور ہوگیا۔ مرفی کی موت اور طیارے کی تباہی کا تصور ہی ہولناک تھا۔

ان اندیشوں کا خاتمہ چند لمحوں میں ہی ہوگیا۔ برطانوی طیارے نے عقب سے یکدم پرواز بھری اور اپنے دوسرے پھیرے میں جرمن طیارے کو نشانہ بنا دیا۔ فضا میں دھواں بلند ہوا اور اگلے ہی پل جرمن طیارہ شعلوں کی زد میں دکھائی دینے لگا۔ لارنس اور اس کا دستہ خوشی سے بےقابو ہوکر نعرے لگانے لگا۔ جرمن طیارے کو تیزی سے پیچ و خم کھاتے پہاڑوں پر گرتے اور ایک میل کے فاصلے پر شعلوں میں جل کر تباہ ہوتے دیکھ کر انہوں نے جوش سے اپنی بندوقوں کے منہ بھی کھول دیے۔ برطانوی طیارہ اس ضرب سے تباہ ہوگیا تھا تاہم خوشی کی بات یہ تھی کہ مرفی صحیح سلامت زمین پر اتر آیا تھا۔

اس ہوائی مہم کے بعد لارنس کی منزل "ڈیرہ" کی شمالی سمت پیش قدمی تھی۔ اس نے یہاں بھی اپنی سابقہ روش جاری رکھی۔ ریلوے لائنز دھماکوں سے اڑا دیں۔ ٹیلی گراف لائنوں میں خرابی پیدا کی اور اپنی سپاہ کی مورچہ بندی کرتا رہا۔ اسی دوران اسے شمالی جانب سے بندوقوں، مشین گنوں اور سیکڑوں سپاہیوں کی صورت میں مزید کمک بھی مل گئی تھی۔ لارنس کا ہر قدم ناپا تلا اور اس کی منصوبہ بندی کے عین مطابق ہوتا تھا۔ ان دنوں اس نے اپنی حکمت عملی میں قدرے تبدیلی کر رکھی تھی۔ وہ دوراندیشی سے کام لے کر سپاہ کی قیمتی زندگیاں محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ جرمنوں نے اپنے طیارے میدان میں اتار دیے تھے جو ان کی ہتھیار بند موٹروں اور زمینی دستوں پر حملہ کرتے۔ خوش قسمتی یہ رہی کہ موٹروں پر گرائے گئے بم ہدف پر نہ لگ سکے۔ ان طیاروں سے بچنے کے دوران عرب سپاہ نے بھی ایک طیارے کو خاک کر دیا۔ نچلی پرواز کرتی اس "مشینی چڑیا" کے انجن کی ٹینکی میں موٹر سے چلائی گئی گولی تباہ کن ثابت ہوئی۔ طیارہ بھیانک آواز کے ساتھ زمین پر گرا اور اس دھماکے کے زور سے ٹوٹ پھوٹ کر تباہ ہوگیا۔ عربوں کی خوشی اور جوش دیدنی تھا۔ انہوں نے "آہنی گھوڑے" کے بعد "مشینی چڑیا" پر بھی غلبہ پالیا تھا۔

لارنس نے اپنی جدوجہد اور جوڑ توڑ سے تین تازہ طیارے مزید حاصل کرلیے۔ اب وہ ترکوں اور جرمنوں کا بہتر انداز میں مقابلہ کرسکتا تھا۔ انہی دنوں عربوں نے ترکوں کا ایک اور طیارہ بھی مار گرایا۔

لارنس کی اگلی منزل ڈیرہ پر مکمل قبضے کے بعد دمشق کی جانب پیش قدمی تھی لیکن اس سے قبل ایک اور اہم کام بھی نمٹانا تھا۔ "ازرق" روانگی کے بعد "ہنڈلی پیج" طیارے کے ذریعے آئل، روغن، پیٹرول اور غذا کا بندوبست ضروری تھا۔ عرب سپاہ اس ہوائی اور روغن پیٹرول کی بابت سن کر کافی حیران اور الجھے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ ان کی یہ حیرت بہت جلد خوشی اور ہیجان میں ڈھل گئی۔ ایک دوپہر انہوں نے فضا میں تین طیاروں کی اڑان دیکھی جن کے قریب آنے پر وہ آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کیے اس جانب نظریں جمائے رہے۔ ہنڈلی پیج کی جسامت نے وہاں موجود برطانوی ہوابازوں کو بھی مرعوب سے گنگ کردیا تھا۔ عربوں کا حال ان سب سے سوا تھا۔ ایک شخص نے بےساختہ پکار کر کہا۔

"واللہ! یہ تو تمام شیطانی چڑیوں کا باپ معلوم ہوتا ہے۔"

لارنس ان کے استعجاب پر فخر سے مسکرانے لگا۔

☆☆☆

ستمبر کا آخری عشرہ رواں تھا۔ عرب فوج کے حوصلے اس قدر بلند تھے کہ وہ ترک افواج پر حملے اور انہیں مزید ضربات لگانے کے لیے شدید بےتاب تھے۔ ہنڈلی پیج طیارے کے ہواباز "مفرق" روانہ ہوچکے تھے جہاں سے انہیں طیارے میں ہی ڈھیروں بم لے کر واپس آنا تھا۔

پیش قدمی کا آغاز ہوا تو "ذہب" اور "مفرق" کے درمیانی علاقے میں ایک جاسوس لارنس سے ملاقات کے لیے چلا آیا۔ اس نے لارنس کو اطلاع دی "ترک لشکر ایک تباہ شدہ پل کی مرمت میں مصروف ہے۔" لارنس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے اپنی سپاہ کو وہیں توقف کا حکم دیا اور

مطلوبہ مقام پر ایک مخصوص بلندی تک پہنچ گیا۔ اسے اب اپنے سامنے زیرِ تعمیر پل واضح دکھائی دے رہا تھا۔ لارنس نے ہاتھ کے اشارے سے چند عہدیداروں کو بھی وہاں بلوالیا۔ ترک ان کی موجودگی سے یکسر بے خبر تھے۔ لارنس اور اس کے عہدیدار وہاں دو گھنٹے مقیم رہے۔ وہ ترکوں کی سرعت اور جانفشانی دیکھ کر مرعوب بھی ہو رہے تھے۔ انہوں نے مختصر وقت میں ہی ایک عارضی چوبی پل تعمیر کرلیا تھا۔ لارنس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری اور وہ بہت سکون سے کہنے لگا۔

''انہوں نے کام تو خوب کیا ہے۔ انعام بھی اسی قدر شاندار ملنا چاہیے۔''

عہدیدار بھی اس کے ارادے بھانپ کر سنسنی محسوس کرنے لگے۔ لارنس نے چند مزید آدمی اس جانب بلوائے اور ان کارکنوں کو فرار ہونے پر مجبور کردیا۔ اس کے بعد کوڑا کرکٹ اکٹھا کرکے پل کے درمیانی شہتیر نذرِ آتش کردیے گئے۔ کچھ ہی لمحوں میں اس نوتعمیر شدہ پل کے دونوں سرے جل کر خاکستر ہوچکے تھے۔ لارنس نے اسی پر اکتفا نہ کیا۔ اس نے ریلوے لائن کا ایک حصہ بھی تباہ کردیا۔ ان ہنگامہ خیز سرگرمیوں میں گزرے دن کے بعد وہ شب بھی اپنے جلو میں بہت سے ہنگامے سمیٹ لائی تھی۔ ہنڈلی پیج نے مفرق پر بمباری کا آغاز کردیا تھا۔ لارنس اور اس کی سپاہ کو شمالی سمت پہاڑوں کے عقب میں سرخ روشنی کی ہولناک تمتماہٹ دکھائی دی تو وہ خوشی سے جھومنے اور رقص کرنے لگے۔

مفرق کی اس تباہی اور دشمن کو زک پہنچانے کے بعد لارنس کی نگاہیں دمشق پر مرکوز تھیں جسے تسخیر کرنے کا خواب روزِ اول سے ہی اس کی آنکھوں میں بسا تھا۔ تمام انتظامات کے بعد کچھ ہی مسافت طے ہوئی تھی کہ ایک طیارہ جھپٹتا ہوا لوٹا اور دو تین چکر کاٹنے کے بعد ایک پیغام پھینک دیا۔ یہ پیغام فوری طور پر اٹھوا کر بلاتاخیر لارنس تک پہنچادیا گیا۔ متن نے لارنس کو کچھ تشویش و پیچ میں مبتلا کردیا۔ اسے ریلوے کی طرف سے سواروں کی ایک زبردست فوج کی آمد کا عندیہ ملا تھا۔ اس نے اپنے جاسوسوں کو حرکت میں آنے کا حکم دے دیا تاکہ ترکوں اور جرمنوں کی آمد کا بروقت علم ہوسکے۔ اس نے کچھ سپاہی پہاڑ کے دونوں جانب بھی پھیلا دیے۔ ان سپاہیوں نے ترکوں پر کمین گاہوں سے خوب گولیاں برسائیں۔ بعض ترک چٹانوں کے پیچھے گھس آنے میں کامیاب ہوگئے تاکہ اس اچانک حملے کا بھرپور جواب دے سکیں البتہ اکثریت اس ناگہانی آفت سے فرار ہی چاہتے تھے۔

عرب سواروں کے گروہ وادی کے کسی موڑ سے لپک کر باہر نکل آتے اور جوش و نفرت سے چلاتے ہوئے ان مفرور سپاہیوں کو مارنے کے بعد پہاڑوں میں لوٹ جاتے۔ کچھ ہی دیر میں وہ تنگ گھاٹی لاشوں سے اٹ چکی تھی۔

باقی ترکوں کی واپسی ایک ایسی سڑک سے ہوئی تھی جو ایک وادی سے گزرتی تھی۔ یہ صدیوں سے خشک ہوچکے ایک دریا کی گزرگاہ تھی جہاں سے صرف اونٹوں کے کارواں ہی گزر سکتے تھے۔ دونوں جانب عمودی چٹانیں استادہ تھیں جن کے کنارے اس قدر تیز تھے کہ ہاتھ پاؤں جمانے کی کوشش ہی زخموں سے چور کردیتی۔ عربوں نے انہیں اسی وادی کے ایک تنگ اور پیچ و خم کھاتی راہ پر ہنکا دیا۔ اب ترکوں کے لیے بچ نکلنا ناممکن تھا۔ جان بچانے کی فطری کوشش میں جب انہوں نے شمال کی طرف فرار ہونا چاہا تو موت چہار اطراف سے ان کا شکار کرنے کے لیے تیار تھی۔ عربوں نے انہیں انہی کے ہتھیاروں کی زد میں رکھ لیا۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی بچ گیا تو وہ اپنے ہی اونٹوں اور گھوڑوں کی بے ترتیبی میں کچلے گئے۔ باقی ماندہ کسر طیاروں سے ہونے والی بمباری نے پوری کردی۔ یہ جنگ نفرت اور انسانیت سوزی کی بھیانک مثال ثابت ہورہی تھی۔

لارنس نے عربوں کو اس دلیری اور جرأت پر خوب سراہا اور مختصر وقت میں ہی اگلے کچھ اسٹیشنوں پر قبضہ کرکے درعا کے جنوب میں ریل کے ذریعے ترکوں کی نقل و حرکت کا مکمل سدِباب کردیا۔ حالات اب بے حد نازک ہوچکے تھے۔ عالم یہ تھا کہ وادی کے ایک دو موڑ مڑنے کے بعد دشمن سے اچانک سامنا ہوجاتا۔ یہ اعصاب شکنی ہی کم تھی کہ چند پہاڑی افراد نے عربوں پر گولیاں چلانا شروع کردیں۔ عرب بالکل بے خبر تھے۔ ان مشکلات کے علاوہ غذا اور پانی کی قلت بھی سر اٹھانے لگی۔ لارنس اس تمام تر صورتِ حال پر تشویش زدہ تھا۔ گزشتہ پندرہ روز کی مسلسل نقل و حمل اور رات بھر میں صرف چند گھنٹوں کے آرام نے لشکر میں بیزاری پیدا کرنا شروع کردی تھی۔ لشکر کی یہ کیفیات جنگی طیارے سے گرائے گئے ایک پیغام نے نابود کیں۔ اس پیغام کے مطابق ترکوں کی پسپا فوج کے دو دستے شیخ سعد نامی مقام کی طرف پلٹ رہے تھے۔ ان میں سے دونوں کی تعداد بالترتیب چار اور دو ہزار تھی۔ چھ ہزار سپاہیوں کا مقابلہ اس وقت خودکشی کے مترادف تھا۔ لارنس نے اپنے آدمیوں کو نقاس کی جانب سے آگے بڑھایا تاکہ وہاں موجود دو ہزار

ترکوں سے نمٹا جا سکے۔ اس کے بعد ایک مختصر ٹولی کو پہاڑی دیہاتوں کو مشتعل کرنے کے لیے روانہ کر دیا تاکہ ترکوں کے لیے مزید مسائل کھڑے کیے جا سکیں۔

اس کی اسی حکمت عملی کے مطابق عربوں نے حملے کے بجائے صرف چھپتے ہوئے ترکوں کو نشانہ بنانا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے ایک مختصر پیادہ دستے کی آمد کا عندیہ ملا جو غیر منظم انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ لارنس اور اس کے آدمیوں نے اگلے ایک گھنٹے میں اس دستے کو بھاری نقصان پہنچا کر منتشر کر دیا اور خود حتی الامکان تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اس چوٹی پر پہنچ گئے جہاں سے طفاس کی بستی دکھائی دیتی تھی۔

انہیں دھوئیں سے اٹے مکان اور اس سے تقریباً دو میل آگے ترک فوج دکھائی دی جو تیزی سے مزید آگے بڑھ رہی تھی۔ عربوں پر اس بستی کی تباہی کی وجہ نے نہایت وحشت ناک اثرات مرتب کیے۔ وہ لارنس کے ہمراہ قریب آئے۔ گاؤں میں شیر خوار سے لے کر پانچ سال کی عمر تک کے بچوں کی لاشیں گرد و غبار میں اٹی پڑی تھیں۔ طفاس کے رہائشیوں کی اس عبرت ناک حالت نے عربوں میں بھی وحشت کا کرب اجاگر کر دیا۔ امیر فیصل کا ایک قریبی ساتھی شیخ طلال کرب سے دھاڑتا ہوا آگے بڑھا اور بھیانک آواز میں ترکوں کو للکارنے لگا۔

"طلال رکو..... کیا ہوا ہے تمہیں؟" لارنس نے اسے پکارا۔

"وہ نہیں رکے گا لارنس! طلال کا تعلق اسی تباہ شدہ گاؤں سے ہے۔ یہ سب اس کے اپنے تھے۔" عودہ نے تاسف سے اسے بتایا۔

"آج کوئی نہیں بچے گا ان میں سے۔ کسی کو قیدی نہیں بنایا جائے گا۔ سب کے سب یہیں مریں گے آج۔" طلال کی آواز پھٹنے کے قریب تھی۔

وہ لارنس کی ہر پکار نظرانداز کرتے ہوئے اپنا گھوڑا تیزی سے دوڑاتے ہوئے دیوانگی کے عالم میں آگے بڑھ گیا۔ اگلے چند لمحے بے حد خونخوار تھے۔ وہ تن تنہا اس سپاہ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اپنا ہتھیار نکال لیا۔ ترکوں کی مشین گنیں بیک وقت حرکت میں آگئیں اور طلال کا وجود چھلنی ہو گیا۔

لارنس کی آنکھوں میں لہو اتر آیا۔ اس نے اپنی سپاہ کے تین حصے کیے اور انہیں پہاڑوں میں لوٹ کر ہر اس شخص کو ساتھ لانے کا حکم دیا جو اس مقصد کے لیے لڑائی پر آمادہ ہوتے۔

"کسی کو قیدی نہیں بنایا جائے گا۔ ان سب کا مدفن یہیں بنا دو۔" اس نے سفاکی سے کہا۔

لارنس کی یہ حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی۔ فتح کے نشے میں سرشاری سے آگے بڑھتے ترکوں کو پسپائی منظم کرنے کا وقت ہی نہ ملا۔ ترکوں نے بھی بے جگری سے اس لشکر کا مقابلہ کیا لیکن اس روز عربوں کا غیظ و انتقام ہر جذبے پر حاوی تھا۔ انہوں نے ہتھیار ڈال کر ہاتھ کھڑے کر دینے والے ترکوں کو بھی کوئی رعایت نہ دی۔

یہ قتل و غارت بلاتعطل جاری رہی تاوقتیکہ انگلیاں گرم ہو کر فائر کرنے کے قابل ہی نہ رہیں۔ عربوں کے بازو بھی یہ ہتھیار اٹھائے رکھنے سے شل ہو گئے تھے۔ طفاس اور طلال کا بدلہ لیتے نفرت کا ایک نیا باب رقم ہو گیا تھا لیکن ایک اور ہولناکی کا واقعہ تو ابھی باقی تھا۔

امدادی افواج کے دستوں نے ان مقامات پر ترکوں کے رسد لانے والے آدمیوں کا گھیراؤ کر لیا تھا۔ وہ بے بسی سے اپنے ساتھیوں کو دم توڑتے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ہتھیار ڈالے اور رحم طلب کرنے کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ انہیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک چوہے دان میں آ پھنسے ہیں اور غیظ زدہ عرب جانے ان کا کیا حال کریں گے۔ ان کے بھی خدشات اور بدترین اندازے درست ثابت ہو گئے۔ غیظ اور تنفر میں عربوں نے قتل و غارت کا ایک نیا بازار گرم کر دیا۔

لارنس کے کپڑے بھی دیگر افراد کی طرح لہو آلود ہو گئے تھے۔ عرب لارنس کی ہر حکمت عملی، منصوبے اور چال پر من و عن عمل کرتے۔

لارنس کی گزشتہ چند مہینوں کی محنت اور بھاگ دوڑ کا ثمر اب واضح نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے شمالی قبائل کے شیوخ سے ملاقاتوں کے بعد انہیں ترکوں کے خلاف صف آرا ہونے پر قائل کیا تھا۔ عرب بالآخر انہیں متحد ہو کر انہیں دیرہ سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس بے دردی سے قتل عربوں نے طفاس میں بربریت کا مظاہرہ کرنے والے دیرہ میں پناہ گزین ترکوں پر اپنی نفرت کا باقی زہر بھی انڈیل دیا۔ دیرہ کی ایک مرکزی بستی میں چند ماہ پہلے عرب راہنماؤں کو سخت جسمانی سزائیں دے کر پھانسی پر لٹکایا جا رہا تھا اور اب وقت کے الٹ پھیر نے عربوں کو بدلہ لینے کے مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ ترک ان کے رحم و کرم کے محتاج ایک چوہے دان میں آ پھنسے تھے۔

آتش انتقام نے انہیں بصارت اور بصیرت دونوں سے ہی محروم کر دیا تھا۔ جنگ کی ہولناکی نے ان کی باطنی ہی نہیں بلکہ ظاہری ہیئت بھی بدل کر رکھ دی تھی۔ فی الوقت وہ

ایک وحشیانہ زندگی بسر کر رہے تھے اور یہی وحشت ان کی فطرت میں بھی سما گئی تھی۔ لارنس نے ان کی وحشت مطیع کر لی تھی۔ اب ان کے ہمراہ شمال میں دمشق کی جانب بڑھنے کا وقت آ گیا تھا۔

لارنس نے دیرہ کی حفاظت فوج کے ایک دستے کے سپرد کی اور دیگر لشکریوں کے ہمراہ دمشق کی جانب روانہ ہو گیا۔ دمشق کی فتح کے ساتھ حجاز کی ترک تسلط سے آزادی ترکوں کے لیے ناقابل فراموش زخم ہوتی جو تاریخ بن کر ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتی۔ لارنس یہ تاریخ رقم کرنے کے لیے اب مزید صبر نہیں کر سکتا تھا۔

دمشق کے قریب پہنچتے ہی ہولناک نظارے لارنس اور عربوں کی دید کے منتظر تھے۔ آسمان آگ اور دھوئیں کے بادلوں سے کثیف ہو چکا تھا۔ دھماکوں کی آوازیں سمع خراش تھیں۔ ترکوں نے یہ علاقہ چھوڑنے سے قبل اپنے گولہ بارود کے بھی چھوٹے بڑے گودام نذرِ آتش کر دیے تھے۔ مدھم دھماکوں کے ساتھ آگ پھیلنے سے شمالی پہاڑیوں میں کڑاکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ شہر کے قریب تو یہ شور و غل مزید سمع خراش تھا۔ خوش کن بات بہرحال یہ تھی کہ گرد و نواح کے قصبوں اور دیہاتوں میں مقامی افراد جوق در جوق لارنس اور عرب سپاہ سے ملاقات کے لیے آنے لگے۔ وہ ترکوں کی غلامی سے نجات پر اپنی شکر گزاری کے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

☆☆☆

دمشق میں لڑائی فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ ہر جگہ لاشوں کے انبار نظر آنے لگے۔ لارنس کا وجود اور شخصیت مقامی عربوں کے لیے بہت "معتبر" ہو چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں لارنس اور اس کے ساتھی جب اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر شہر سے گزرے تو ان کا مثالی استقبال ہوا۔ شامی عیسائی اور عرب بلاتخصیص مذہب پُرجوش نعرے لگانے لگے۔ ان پر گھروں کی چھتوں سے پھول نچھاور کیے گئے۔ خواتین کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ گلیوں سے گھوڑے پر سوار گزرتے چھوٹے دستوں پر کھڑکیوں سے عطر اور غازہ چھڑکتیں۔ شریف مکہ اور اس کے اہم عہدیدار ناصر اور نوری، لارنس سے پہلے ہی شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ انہوں نے لارنس کے لیے ایک خوشگوار حیرت کا انتظام کر رکھا تھا۔

ٹاؤن ہال پر عربوں کا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ ترک حکومت کی بلبلاہٹ کا تصور لارنس کے لیے سنسنی خیز تھا۔ تین براعظموں پر تقریباً چھ سو سال تک حکومت کرنے والے اس خانہ بدوش قبیلے کو لگائی گئی یہ چار چوٹ لارنس اور اس کے عربوں کے لیے "وقتِ جشن" تھا۔

اس کامیابی کی خوشی میں اس وقت خلل پڑا جب عبدالقادر نامی عرب نے اپنے دو بھائیوں کے ساتھ دمشق پر قبضے کے بعد اقوام عرب کے نام پر اپنی گورنری کا اعلان کر دیا۔ عبدالقادر نے اس سے قبل بھی اپنی جاسوسی اور دروغ گوئی سے لارنس کے لیے بہت سے مسائل پیدا کیے تھے۔ لارنس اب تمام تر سابقہ چپقلش اور حسابات چکتا کر دینا چاہتا تھا۔ وہ جارح مزاجی سے ٹاؤن ہال کے دفتر میں گھسا اور عبدالقادر کو اس کے حامیوں سمیت گٹھڑی کی صورت میں باندھ کر کھلی ہوئی رائفلوں اور ریوالورز کے سائے میں باہر لے آیا۔ چند ہی لمحوں میں چوک دھماکوں سے گونج اٹھا اور لارنس کے وہ "دشمن" اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

اس کے بعد لارنس نے پانچ گن اور دو درجن بندوق باز متعین کر کے عارضی "شریفی حکومت" کی داغ بیل رکھ دی۔ گزشتہ دو ڈھائی سال کی محنت، لگن اور حکمت عملیاں، پانچ سو میل طویل محاذِ جنگ پر مورچوں کے حملے کی پے در پے جارحی کے بعد ہی ترک حکومت کو یہ ناقابل فراموش ضرب پہنچی تھی۔ اس مہم کے دوران انہوں نے تقریباً پانچ ہزار ترک قتل اور آٹھ ہزار کو قیدی بنایا تھا۔ تین مشین گنیں، پچیس سے تیس توپیں اور تیرہ طیاروں پر قبضہ اس کے علاوہ تھا۔ اس کے مقابلے میں عربوں کی باقاعدہ افواج سے زخمیوں اور ہلاک شدگان کی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔

ترکوں کی فوج بری طرح شکست ہو چکی تھی۔ فتح کا جشن ختم ہوا تو لارنس کی توجہ انتظامی امور و حشیانہ کی طرف مائل ہو گئی۔ اسے عبدالقادر کی بوئی گئی فصل کاٹنا تھی۔ اس کی وجہ سے اکثر مقامی باشندوں کی سوچ میں تذبذب در آیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنی سابقہ نسلی رقابتوں کی طرف مائل ہونے لگے۔ دمشق کی فتح کے بعد قومی مفاد پایۂ تکمیل تک پہنچا تو انہیں اپنی ذاتی نسلی منافرت کی یاد ستانے لگی۔ ان رقابتوں کا بدلہ چکا پانے کی خلش انہیں بے کل کیے ہوئے تھی۔ نتیجتاً دمشق کی گلی گلیاں ایک نئی لڑائی کی آماجگاہ بن گئیں۔ عیسائی، عربوں سے اور عرب، ترکوں سے لڑنے لگے۔ شامی باشندے ان سبھی گروہوں کے خلاف تھے۔ انہوں نے فرانس کی ہمدردی میں ان سبھی افراد کے خلاف محاذ بنا لیا۔

اگلے چوبیس گھنٹے سخت ہولناک تھے۔ دمشق کی گلیاں اکھاڑے کا روپ اختیار کر چکی تھیں۔ لارنس کے لیے یہ صورتِ حال قطعی ناقابل برداشت تھی۔ وہ اپنی اس محنت اور

کامیابی کو کسی "خانہ جنگی" کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا تھا۔ اس دہشت کو کچلنے کے لیے طاقت کا سہارا لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور لارنس نے ایسا ہی کیا۔ اب دمشق کی بستی عبرت ناک حالت میں تھی۔ ہر گلی میں لاشوں کے انبار تھے۔ دوا خانے بھی مُردوں سے بھرے پڑے تھے۔ لارنس کے حکم پر دن بھر مختلف گاڑیاں ان تنگ راستوں سے گزرتیں۔ لاشیں بستی سے باہر کھلے میدانوں میں پہنچانے لگیں۔ دوا خانوں کی حالت شدید ابتر ہوتی جارہی تھی۔ کمروں میں پاؤں دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ لوگ زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے اپنی آخری سانسیں لینے پر مجبور تھے۔ ان دوا خانوں میں طبی عملہ شرمناک حد تک کم تھا۔ صرف دو یا تین ڈاکٹرز کے علاوہ بقیہ ماندہ افراد ترکوں کے ساتھ ہی فرار ہوگئے تھے۔ غذا، اجناس اور پانی مہلک حد تک آلودہ اور ناپاک تھا۔ لارنس نے رضاکاروں کی ایک جماعت کے ساتھ مردے جلانے کا عمل شروع کیا۔ یہ مُردے جو گاڑیوں میں بھر کر ان وسیع اور گہری خندقوں میں پھینک دیے جاتے جو بستی کی شمالی جانب واقع کوہ میں سرعت سے کھودی جارہی تھیں۔ لاشیں اس قدر کثیر تھیں کہ ایک خندق بھرتے ہی دوسری کی فوری کھدائی شروع کرنا پڑتی۔ گندگی اور کوڑا کرکٹ کے ڈھیر ایک الگ سمت میں نذرِ آتش کیے گئے تاکہ متعدی جراثیم کا خطرہ نہ ہوسکے۔ اس کے بعد لارنس نے زخمیوں کے علاج معالجے کے لیے کوششوں کا آغاز کردیا۔

حالات کچھ معمول پر آئے تو تیرہ اکتوبر کو جرنیل ایلن بائے کی دمشق آمد ہوئی۔ ایلن بائے کو برطانوی حکومت سے یکم اکتوبر کو ہی عربوں کے جھنڈا نصب کرنے کا عمل تسلیم کرنے کا اختیار مل گیا تھا۔ ایلن بائے کے بعد اسی روز دن ڈھلے فیصل کی آمد ہوئی۔ لارنس نے اپنے جنگی حلیف کا بہت گرمجوشی سے استقبال تو کیا لیکن اس گرمجوشی اور تپاک میں ایک بے کلی بھی کروٹ لے رہی تھی۔ وہ دونوں ہی جرنیل ایلن بائے کا رویہ سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ انہیں کچھ ایسا تاثر دے رہا تھا گویا اس کامیاب مہم کا حصہ ہونے کے باعث انہیں چند انعامات واکرامات سے نوازنے کا متمنی ہو۔ اس خلش اور بے کلی پر پرکھنے کے لیے لارنس اور فیصل شہر کے دورے پر نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے سب سے پہلے سلطان صلاح الدین ایوبی کے مزار پر حاضری دی۔

سلطان کی تربت دیکھ کر لارنس کی آنکھوں میں سفاک چمک اور ہونٹوں پر تیکھی مسکراہٹ تھی۔ اسے اپنے آباؤ اجداد کی رچرڈ کی فوج میں صلاح الدین ایوبی سے جنگوں میں ہزیمت یاد آنے لگی تھی لیکن اب حالات اور نتائج مختلف تھے۔ اس نے ماضی میں صلیبیوں کے لیے خوفناک خواب ثابت ہونے والے اس جنگجو کی قوم کو عظیم الشان اور تاریخی سبق سکھایا تھا۔ چند سال قبل جرمنی کے ایک حکمران نے اس مقبرے پر جھنڈا نصب کرکے کانسی رنگ کا ایک ہار بھی قبر پر چڑھایا تھا جس پر "ایک زبردست شہنشاہ کی طرف سے دوسرے زبردست شہنشاہ کے لیے" کے الفاظ کندہ تھے۔ لارنس نے وہ جھنڈا اور ہار ہٹائے اور انہیں کوڑا کرکٹ کی طرح روندتا ہوا واپس لوٹ آیا۔

☆☆☆

تیس اکتوبر 1918ء کا دن ترکوں کے لیے یوم سیاہ سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اتحادی افواج کی پیش کردہ شرائط قبول کرلیں۔ اس کے بعد گیارہ نومبر کو التوائے جنگ کا اعلان ہوا تو لارنس انگلستان لوٹ چکا تھا۔ اس کے ذہن میں اب ان وعدوں کی تکمیل کا خیال تھا جس کے خواب فیصل اور عربوں کو دکھائے گئے تھے۔ ان وعدوں کے مطابق اتحادی افواج کی جنگ میں فتح کی صورت میں شمال سے جنوب تک سارا عربستان ایک سلطنت قرار دیا جاتا تھا۔ فتنہ پرور لارنس اور خطرناک حد تک سادہ لوح عربوں کو اس بات کا علم ہی نہ تھا کہ برطانوی حکومت نے درپردہ کیا منصوبے تشکیل دے رکھے ہیں۔ لارنس پر بھی یہ انکشاف جرنیل ایلن بائے اور حکومتی عہدیدار جارج سے ملاقات کے دوران ہوا۔

"یہ تم نے کیا لکھا ہے میجر لارنس؟" ایلن بائے نے اپنی میز پر رکھے کاغذ کے ایک ٹکڑے کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ ایک درخواست ہے۔ سرزمین عرب کا ایک حصہ آزاد کرکے ان عربوں کے حوالے کردیا جائے۔" اس نے متانت سے اپنا مدعا بیان کیا۔

"نہیں...... فی الوقت ایسا ممکن نہیں ہے۔" ایلن بائے نے سر ہلایا۔

"ممکن نہیں ہے...... لیکن کیوں؟" لارنس نے حیرانی سے استفسار کیا۔

"کیونکہ فرانس، برطانیہ، اٹلی اور روس میں ایک معاہدہ طے پایا ہے جس کے تحت عرب سمیت ترک سلطنت کے حصے باہمی طور پر تقسیم کیے جائیں گے۔" جارج نے بے نیازی سے اسے بتایا۔

"یہ صریحاً غلط ہے۔ آخر آپ کو ایسا معاہدہ کرنے کا حق کس نے دیا؟" وہ تڑپ گیا۔

"سیاست کی باریکیاں اور بین الاقوامی تعلقات

عامہ کی اہمیت تم نہیں سمجھ سکتے۔" جارج نے گویا ناک سے مکھی اڑائی۔

"فوج میں سیاست کا کیا عمل دخل؟ سلطنت عثمانیہ کو شکست فوج نے دی ہے۔ آپ سیاست دانوں کا اس میں کوئی کمال نہیں۔" اس نے رکھائی سے کہا۔

"میجر لارنس! تم فوجی آداب فراموش کر رہے ہو۔ کسی فوجی کو ایسی جذباتیت اور اعلیٰ افسران پر نکتہ چینی، ان کے فیصلوں پر اعتراض و بحث زیب نہیں دیتے۔" ایلن بائے نے اسے سختی سے گھرکا۔

"تو کیا وعدہ شکنی اور اپنی مطلب برآری کے بعد مقابل کو دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دینا عسکری اداروں کو زیب دیتا ہے؟" اس نے جوابی چوٹ کی۔

ایلن بائے نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ملاقات کے اختتام کا عندیہ دے دیا۔

عربوں کی بہادری اور تعاون کے صلے میں انہیں حجاز سونپ دینے کا فیصلہ طے شدہ تھا۔ لارنس کے لیے یہ انکشاف کسی ہزیمت سے کم نہ تھا۔ اس کی انا ایک بار پھر مضروب ہوئی۔ 1919ء کی صلح کانفرنس میں فیصل کے بھی خواب چکنا چور ہو گئے۔ اسے واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ برطانیہ کے اپنے "بزرگ تر اتحادیوں" سے کیے گئے وعدے زیادہ اہم ہیں لہٰذا اسے ایک محدود قطعۂ زمین پر ہی اکتفا کرنا ہوگا۔ لارنس کی پیروکیل اور کوشش بھی نقار خانے میں طوطی کی صدا ہی ثابت ہوئی۔ فیصل اس توہین پر بلبلا کر رہ گیا۔

لارنس نے اپنے اس حلیف کی جانب سے ان عالمی سیاست دانوں کے سامنے پُرجوش تقریر کی جس میں شریف اور اس کے بیٹوں کے کارنامے، اتحادی افواج کے لیے ان کی خدمات اور دورانِ جنگ بہادرانہ اقدامات کا احاطہ کرتے وعدوں کی تکمیل پر بھی زور دیا۔ سبھی عہدیدار بے تاثر نظروں اور سپاٹ تاثرات سے یہ تقریر سنتے رہے۔

فیصل بھانپ گیا تھا کہ اس کے ساتھ زبردست دغا بازی کرتے ہوئے ان کے قومی جذبات کا بدترین استحصال کیا گیا ہے۔ عرب سلطنت کے قیام کا خواب ایک خواب ہی رہا تھا۔ اس کی شاکی نظریں اور پتھریلے تاثرات لارنس کے لیے ایک اور تازیانہ ثابت ہوئے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ فیصل اس دھوکے کا ذمے دار اسے بھی گردان رہا ہے۔ لارنس اس سے کیا گیا کوئی بھی پیمان مکمل نہیں کر پایا تھا۔ عین ممکن تھا کہ حجاز لوٹنے پر وہ اسے علی الاعلان دروغ گو اور غدار بھی کہنے لگے۔

لارنس کی کوئی بھی دلیل کام نہ آئی اور "جنگ پاس واری" کے طاقتور ترین حلیف فرانس کو ملک شام سونپ دیا گیا جس کے نتیجے میں اگست 1920ء کو فیصل دمشق سے بے دخل ہو گیا۔ لارنس اپنے جنگ کے دور کے اس ساتھی کی افسردگی اور توہین بے طرح محسوس کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ 1921ء میں فلسطین اور میسوپوٹیمیا پر برطانوی اقتدار قائم ہوا تو ان دنوں لارنس بطور مشیر اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ ونسٹن چرچل کے ان ممالک میں نظم و نسق کے لارنس سے استفسار پر اس نے فیصل کو عراق کا بادشاہ بنانے کی تجویز دی جسے چرچل نے قبول بھی کر لیا۔

اس کے بعد لارنس آکسفورڈ واپس چلا آیا۔ اب اس کی توجہ "بغاوت عرب" کا اولین مسودہ لکھنے پر مرکوز تھی۔ اس کے مزاج میں لاتعلقی اور بے نیازی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اسے اپنی غیر معمولی خدمت کے صلے میں اعلان شدہ انعام کی کوئی طلب تھی نہ ہی کرنل کا عہدہ ملنے کی کوئی خوشی۔ مضطرب انا نے اسے اس قدر بے باک بنا دیا کہ اس نے بادشاہ کے سامنے بھی انعام و اعزاز قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لارنس کی یہ بے نیازی اور سرد مزاجی قومی عہدیداروں کے مزاج پر گراں گزرنے لگی۔ انہوں نے بغاوت عرب کی سرکاری رپورٹوں سے لارنس کا نام حذف کروا دیا۔ ترک افواج کی شکست اور تباہی کا سہرا اعلیٰ عہدیداروں کے سر سجا دیا گیا۔ لارنس نے یہ ہزیمت بھی کڑوے گھونٹ کی طرح خاموشی سے برداشت کر لی۔ وہ اپنی بقیہ زندگی اسی خاموشی اور قدرے گمنامی میں بسر کرنا چاہتا تھا لیکن یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔

انہی دنوں ایک امریکی صحافی "کووینٹ گارڈن تھیٹر" میں عربی اور ترکی لڑائیوں پر مبنی فلمیں دکھانے لگا۔ اس نے عقبہ اور اس کے قرب و جوار میں چند روزہ محنت کے بعد ایک رنگین فلم تیار کی جس میں لارنس کی مہم کو ہی مرکزیت حاصل تھی۔ اس فلم اور لارنس کے کردار نے عوام الناس میں دھوم مچا دی۔ وہ لارنس کی شخصیت کے اسرار اور رومان میں بے طرح مبتلا ہو گئے۔ خود اس کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی تشہیر سے بیزاری اور چڑچڑے پن کا شکار ہو گیا۔ خود کو مصروف تر رکھنے کے لیے وہ 1928ء میں ایک نئے نام "راس" سے بحیثیت سپاہی شاہی ہوائی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ وہ الگ بات تھی کہ اس کی بدسلیقگی اور فوجی نظم و ضبط سے بیزاری تاحال قائم تھی۔

کچھ ماہ گمنامی اور سکون میں بیت گئے اور پھر اگلے برس کے آغاز میں ہی اس کی شناخت ایک بار پھر آشکار

ہوگئی۔ ایک عسکری عہدیدار نے دورانِ جنگ مشرقی خطے میں اپنی خدمات سرانجام دی تھیں۔ وہ لارنس کو دیکھ کر پہلے تو شبے میں مبتلا ہوا پھر دو تین روزہ محنت کے بعد یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ ہوا باز راس نہیں بلکہ بغاوت عرب کا مرکز تھامس ایڈورڈ لارنس ہے۔ اس نے اپنے "قومی ہیرو" کی یہ خفیہ شناخت اخبارات تک بھی پہنچادی۔ نتیجتاً اخبار نویس، نامہ نگار اور فوٹو گرافر "آکس برج چھاؤنی" کے گرد شہد کی مکھیوں کی طرح منڈلانے لگے۔ ہوائی فوج کے اربابِ اقتدار کے لیے یہ صورت حال ناقابلِ برداشت تھی۔ انہوں نے لارنس کی کسی بھی صفائی پر کان نہ دھرے اور احتجاج کے باوجود اسے سبکدوش کردیا۔

اخباری کارروائیوں اور سرگرمیوں سے نالاں لارنس کو اگلے ایک ماہ تک روپوش رہ کر ان سے خلاصی حاصل کرنا پڑی۔ اخبارات کا معاملہ کچھ سرد ہوا تو مارچ میں بری فوج کے عہدیداران نے اسے "ٹینک کور" میں "شا" کی نئی شناخت سے بھرتی کرلیا۔ اب یہاں کسی کو اس کے اصل نام اور کارناموں سے واقفیت نہ تھی۔ فوجی انتظامیہ نے اس سے عہد کیا تھا کہ ٹینک کور میں بلاتعطل دو سال تک کام کے بعد اسے دوبارہ شاہی ہوائی فوج کا حصہ بنادیا جائے گا۔ لارنس کا لاابالی پن "بوونگٹن چھاؤنی" میں ماضی کی طرح بھرپور انداز میں قائم رہا۔ وہ ایسی پریڈ سے بھی غیر حاضر رہتا تھا جو کوارٹر ماسٹر کے بیٹے تک پر لازم ہوتی ہے۔ وہ دن بھر کام کے بعد اپنی موٹر سائیکل پر "اوول" سے ہوتا ہوا نامعلوم منازل کی طرف روانہ ہوجاتا۔ اس کے علاوہ کمرا طعام میں آتا نہ ہی باقاعدگی سے کوئی مقررہ غذا کھایا کرتا۔ وہ اپنی طلب کے مطابق غذا اسی چھاؤنی سے ملحق شہریوں کی کسی بھی کینٹین سے حاصل کرلیتا۔ پھل البتہ اسے بے حد مرغوب تھے۔ لارنس کو اندازہ ہی نہ ہورہا تھا کہ اس کی یہی حرکات ایک بار پھر اسے مرکزِ نگاہ بنانے لگی ہیں۔

یہی بے پروائیاں کم نہ تھیں کہ تنخواہ کی وصولی کے لیے نہ جانے کا معمول ان افواہوں کو مزید تقویت دینے لگا کہ "شا" دراصل کرنل لارنس ہے۔ یہ چہ میگوئیاں جب سپاہیوں کی محفلِ طعام سے عہدیداران کی محفل تک پہنچیں تو نتیجہ ایک بار پھر اس کی سبکدوشی پر ہی منتج ہوا۔

☆☆☆

اس سبکدوشی کے بعد لارنس نے اپنی سرگرمیاں ہی تبدیل کرلیں۔ اس کی توجہ اب تصنیف و مطالعے اور سائیکل رانی کی طرف مرکوز تھی۔ انہی دنوں اس کی شناسائی نامور ناول نگار "تھامس ہارڈی" سے ہوگئی۔ ہارڈی کے توسط سے لارنس کی ملاقات "جارج برنارڈ شا" اور اس کی اہلیہ سے بھی ہوگئی۔ جارج برنارڈ شا اپنے اس ہم نام "شا" سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اگست .... میں وہ ایک بار پھر کسی نہ کسی طرح شاہی فوج تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب اس کی توجہ انجنوں اور مشینوں کی طرف ہوچکی تھی۔ وہ انجن کو تیز رفتار بنانے کے لیے نت نئے تجربات کرنے لگا۔ دن بھر پیشہ ورانہ امور سرانجام دے کر وہ شام کو سنسان سڑکوں پر نہایت تیز رفتاری سے اپنی موٹر سائیکل دوڑاتا۔ انجن کی بلند آواز اور سواری کی گڑگڑاہٹ اس کے لیے نفاتی سرور ثابت ہوا کرتیں۔

اسی برس دسمبر میں لارنس کو کچھ عرصے کے لیے ہندوستان روانہ کرکے کراچی میں تعینات کردیا گیا۔ کراچی آمد کو کچھ ہی وقت بیتا تھا کہ اسے "ہومر" کے ایک ڈرامے کو ترجمے کے قالب میں ڈھالنے کی فرمائش موصول ہوئی۔ اس ترجمے کی اشاعت امریکا میں ہونا تھی۔ لارنس نے یہ ذمے داری اپنے لیے ذاتی توقیر سمجھتے ہوئے ہامی تو بھرلی البتہ ناشر سے ایک شرط بھی عائد کردی کہ ترجمے پر اصل نام ظاہر نہیں کیا جائے گا۔ ناشر نے ہامی بھرلی۔ لارنس نے کراچی اور بعد ازاں ہندوستان کی شمال مغربی سرحد میں قیام کے دوران اس نئی مصروفیت میں خود کو الجھائے رکھا۔ وہ تصنیف و تالیف کے اس کام میں بے حد خوش تھا۔ یہاں سے حاصل ہونے والی رقم موٹر سائیکل کی قیمت اور ڈورسٹ میں رہائش گاہ کے قرض کی ادائیگی میں کافی مددگار ثابت ہوسکتی تھی۔ یہ رہائش گاہ ایک کاٹیج پر مشتمل تھی جو اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام کے سکون و راحت کے لیے خرید رکھا تھا۔

لارنس اپنی ان سرگرمیوں اور مستقبل کے سہانے منصوبوں پر بے حد خوش تھا لیکن اربابِ اقتدار کی ناخوشی تا حال برقرار تھی۔ لارنس کی شناخت کسی بھی طرح خفیہ رہ ہی نہ پاتی تھی۔ اس برس کے اختتام تک برطانوی اور دیگر غیر ملکی اخبارات میں مضامین کی بھرمار ہوچکی تھی کہ لارنس شاہی ہوائی فوج میں سپاہی کی حیثیت سے نہیں بلکہ برطانوی خفیہ اہلکار کے طور پر کسی مہم میں مصروف ہے۔ ان افواہوں اور عہدیداران کی تلملاہٹ سے بے نیاز لارنس نے بغاوت عرب کے احوال پر مشتمل ایک کتاب مکمل کرلی۔ اس کتاب کی اشاعت دھماکا خیز تھی۔ لارنس نے مسودے میں اپنی ذات اور اس بغاوت سے متعلقہ دیگر لوگوں کی غلطیوں کی بالکل پردہ پوشی نہیں کی تھی۔ مصورین نے بھی کتاب کو خوشنما

بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس کے باوجود صرف دو سو جلدوں کی اشاعت ممکن ہو سکی تھی۔ بیس گنا قیمت پر مشتمل یہ جلدیں انفرادی طور پر ہی تقسیم ہوئی تھیں۔

بعدازاں امریکا نے اس کی فروخت میں دلچسپی لیتے ہوئے قیمت میں ہزار ڈالرز اور چار ہزار پاؤنڈز سے زائد مقرر کی۔ اس کتاب کی خفیہ اشاعت کے بعد ''ریگستان میں بغاوت'' نامی ایک اور مختصر ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ پانچ ایڈیشن دھڑا دھڑ فروخت ہوئے۔ لارنس کو طے شدہ رقم ملنے کے بعد بقیہ اثاثے ایک خصوصی فنڈ کے لیے مختص کر دیے گئے جس کا مقصد شاہی ہوائی فوج سے منسلک افراد کی اولاد کو تعلیم دلوانا تھا۔

☆☆☆

لارنس کی ذات سے وابستہ تنازعات میں ہر گزرتا دن مزید اضافہ کر رہا تھا۔ افغانستان اپنی سرحدوں کے قریب اس کی موجودگی سے خاصے تحفظات کا شکار تھا۔ کابل میں مقیم برطانوی سفیر ان سوالات اور افواہوں کا جواب دیتے شدید زچ ہو گیا تھا۔ اس نے حکومت برطانیہ کو خصوصی پیغام بھیج کر اس بات کا مطالبہ کیا کہ ان خبروں کی باضابطہ تردید کی جائے یا ''شا'' کو سرحدی خدمت سے ایک بار پھر سبکدوش کر دیا جائے۔

حکومتی عہدیدار سر جوڑ کر بیٹھنے پر مجبور ہو گئے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ لارنس کی ذات اب دائمی اسرار اور شہرت کا شکار ہو چکی ہے۔ اس کی کوئی بھی شناخت خفیہ رکھنا ناممکن دکھائی دیتی تھی۔ حالات ہر رخ پر اس کے مخالف ہو رہے تھے۔ جنوری 1929ء میں ہندوستان سے روانگی کے بعد وہ اگلے ہی ماہ انگلستان پہنچ گیا۔ دخانی کشتی پر پہنچتے ہی امیر البحر کے دفتر سے ڈونگا روانہ ہوا تاکہ کشتی بردار مسافروں کو ساحل پر اترنے میں آسانی رہے۔ لارنس کی بدقسمتی ہی تھی کہ چند اخباری نمائندوں کی نظروں سے یہ عمل پوشیدہ نہ رہ سکا۔ نتیجتاً اس خبر کو ایک نیا ہی رنگ دے کر ''شا'' اور ''لارنس'' کی ذات کے متعلق خوب افواہیں پھیلائی گئیں۔

جلد ہی نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ برطانیہ کے دارالعوام میں سوالات کا کوہ گراں کھڑا ہو گیا۔ دارالعوام کو ''شا'' کی اصلیت، فوج میں خدمات کی نوعیت، ہندوستان میں تقرری کی وجوہات، حکومت افغانستان کی شکایتیں، ساحل پر پراسرار آمد کے متعلق تسلی بخش جواب درکار تھے۔ اسی دوران کئی اخبارات نے تو ان خدشات کا اظہار بھی کر دیا کہ اصل کرنل لارنس اب بھی ہندوستان میں کسی خفیہ مہم میں مصروف ہے۔ ساحل سمندر پر دانستہ طور پر ایک فرضی لارنس کو لایا گیا ہے تاکہ قومی اداروں کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا سکے۔

لارنس کی زندگی ایک آزار میں مبتلا ہو گئی تھی۔ ہومر کی تصنیف Odyssey کے ترجمے کی قلعی بھی کھل گئی تھی۔ اخبارات میں آئے روز اس کے متعلق کوئی نہ کوئی خبر اور افواہ لازم موجود ہوتی۔ لارنس ان حالات و واقعات سے اس قدر بیزار ہو گیا تھا کہ وہ انگلستان کو ''گپ بازوں کی ایک دکان'' قرار دینے پر مجبور ہو گیا۔ لارنس کو عربستان میں کامیاب مہم کی قیمت قومی سطح پر ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی شہرت اور تنازعات کی صورت میں چکانا پڑ رہی تھی۔ مشرق قریب و بعید کے ممالک اس بات کے لیے تیار ہی نہ تھے کہ ''ہوا باز شا'' ہی کرنل لارنس اور اس وقت انگلستان میں مقیم ہے۔

چین بھی اس بات پر اصرار کرتا کہ لارنس کسی خفیہ مہم پر ہانگ کانگ میں روپوش ہے۔ حکومت برطانیہ کے علی الاعلان اعتراف اور ''سوتھ ہیمپٹن'' میں لارنس عرف شا کی موجودگی کی تصدیق کو بھی چین نے ''برطانوی خفیہ خدمت'' کے محکمے کی متنازعہ سرگرمیوں کی پردہ پوشی کی کوشش قرار دے دیا۔

فروری 1929ء کے بعد لارنس کہیں تو کیا علاقائی حدود سے بھی باہر نہ نکلا تھا۔ اس کے باوجود افواہوں کا یہ عالم تھا کہ مشرق بعید اعلان کرتا لارنس چین میں ہے۔ روس میں شور برپا ہوتا کہ کرنل لارنس ترکستان میں روپوش ہے جہاں وہ اپنی خفیہ سرگرمیوں سے مرکزی سوویت حکومت اور جمہوریہ ترکستان کے تعلقات میں بگاڑ پیدا کرنے پر مامور ہے۔ سوویت حکومت اس کی سرگرمیوں کا جواب طلب کرنے کے لیے شدید دباؤ ڈالے گی۔

ہالینڈ کا موقف بھی سب سے مختلف تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ لارنس اس سال کے آغاز میں ہی ایک ہوائی حادثے کا شکار ہو کر جاں بحق ہو چکا ہے۔ حکومت برطانیہ کے موقف پر یقین کرنے کے لیے کوئی بھی تیار نہ تھا۔

اس دوران لارنس کا تبادلہ شاہی فوج کے کشتیوں کے شعبے میں ہو گیا۔ اسے ساؤتھ ہیمپٹن میں تیار ہونے والی تیز رفتار کشتیوں پر کام کرنا تھا۔ ان دنوں لارنس کے ذہن میں ایک ایسی تیز رفتار کشتی کا خاکہ بھی تھا جس میں غیر معمولی طاقت کے انجن لگا کر انہیں ایسی ساخت میں تبدیل کر دیا جائے جس سے کشتی کا تین چوتھائی حصہ پانی سے باہر ہی رہے۔ اس طرح یہ کشتی پانی کو چیرنے کے بجائے محض سطح

آب کو چھوتے ہوئے گزرتی۔

لارنس کے اس نظریے نے جہازوں کے انجینئرز کی توجہ اپنی جانب مائل کرلیا۔ لارنس کی توجہ بھی اب مکمل طور پر انجنوں کی جانچ پڑتال کی طرف ہو چکی تھی۔ Odyssey کا ترجمہ بھی مکمل ہو گیا۔ لارنس بظاہر بے حد مصروف اور اپنے ماضی کی سرگرمیوں سے بالکل لاتعلق ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود ماضی کی بازگشت اس کا تعاقب ترک کرنے پر تیار نہ تھی۔ 1931ء میں ایشیائے کوچک کے ایک علاقے میں مذہبی فسادات ہوئے۔ تفتیشی اہلکاروں نے اس کا ذمے دار لارنس کو قرار دے کر اخبارات میں بھی یہ تحقیق شائع کروادی۔

اگلے کئی ماہ تک دنیا کے کسی بھی کونے میں ہونے والے فساد کو لارنس کی ذات سے منسوب کیا جاتا رہا۔ جولائی 1932ء میں جرمن لاسلکی اسٹیشن نے برطانوی حکومت پر یہ الزام دھر دیا کہ وہ کرنل لارنس کی مدد سے ان کے خلاف تبت سے ایک خفیہ معاہدہ کررہے ہیں۔

لارنس ان تمام خبروں اور تجزیوں پر اپنا سر پیٹ کر رہ جاتا تو کبھی ہنسی سے مسکرا کر صحرائے حجاز اور ماضی کے ادھورے وعدوں کو یاد کرنے لگتا۔ مارچ 1933ء میں اس نے خود ہی شاہی ہوائی فوج سے سبکدوشی کی درخواست دائر کردی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اعلیٰ عہدیداران نے درخواست التوا کا شکار رکھی۔ لارنس کی مدت ملازمت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور عسکری آئین کے مطابق ذاتی مسائل درخور اعتنا نہ سمجھے جاتے۔

درخواست کی منظوری کے منتظر لارنس نے موٹر سائیکل کی سواری کے تفریحی سلسلے کا آغاز کردیا۔ وہ شعوری کوشش کے تحت عربستان کی یادیں فراموش کرنے کی کوششیں بھی کرتا۔ اگلا ایک سال دبے قدموں بیت گیا۔ اخبارات کی توجہ اس کی ذات سے قدرے کم ہو گئی تھی۔ لارنس کی زندگی بھی ایک مخصوص مدار میں رواں تھی۔ اس کے پاس کئی ذاتی موٹر سائیکلیں تھیں۔ ذمے داریوں سے فراغت کے بعد وہ اپنا تمام تر وقت ڈورسٹ میں واقع کاٹیج میں گزارتا۔ اس کا حلقہ احباب انتہائی محدود تھا۔

انہی دنوں اس نے ایک اور کتاب تصنیف کرنے کا خاکہ بنانا شروع کردیا جس میں وہ فوجی زندگی کا حقیقی عکس واضح کرنا چاہتا تھا۔ اخبارات کی کرم فرمائی کم ہوئی تو عوام بھی اسے دھیرے دھیرے فراموش کرنے لگے۔ ایک طویل عرصے بعد آزادی اور اعصابی سکون محسوس کرتے ہوئے لارنس نے فوج سے علیحدگی کے بعد شب و روز کی منصوبہ بندی کا آغاز کردیا۔

لارنس ..... شاہی ہوائی فوج سے علیحدگی کے بعد ... "کلاؤڈز ہل کاٹیج" میں کچھ عرصہ بسر کرنا چاہتا تھا۔ اب اسے اپنی بقیہ ماندہ زندگی کسی بھی تنازعے، کشمکش اور آزار سے مبرا ہو کر بسر کرنے کی خواہش تھی۔ موت اس کی خواہش پر قریب ہی کھڑی بڑی دلچسپی سے خندہ زن تھی۔

☆☆☆

وہ ماہ مئی کا تیرھواں روز تھا۔ سوموار کے اس مصروف ترین دن لارنس دوپہر سے کچھ ہی دیر پہلے اپنی موٹر سائیکل پر ڈورسٹ میں واقع بووینگٹن کیمپ گیا تھا۔ واپسی پر وہ نہایت ترنگ میں تھا۔ موٹر سائیکل کی رفتار پچاس سے ساٹھ میل فی گھنٹا تھی۔ سڑک پر آگے بڑھتے وہ صحرائے حجاز کے ان ناقابل فراموش مناظر کے تصور اور خیالوں میں گم تھا کہ مخالف سمت سے پہلو بہ پہلو دو سائیکل سوار لڑکے دکھائی ہی نہ دیے۔ لارنس کو خطرے کا احساس ہونے تک بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ موٹر سائیکل پر قابو پانے کی ہر کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ لارنس اپنی ہی سواری کے ہینڈل سے اڑتا ہوا منہ کے بل زمین بوس ہو گیا۔ اسے فوراً اوول کے فوجی دواخانے پہنچایا گیا۔

برطانوی ارباب اقتدار اب ایک نئے آزار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ لارنس کو پیش آنے والا یہ حادثہ پوشیدہ رکھنے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اگلے چند گھنٹوں میں ہی یہ خبر..... سرعت سے پھیل چکی تھی۔ برطانیہ کے بہترین ڈاکٹر، سرجن اور ماہر افراد اس کے علاج پر مامور ہوئے۔

لارنس چار روز تک ان سب کوششوں سے بے خبر ہوش و حواس سے غافل رہا۔ طبی ماہرین متفقہ طور پر یہ تسلیم کررہے تھے کہ لارنس کی غیر معمولی قوت ارادی تھی جو سانسوں کی ڈور سلامت رکھے ہوئے ہے۔ کوئی بھی عام شخص اس شدید حادثے میں فوراً جاں بحق ہو جاتا۔ معالجین کی ہر ممکن اور جدید ترین سہولیات کی فراہمی کے باوجود اس کی حالت میں کوئی بہتری نہ آسکی۔

ہفتے کے دن اور رات بھی اسی کشمکش میں بیت گئے۔ معالجین اب اس کی زندگی سے مایوس ہونے لگے تھے۔ وہ اپنے تجربات اور علم کی بنا پر جان گئے تھے کہ لارنس اب چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ اس کی نازک حالت پر اخبارات میں الگ کھلبلی مچی تھی۔ ہر ایک اخبار کی یہی تمنا تھی کہ اس نابغہ روزگار شخص کے دنیا سے کوچ کی خبر سب سے پہلے اس

کے تو سطے دنیا کو ملے۔

اپنے ان دیرینہ کرم فرماؤں کی بےحسی سے بےخبر لارنس کی دھڑکنیں انیس مئی بروز اتوار صبح آٹھ بجے دل کا مقام ویران کر گئیں۔ اس کی موت کے بعد ہونے والی تحقیقات میں چند نئے پہلو بھی آشکار ہوئے۔ ایک دفعدار نے تفتیش کے دوران بتایا کہ لڑکوں کی سائیکلوں سے ٹکرانے سے پہلے کوئی سیاہ موٹر بھی اس کے ایک جانب سے مخالف سمت میں گزر رہی تھی۔ یہ موٹر ان لڑکوں نے تو نہ دیکھی تھی البتہ دفعدار اس بات کے متعلق اپنے موقف پر قائم ہی رہا۔ لارنس کو دریائے فروم کے کنارے ایک معمولی قبر میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

☆☆☆

لارنس کی تدفین کے کچھ روز بعد سرکاری سطح پر کسی عمومی تقریب کا انعقاد کیا گیا تو اس موقع پر اخباری نمائندے لارنس کے متعلق عسکری اہلکاروں کی رائے جاننے کے لیے وہاں منڈلاتے رہے۔

”جنرل ایلن بائے! کرنل لارنس اور عرب بغاوت کے بارے میں آپ کا کیا موقف ہے؟“ ایک اخباری نمائندہ تجسس سے پوچھنے لگا۔

”عرب کے صحراؤں میں ہونے والی بغاوت نے مشرق وسطیٰ کی سیاست میں تاریخی کردار ادا کیا تھا۔“ اس نے بےنیازی سے جواب دیا۔

”لیکن کرنل لارنس کے بارے میں آپ نے کوئی رائے نہیں دی؟“ نمائندہ مصر ہوا۔

”کیونکہ میں اس سے ذاتی طور پر واقف نہیں۔“ ایلن بائے نے رکھائی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

اسی دوران اخباری نمائندے کی نگاہ جارج بیجلے پر پڑی۔ وہ لپک کر اس کی جانب گیا اور اپنا وہی سوال دہرا دیا۔

”ہاں، میں کرنل لارنس سے کافی حد تک واقف تھا۔ وہ ایک بہترین شاعر، عالم اور ایک بہادر جنگجو تھا۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

نمائندہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آگے بڑھا تو بیجلے دانت پیستے ہوئے اپنے ساتھی سے سرگوشی میں کہنے لگا۔

”کاش..... میں انہیں بتا سکتا کہ وہ کتنا خودسر، آزاد منش اور غیر منظم شخص تھا۔ ان وحشی عربوں کی ہمدردی میں وہ اپنی ہی فوج کے خلاف ہو گیا تھا۔“

”بعض حقائق پوشیدہ ہی رہیں تو بہتر ہیں ورنہ اداروں کی ساکھ داؤ پر لگ جایا کرتی ہے۔“ مائیکل نے مصلحت پسندی سے جواب دیا اور اسی نمائندے کی جانب دیکھنے لگا جو اب جنرل کلے ٹن سے اپنا مخصوص سوال دہرا رہا تھا۔

”کرنل لارنس قاہرہ میں میرے عملے کا ایک معمولی حصہ تھا۔ اس سے زیادہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ کلے ٹن نے سرد مہری سے جواب دیا۔

مائیکل تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا۔ اسے علم تھا کہ لارنس کے انتقال کے بعد صرف شہنشاہ جارج پنجم نے اس کے بھائی کو خراج تحسین پر مبنی ایک خصوصی پیغام ارسال کیا تھا۔

”تمہارے بھائی کا نام تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ بادشاہ شکرگزاری کے جذبات سے تھامس ایڈورڈ لارنس کی قومی خدمات کا معترف ہے۔ لارنس جیسے ذہانت سے بھرپور شخص کے ایسے حسرت ناک انجام پر سخت تاسف ہے۔“

کچھ روز بعد مائیکل خاموشی سے لارنس کی قبر پر گیا اور کتبے پر نظریں جمائے کہنے لگا۔

”آہ لارنس! تم ایک بہترین جنگجو اور مثالی قلم پرور شخص تھے لیکن یہ سیاست تمہاری بھی خوبیاں اور کارنامے نگل گئی۔ تمہاری جدوجہد اور کارنامے دوسروں کی جھولی میں ڈال دیے گئے۔ ایسی ناانصافی اور زیادتی بھی کسی کے ساتھ نہیں ہوئی ہوگی۔ تمہارے ساتھ ہونے والے اس سلوک نے میرے حب الوطنی کے بہت سے بت پاش پاش کر دیے ہیں۔ سیاست کی منافقت اور فریب جھوٹ کے سوا کچھ نہیں اور کم از کم مجھے تو یہی دکھائی دے رہا ہے کہ عظیم برطانیہ کی یہ موجودہ سیاسی روش ہی اسے لے ڈوبے گی۔ برطانوی سلطنت میں سورج بھی غروب ہی نہیں ہوتا کا تفاخر شرمناک خلفشار میں مبتلا ہوتا نظر آنے لگا ہے۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ مشرق میں ”سونے کی چڑیا“ بہت جلد آزادی کی پرواز بھرے گی۔ اس وقت تک جانے زندگی میرا ساتھ دے گی یا نہیں لیکن اگر میں بقید حیات ہوا تو ایک خلش ضرور محسوس کروں گا کہ کاش تم یہ سب دیکھنے کے لیے زندہ ہوتے۔ تمہارے دل میں گڑے خلش کے کانٹے یقیناً بہت فرحت محسوس کرتے۔ کاش..... تم یہ سب دیکھنے کے لیے زندہ رہ جاتے۔“

⌘⌘⌘

ماخذات: لارنس آف عریبیا، ایڈورڈ رابنسن





غلطی

عتیق بخاری

اکثر لاعلمی میں ہم کسی کے بچھائے ہوئے ایک ان دیکھے جال میں قدم رکھ کر خود کو محصور ہو جانے کا موقع خود فراہم کردیتے ہیں اور پھر شور کرکے کبھی قسمت کو اور کبھی حالات کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں... اور نہیں تو ایک دوسرے پر الزام تراشی کرکے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں... لیکن... اپنی غلطی تسلیم کرنے میں ہم عمر گزار دیتے ہیں... ان سب سے بھی یہی غلطی ہو رہی تھی۔

زندگی کو ہارنے والوں اور ایڈونچر کے متوالوں کی نادانیوں کا احوال

سنسان سڑک پر جیپ تیزی سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ رات کا وقت تھا۔ جیپ میں سوار چھ افراد بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ آسمان پر چاند نہ ہونے اور بادل ہونے کی وجہ سے تاریکی معمول سے زیادہ تھی۔

”کیا خیال ہے، سفر ویسا ہی ہے نا جیسا ہم چاہ رہے تھے؟“ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ورشن نے باقی افراد سے سوال کیا۔

”ہاں، کافی حد تک ویسا ہی ہے۔“ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے اینڈریو نے کہا۔

”ڈر تو نہیں لگ رہا؟“ زکی نے مسکراتی آواز میں

پوچھا۔ اس کا مخاطب وہ تینوں لڑکیاں تھیں جو اس کے ساتھ جیپ کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھی تھیں۔

''بالکل نہیں...... بالکل بھی نہیں۔ ہم انجوائے کر رہے ہیں کیونکہ یہ ہماری ہی خواہش تھی۔ تم بے فکر رہو۔'' لیزا کا لہجہ تیکھا سا تھا۔ یعنی اسے پسند نہیں آیا تھا کہ کوئی اس کا مذاق یہ سوچ کر اڑائے کہ وہ لڑکی ہے۔ باقی دو لڑکیوں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ مارٹن، اینڈریو اور رکی تینوں ہنسنے لگے۔

''ٹھیک ہے۔ مت ڈرو لیکن آگے چل کر بھی اسی بہادری پر قائم رہنا۔'' اینڈریو نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم پکا ارادہ کر کے نکلے ہیں۔ ہرگز نہیں گھبرائیں گے۔'' اس بار روزی نے جواب دیا۔ اس نے لیزا کے کندھے پر سر رکھا ہوا تھا اور آنکھیں موندی ہوئی تھیں۔

''دیکھو، چھپانے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی خوف، اندیشہ ستا رہا ہے تو فوراً بتا دو۔ ہم زیادہ دور نہیں نکلے۔ واپسی ہو سکتی ہے۔'' مارٹن نے کہا۔ وہ بھی لڑکیوں کو ہی ستا رہا تھا۔

''گاڑی روکو...... جلدی۔'' ایلس نے تیز لہجے میں کہا۔

مارٹن نے گھبرا کر گاڑی روک دی۔ ''کیا ہوا ایلس، خیریت ہے نا؟'' وہ پیچھے مڑا۔ اینڈریو بھی پیچھے دیکھ رہا تھا۔ رکی، لیزا اور روزی بھی حیران ہی تھیں۔

''ڈراؤنے راستے پر سفر، کم آبادی والی جگہ پر قیام اور چھٹیاں گزارنے کا پلان کس کا تھا...... ذرا بتاؤ؟'' ایلس کے لہجے میں ناراضگی تھی۔

''تو یہ تو چلتی گاڑی میں بھی پوچھا جا سکتا تھا، احمق لڑکی!'' مارٹن منہ بنا کر بولا۔

''دراصل میں تمہارے جبڑے یا گردن پر گھونسا رسید کرنا چاہتی ہوں۔ ظاہر ہے تمہاری ڈرائیونگ کے دوران یہ کرتی تو خطرناک ہوتا اس لیے میں نے تمہیں رک جانے کا کہا۔'' ایلس خراب لہجے میں بولی۔

''چلو، اب اس کے سوال کا جواب دو۔'' روزی نے تینوں لڑکوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ہاں، ہاں...... پتا ہے تم تینوں لڑکیوں، بالخصوص ایلس کا ہی یہ پلان ہے۔'' اینڈریو نے کہا۔

''تو پھر بار بار کیوں الٹے سیدھے سوال کر رہے ہو؟'' ایلس نے رکی کے بال پکڑنا چاہے لیکن اس نے جھکنے سے سر پیچھے کر لیا۔

''اوکے...... اوکے، اب یہ سوال کرنے کا سلسلہ بند اور سفر شروع کرتے ہیں۔'' اینڈریو نے صلح صفائی کے انداز میں کہا۔ مارٹن نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''اینڈریو! اب ہم کتنی دیر بعد جنگل کے راستے پر مڑنے والے ہیں؟'' گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے مارٹن نے ساتھ بیٹھے اینڈریو سے سوال کیا۔

''بس تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ موڑ آنے والا ہے جہاں سے ہم جنگل میں داخل ہو جائیں گے۔'' اینڈریو نے سیل فون کی اسکرین کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ کن رستوں سے جانا ہے اور کہاں پہنچنا ہے، اس کا سارا ذمہ اینڈریو کا تھا اور وہ اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے راہنمائی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد بجلی چمکنے لگی۔ بارش کے آثار نظر آ رہے تھے۔

''جب موڑ مڑنے لگو تو مجھے بتانا...... بلکہ بتانا کیا، ذرا گاڑی روک لینا۔'' ایلس نے کہا۔

''کیوں، کیا پھر کسی کو گھونسا مارنے کا سوچ رہی ہو؟'' رکی نے ہنس کر پوچھا۔

''نہیں، کچھ اور کام ہے۔'' ایلس کہہ کر چپ ہو گئی۔ سب اپنے اپنے دل میں سوچنے لگے کہ پانچ چھ منٹ بعد موڑ پر ایلس کیا کرنے والی ہے۔ گاڑی رک چکی تھی۔

''ایلس! کیا کام ہے تمہیں؟ لو گاڑی روک دی ہے۔'' مارٹن ابھی یہ جملہ بول ہی رہا تھا کہ ایلس نے دروازہ کھولا اور نیچے اتر گئی اور اس سے پہلے کہ کوئی اسے کچھ کہتا، اس راستے پر تیز تیز قدموں سے چلنے لگی جس پر اب انہیں جانا تھا۔

''ارے رکو...... یہ کیا؟''

''ایلس، یہ خطرناک جگہ ہے۔ کیا کر رہی ہو؟''

''پاگل لڑکی! کوئی جانور تم پر حملہ کر سکتا ہے۔'' سب بول رہے تھے لیکن وہ آرام سے آگے بڑھ رہی تھی۔ کچھ آگے جا کر اس نے پیچھے دیکھتے ہوئے انہیں ابھی رکنے کا اشارہ کیا اور خود پھر چلنے لگی۔ مارٹن گاڑی آگے بڑھاتا بڑھاتا رک گیا۔ سب شدید حیران و پریشان تھے۔

''میرا خیال ہے میں اس بے وقوف کو جا کر روکتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ یہ کیا کر رہی ہے۔''

رکی اترنے ہی والا تھا کہ ایلس نے کال ملا دی۔ روزی نے ہیلو کہتے ہی بے تابی سے پوچھا۔ ''کیا کر رہی ہو ایلس! نیچے کیوں اتر گئی ہو اور ہمیں کیوں پیچھے آنے سے روکا ہے؟''

''بس چند منٹ اور رکو۔ ابھی میں تم کو نظر آ رہی ہوں نا؟''

"ہاں...... ہاں لیکن اندھیرے میں گم سی ہوتی دکھائی دے رہی ہو۔"

"جونہی میں مکمل غائب ہو جاؤں، تم گاڑی لے کر میرے پیچھے آ جانا۔"

"کیوں؟ یہ کیا......" "سیل فون آف ہو گیا۔" یہ سن کر سب پریشان ہو گئے کہ ان حالات میں اگر اسے کوئی نقصان پہنچ گیا تو؟

"ہمیں اس کے پیچھے فوراً جانا چاہیے۔" مارٹن نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھائی۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ کیسے وہ احمقوں کی طرح بیٹھا ایلس کو من مانی کرتے دیکھتا رہا۔

"ایلس نظر نہیں آ رہی۔" روزی بُری طرح گھبرا گئی۔

"کال ملاتا ہوں۔" کہہ کر اینڈریو نے سیل فون نکالا ہی تھا کہ انہیں گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں ایلس کھڑی نظر آ گئی۔ ایلس نے ایک درخت سے ٹیک لگائی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی اور وہ بھیگ رہی تھی۔ گاڑی قریب آتے ہی وہ آگے بڑھی اور آرام سے جیپ میں سوار ہو کر یوں بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"یہ کیا احمقانہ حرکت تھی؟" لیز ناراض سی ہو کر بولی۔

"بتاتی ہوں۔" کہہ کر وہ اپنے بالوں سے پانی جھٹکنے لگی۔ سب اس سے اس مختصر سے پیدل سفر کی وجہ جاننا چاہ رہے تھے۔

"ایک لڑکی رات کی تاریکی میں گھنے بادلوں اور بجلی چمکنے جیسے ماحول میں جنگل جس میں درندوں کا خطرہ ہے، میں اکیلی بھی نہیں چل سکتی۔ یہ خیال کیا جاتا ہے۔ میں اس خیال کو غلط ثابت کرنے اور تم لوگوں کو اپنی بے خوفی دکھانے کے لیے یہ سب کر رہی تھی۔" ایلس نے بتایا اور سیٹ سے ٹیک لگا لی۔

"اوہ۔" مارٹن نے گہری سانس لی اور گاڑی چلانے پر توجہ مرکوز کر دی۔ اینڈریو ہلکا سا ہنسا جبکہ رکی اسے گھور رہا تھا۔ لیز اور روزی خاموش بیٹھی تھیں۔

یہ چھ افراد ایک ہی فیملی سے تعلق رکھتے تھے۔ امیر فیملی تھی۔ زندگی میں بے فکری و سکون تھا۔ چھ کے چھ خاندانی بزنس سے جڑے ہوئے تھے۔ ایک روز روٹین لائف سے ہٹ کر چند دن گزارنے کا پروگرام بنایا گیا۔ مارٹن جس کے ذمے بزنس کا کافی کام ہوتا تھا، اس نے یہ تجویز دی تھی کہ سب مل کر کسی اچھی سی پُرسکون جگہ پر جائیں لیکن جائیں کہاں؟ سب اپنی اپنی رائے دینے لگے۔ کسی کو کوئی جگہ پسند تھی اور کسی کو کوئی اور مقام۔ جب کافی دیر کچھ بھی فیصلہ نہ ہو سکا تو اچانک ایلس بولی۔

"میں نے سوچ لیا ہے کہ ہم کہاں جائیں گے۔"

"کہاں؟" سب کو جواب جاننے میں جلدی تھی۔

"میں نے ذرا انوکھا پلان بنایا ہے۔ پلان یہ ہے کہ ہم کسی کم آبادی والے اور دور دراز کے علاقے میں جائیں۔ راستہ سنسان جگہوں، جنگل میں سے گزر کر طے کیا جائے۔ کوشش کی جائے کہ سفر رات کا ہو۔ جیسے لوگ تفریح کو جاتے ہیں۔ ہم ڈرتے ہوئے، ڈر سے لڑتے ہوئے، سنسنی خیز سفر کریں گے تو یہ منفرد تفریح ہوگی۔ سوچو ذرا، رات کا وقت ہے...... خوب تاریکی ہے...... سنسان راستہ ہے اور گھنے جنگل سے گزر رہا ہے۔ درندوں کی آوازیں آ رہی ہیں اور ہم وہاں سے جیپ دوڑاتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ ہے نا انوکھا پروگرام؟" ایلس نے تفصیل بتائی تو تینوں لڑکے ہنس دیے۔

"کافی فضول سا پلان ہے۔" رکی نے کہا۔

"اور لڑکیاں یہ کیسے کر سکتی ہیں۔ تم نے صرف بولا ہے، اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔" اینڈریو نے رکی کا ساتھ دیا۔

"کیوں؟ لڑکیاں کیوں ایسا سفر نہیں کر سکتیں؟ تم ہماری انسلٹ کر رہے ہو۔" لیز کو ہلکا سا غصہ آ گیا۔

"اب تو طے ہو گیا کہ ایلس کے کہنے کے مطابق ہی سیر کی جائے گی۔" روزی نے فیصلہ سنایا۔

کچھ دیر بحث کے بعد ایلس کی بات کو مان لیا گیا۔

اینڈریو نے اپنے ذمے لیا کہ وہ ایسی جگہ کے بارے میں معلوم کرے گا جو ان کے پلان کے مطابق ہو۔ یعنی کم آبادی والی اور مشکل راستوں کے بعد آنے والی۔ اینڈریو نے اپنے ایک دوست کے ذریعے بہ آسانی یہ معلوم کر لیا تھا، ویسے بھی جنگل تو کئی سفروں کے دوران آتے ہیں۔ یہ کوئی مشکل نہیں تھا کہ ایسی جگہ ڈھونڈ لی جائے جو دشوار رستوں سے ملے۔ اینڈریو نے باقاعدہ نقشہ بنا رکھا تھا۔ وہاں قیام کرنے کے لیے رہائش اور لنگ کا بھی انتظام اس کے دوست نے کروا دیا تھا اور اب وہ وہاں جا رہے تھے۔ سفر واقعی ویسا ہی تھا جیسا وہ کرنا چاہ رہے تھے۔ خراب موسم اور رات کی تاریکی میں گھنے جنگل نے اسے سنسنی خیز سا بنا دیا تھا۔ اینڈریو، مارٹن کی راہنمائی کر رہا تھا۔ گاڑی قدرے سست رفتاری سے چل رہی تھی۔ بارش تیز ہو چکی تھی اور ہوا بھی کافی تیز تھی۔ مارٹن ڈرائیو کرتے ہوئے تھوڑا سا گھبرا رہا تھا۔

سب خاموشی سے بیٹھے تھے کہ اچانک ایک بہت بڑا

درخت ٹوٹ کر اپنے سامنے والے درخت پر بڑی خوفناک آواز کے ساتھ گرا۔ جیپ صرف چند فٹ کے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے محفوظ رہی ورنہ اگر وہ اس درخت کے نیچے آ گئی تو اس کے سواروں کا زندہ بچنا مشکل تھا۔ نیم تاریکی و نیم روشنی میں یہ منظر دیکھ کر لڑکیوں کی تو باقاعدہ چیخیں نکل گئیں۔ مارٹن نے ایک دم گاڑی روکی۔ تینوں لڑکے بھی پھٹی پھٹی نظروں سے سامنے دیکھ رہے تھے جہاں سے وہ بال بال بچے تھے۔ سب کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔

''راستہ بند ہو چکا ہے۔ اب آگے بڑھنا ناممکن ہے۔'' اینڈریو آہستگی سے بولا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سب بہت ڈرے ہوئے تھے۔

''میں گاڑی ریورس کر رہا ہوں۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں۔'' مارٹن نے اطلاع دیتے ہوئے گاڑی نہایت آہستگی سے پیچھے کرنا شروع کر دی۔ رکی پچھلے راستے کو غور سے دیکھنے لگا۔ لڑکیاں تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے بیٹھی تھیں۔ کافی مشکل کام تھا ایسے دشوار راستے پر گاڑی کو ریورس میں چلانا لیکن خوش قسمتی یہ تھی کہ ابھی تک رستہ سیدھا تھا۔ کوئی موڑ وغیرہ نہیں تھا اور پھر وہ ابھی زیادہ دور تک نہیں گئے تھے پھر بھی رات کے وقت سڑک تک آتے آتے مارٹن کو داتوں پسینہ آ گیا۔ اس نے گاڑی کو سیدھا کیا اور روک کر اسٹیئرنگ پر سر رکھ دیا۔ اسے تھکن، پریشانی اور ایلس پر غصے نے گھیرا ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے سڑک کے رستے ہی چلتے ہیں۔'' لیزا نے کھڑکی سے باہر تیز بارش کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایلس سے پوچھ لو۔'' مارٹن نے جلے بھنے انداز میں کہا۔ ایلس چپ رہی۔

''اب میں ڈرائیونگ کرتا ہوں۔'' رکی اتر کر ڈرائیونگ سیٹ کے قریب جا کر بولا۔ مارٹن کچھ کہے بغیر پیچھے آ گیا۔ گاڑی چلنے لگی۔ رستہ کافی سنسان تھا۔ لگ رہا تھا وہاں سے کبھی کبھار ہی کوئی گاڑی گزرتی ہو گی یا پھر اس رات موسم کی خرابی کی وجہ سے کوئی ادھر نہیں آیا تھا۔ سڑک بالکل خالی تھی۔ بارش ہو رہی تھی اور بجلی بھی چمک رہی تھی۔ جنگل میں نہ ہونے کے باوجود خوفناک ماحول ہی تھا۔ تاریکی، گرج چمک، صرف ایک گاڑی، دور دور تک کوئی نہیں۔ یہ سب ڈراؤنا پن پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔ مارٹن اونگھ رہا تھا۔ تینوں لڑکیاں باہر کا موسم دیکھ رہی تھیں۔ اینڈریو اور رکی خاموش تھے۔

''درخت نے گر کر سارا معاملہ خراب کر دیا ورنہ جنگل کے رستوں پر سنسنی انجوائے کرتے۔'' اچانک روزی نے خاموشی توڑی۔

''درخت نے گر کر اور تم تینوں نے ملو و چیخ مار کر..... ہے نا؟'' رکی نے مذاق اڑایا۔

''ہاں تو کیا ہوا۔ اچانک ڈور دار آواز سن کر رد عمل دے دیا تو کون سی بڑی بات ہو گئی۔'' لیزا نے برا مناتے ہوئے کہا۔

''یوں کہو نا کہ تم تینوں لڑکے اس خطرناک کام سے گھبرا گئے اس لیے وہاں سے فوراً بھاگے۔ ہم نے تو تم سے نہیں کہا تھا کہ واپس مڑو۔'' ایلس ذرا اونچی آواز میں بولی۔

''تم لوگوں کی وجہ سے میری نیند اور موڈ دونوں خراب ہو رہے ہیں۔ پلیز چپ کر جاؤ اور ایلس! یہ تم ہمیں گھبرا جانے کا کہہ رہی ہو تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ کیا ہم اس طوفانی ماحول اور گرتے درختوں میں سفر کرتے اور سفر بھی کیا..... وہاں ہم یقیناً بری طرح پھنس جاتے۔ ہماری زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ اسے ڈر نہیں، سمجھ داری کہتے ہیں کہ ہم وہاں سے نکل آئے ورنہ.....'' مارٹن نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ غصے میں لگ رہا تھا کہ اسے ناحق بزدل سمجھا جا رہا ہے۔

''ورنہ کیا؟'' ایلس نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''ورنہ..... یہ ہوتا کہ کافی دنوں بعد جب ہماری درخت کے نیچے سے تمہاری لاش ملتی تو سب افسوس کرتے۔ کسی کو یہ پتا تک نہ چلتا کہ ایلس نے بڑی بہادری سے خطرناک رستہ چنا ہے۔'' لیزا اور روزی نے بھر پور ہنسی لی جبکہ ایلس اسے جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے باہر دیکھنے لگی۔

''چلو، اب لڑائی بند کرو اور کوئی اچھی سی بات کرو۔'' اینڈریو نے پیچھے مڑتے ہوئے صلح صفائی کے انداز میں کہا۔

''اور کیا..... ہم لڑنے جھگڑنے نہیں بلکہ سیر و تفریح کے لیے جا رہے ہیں۔'' رکی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سب آپس میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

سفر جنگل یا ایڈونچر سے بھرپور تو نہیں رہا تھا لیکن وہ پھر بھی انجوائے کرنے لگے اور جہاں جا کر ٹھہرنا تھا، اس جگہ کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔

''چلو، ذرا الگ تھلگ پُرسکون جگہ پر رہنے کی خوشی تو مل ہی جائے گی۔'' اینڈریو خوش دلی سے بولا۔

''ہاں، شہر کے ہنگاموں اور کاروباری الجھنوں سے

دورہ یہ تفریحی پروگرام یقیناً ہمیں پرسکون کر دے گا۔'' مارٹن نے کہا۔ بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے غصے میں تھا اور ایلس سے الجھ رہا تھا۔

☆☆☆

''کافی امیر پارٹی ہے جو آ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے ہمیں خوش ہو کر معاوضے سے زیادہ پیسے دے دے اس لیے ہمیں ان کا خوب دھیان رکھنا ہوگا۔'' کارل نے بیوی سے کہا۔

عام سی شکل اور سادہ سی زندگی گزارنے والا کارل اپنی بیوی سے مخاطب تھا۔ اس کے پاس تھوڑے سے جانور اور چھوٹا سا لان تھی کا قطعہ تھا۔ گزر بسر مشکل سے ہو رہی تھی۔ ایک تو زمین کا ٹکڑا بہت چھوٹا تھا دوسرا اس پر پیداوار بھی کچھ خاص نہ تھی۔ وہ اور اس کی بیوی وکٹوریہ کئی اور چھوٹے موٹے کام کرتے تھے تاکہ آمدنی کچھ تو بڑھائی جا سکے لیکن تین بچوں کے ساتھ گزارہ کرنا پھر بھی کافی مشکل ہی تھا۔ چند دن پہلے کارل کو شہر سے اس کے ایک واقف بزنس مین مسٹر پرل کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کارل سے کہا کہ ان کے کچھ دوست اس کے قصبے میں کچھ دن گزارنے آ رہے ہیں۔ ان کے قیام و طعام کا بندوبست کارل کے ذمے لگایا گیا۔ قصبے میں مسٹر پرل کا ایک خاندانی گھر تھا جو خالی پڑا تھا۔ کارل سے کہا گیا کہ اس کی صفائی ستھرائی کروا کر مہمانوں کے رہنے کے قابل بنائے اور جتنے دن وہ رہیں، ان کے لیے وہ اور اس کی بیوی کھانا پکا کر دیں۔

مسٹر پرل نے کافی زیادہ معاوضہ ملنے کی خوشخبری سنائی تھی۔ کارل اور وکٹوریہ فوراً ہی اس گھر میں گئے جہاں مہمانوں نے ٹھہرنا تھا۔ اس کی صفائی کی، بستر، کمبل وغیرہ کا انتظام کیا گیا۔ اب وہ مکان کی دوسری منزل پر موجود تھے۔ وہاں دو کمرے اور ٹیرس تھا جہاں سے قصبے کا بآسانی نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ ٹیرس پر لگی ہوئی ریلنگ ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ کارل اور وکٹوریہ کام سے فارغ ہو کر یہاں بیٹھے تھے۔ دونوں ارد گرد دیکھ رہے تھے۔ کارل کی بات سن کر وکٹوریہ اس کی جانب پوری مڑ گئی۔

''اوہ، اچھا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کافی دولت مند ہیں؟'' وکٹوریہ نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی تھی۔

''ہاں، میں نے مسٹر پرل سے ساری تفصیل معلوم کر لی تھی۔ بہت بڑے کاروباری لوگ ہیں۔ میں نے باتوں باتوں میں یہ بھی معلوم کر لیا کہ کس عمر کے لوگ آ رہے ہیں، کیسی طبیعت کے ہیں، کیا پسند کرتے ہیں؟ وغیرہ ..... تو پتا چلا کہ سب نوجوان ہیں اور صرف سیر و تفریح اور سکون کے لیے یہاں آ رہے ہیں۔ مسٹر پرل بتا رہے تھے کہ وہ لوگ دولت میں کھیلتے ہوئے گھرانے کی پرتعیش زندگی گزارنے کی وجہ سے عام دنیا اور لوگوں کے رہن سہن سے بہت دور ہیں۔ وہ یہاں سکون کے چند دن کے لیے تو آ ہی رہے ہیں، ساتھ ہی ان کا مقصد یہ بھی ہے کہ قصبے کی سادہ سی لائف کو انجوائے کریں۔'' کارل نے پوری تفصیل بتائی تو وکٹوریہ سر ہلانے لگی۔

''تو پھر ٹھیک ہے، ہم دونوں ان کا حد سے زیادہ خیال رکھیں گے۔ انہیں یہاں کی سب جگہیں دیکھنے کا کہیں گے اور خود ہر جگہ لے کر جائیں گے۔ میں ان کو قصبے میں ہونے والے دلچسپ واقعات سناؤں گی۔ یہ کام صفائی ستھرائی اور کھانا پکانے کے علاوہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس زائد کام کے ہمیں پیسے دیں گے جو معاوضے کے علاوہ ہوں گے۔'' اس نے شوہر سے کہا۔ وہ دونوں ضرورت مند تھے اس لیے زیادہ سے زیادہ کمائی کا سوچ رہے تھے۔

دونوں اب نیچے کچن میں آ چکے تھے۔ انہوں نے کچن کے سامان کا جائزہ لیا۔ مسٹر پرل نے کچھ دیر پہلے انہیں بتا دیا تھا کہ مہمان چند گھنٹوں میں پہنچنے والے ہیں۔ وہ دونوں اپنے گھر جانے کے لیے نکل گئے تاکہ جلدی گھر کا کام نمٹا لیں۔ انہوں نے واپس آ کر مہمانوں کا رات کا کھانا بھی تیار کرنا تھا۔

☆☆☆

گاڑی قصبے میں داخل ہوئی۔ اینڈریو ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ شام ہو رہی تھی۔

''ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔'' اس نے اطلاع دی۔ رکی تو اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا، پیچھے بیٹھے مارٹن، لیزا، روزی اور ایلس جو آپس میں باتیں کر رہے تھے، اس کی بات سن کر باہر جھانکنے لگے۔ قصبے میں شام اتر رہی تھی۔ درختوں کے پیچھے سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا۔ ماحول میں پرسکون خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ کچھ فاصلے پر آبادی نظر آ رہی تھی۔

''بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' روزی نے باہر دیکھتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اونچا بول کر پرسکون ماحول کو خراب نہیں کرنا چاہتی۔

''ہاں، واقعی۔'' روزی بھی آہستگی سے بولی۔ وہ بڑی محویت سے غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہی تھی۔

''شہر کی تیز روشنیوں میں سورج اور طرح غروب ہوتا

ہے، ہے نا؟'' ایلس نے مسکراتے ہوئے مارٹن سے کہا۔

''ہاں اور طلوع بھی اور طرح ہوتا ہے۔ ہم بھی دیکھنے تو یہاں آئے ہیں۔'' جواباً مارٹن بھی مسکرایا۔ گاڑی رک چکی تھی۔

''ہمیں لینے ایک آدمی یہاں آئے گا اور ہمیں ہمارے رہنے کی جگہ پر لے جائے گا۔ مسز پرل نے اس کا نام کارل بتایا تھا۔'' اینڈریو نے سیٹ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ وہ اپنا سر مسلنے لگا۔ وہ تھک چکا تھا۔

''تو اسے ہمارے یہاں قصبے میں داخل ہونے کا پتا چل چکا ہوگا؟'' روزی نے پوچھا۔

''ہاں، اسے اطلاع مل گئی ہے۔ بس آتا ہی ہوگا۔'' اینڈریو نے جواب دیا۔

چند منٹ بعد کارل انہیں لینے آ پہنچا۔ رکی بھی جیپ کے پچھلے حصے میں آ چکا تھا کیونکہ اب کارل فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا تاکہ ان کی راہنمائی کر سکے۔ اپنی عارضی قیام گاہ پر پہنچ کر اینڈریو نے فوراً کافی کی فرمائش کی۔ وکٹوریہ نے کافی بنا کر انہیں دی۔ وہ سب ایک ہی کمرے میں بیٹھے کافی پینے لگے۔

''کھانا کتنے بجے چاہیے... میرا مطلب ہے کب تک تیار کر دوں؟'' وکٹوریہ نے بڑے مؤدبانہ انداز میں سوال کیا۔

''ابھی تو ہم ریسٹ کریں گے۔ بہت تھک چکے ہیں۔ کافی طویل سفر تھا پھر تمہیں بتائیں گے۔'' رکی نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ کافی پی کر تازہ دم ہونے کے بجائے وہ آنکھیں بند کر رہا تھا۔ وکٹوریہ نے سر ہلایا اور باہر آ گئی۔

☆☆☆

''واقعی بہت پیسے والے لوگ ہیں۔'' وکٹوریہ نے کارل سے کہا۔ وہ تیزی سے چائے اور بریڈ کا ناشتا کر رہی تھی۔ اس نے ناشتے کے بعد مہمانوں کا ناشتا بنانے کے لیے جانا تھا۔ رات کا کھانا ان لوگوں نے کافی لیٹ کھایا تھا۔ وہ بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے وکٹوریہ سے کہا کہ وہ صبح زیادہ جلدی نہ آئے۔ اینڈریو نے وکٹوریہ اور کارل سے کہا کہ وہ اور اس کے باقی کزنز نیند پوری کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہی بریک فاسٹ لیں گے۔ جب اینڈریو یہ کہہ رہا تھا باقی سب سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔

اب دونوں میاں بیوی وہاں جانے کی تیاری میں تھے جہاں مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔

''ہاں، دیکھو کتنی شاندار گاڑی تھی اور ان کے ڈریسز بھی بہت قیمتی لگ رہے تھے۔'' کارل نے چائے کا کپ خالی کر کے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ سرخ لباس والی لڑکی جس کو روزی کہہ رہے تھے، دیکھا اس نے بُندے کتنے پیارے پہنے تھے۔ یقیناً ہیرے کے تھے۔'' وکٹوریہ نے کارل سے تائید چاہی۔

''ہاں، اتنے امیر لوگ ہیں۔ ہیرے کے ہی ہوں گے۔ میں نے ہیرا دیکھا تو نہیں لیکن اندازہ لگا سکتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔'' کارل نے بوسیدہ سا کوٹ پہنتے ہوئے کہا۔

''اور ان لوگوں کی گھڑیاں، پرفیوم، سب کتنے اعلیٰ لگ رہے تھے۔'' وکٹوریہ نے یوں کہا جیسے اس کے خیالوں میں بس جیولری، گھڑیاں ہی بس گئی ہوں۔ وہ قدیم سے نظر آنے والے آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں برش پھیر رہی تھی۔ بھوری آنکھوں، بھورے بالوں اور متناسب جسم کے ساتھ وہ ٹھیک ٹھاک دکھائی دیتی تھی۔ غربت اور اچھا پہننے کو نہ ہونے کی وجہ سے اس کے خدوخال اور خوبصورتی دب سی گئی تھی۔ جب سے اس نے ایلس، روزی اور لیزا کو دیکھا تھا، اس میں ایک احساس کمتری سا پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا شدت سے جی چاہنے لگا تھا کہ اس کے پاس اچھے لباس ہوں، اچھی اور مہنگی جیولری ہو اور وہ بھی خوبصورت نظر آئے۔ وہ اور تو کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ بس اپنے بالوں کو اچھی طرح سنوار رہی تھی اور کپڑے بھی اس نے اپنی طرف سے سب سے نئے والے پہنے تھے۔

''چلو، اب برش پھیرنا بند کرو۔ ہم نے وہاں کام کرنا ہے۔ تم تو یوں تیار ہو رہی ہو جیسے ہم پارٹی میں جانے والے ہیں۔'' کارل نے اچانک ہی اس کے لباس اور تیاری کو غور سے دیکھا۔

''کیسی تیاری؟ میں تو پھر بھی ان تینوں لڑکیوں سے کم ہی لگ رہی ہوں۔'' وکٹوریہ اداسی آمیز لہجے میں بولی۔

''ارے..... تم اپنا اور ان امیرزادیوں کا موازنہ کر رہی ہو وکٹوریہ! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' کارل بے اختیار ہنسنے لگا۔ وہ اپنی بیوی کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کے دماغی توازن پر شبہ ہو۔

''کیوں..... میں ان سے موازنہ کیوں نہیں کر سکتی؟ میرے نقوش اچھے ہیں، آنکھیں، بال خوبصورت ہیں۔ مجھ پر زائد چربی بھی نہیں چڑھی ہوئی۔ بس لباس مہنگا نہیں اور ہیرے موتی کے زیورات نہیں ہیں ورنہ..... شاید میں ان سے بھی زیادہ خوبصورت لگوں۔'' وکٹوریہ نے آدھی بات تیز لہجے اور آدھی اداسی سے کہی۔

''ارے وکٹوریہ! کیوں پاگل ہو رہی ہو؟ جانتی تو ہو

ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم ان کی طرح امیر ہو جائیں اور ان کی طرح من پسند چیزوں کی شاپنگ کر سکیں۔ تم بس آؤ اور میرے ساتھ چل کر وہ کام کرو جس کا ہمیں معاوضہ ملنا ہے۔'' کارل نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ وکٹوریہ زبردستی مسکرائی۔

☆☆☆

''ناشتا تو تم بہت اچھا بناتی ہو۔'' ایلس نے مزیدار آملیٹ ختم کر کے وکٹوریہ کی تعریف کی۔

''ہاں، بالکل درست کہا تم نے ایلس! بریک فاسٹ کمال کا ہے۔'' روزی نے بھی تائید کی۔

''تو کیا رات کا کھانا اچھا نہیں بنا تھا؟'' وکٹوریہ نے مسکرا کر پوچھا۔ اپنی تعریف سے وہ خوش ہو رہی تھی۔

''وہ بھی بہت اچھا تھا لیکن دراصل ہم تھکے ہوئے اتنے تھے کہ تمہاری تعریف کرنے کی ہمت نہیں تھی۔'' مارٹن نے اپنی خالی پلیٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ وکٹوریہ ان کے ناشتا ختم کرنے کے بعد اب برتن سمیٹ رہی تھی۔ وہ مزید خوش ہو گئی۔

''بات سنو۔'' رکی نے اسے بلایا۔ وہ برتن دھو کر کچن صاف کر چکی تھی۔

''یس سر!'' وکٹوریہ مودبانہ بولی۔ اس نے رکی کو والٹ نکالتے دیکھ لیا تھا۔

''یہ لو، تمہارا ناشتا بنانے کا انعام۔'' رکی نے بڑا سا نوٹ اسے پکڑایا تو وکٹوریہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اس کے والٹ کو غور سے دیکھ رہی تھی جس میں ایسے کئی نوٹ تھے۔

''تھینک یو سر..... تھینک یو۔'' وکٹوریہ نے سر جھکا کر شکریہ ادا کیا۔ کارل کمروں کے بعد اب بیرونی حصے کی صفائی کر رہا تھا۔ وکٹوریہ بھاگ کر اس کے پاس گئی اور ملنے والا انعام دکھایا۔ کارل کو بھی حیران کن خوشی ہوئی۔ مہمان امیر ہونے کے ساتھ ساتھ کشادہ دل بھی تھے۔ وہ اور دلجمعی سے فرش کی رگڑائی کرنے لگا۔ وہ اسے شیشے کی طرح چمکانا چاہتا تھا۔ اسے بیوی کو ملنے والے انعام کے بڑے نوٹ نے مستعد کر دیا تھا۔

''کارل! کام ختم ہو جائے تو تم دونوں گھر چلے جانا۔ ہم ذرا باہر گھومنے جا رہے ہیں۔'' رکی نے کارل کے قریب آ کر کہا۔ وہ آج اس علاقے میں گھومنے پھرنے کے لیے جا رہے تھے۔ قدرتی ماحول والا یہ علاقہ انہیں پرسکون سیر کے لیے بہت پسند آ رہا تھا۔

''اوکے سر! ویسے اس چھوٹے سے قصبے میں اتنا خاص نہیں ہے جسے آپ دیکھیں۔'' کارل نے بڑے شہر سے آنے والوں کے سامنے گویا عاجزی دکھائی۔

''ارے! اس کا چھوٹا ہونا، کم آبادی والا ہونا اور خاص چیز کا نہ ہونا ہی تو ہمارے لیے خاص ہے۔'' مارٹن نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔

''اگر آپ کہیں تو ہم دونوں یا کوئی ایک آپ کے ساتھ چلے؟'' وکٹوریہ نے بڑے اشتیاق سے سوال کیا۔ وہ ان امیر لوگوں کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی تھی۔

''ہاں، ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اگر تمہارے کسی کام کا حرج نہیں ہو رہا تو چلو ہمارے ساتھ۔ اچھا ہے ساتھ کے ساتھ تم ہمیں کچھ معلومات دیتے رہو گے اور گائڈ بھی کرتے رہو گے۔ کیوں بھئی، کیا خیال ہے..... ٹھیک کہا نا میں نے؟'' مارٹن نے ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ سب باہر نکلنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ چلو آؤ، اب چلتے ہیں۔'' ایلس نے کہا۔ وہ کارل کو دیکھ رہی تھی جو نہایت اچھی صفائی کر کے اب ہاتھ دھو رہا تھا۔ چند منٹوں بعد وہ باہر نکل آئے تھے۔ موسم بڑا اچھا تھا۔ کافی دنوں بعد دھوپ نکلی تھی اور ساتھ ہی بادل بھی تھے جو بار بار سورج کو ڈھانپ رہے تھے۔ کارل اور وکٹوریہ انہیں قصبے کی دلچسپ باتیں بتا رہے تھے۔

''اینڈریو! تم نے چھٹیاں گزارنے کے لیے بہت اچھی جگہ ڈھونڈی ہے۔ واقعی میں تو یہاں پہنچتے ہی انجوائے کرنے لگی تھی۔'' روزی نے کشادہ گلی سے گزرتے ہوئے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے اندازہ تو تھا کہ ہمیں یہ جگہ پسند آئے گی لیکن یہ نہیں پتا تھا کہ بہت زیادہ پسند آ جائے گی۔ یہاں گھومنا پھرنا خوشی بھی دے گا اور سکون بھی۔'' اینڈریو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اب وہ آبادی سے ذرا آگے نکل آئے تھے۔ ہلکی پھلکی باتیں کرتے انہوں نے وہ دن گزارا۔ اگلے دن دوسری جگہوں پر جانے کا سوچ کر وہ واپس آ گئے لیکن اگلے دن باہر جانا ممکن نہ رہا۔ تیز بارش نے ان کے ارادوں کے سامنے بریک لگا دی۔ جب بارش رکی تو انہوں نے پہلے تو باہر جانے کا سوچا لیکن سردی کی شدت کو دیکھتے ہوئے آتش دان کے سامنے بیٹھنے اور گپ شپ کرنے کا پلان بنا لیا۔ وکٹوریہ اور کارل ان کا لنچ بنا رہے تھے۔

''تمہیں ناشتے سے خوش ہو کر اور مجھے کل مختلف جگہیں دکھانے پر جس طرح انہوں نے انعام میں پیسے

دیے، اس سے لگ رہا ہے کہ جتنا معاوضہ ہمیں ملا ہے، اتنی ہی تقریباً ہماری انعامی رقم بن جائے گی۔'' کارل نے آہستہ سے کہا۔ اس کے چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی۔

''لگتا ہے خوب پیسہ ہے ان کے پاس اسی لیے تو لٹا رہے ہیں۔'' وکٹوریہ نے اسی کے انداز میں دھیمے سے بات کی۔

''ہوں، پیسہ بھی خوب ہے اور مجھے لگتا ہے یہ اتنے تیز طرار بھی نہیں ہیں جیسے بعض امیر لوگ ہوتے ہیں کہ اپنی دولت کو بچا بچا کر رکھتے ہیں۔ یہ چہرے کے تو بہت بھولے اور معصوم سے لگتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے وکٹوریہ؟'' کارل نے سوچنے کے انداز میں بات کرتے ہوئے بیوی سے سوال کیا۔

''ہاں مجھے بھی ایسا لگتا ہے۔ چلو، اچھا ہی ہے۔ ہمارے لیے تو خوشی کی بات ہے ان کا قدرے سیدھا سادہ ہونا۔'' وکٹوریہ نے پلیٹیں اٹھاتے ہوئے کہا۔ آواز نیچی ہی تھی۔

''میری خواہش ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ دن یہاں ٹھہریں۔'' کارل ٹرے اٹھاتے ہوئے بولا۔ جواباً وکٹوریہ ہلکا سا ہنسی۔ تھوڑی دیر میں وہ مہمانوں کے لیے چائے لا رہے تھے۔

☆☆☆

''کیا خیال ہے، کل باہر نکلنے کا پروگرام بن سکے گا؟'' لیزا نے دونوں ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے باقی سب سے پوچھا۔ وہ سب ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ آتش دان کی وجہ سے کمرے میں پرسکون حرارت تھی۔

''ہاں شاید...... کیونکہ کل بارش یا برف باری کی پیشگوئی نہیں ہے۔'' رکی نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ صوفے پر نیم دراز تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ضرور کل سیر کرنے جائیں۔ وہ چھٹیوں کا ایک دن بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا جو کہ خراب موسم کر رہا تھا۔

''لگتا ہے تم بور ہو گئے ہو کہ آج باہر کیوں نہیں جا سکے۔'' لیزا نے رکی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہم یہاں انجوائے کرنے آئے ہیں، ایک جگہ قید ہونے نہیں۔'' رکی نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

''اگر غور کرو تو یہ بھی انجوائے منٹ ہی ہے کہ ہم شہر سے بہت دور ایک پُرسکون جگہ کے کمرے میں آتش دان کے سامنے بیٹھے بزنس، دنیا داری کے جھنجٹ سے آزاد گپ شپ کرتے ہوئے کھڑکی سے بارش کا نظارہ کر رہے ہیں۔'' اینڈریو نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے گویا سمجھایا۔

''ہاں، یہ تو ہے لیکن پھر بھی مجھے باہر گھومنا پھرنا زیادہ پسند ہے۔'' رکی نے کہا۔

''فکر مت کرو۔ کل کو تمہاری پسند کا کام کرنے کے چانسز نظر آ رہے ہیں۔'' روزی نے ہنستے ہوئے اسے دلاسا دیا۔ کچھ دیر مزید گپ شپ کے بعد وہ سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

☆☆☆

''اچھی طرح سے تیار ہو جاؤ پھر مہمانوں کے لیے ناشتا بنانے کے لیے ادھر چلتے ہیں۔'' کارل نے بیوی کو جگاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب، اچھی طرح تیار ہونے کا؟'' وکٹوریہ نے اٹھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ آج کل تم خوب اچھی طرح تیار ہو کر ہی وہاں جاتی ہو۔'' کارل ہنسا۔ وکٹوریہ خاموشی سے اٹھی اور اپنے کام پر جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ آج مطلع صاف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج مہمان باہر سیر کے لیے نکلیں گے۔ وہ ان کے ساتھ سیر کرنے کی خوشی حاصل کرنے کے لیے تیزی سے تیار ہو رہی تھی۔ مہمانوں کی قیام گاہ پر پہنچ کر دونوں میاں بیوی اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ وکٹوریہ ناشتا بنانے لگی جبکہ کارل نے صفائی کرنا شروع کر دی۔ ناشتے کے بعد وہ سب گاڑی میں بیٹھ گئے۔ کارل نے انہیں چند خوبصورت جگہوں کو دکھانے کا کہا تھا۔

''بس، روک دیں گاڑی۔'' کارل نے مارٹن سے کہا جو گاڑی چلا رہا تھا۔

''کیا وہ جگہ آ گئی؟'' مارٹن نے گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، یہی ہے وہ جگہ جہاں ہم نے پہنچنا تھا۔'' کارل جواب دیتے ہوئے اتر گیا۔ باقی سب بھی گاڑی سے باہر نکل آئے تھے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ بہت سرسبز اور قدرتی مناظر سے بھرپور جگہ تھی۔ وہ جگہ کی خوبصورتی سے انجوائے کرتے ہوئے خوش ہو رہے تھے کہ اچانک کارل رک گیا اور ایک جانب غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

وکٹوریہ نے شوہر کی طرف دیکھا اور اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ ''چلو، یہاں سے۔ یہاں رکنے یا دیکھنے کا کیا فائدہ۔ کون سا ہمیں......'' اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

ایلس قریب آ کر بولی۔ ''تم دونوں رک کیوں گئے، تھک گئے کیا؟''

''نہیں، میں ایک خاص چیز دیکھ رہا تھا۔'' کارل نے

دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا؟" ایلس نے اس سے پوچھا۔ کارل نے بغیر بولے ایک جانب اشارہ کیا۔ ایک بہت خوبصورت عمارت ان سب کے سامنے تھی۔ سب اس جانب مڑ گئے۔ سڑک سے چند ہی میٹر کی دوری پر جدید و حسین اختراع سے بنی ہوئی یہ شاندار عمارت کسی بہت امیر شخص کی رہائش گاہ لگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک فارم بھی تھا جس کی حد کافی دور تک تھی۔

"یہاں کون رہتا ہے؟" روزی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"میرے بڑے بھائی اسٹیفن کی رہائش گاہ ہے یہ اور...... یہ فارم بھی اسی کا ہے۔" کارل نے نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔ سب سن کر حیران رہ گئے کہ غریب کارل کا بھائی اتنا امیر۔

"لگتا ہے تمہارا بھائی کافی دولت مند ہے۔ کیا بزنس ہے اس کا؟" ٹیرا نے پاس موجود ایک کٹے ہوئے تنے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ وہ عمارت کے حسن میں کھوئی ہوئی لگ رہی تھی۔

"وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا ہے۔ یہاں نہیں رہتا۔ وہ شہر میں ہے۔ یہاں کبھی کبھار ہی آتا ہے۔ ملازم ہی گھر اور فارم کی نگرانی پر مامور ہیں۔ کافی دولت مند ہے لیکن یہ گھر اور فارم اس کا خریدا ہوا نہیں۔ خاندانی وراثت کے طور پر ملا ہوا ہے۔ یہ اور کچھ زرعی زمین میرے مرحوم باپ نے چھوڑی تھی۔" کارل نے بتایا تو وہ ایک بار پھر حیرت زدہ ہو گئے۔

"باپ کی وراثت......؟ تو تمہیں اس میں سے حصہ نہیں ملا۔ میرا مطلب ہے کہ تمہاری مالی پوزیشن تو خاصی ابتر ہے۔" اینڈریو نے سب کے چہروں پر لکھا سوال کیا تو کارل دکھی سے انداز میں ہنس دیا۔ وکٹوریہ بڑی حسرت سے شوہر کے بھائی کی رہائش گاہ کو دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، مجھے باپ کی وراثت سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملی۔"

"کیوں؟" رزی نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"ابھی آپ سیر کریں۔ پوری بات واپس جا کر بتاؤں گا۔" کارل نے جواب دیا اور چلنے کے لیے قدم بڑھائے۔ وکٹوریہ نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں بھی چلنے کا اشارہ کیا...... گویا کہہ رہی ہو کہ ابھی اس کے شوہر کے زخم نہ کریدے جائیں۔

☆☆☆

"اسٹیفن میرا بڑا بھائی ہے...... سوتیلا بھائی...... جو مجھ سے اور میری ماں سے ہمیشہ شدید نفرت کرتا رہا۔" کارل نے بات بتانا شروع کی۔ شام کافی گہری ہو چکی تھی۔ آتش دان کی حرارت والے کمرے میں بیٹھے وہ وکٹوریہ کے ہاتھ کی بنی کافی پی رہے تھے۔ وکٹوریہ کارپٹ پر بیٹھی اپنے شوہر کی جانب یوں دیکھ رہی تھی جیسے اسے بھی حقیقت کا اب پتا چلنے والا ہے۔

"میرے باپ نے پہلی بیوی کے مرنے کے بعد اس وقت دوسری شادی کی جب اسٹیفن جوان ہو چکا تھا۔ اس نے سوتیلی ماں اور وہ بھی ایک غریب عورت سے شدید نفرت کا اظہار کیا اور باپ سے کھنچا کھنچا رہنے لگا۔ میں پیدا ہوا، ہوش سنبھالا، اسکول جانے لگا۔ اس سارے عرصے میں اسٹیفن نے مجھ سے کبھی سیدھے منہ بات نہ کی۔ وہ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا تاکہ میری اور میری ماں کی شکل نہ دیکھنا پڑے۔ میں ابھی اسکول میں تھا کہ میرے باپ کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے مرنے کے چند دنوں بعد ہی اسٹیفن نے مجھے اور میری ماں کو گھر سے نکال دیا اور جائیداد کے کاغذات ہمیں دکھائے جن کی رو سے ساری جائیداد، گھر، فارم، زمین صرف اور صرف اسٹیفن کی ملکیت تھی۔ شاید میرے باپ نے بڑے بیٹے کی نفرت کو باپ سے شدید محبت میں بدلنے کے لیے یہ سب کیا تھا کہ دوسری بیوی اور دوسرے بچے کو وراثتی حق سے محروم کر دیا۔ ہم دونوں بے آسرا و خالی ہاتھ گھر چھوڑ کر نکل آئے۔ اس گھر سے جو آج آپ لوگوں نے دیکھا ہے۔ اس کی شکل اس وقت اور طرح تھی۔ بعد میں اسٹیفن نے اس میں کچھ تبدیلیاں کر کے دوبارہ بنوایا اور کچھ عرصے بعد شہر چلا گیا۔ وہاں اس نے کاروبار شروع کر دیا، شادی کی اور وہیں رہنے لگا۔ میری ماں بھی باپ کے انتقال کے چند سال بعد مر گئی اور میں اکیلا اپنے نامساعد حالات سے آج تک لڑ رہا ہوں۔ تعلیم بھی پوری نہ کر سکا اور اب میری مالی پوزیشن کیا ہے یہ آپ کے سامنے ہے۔ میں نے کبھی بھی شہر جا کر بھائی سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کبھی کبھار یہاں کا چکر لگاتا ہے۔ لوگوں کی زبانی پتا چلا ہے کہ اس کا ایک بیٹا بھی ہے جو جوان ہو چکا ہے لیکن اس کی بیوی اور بیٹا کبھی اس قصبے میں نہیں آئے۔ صرف اسٹیفن ہی سال، ڈیڑھ سال میں یہاں آ کر چند دن گزار کر جاتا ہے۔ اس کے آنے کا پتا تک نہیں چلتا۔ بس لوگ بتاتے ہیں کہ اسٹیفن آیا ہوا تھا، اب چلا گیا۔ میں

جب بھی خاندانی گھر کے سامنے سے گزرتا ہوں تو دل میں ایک بار یہ خیال ضرور آتا ہے کہ اس جائداد کے آدھے حصے کا میں حقدار ہوں۔ کبھی باپ کے بارے میں بُرا سوچتا ہوں کہ وہ یہ بھیانک ظلم میرے اور میری ماں کے ساتھ کیوں کر کے گیا اور کبھی یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ میرے سوتیلے بھائی نے خود یہ کاغذات بنوا کر بیمار باپ کے سائن لے لیے ہوں گے۔ ایک طرف اتنی دولت، دوسری طرف محرومیاں ہی محرومیاں۔ میں تو ادھر جاتا ہی نہیں ہوں۔ بس آپ کی خاطر گیا تھا کیونکہ اس جانب زیادہ خوبصورتی اور دیکھنے کی جگہیں ہیں۔'' کارل پوری تفصیل بتا کر چپ ہو گیا۔ باقی لوگ بھی خاموش تھے پھر اینڈریو نے خاموشی توڑی۔

''تو تم نے کوئی کوشش نہیں کی اپنا حق مانگنے یا وصول کرنے کی؟''

''جب یہ سب ہوا، میں بہت چھوٹا اور نا سمجھ تھا اور جب سمجھ دار اور بڑا ہو گیا تو معاملات بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ میں ہر لحاظ سے کمزور انسان تھا، اس سے اپنا حق نہ لے سکتا تھا اس لیے حالات کے ساتھ سمجھوتا کر لیا۔'' کارل نے افسردگی سے جواب دیا۔

''میں رات کے کھانے کی تیاری کے لیے جا رہی ہوں۔'' وکٹوریہ یہ کہہ کر کچن میں چلی گئی۔ وہ شوہر کی بات کے درمیان کچھ بولی بھی نہ بات مکمل ہونے پر کوئی تبصرہ کیا تھا۔ بس چپ چاپ سنتی رہی اور پھر اپنے کام میں لگ گئی۔ کارل بھی اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے کچن میں چلا آیا۔ کمرے میں مہمان گفتگو کرنے لگے۔ ان کا موضوع تھا اسٹیفن، کارل اور دونوں کا معاشی فرق۔

☆☆☆

صبح ہوئی تو موسم نے مہمانوں کو واضح پیغام دیا کہ آج وہ اپنی عارضی قیام گاہ پر ہی قیام کریں۔ وقفے وقفے سے برف باری ہوتی رہی۔ کارل اور وکٹوریہ ناشتا بنانے، سرو کرنے تو آئے لیکن بعد میں آنا ممکن نہ رہا۔ برف باری تیز ہو رہی تھی۔ راستے اَٹ گئے تھے۔ لیزا، روزی اور اینڈریو نے لنچ بنایا جبکہ رکی، مارٹن اور ایلس کے ذمے رات کا کھانا بنانا تھا کیونکہ وہ جان چکے تھے کہ رات کو بھی انہیں خود ہی کام کرنا پڑے گا۔ رات کے کھانے میں مچھلی اور سوپ بنایا گیا۔ سردی کی شدت کو قدرے کم کرنے کے لیے مسلسل آتش دان دہکایا جا رہا تھا۔

''مجھے لگتا ہے جو دو چار چھٹیاں رہ گئی ہیں، وہ برف باری دیکھتے ہی گزریں گی اور یہ ایک خوبصورت بات ہے۔ بڑے عرصے بعد کسی اچھے مقام پر برف باری کا نظارہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔'' مارٹن نے اپنے سامنے رکھے سوپ میں چمچ چلاتے ہوئے کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔

''سچ کہہ رہے ہو۔ مجھے یہ ٹرپ ہمیشہ یاد رہے گا۔ بہت مزہ آ رہا ہے۔'' اپنی پلیٹ میں مچھلی کا ٹکڑا رکھتے ہوئے روزی مسکرائی۔

''تو پھر تم سب میرا شکریہ ادا کرو کہ میں نے یہ پلان بنایا اور یہ مزیدار کھانا بھی۔'' ایلس نے ایک ایک کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے انداز سے کہا۔ سب ہنسنے لگے۔ اچانک دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔

''ارے یہ کون، اس موسم میں؟'' رکی بولا۔ سب چونک گئے۔ ساتھ ہی کارل کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازہ کھولنے کا کہہ رہا تھا۔ حیران حیران سا اینڈریو بیرونی دروازہ کھولنے کے لیے گیا۔ کارل دروازہ کھلتے ہی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے رین کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ اندر آ گیا۔

''کارل! کیا بات ہے، تم کیوں آئے ہو اس خراب موسم میں؟'' اینڈریو اس کے ساتھ چلتے ہوئے سوال کر رہا تھا۔

''آپ کو کسی چیز یا کسی کام کی ضرورت تو نہیں؟'' کارل نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

''نہیں، نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں لیکن یہ تو بتاؤ کیا تم صرف یہ پوچھنے یہاں آئے ہو؟'' رکی بولا۔ برف باری اور برف سے اَٹے راستوں پر چل کر آنا بہت زیادہ دشوار کام تھا۔

''نہیں، میں خصوصی طور پر تو یہاں نہیں آیا۔ دراصل مجھے ایک ضروری کام سے کہیں جانا پڑ گیا تھا۔ اب واپسی پر یہاں سے گزرا تو ویسے ہی خیال آیا کہ آپ کی طرف سے ہوتا چلوں۔ شاید کوئی کام ہو۔'' کارل نے کہا۔

''تمہیں اتنے خراب موسم میں گھر میں ہی ٹھہرنا چاہیے تھا۔'' روزی نے پلیٹیں کچن میں لے جاتے ہوئے کہا۔ آج رات کے برتن دھونا اس کی اور مارٹن کی ذمے داری تھی۔

''جب میں کام کے لیے نکلا تھا تو اس وقت اتنا خراب موسم نہیں تھا۔ یہ تو بس آتے آتے ہو گیا اور جہاں میں گیا تھا، وہاں ٹھہرنا بھی ممکن نہیں تھا۔'' کہتے ہوئے کارل بیٹھ چکا تھا۔

''اگر تم چاہو تو رات یہاں رک سکتے ہو۔'' اینڈریو نے فراخ دلی سے پیشکش کی۔

''نہیں، شکریہ۔ ویسے بھی کون سا اب زیادہ فاصلہ

ہے جو میں نے طے کرنا ہے۔'' کارل نے کہا اور اچانک چونکنے والے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ دروازے پر آہستگی سے دستک ہوئی تھی۔

''میں دیکھتا ہوں، کون ہے۔'' کارل نے کہا اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

''یہ کون ہے جو کارل کی طرح اس موسم میں گھر سے نکل آیا ہے؟'' لیزا نے کہا۔

اسی دوران کارل واپس آچکا تھا۔ ''کوئی نہیں تھا۔ یہ موسم کا شور تھا جو ہمیں دستک لگا۔'' کہہ کر کارل رین کوٹ پہننے لگا جو اس نے آتے ہی اتار کر رکھ دیا تھا۔ کھڑے ہو کر اس نے چند باتیں اور کیں اور ان سے اجازت لیتے ہوئے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

''کارل بھی عجیب آدمی ہے۔ کتنی اہم بات اب بتا کر گیا ہے۔'' اینڈریو بیرونی دروازہ بند کر کے آ کر بولا۔ اس کے چہرے پر پریشانی سی نظر آرہی تھی۔

''کون سی اہم بات؟'' سب کے کان کھڑے ہو گئے۔

''کہہ رہا تھا کہ اس عمارت کی چھت ایک دو جگہ سے کمزور ہے۔ وہاں سے برف جلدی ہٹانا ہو گی ورنہ نقصان کا خدشہ ہے۔ کہنے لگا صبح ہوتے ہی یا رات کے کسی پہر ممکن ہو تو یہ کام کر لینا۔'' اینڈریو نے بتایا تو باقی لوگ بھی پریشان ہو گئے۔

''کہیں زیادہ بھیانک صورت حال کا خدشہ تو نہیں؟'' لیزا گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

''میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔ بس عام سی پرابلم ہو گی۔ اگر زیادہ مسئلہ ہوتا تو پہلے بن چکا ہوتا کیونکہ برف باری تو کئی دن سے ہو رہی ہے۔ بس وہ ایسے ہی بات کر گیا ہے۔ ہمیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں، چیک ضرور کر لیں گے۔'' مارٹن نے تسلی دیتے ہوئے کہا تو سب کا ڈر تھوڑا سا دور ہوا لیکن بے چینی پھر بھی تھی۔ وہ سونے کی کوشش کر رہے تھے لیکن سویا نہیں جا رہا تھا پھر نیند آ ہی گئی۔

صبح ہونے میں تھوڑی ہی دیر تھی کہ روزی کی آنکھ کسی کھٹکے سے کھلی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی جیسے اسے ڈر ہو کہ چھت کا کوئی حصہ ٹوٹ کر اس پر آ گرا ہے۔ اس نے اپنی سانسیں مشکل سے بحال کیں۔ ایلس اور لیزا اپنے اپنے بستر پر سو رہی تھیں۔ روزی کا مزید آرام کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ اپنے لیے کافی بنانے کے لیے کچن کی طرف بڑھی۔ اچانک کسی خیال کے تحت اس نے سیڑھیوں کی جانب قدم بڑھائے۔ آخری سیڑھی پر چڑھ کر وہ کمروں اور باقی چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ اچانک اسے خود پر ہنسی آئی۔ اس نے سوچا میں کیسے پاگلوں کی طرح چھت کا معائنہ کر رہی ہوں۔ کیا برف سے ڈھکی چھت کو غور سے دیکھ کر میں اس کی حالت کے بارے میں کوئی اندازہ لگا سکتی ہوں؟ ڈر نے میری کیا عجیب کیفیت کر دی ہے۔ وہ سر ہلاتے ہوئے اترنے ہی والی تھی کہ اس کی نظر ٹیرس والی سائڈ پر پڑی۔ وہ بری طرح چونکی۔ وہاں کوئی کھڑا تھا۔ ''یہ کون ہے؟'' وہ ڈر گئی کہ کوئی عمارت کے اندر آ کر اوپر کھڑا تھا۔ وہ تیزی سے نیچے آئی اور سب کو جگا دیا۔ رکی، مارٹن، اینڈریو جلدی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر گئے اور ٹیرس کے اس حصے کو دیکھا جہاں واقعی کوئی اس طرح کھڑا تھا کہ اس نے ریلنگ کے ٹوٹے ہوئے حصے کے ایک جانب ٹیک لگائی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ باہر کی طرف تھا یعنی انہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اتنی بے خوفی سے کوئی جگہ پر اسے کھڑے دیکھ کر وہ سب حیران و پریشان تھے۔

''کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اینڈریو نے سخت لہجے میں کہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا۔ آگے سے کوئی جنبش ہوئی نہ کوئی جواب ملا۔ رکی اور مارٹن نے بھی اسے پکارا لیکن وہ اسی پوز میں کھڑا رہا جیسے بہرا ہو گیا ہو۔ تینوں لڑکیاں سیڑھیوں پر کھڑی خوف زدہ سی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

اینڈریو کو غصہ آگیا۔ وہ آگے بڑھا اور اس کے سر پر ڈنڈے سے ضرب لگائی۔ اس نے دھیان رکھا تھا کہ ضرب زیادہ زور دار نہ لگے۔ بس وہ اسے ہلکی سی چوٹ پہنچا کر قابو کرنا چاہتا تھا۔ رکی اور مارٹن بھی اس کے ضرب لگتے ہی چند قدم آگے بڑھے لیکن وہ تینوں دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

اینڈریو کا ڈنڈا پڑتے ہی وہ شخص نیچے کو جھکا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے پکڑتے، وہ جہاں سے ریلنگ ٹوٹی ہوئی تھی، نیچے جا گرا۔ تینوں نے آنکھیں پھیلا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور نیچے جھک کر دیکھا۔ وہ شخص بے حس و حرکت پڑا تھا۔ تینوں بھاگ کر سیڑھیاں اترے اور اس کے پاس پہنچے۔ لیزا، روزی اور ایلس حیران سی ان کے پیچھے آ گئیں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ کیا ہو چکا ہے۔ وہ شخص بالکل بھی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ مارٹن نے اس کے پاس جا کر اسے ہلایا جلایا۔ اس کے ماتھے پر خون تھا۔ مارٹن کا دل دھک سے رہ گیا۔ سب بہ مشکل سانس لیتے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے

تھے۔

"یہ...... زندہ نہیں ہے۔" مارٹن نے کانپتی آواز میں کہا۔ سخت سردی میں بھی اینڈریو کو پسینا آ گیا۔ ڈنڈے کی ضرب اس کے سر پر اسی نے لگائی تھی اور اسی ضرب سے وہ گرا اور گرتے ہی مر گیا۔

تینوں لڑکیاں تقریباً رونے کو ہو گئیں۔ اینڈریو کو رکی نے پکڑ رکھا تھا ورنہ وہ تو گرنے ہی والا تھا۔

"اب...... اب کیا...... کیا کریں گے ہم؟" مارٹن نے خود کو اٹھا کر مشکل سے کھڑا کیا ہوا تھا۔

"اسے اندر لے چلتے ہیں یعنی لاش اندر لے جاتے ہیں پھر سوچتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔" رکی نے خود کو کافی سنبھالا ہوا تھا۔

"یقین کرو، میرا اسے مارنے کا ارادہ نہیں تھا۔ میں تو چور وغیرہ سمجھ کر اسے پکڑنا چاہتا تھا۔ بس ہلکی سی ضرب......" اینڈریو رو دینے کو تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کے سامنے ایک مقتول پڑا تھا اور اسے خود پر قاتل کا ہی گمان ہو رہا تھا۔

"جانتے ہیں ہم...... لیکن یہ وقت ہے کہ تیزی سے کچھ سوچ کر خود کو بچایا جائے ورنہ ہم بہت برے پھنسیں گے اور جب تک یہ موت حادثاتی ثابت ہو گی اور ہمیں جیل سے چھٹکارا ملے گا تب تک ہمارا بزنس ہماری بدنامی کی وجہ سے تباہ ہو جائے گا۔ آؤ، جلدی اسے اٹھائیں۔" رکی نے تیزی سے بولتے ہوئے کہا۔ تینوں لڑکیوں کو ان کے کمرے میں بھیج دیا گیا جہاں وہ ایک بیڈ پر ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے سہمی بیٹھی تھیں۔

"ہمیں پولیس کو اطلاع دے دینی چاہیے۔ ہم نے کون سا قتل کیا ہے۔ کوئی اور منصوبہ بنانے یا چھپ کر بھاگنے کی ضرورت نہیں۔" اینڈریو بولا۔ اس نے اب خود کو سنبھال لیا تھا۔

"پاگل مت بنو۔ ہمیں کچھ اور سوچنا ہو گا ورنہ معاملہ بہت زیادہ بگڑنے کا خدشہ ہے۔" رکی نے کہا۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ اینڈریو اور رکی نے لاش جو ایک نوجوان لڑکے کی تھی، کو بیڈ کے نیچے کیا اور دروازہ بند کر کے مارٹن سے کہا کہ وہ دیکھے باہر کون ہے اور یہ ظاہر کرے کہ ہم سب سو رہے ہیں۔

یہ کارل اور وکٹوریہ کے آنے کا وقت تھا۔ مارٹن سے انہوں نے کہا کہ کسی طرح انہیں واپس بھیج دے تا کہ انہیں پتا نہ چل سکے کہ کیا حادثہ ہو چکا ہے۔ مارٹن کے دروازہ کھولتے ہی کارل اور وکٹوریہ تیزی سے اندر داخل ہونے لگے تو مارٹن نے انہیں روکا۔

"رکو...... آج ناشتا لیٹ کریں گے۔ دراصل رات ہم بہت دیر تک جاگتے رہے اور سب ابھی سو رہے ہیں۔ تم لوگ گھنٹا بھر ٹھہر کر آنا۔" اس نے جلدی سے کہہ کر ان کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو کہ جاؤ اب۔

"ٹھہر کر کیا آنا۔ ہم آ ہی چکے ہیں تو صفائی کر لیتے ہیں اور جب آپ کہیں گے، ناشتا بنا دیں گے۔" وکٹوریہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کارل نے بیوی کی تائید میں سر ہلایا۔

"نہیں نہیں۔ کہا نا ابھی تم جاؤ۔ دراصل ہم ڈسٹرب ہوئے بغیر آرام کرنا چاہتے ہیں۔" مارٹن نے کہا۔ اس کا دل رونے کو کر رہا تھا۔ اس پریشان کن صورت حال پر کارل اور وکٹوریہ واپس جانے کے لیے باہر نکل گئے لیکن ساتھ ہی اچانک کارل مڑا اور مارٹن کو غور سے دیکھا۔

"کیا بات ہے سر! کوئی پریشانی ہے کیا؟" اس نے سوال کیا۔ مارٹن کو اس کی نظریں کھوجتی ہوئی سی لگیں۔

"نہیں...... ایسا کچھ بھی نہیں...... تم کیوں کہہ رہے ہو یہ؟" مارٹن نے کہا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"آپ کے چہرے پر ایسے تاثرات ہیں اس......" وہ بولنے لگا تھا کہ مارٹن نے ذرا غصے سے اس کی بات کاٹ دی۔

"کارل پلیز، اب تم جاؤ۔ کہا تو ہے کہ کچھ دیر بعد آنا۔ جاؤ اور مجھے بھی آرام کرنے دو۔"

"وکٹوریہ! لگتا ہے میرا دوست سچ ہی کہہ رہا تھا۔" کارل نے بیوی کی طرف مڑتے ہوئے کہا اور پھر مارٹن کی طرف دیکھا جو اس کا جملہ سن کر اس پر غور کرنے لگا تھا۔

"مسٹر ووڈ...... آپ برا تو نہیں مانیں گے؟" کارل کچھ کہتے کہتے رک کر بولا۔

"کیا...... کیا کہنا ہے......؟" دل میں چور تھا اس لیے مارٹن گھبرا گیا۔

کارل نے چند سیکنڈ اس کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔ "جب میں اور وکٹوریہ یہاں آ رہے تھے تو میرے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ وہ ابھی ابھی یہاں سے گزر رہا تھا۔ اس نے شہر سے آئے لوگوں یعنی آپ کو اس عمارت کے پچھلی جانب دیکھا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کوئی آدمی برف پر گرا ہوا تھا اور آپ اس کے ارد گرد پریشان کھڑے تھے۔ میں نے اس کی بات کو یوں ہی سمجھا لیکن اب لگ رہا ہے کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ اگر ایسا ہے تو مجھے بتائیں۔ میں کسی مسئلے کی صورت میں آپ کی مدد کر سکتا

ہوں۔“ کارل نے بہت نرمی سے ساری بات کی تو مارٹن نے سر جھکا لیا۔ اس نے اس بدترین حالت میں اس کو اپنے لیے کوئی مددگار سمجھا۔

”دونوں اندر آجاؤ۔ بتاتے ہیں تمہیں کہ کیا ہوا؟“ مارٹن نے کہا۔ اس نے اینڈریو اور رکی کو آواز دے کر باہر آنے کا کہا اور انہیں مختصراً کارل اور اس کے دوست کی بات بتائی۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں، سوائے کارل کے سامنے سارا کچھ کھول کر رکھ دینے کے۔ وہ سب کمرے میں گئے۔ رکی اور مارٹن نے بیڈ کے پیچھے سے لاش باہر نکالی تو کارل اور وکٹوریہ کی حالت غیر ہو گئی۔

”تم نے...... تم...... نے اسے مارا ہے؟“ کارل نے لاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”بتایا تو ہے کہ ہم نے اسے مارا نہیں ہے۔ یہ کھڑا ہی وہاں تھا جہاں سے پھسل کر گرنا ممکن تھا۔ بس ہلکی سی چوٹ پڑی اور وہ مر گیا۔“ اینڈریو نے اسے بتایا لیکن کارل کچھ نہیں بولا۔ وہ لاش کو ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ وکٹوریہ بھی نیچے بیٹھ گئی۔

”کارل! بتاؤ، کیا کریں ہم۔ کیا ہمیں پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے؟ تم ہماری صفائی دو گے نا؟“ رکی نے کارل کا شانہ ہلایا۔ جواب میں کارل جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔ وہ تینوں حیران سے ہو گئے۔ کارل تینوں کو بری طرح گھور رہا تھا۔

”تم نے جسے مارا ہے، جانتے ہو کون ہے؟“ وہ حلق کے بل چیخا۔ ”یہ...... یہ میرا بھتیجا جونی ہے۔“ اس نے آگے بڑھ کر اینڈریو کا کالر پکڑنا چاہا لیکن رکی درمیان میں آ گیا۔

”ارے...... رکو...... کیا کہہ رہے ہو؟ یہ تمہارا بھتیجا ہے؟ دیکھو، ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔ ہم بے قصور ہیں۔“

تینوں لڑکیاں بھی وہاں آ چکی تھیں۔ وکٹوریہ نے مشتعل شوہر کو بمشکل سنبھالا۔ مارٹن نے اور اس نے کارل کو کرسی پر بٹھایا۔

”یہ اسٹیفن کا بیٹا یعنی کارل کا سوتیلا بھتیجا جونی ہے۔ سوتیلا سہی لیکن ہے تو بھتیجا...... اس لیے کارل جذباتی ہو رہا ہے۔“ وکٹوریہ نے افسردگی سے کہا۔ اینڈریو سر تھام کر فرش پر بیٹھ گیا۔

”کارل! سنبھالو اپنے آپ کو اور پھر ہماری پوری بات سنو۔“ مارٹن نے کارل کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ کارل اب سر جھکا کر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”میں نے آج اپنے بھتیجے کو دیکھا...... اور وہ بھی لاش

کی صورت میں۔'' کارل جذباتی انداز میں بول رہا تھا۔
''میں اس کو اس حالت میں دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ یہ سوتیلا ہی سہی لیکن میرا خون ہے...... جوان تھا...... اس کی شادی ہونے والی تھی اور دیکھو کیا ہوا۔'' اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ کمرے میں خوف، ڈر کے بعد اب گہری افسردگی اتر آئی۔

''تو کیا اب تمہارے بھائی سے رابطہ کرنا ہوگا؟ ظاہر ہے......'' رکی بول ہی رہا تھا کہ کارل نے اس کی بات کاٹ دی۔

''نہیں، یہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا بھائی جس ذہن کا ہے، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں تو سمجھ گیا ہوں کیونکہ میں آپ کو اتنے دن سے جان چکا ہوں کہ آپ کیسے لوگ ہیں لیکن وہ ہرگز نہیں سمجھے گا۔ اس کی پہنچ بہت دور تک ہے۔ وہ تم لوگوں کو ڈیتھ سیل تک پہنچا کر دم لے گا۔'' کارل نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تو وہ لوگ لرز گئے اور اینڈریو سکتے میں آ گیا۔ مقتول کے سر پر ڈنڈا اسی کے ہاتھ سے لگا تھا۔

''آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں۔ میں معاملہ سنبھال لوں گا۔'' کارل نے کہا۔ وکٹوریہ شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''تمہارا مطلب ہے ہم بھاگ جائیں؟ لیکن تم معاملہ کیسے سنبھالو گے اور...... کیوں؟'' مارٹن نے شدید حیرت سے بات کرتے ہوئے سب سے اہم سوال کیا۔

کارل نے گہری سانس لیتے ہوئے نوجوان بھتیجے کی لاش کی طرف دیکھا۔

''مجھے یقین آ گیا ہے کہ اس کی موت حادثاتی ہے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ اس معاملے سے دور ہو جائیں اور رہی بات کیوں سنبھال لوں گا تو......'' وہ کچھ دیر رکا۔ وہ چھ کے چھ اس کی طرف سانس روک کے دیکھ رہے تھے۔

''تو صاف اور سیدھی بات کہوں گا کہ...... آپ مجھے اس کی تھوڑی بہت قیمت دے دیں۔'' کارل نے بات مکمل کی تو وہ لوگ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

''یعنی...... تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم تمہیں کچھ رقم دے دیں گے تو تم کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ یہ حادثہ یہاں پیش آیا ہے۔'' اینڈریو اٹھ کر بولا۔ اسے مرتے مرتے زندگی کی خوشخبری مل رہی تھی۔

''آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔ ایسا ہی ہوگا۔ برف باری کی وجہ سے پہلے ہی کافی ثبوت مٹ چکے ہیں اور آج کی ہونے والی برف باری جس کا سو فیصد امکان ہے، بھی ہمارا معاملہ آسان کرنے میں مدد دے گی۔ بس آپ لوگ جلد سے جلد نکلیں تاکہ میں قصبے میں کہہ سکوں کہ آپ یہاں سے جا چکے ہیں۔'' بھاؤ تاؤ کرتا کارل کہیں سے بھی کچھ دیر پہلے والا کارل نہیں لگ رہا تھا۔

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آپ کو اس کا مشورہ مان لینا چاہیے۔'' وکٹوریہ نے آہستگی سے کہا۔

''پلیز، مان لو اس کی بات اور پھر چلیں یہاں سے۔'' لیزا نے روہانسی آواز میں کہا۔

''ہاں، اینڈریو! دیکھو، چند ہی منٹ میں ہم اس بدترین حالت سے نکل جائیں گے۔'' روزی بولی۔ کچھ دیر بات چیت کرنے کے بعد وہ کارل اور وکٹوریہ کو معاملہ سنبھالنے کی قیمت دینے اور وہاں سے رخصت ہونے کے لیے مان گئے۔

''کارل! تمہیں یقین ہے کہ معاملہ دب جائے گا؟'' اینڈریو نے کارل سے یقین دہانی چاہی۔ اسی دوران ایلس کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کچھ دیر پہلے کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے اینڈریو کا جملہ سن لیا تھا۔

''نہیں دبے گا معاملہ...... اور اسے دبنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ......'' ایلس بولتے بولتے رکی اور کارل کی آنکھوں میں دیکھ کر جملہ مکمل کیا۔ ''کیونکہ یہ انسانی جان کا معاملہ ہے...... ہے نا کارل؟''

''ہاں، لیکن...... آپ لوگ بے قصور ہیں اس لیے......'' کارل بولنے لگا اور ساتھ ہی اینڈریو بھی چیخ اٹھا۔

''ایلس! تم اپنی اور ہماری دشمن کیوں بن رہی ہو؟ کیا کہہ رہی ہو، دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟'' اینڈریو نے شدید حیرت و غصے سے ایلس سے کہا۔ سب اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے اس کے دماغ چل جانے یا غدار بن جانے کا شبہ ہو۔ سب معاملہ رفع دفع کروانے میں ہلکان ہو رہے تھے اور وہ بات کو واضح کرنے، دوسرے لفظوں میں حقائق سامنے لا کر سب کو پھنسانے کا سامان کر رہی تھی۔

''میرے کہنے کا مطلب ہے کہ جب ہم نے جونی کا خون کیا ہی نہیں تو ہم چپ چاپ کیوں بھاگیں؟ اس طرح تو ہم واقعی مشکوک ہو جائیں گے۔ کیا جونی کا باپ بیٹے کی لاش لے کر چپ بیٹھا رہے گا؟ نہیں...... بالکل نہیں۔ وہ پولیس کے پاس جائے گا اور پولیس یہاں آئے گی پھر جانتے ہو کیا ہوگا؟ کیونکہ پولیس پاگل تو ہے نہیں اس لیے وہ سوتیلے چچا یعنی مسٹر کارل جو بھائی اور مقتول بھتیجے سے ناراض بھی تھا، کا

یقین کرنے کے بجائے تمام پہلوؤں سے تفتیش کرے گی اور ضرور اس عمارت تک پہنچ جائے گی جہاں سے وہ گر کر مرا ہے اور پھر یہاں سے بھاگ جانے والوں یعنی ہم پر پکا شک ہوگا اور اس کے بعد جو ہوگا، وہ بہت بھیانک و خطرناک ہوگا۔'' ایلس نے اچانک لاش دیکھ کر گھبرانے اور بھاگنے کا سوچنے والوں کے سامنے بات واضح کی تو سب کی آنکھیں کھل گئیں۔

''یہ درست کہہ رہی ہے۔ جو ہم کرنے کا سوچ رہے ہیں، وہ واقعی غلط ہے۔'' اینڈریو سب سے پہلے بولا پھر اچانک تھوڑا سا گھبرا گیا۔ ''لیکن اس کے سر پر ڈنڈا تو میں نے ہی مارا ہے۔ کیا پولیس میری نیت کا یقین کرے گی اور جونی کا باپ مجھے معاف کر دے گا؟''

''ہاں تو..... میں کہہ تو رہا ہوں کہ.....'' کارل کو انہیں یہاں سے بھگانے کی بہت جلدی تھی۔

''تمہیں کیوں ہمیں بچانے میں اتنی دلچسپی ہے؟'' ایلس نے بڑے دھیمے لہجے میں کارل کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔ سب ایلس کو حیرانی و پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔

''میں صرف آپ کے اچھے اور مجرم نہ ہونے کی وجہ سے آپ لوگوں کا ساتھ دے رہا ہوں اور اس کی تھوڑی سی قیمت لے رہا ہوں۔ اس میں غلط کیا ہے؟'' کارل نے گویا اسے سمجھایا۔

''غلط کا تو چھوڑو..... تم نے ایک بہت بڑی غلطی کی ہے کارل!'' ایلس نے بڑے آرام سے کہا۔

''غلطی..... کون سی غلطی؟ کیا مطلب، میں سمجھا نہیں۔'' کارل کرسی سے اٹھا اور جونی کے مُردہ وجود کو غور سے دیکھا۔ وکٹوریہ فرش پر جونی کی لاش کے پاس افسردہ تاثرات کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کا شوہر اور دوسرے لوگ ڈیڈ باڈی کو نظر انداز کر کے اپنی اپنی بات کر رہے تھے لیکن وہ خاموش و قدرے دل گرفتہ شوہر کے بھتیجے کا سوگ منا رہی تھی۔

''جونی کی..... ڈیڈ باڈی کو غور سے کیوں دیکھ رہے ہو..... اس لیے کہ جو تم نے غلطی کی ہے، اس کا کوئی نشان ہے یہاں۔'' ایلس کا لہجہ اب واضح بدل گیا تھا جسے کارل کے علاوہ ایلس کے ساتھیوں نے بھی محسوس کیا۔

''ایلس! کارل کی کس غلطی کی بات کر رہی ہو؟ بتاؤ۔'' کارل کے کچھ بولنے سے پہلے اینڈریو نے بڑی تیزی سے پوچھا۔

''کارل نے یہ غلطی کی ہے کہ بڑا کمزور سا ڈراما بنایا جو فلاپ ہو چکا ہے۔'' ایلس نے گویا دھماکا کیا۔ کارل کے چہرے پر پریشانی تو پہلے ہی ایلس کے جملوں کی وجہ سے چھلک رہی تھی۔ اب تو زلزلے کے تاثرات پیدا ہو گئے۔

''کون سا ڈراما؟ ایلس! جلدی بتاؤ۔'' رکی غرایا اور قہر آلود نظروں سے کارل کی طرف دیکھا۔ بات سب کو سمجھ میں آنے لگی۔ تینوں لڑکے چوکنے ہو کر کارل اور وکٹوریہ کو دیکھ رہے تھے کہ کہیں بھاگنے کی کوشش کریں تو انہیں پکڑا جا سکے۔

''جونی کی موت حادثاتی نہیں ہے بلکہ اس کا واقعی قتل ہوا ہے اور قاتل ہے..... کارل!'' ایلس نے جونہی کہا، وکٹوریہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''تم کیسے کہہ سکتی ہو یہ..... کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟'' وہ غصے سے بولی۔ کہیں سے بھی وہ احترام یا خدمت کرنے والی وکٹوریہ نہیں لگ رہی تھی۔ لیزا اور روزی حیرت سے منہ پھاڑے ساری صورت حال دیکھ رہی تھیں۔

''جونی کو قتل کرنے کا خود کارل نے بتایا ہے۔'' ایلس پھر بولی تو کارل نے دروازے کے قریب کھڑے ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تیزی سے بھاگنے کی کوشش کی۔ اسے وکٹوریہ کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔ وہ بس خود کو بچا کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن اس کی کوشش ناکام رہی۔ اینڈریو اور رکی نے بڑی آسانی سے اسے پکڑ لیا کیونکہ وہ اس کام کے لیے پہلے سے تیار تھے۔ مارٹن اور تینوں لڑکیوں کے لیے اکیلی وکٹوریہ کو قابو کرنا ہرگز مشکل نہیں تھا۔ ان دونوں کو دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ دونوں رسیوں سے بندھے ان کو بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔

''ایلس! کیا کہہ رہی تھیں تم کہ کارل نے خود بتایا ہے کہ اس نے قتل کیا ہے۔'' رکی نے پوچھا۔ وہ سب ایک ہی کمرے میں تھے۔ بیرونی دروازہ بند کر دیا گیا تھا اور طے ہوا تھا کہ پولیس کو اطلاع دینے سے پہلے خود کارل سے ذرا بات کی جائے جو انہیں زبردستی قاتل بنا کر رقم اینٹھنا چاہتا تھا۔

''یاد ہے نا، کارل نے کہا تھا کہ اس نے اپنے بھائی کی بیوی اور بیٹے کو کبھی نہیں دیکھا تو پھر اس نے لاش کو دیکھتے ہی کیسے پہچان لیا کہ یہ ان کا بھتیجا ہے اور اس کا نام جونی ہے؟'' ایلس نے بڑے پتے کی بات کی۔

''اوہ.....!'' سب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''پھر اس نے لاش کے پاس بیٹھتے ہی کہا تھا کہ آج

پہلی بار بھتیجے کو دیکھ رہا ہوں، وہ بھی لاش کی صورت میں۔ کیا اسے ڈیڈ باڈی نے یا ہم نے بتایا تھا کہ یہ اس کا بھتیجا جونی ہے جسے وہ پہلی بار دیکھنے والا ہے؟ جس سے یہ بھی ملا نہیں، ان کی ساری باتوں کا اسے کیسے علم ہوا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ اس کی شادی ہونے والی تھی پھر مسٹر کارل نے یہ بھی کہا کہ برف باری کی وجہ سے پہلے ہی کافی ثبوت مٹ چکے ہیں...... تو ہمیں یہ کہہ دینا چاہیے کہ اپنے جملوں، لفظوں کے ذریعے کارل نے ہمیں خود ہی بتا دیا کہ اپنے سوتیلے بھائی کے بیٹے جونی کو قتل کیا ہے۔'' ایلس نے اینڈریو اور باقی سب کو معیت سے نکالنے کے لیے بہت کم وقت میں خوب حاضر دماغی دکھائی تھی۔ سب حیران و خوش تھے۔

''اب تمہاری باری ہے فراڈ انسان! تم پوری بات بتاؤ کہ یہ سب کیوں کیا اور ہمیں کیوں پھنسانے کی کوشش کی؟'' زکی نے آگے بڑھ کر بڑھتے ہوئے کارل کو ایک زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے طیش لہجے میں کہا۔ اسے شدید غصہ آرہا تھا کہ کیسے اکیلے ڈرا کر کارل نے ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ختم کر دیا تھا اور وہ خود کو مجرم سمجھتے ہوئے اسے رقم دینے اور بھاگنے پر آمادہ ہو چکے تھے۔ کارل خاموش رہا۔ وکٹوریہ اب کانپ رہی تھی۔ کارل کی خاموشی پر مشتعل ہو کر مارٹن اس کے قریب گیا اور منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔

''جلدی بولنا شروع کر دو۔ پولیس تو تمہارے منہ سے سب کچھ اگلوائے گی ہی لیکن میں چاہتا ہوں کہ پہلے تم ہمیں ہی بتا دو کہ ہمارے ساتھ یہ کیا کرنے جا رہے تھے؟'' وہ اسے بالوں سے پکڑ کر پوچھ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ ایک چاقو لا کر اس سے تفتیش کی جائے۔ اس کا ایک کان کاٹا جائے۔ اس کے بعد بھی نہ بولے تو دوسرا کان پھر......'' روزی قہر آلود لہجے میں بولی۔

''درست کہہ رہی ہو تم۔ ہم اس سے اس طرح تفتیش کر سکتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس وحشی، قاتل، فراڈ انسان کے ساتھ جو بھی ہو جائے، ہمیں کچھ نہیں کہا جائے گا کیونکہ یہ اسی چیز کا مستحق ہے۔'' لیزا نے ہاں میں ہاں ملائی۔ قاتل کا پتا چل جانے اور اپنی جان چھوٹ جانے نے اسے بہادر بنا دیا تھا اور وہ اب کارل کو بھیانک سزا دینے کا کہہ رہی تھی۔ ایلس واقعی کچن سے چاقو لے آئی تھی۔

''نہیں...... نہیں، کچھ مت کرنا۔ میں...... میں بتاتا ہوں۔ یہ...... یہ سب اس وکٹوریہ کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس لالچی عورت نے مجھے پھنسوا دیا۔ میں ساری بات بتا دیتا ہوں۔ پلیز، یہ چاقو تو دور رکھو۔'' ایلس اور اینڈریو کے اس کے بالکل قریب بیٹھتے اور ایلس کے اینڈریو کو چاقو تھماتے ہی وہ گڑگڑانے لگا۔

''بولو جلدی۔'' زکی غرایا۔

''جس دن سے آپ آئے تھے، وکٹوریہ آپ لوگوں کی جیولری، قیمتی گھڑیاں، مہنگے لباس کو دیکھ دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو رہی تھی۔ یہ ہر روز اپنے معاشی حالات پر کڑھنے لگی تھی۔ انہی دنوں یہ میرے بڑے بھائی اسٹیفن کے خلاف بھی کچھ زیادہ ہی بولنے لگی۔ یہ اکثر کہتی کہ اگر ساری جائیداد اکیلا اسٹیفن ہڑپ نہ کرتا تو آج ہم بھی عیش کی زندگی گزار رہے ہوتے۔ یہ آپ لوگوں سے زیادہ سے زیادہ رقم اینٹھنے کے چکر میں زیادہ کام کرتی کیونکہ آپ اکثر اسے خوش ہو کر پیسے دیتے تھے پھر بھی یہ خوش ہونے کے بجائے میرے سوتیلے بھائی کو برا بھلا کہتی رہتی تھی کہ کیسے اس کے ظلم کی وجہ سے ہم لوگوں کی خدمتیں کر رہے ہیں۔ اس کی باتیں سن سن کر میرا بھی دماغ کافی غلط سوچنے لگا تھا۔ پھر کل صبح اچانک غیر متوقع طور پر میرے گھر جونی آ گیا۔ یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ وہ پہلی بار یہاں آیا تو اسے چچا سے ملنے کا شوق ہوا۔ وہ لوگوں سے میرا پتا پوچھتا ہوا میرے گھر تک پہنچا تھا۔ وہ بہت معصوم اور سیدھا سا نوجوان تھا۔ کہنے لگا کہ میں آبائی گھر اور زمین وغیرہ دیکھنے کے لیے آیا ہوں۔ دو تین دن رہ کر چلا جاؤں گا۔ سوچا چچا سے ملوں۔ آپ کے بارے میں تھوڑا بہت سنا تھا اس لیے ملنا چاہتا تھا کہ آپ کیسے ہیں اور میرے باپ کے ساتھ کیا اختلاف ہیں۔ یعنی اس کے باپ نے اسے میرے اور اپنے درمیان ناراضی کی وجہ نہیں بتائی تھی۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا تو وکٹوریہ نے مجھے ایک شیطانی منصوبے پر عمل کرنے کا کہا۔ منصوبہ یہ تھا کہ جونی کو قتل کر دیا جائے تاکہ ہمیں مفلسی دینے والے اس کے باپ کو دکھ دے کر بدلہ لیا جا سکے اور ساتھ ہی اس نے آپ سے بھاری رقم حاصل کرنے کا پلان بنایا۔ اس نے کہا کہ وہ لوگ زیادہ تر نچلی منزل پر ہی رہتے ہیں۔ اگر کسی طرح جونی کو مار کر اس کی لاش چھت پر پہنچا دی جائے اور ان پر قتل کا الزام لگا دیا جائے تو وہ ڈر کر ہماری بات ضرور سنیں اور مانیں گے۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ لوگ زیادہ تیز طرار نہیں ہیں اس لیے کوئی سمجھ داری دکھائے بغیر ہمارے مطالبات پورے کر کے بھاگ جائیں گے۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ میں نے جونی کو رات

کے کھانے پر بلایا اور جب وہ بے خبری میں ہمارے گھر کے کمرے میں آرام سے بیٹھا تھا، میں نے اس کے سر پر زوردار ضرب لگا کر اسے ختم کر دیا پھر میں اپنے ایک دوست جسے میں نے اپنے منصوبے میں شامل کیا تھا، کی مدد سے اس کی ڈیڈ باڈی کو یہاں لایا۔ آپ سے بہانہ کر کے باتیں کرنے لگا پھر جونہی میرے دوست نے آہستہ سے دستک دی جیسا کہ میں نے اسے کہا تھا کہ اس کے دستک دیتے ہی میں آؤں گا، بس وہ آواز ذرا اونچی رکھے تاکہ ہوا یا بارش کے شور کا بہانہ کیا جا سکے۔ ایسا ہی ہوا اور میں دروازہ کھول کر آ گیا۔ دبے پاؤں جونی کی ڈیڈ باڈی کو اس نے جیسے میں نے کہا تھا، ٹوٹی ریلنگ والے حصے کے ساتھ کھڑا کر دیا اور تیزی سے واپس چلا گیا۔ پھر میں نے آپ کو چھت کے کمزور ہونے کا اسی لیے کہا تھا کہ آپ میں سے ضرور کوئی چھت پر جائے اور پھر حیران ہو کر کسی انجانی کو دیکھے۔ اسے متوجہ کرنے کے لیے پاس جائے پھر ڈیڈ باڈی وہاں سے گر جائے کیونکہ وہ رکھی ہی اس پوزیشن پر گئی کہ ہلکا سا ہاتھ ہی اسے گرانے کے لیے کافی تھا اور اگر وہ باہر بھی گرتا اور چھت پر گرتا تب بھی ہم آپ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر... اپنا مطلب نکال سکتے تھے۔ سب کچھ پلان کے مطابق ہوا۔ جونی گرا اور آپ کی نظر میں مر گیا پھر میں اور وکٹوریہ آ گئے اور آپ رقم دینے پر بھی آمادہ ہو گئے۔ آپ اتنا خوفزدہ ہو گئے کہ یہ بھی نہ سوچا کہ قتل کا معاملہ اتنی آسانی سے ختم ہو جائے گا؟ ہم نے سوچا تھا کہ بس ایک دفعہ دشمن کو ختم اور آپ سے رقم لے لیں یا رقم نہ ہونے کی صورت میں جیولری وغیرہ ہمیں دے جائیں۔ اس کے بعد آپ کے پیچھے پولیس آئے یا اسٹیفن، ہمیں کوئی سروکار نہیں ہوتا کیونکہ ہمارے مقاصد تو پورے ہو گئے تھے لیکن پھر.....'' لرزہ خیز پلان اور اس پر عمل کا بتا کر کارل چپ ہو گیا کیونکہ آگے اب اس کی زندگی میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کمرے میں چند ثانیوں کے لیے گہری خاموشی چھا گئی۔

''تم نے واقعی ہمیں ڈرا دیا تھا گھٹیا انسان! ہم نے تو اس بات پر بھی غور نہ کیا کہ ایک آدمی چھت پر کیسے آیا۔ دروازہ بند تھا۔ اس کے باوجود وہ عمارت کے اندر آیا اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر جا کھڑا ہوا۔ تم یقیناً مجرم ذہنیت کے ہی تھے اور یہ تمہاری بیوی تمہاری شریک جرم بلکہ کہنا چاہیے کہ اس واردات کی ماسٹر مائنڈ۔ لالچی وکٹوریہ بھی ایسی ہی ہے اس لیے بڑا منصوبہ بنایا لیکن قدرت نے ہماری مدد کی کہ تم نے کمزور ڈراما بنایا۔'' مارٹن نے نفرت سے دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ کارل نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں اور وکٹوریہ زاروقطار رو رہی تھی۔

''اور قدرت نے حقائق سامنے لانے کے لیے مجھے استعمال کیا۔'' ایلس نے اینڈریو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے سکون سے کہا۔ اینڈریو بھی پُرسکون مسکراہٹ سجائے کھڑا تھا۔ لاؤنج میں آ کر کارل اور وکٹوریہ اپنی زندگی پر بار کر بیٹھے تھے۔ اب جیل کی سلاخیں ان کا مقدر بن چکی تھیں۔ اینڈریو نے مسٹر پرل کا نمبر ملایا تاکہ ان کی مدد سے اسٹیفن اور پولیس سے رابطہ کیا جا سکے۔

☆☆☆

قصبے سے نکل کر گاڑی شہر کی جانب جا رہی تھی۔ سب خاموش بیٹھے گزری صورتحال پر غور کر رہے تھے۔

''تھینک گاڈ! ہم آرام سے وہاں سے نکل آئے۔ ایلس! تمہارا شکریہ، تم نے بہت عقل سے کام لیا۔'' ڈرائیونگ کرتے رکی نے خاموشی کو توڑتے ہوئے ایلس کا شکریہ ادا کیا تو وہ مسکرا دی۔

''ایلس نے اگر ہمیں بچایا ہے تو پھنسایا بھی تو اسی نے تھا۔ جیل کی ایڈونچر بھری سیر کرنے اور ہماری غلطی کہ ہم نے اس کی بات مان لی۔'' مارٹن نے کہا۔ وہ ایلس کو باقاعدہ گھور رہا تھا۔

''تم لوگوں نے میری بات ماننے کی غلطی کی اور..... مسٹر کارل اور وکٹوریہ نے کمزور پلان بنانے کی غلطی کی۔ دیکھو ذرا میں نے کیا، کیا..... تمہاری ایڈونچر بھری سیر بھی کروا دی اور ان لوگوں کا منصوبہ بھی ناکام کر کے انہیں پکڑوا دیا۔ یقین میں کہیں پہ بھی غلط نہیں رہی۔ کیوں، کیا خیال ہے؟'' اس نے روزی اور لیزا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، سچ بات ہے۔ ایڈونچر تو بھرپور رہا۔ بہت سنسنی خیز اور منفرد چھٹیاں گزار کر آ رہے ہیں ہم۔'' روزی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اور اگر اینڈریو جیل جاتا تو.....؟'' مارٹن نے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں لیکن لڑائی کرنے کے موڈ میں تھا۔

''اینڈریو کبھی جیل نہ جاتا کیونکہ قدرت ہماری مدد کر رہی تھی اور میں سمجھداری سے معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی۔'' ایلس نے کہا۔ وہ خود کو بہت بڑی چیز سمجھنے لگی تھی۔ قتل کا معما جو حل کیا تھا۔

⌘⌘⌘

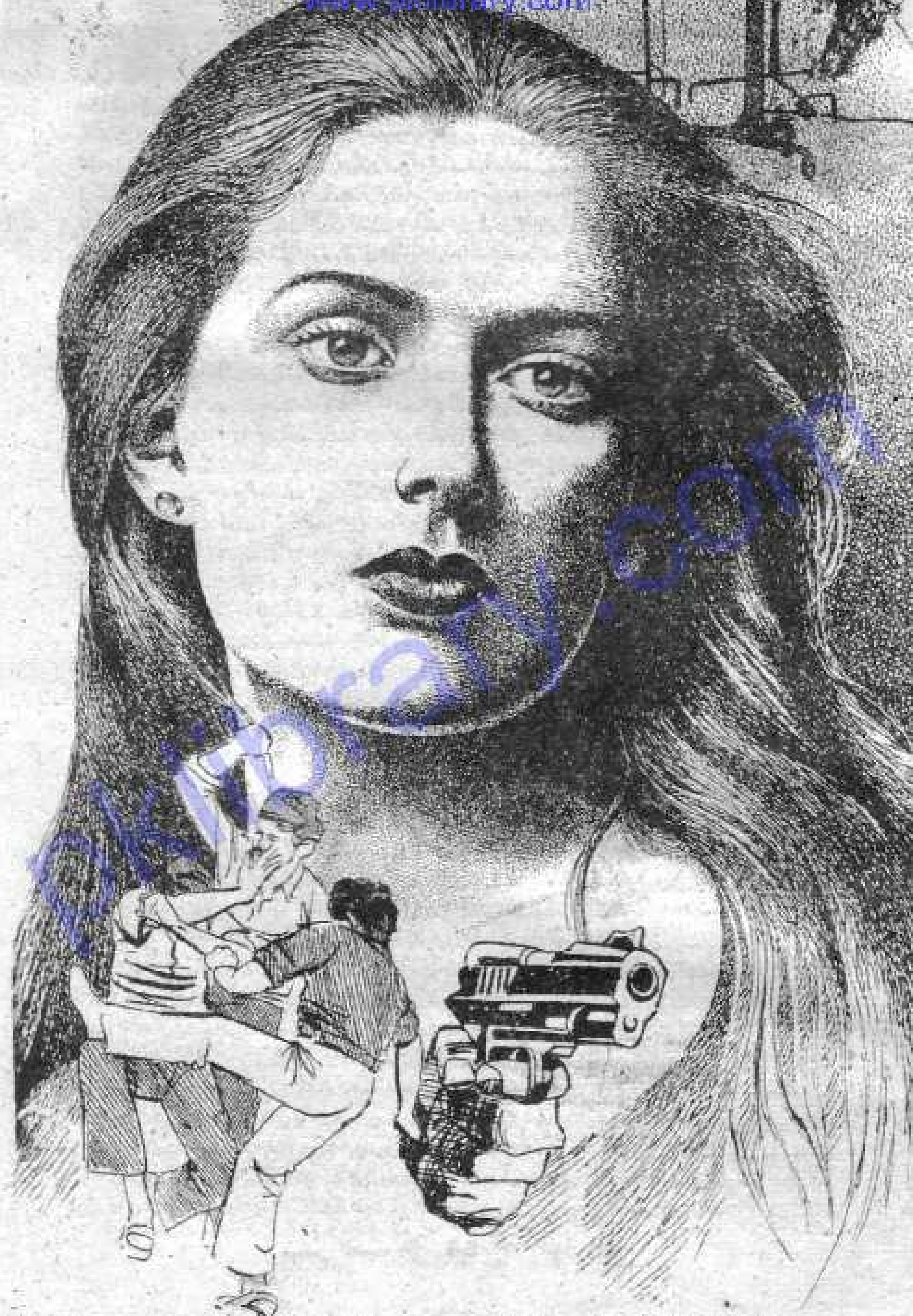


قسط نمبر: 40

اسماء قادری

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرفِ غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے... اس کی زندگی جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان



گذشتہ اقساط کا خلاصہ

معاذ ایک ذہین لیکن جنون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیرِ تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے یہ علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کر رہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے مدد لیتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے مگر دشمنوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ اکوا سے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وہاں سے ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات اگلوانے پر اس کے بھائی کا ایک گروہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ سب بتا دیتا ہے۔ ادھر بشریٰ کی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بھائی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ [illegible] میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے [illegible] کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ [illegible] سے حاصل [illegible] کی بدولت ان کو [illegible] جاتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن گل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشریٰ دبئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وہ اس اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وہ اس کو ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا دونوں ان کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ عالم شاہ، گل اور سرمد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ ائیرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشریٰ اور وہ شخص باذل کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مارا ماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ ایک مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ

زخمی ہو جاتا ہے اور اسے معود ساحر اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر دھر لیے جاتے ہیں اور "را" کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر شرجیل باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ ساحر کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے نیلی کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عطیہ اور وہ اس ڈیرے کو لالہ بھیل ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور پھر حسن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن عطیہ پاکستان میں شوبیہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ شوبیہ پہ تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ اس عطیہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو وہاں نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے نیلی کو بچانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں "را" کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ بھیل کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کرتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد ... معلوم کر لیتے ہیں۔ سونیا اور معاذ حیدر آباد نواب ... کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور ... موسیٰ کو میڈم ایکس کے قبضے سے چھڑانے کے لیے انہیں وہاں آنا پڑتا ہے۔ کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کر کے انہیں رہا کرا لیتا ہے۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جارو نامی شخص آتا ہے۔ معاذ نے "..." کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ جارو اور معاذ نیلی سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور وہ لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا معاذ کی تلاش میں نکلی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ واٹوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وہاں عطیہ و دیگر لوگ مذکورہ ہوتے ہیں۔ وہ اس حلیے بدل کر گلو کا ... ہوتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے ... ہوتا ہے۔ وہاں اس کی نیلی خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم وہ جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے۔ ان سب کو ابتدائی طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ نیلی کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آ جاتا ہے اور عطیہ کو اغوا کروا لیتا ہے۔ لالہ میڈم ایکس کے ٹھکانے کی نگرانی کرواتا ہے۔ باذل، معاذ وغیرہ کے ٹھکانے سے باخبر ہو جاتا ہے۔ ادھر لالہ کے آدمی میڈم ایکس کی نگرانی کے چکر میں مارے جاتے ہیں۔ لالہ اپنے آدمیوں کو اغوا کروا دیتا ہے۔ معاذ وغیرہ جہاں ہوتے ہیں وہاں دشمن حملہ کر دیتا ہے اور کافی مار ماری ہوتی ہے۔ باذل، معاذ کا پیچھا کرتا ہے اور چینیوں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ معاذ چینیوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے۔ اس دوران ... پتا ... کر لیا گیا تھا۔ وہ لوگ ... نامی عورت کو بھی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اس سے معلومات لیتے ہیں۔ ادھر لالہ ... نکالنے کے لیے کارروائی کرواتا ہے اور موسیٰ اور نیلی، اعظم کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ معاذ دشمنوں کے کیمپ پر حملہ کر کے وہاں قبضہ کر لیتا ہے۔ موسیٰ اور نیلی کی گاڑی پر حملہ ہوتا ہے تاہم مار ماری کے بعد صداقت شاہ کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لالہ بھیل صداقت شاہ کو حویلی پر ریڈ کا ... ہے۔ صداقت شاہ، اعظم کے محفوظ ٹھکانے کے لیے قربان شاہ کو فون کرتے ہیں۔ اعظم کو وہاں سے نکال لیا جاتا ہے اور دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ادھر معاذ دیگنگ پہنچ جاتا ہے اور وہاں کے ... سے بات کر کے پاکستان پہنچنے کی اجازت چاہتا ہے۔ ادھر موسیٰ اور نیلی کو پولیس گھیر لیتی ہے اور فائرنگ میں موسیٰ مارا جاتا ہے۔ وہ اعظم کو لے جاتے ہیں اور نیلی زخمی حالت میں ان کے قبضے میں آ جاتی ہے۔ معاذ اور وکی وغیرہ پاکستان پہنچ جاتے ہیں اور اعظم کی بازیابی کے لیے کارروائی کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ وکی، نیلی کو موسیٰ کا آخری دیدار کراتا ہے اور بے قابو ہونے پر اسے سکون آور انجکشن لگا دیا جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

موسیٰ کی تدفین سے پہلے وکی، نیلی کو آخری دیدار کے لیے لایا... تو وہ بے قابو ہونے لگی۔ اسی لیے نرس نے اسے نیند کا انجکشن دیا۔

"اس کا بہت زیادہ خیال رکھنا سسٹر! اس وقت میری یہ بہن اپنی زندگی کے سب سے بڑے دکھ سے گزر رہی ہے۔" وکی نے نرس کو بطور خاص تاکید کی اور موسیٰ کی میت کی منتقلی کی جانے لگی۔ اس موقع پر وکی لالک کی ہدایت کے مطابق ان لوگوں سے الگ ہو گیا لیکن وہ اس بڑے سے میدان میں ضرور پہنچا جہاں سرکس کا میلا سجتا تھا

اور موی اس میلے کی جان ہوا کرتا تھا۔ میدان لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پولیس کی طرف سے موی کے اغوا کی واردات میں ملوث ہونے کا الزام عائد کیے جانے کے باوجود کوئی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ وہ اتنا نیک فطرت لڑکا ایسی کسی واردات میں ملوث ہو سکتا ہے۔ کسی کو خاموش آنسو بہاتے تو کسی کو دھاڑیں مار مار کر بلکتے وکی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس نے خود اس طرح جنازے کو کندھا دیا کہ سر پر بندھا رومال ماتھے کو ڈھانپ رہا تھا۔ آنکھوں پر رنگین شیشوں والا چشمہ تھا اور باقی کا چہرہ ماسک میں چھپا ہوا تھا۔ موی کو قبر میں بھی اس نے اپنے ہاتھوں سے اتارا لیکن جب قبر پر مٹی ڈالنے کا مرحلہ آیا تو اس کی ہمت جواب دے گئی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ جسے آج قبر میں اتارا تھا، وہ اپنے وجود ہی کا ایک حصہ لگتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ آج کے بعد وہ زمین پر ادھورے پن کے احساس کے ساتھ ہی زندہ رہے گا۔

☆☆☆

"پارٹی سے وفاداری اپنی جگہ لیکن پارٹی بھی ملک سے اوپر نہیں ہو سکتی۔ میں مانتا ہوں کہ میرا اور صداقت شاہ کا تعلق ایک ہی پارٹی سے ہے لیکن پارٹی کی خاطر بھی میں اس شخص کی حمایت نہیں کر سکتا جس نے اپنا اصل چہرہ ایک عرصے تک دھوکے اور مکاری سے چھپائے رکھا اور لوگوں پر اپنے نیک ہونے کی دھاک بٹھائے رکھی۔ ناجائز مال کے ڈھیر، سرکاری محکموں میں کرپشن، اپنے ہاریوں پر ظلم و ستم ۔۔۔ یہ سب جو تھا سو تھا، بیٹے نے بھی دیارِ غیر جا کر ملکی مفاد کو نقصان پہنچایا۔ پڑوسی ملک آج تک اس کے اس بگڑے بیٹے کو رو رہا ہے جس نے وہاں مجرمانہ کارروائیاں کر کے پاکستان کے مفاد کو سخت نقصان پہنچایا ہے اور عالمی برادری میں پاکستان کی بدنامی کا سبب بنا ہے۔ آج میں آپ سب کے سامنے پارٹی چیئرمین سے درخواست کرتا ہوں کہ صداقت شاہ کی پارٹی رکنیت معطل کی جائے اور تا زندگی اسے پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کے لیے نااہل قرار دیا جائے۔"

وہ کوئی سیاسی جلسہ نہیں تھا بلکہ اس اسکول کی از سر نو ترتیب اور آرائش کے کام کا آغاز ہونے جا رہا تھا جسے عرفان اللہ نے اپنی نگرانی میں لے کر ایک ماڈل اسکول بنانے کا اعلان کیا تھا۔ افتتاحی تقریب کے بعد صحافی اس کے گرد جمع ہو گئے تھے اور بات عرفان اللہ کے فلاحی کاموں سے نکل کر صداقت شاہ تک چلی گئی تھی۔ ایسے موقع پر اس موضوع کو چھیڑنے والا صحافی یقیناً عرفان اللہ کا ہی وظیفہ خوار تھا جس نے اسے یہ جذباتی تقریر کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

"مگر سر! قربان شاہ اور صداقت شاہ کے دیگر حمایتیوں کی طرف سے تو یہ بیان دیا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ صداقت شاہ کے خلاف ایک سازش ہے جو ان کے دشمنوں نے ان کی نیک نامی کو زک پہنچانے کے لیے تیار کی ہے۔" اس کی تقریر میں وقفہ آیا تو ایک ہوشیار صحافی نے سوال جڑ دیا۔

"دنیا کے کسی چور نے آج تک تسلیم کیا ہے کہ وہ چور ہے؟ صداقت شاہ کے چیلے چانٹے بھی شور مچا مچا کر اس کی چوری چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" عرفان اللہ کے لہجے میں صداقت شاہ کے لیے واضح تضحیک تھی۔

"یہ سائیں صداقت شاہ کے نواسے اور قربان شاہ کے پوتے کا کیا قصہ ہے جناب! ایک چینل پر شور مچا ہوا ہے کہ پولیس نے ایک جوڑے کو جعلی پولیس مقابلے میں مار کر بچہ ان کے قبضے سے اپنے قبضے میں لے لیا ہے لیکن اب قبول کرنے سے انکاری ہے۔"

"پولیس کے معاملات پولیس جانے۔ میں البتہ اتنا ضرور پوچھوں گا کہ جو بچہ بقول صداقت شاہ، انڈیا میں گم ہوا تھا، وہ اچانک پاکستان میں کیسے نمودار ہو گیا؟ اگر بچہ آیا ہے تو اس کا مطلب ہے اس کی وہاں غائب ہونے والی ماں اور ماموں بھی آئے ہوں گے۔ پولیس کا کام ہے کہ ان دونوں کو بھی بازیاب کروائے اور ملک کی بدنامی کا سبب بننے پر کڑی تفتیش بھی کرے۔" وہ صداقت شاہ سے اپنی پرانی دشمنی بھی نبھا رہا تھا اور میڈم انیس کے دیے ہوئے نوٹ بھی حلال کر رہا تھا۔

"لیکن پولیس تو ایسے کسی واقعے سے ہی انکاری ہے۔ تصویر کو فوٹو شاپ قرار دے کر صداقت شاہ کے نواسے کی بازیابی کو جھوٹی خبر قرار دیا جا رہا ہے۔ کسی گرفتاری یا ہلاکت کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ ہاں، یہ ضرور کہا جا رہا ہے کہ پچھلے دنوں گاؤں عالم شاہ اور اس کے اطراف میں ڈکیتی کی متعدد وارداتیں ہوئیں جن میں مقامی زمینداروں کے ملازمین اور ڈاکوؤں، دونوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ یہاں ایک سرکس میں کام کرنے والے لڑکے کے بارے میں بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ ڈاکوؤں میں شامل تھا اور فائرنگ کے تبادلے میں مارا گیا۔" صحافی کے پاس پولیس کی فراہم کردہ تفصیلات تھیں۔

"تو بھائی میں پولیس کو تو جھوٹا قرار نہیں دے سکتا۔ پولیس کہہ رہی ہے کہ تصویر فوٹو شاپ ہے تو پھر ہو گی۔ آپ لوگ

پر ہاتھ ڈالتے ہیں۔" جارو نے مشورہ دیا۔

"کس کی ریکی کروانے کی بات ہورہی ہے؟" لالہ خود وہاں چلا آیا اور جارو کا جملہ سن کر استفسار کیا۔

"ڈی ایس پی کی، جس نے سوئی کا ان کا وزن کیا اور اعظم پر قبضہ کیے بیٹھا ہے۔" وکی نے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"ڈی ایس پی ظہیر خان...... اس پر تو میں نے پہلے ہی بندے لگائے ہوئے ہیں۔ اس کے منٹ منٹ کی رپورٹنگ ہورہی ہے ہمیں۔" لالہ نے فخر سے بتایا۔

"لو بولو لالہ! ایسے تو گرو نہیں مان رکھا ہم نے تمہیں۔"

لالہ کے جواب پر وکی کا چہرہ کھل اٹھا اور اسے سراہنے کے بعد فخر سے معاذ اور جارو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تو پھر کریں پلان؟"

"بالکل۔" معاذ مسکرایا۔

"اس سے پہلے ذرا اس بازل کے بچے کا بھی حساب کتاب کردو۔ بہت ہنگامہ مچا رکھا ہے اس نے ہوش میں آنے کے بعد سے۔ سارا دن گالیاں دیتا رہتا ہے۔ اصغر کا دماغ گھوم گیا تو ٹیٹوا دبا دے گا اس کا۔" لالہ نے ان کی توجہ بازل کی طرف مبذول کروائی۔

"اس کا فیصلہ بشریٰ نے کرنا ہے۔ میں اسے صرف اور صرف بشریٰ کی خاطر جگہ جگہ ڈھوتا پھر رہا ہوں ورنہ اس سے بہت پہلے نجات حاصل کرچکا ہوتا۔"

"تو پھر بلوا لیتے ہیں بشریٰ کو۔ اس کو یہاں لانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" لالہ نے اس کا جواب سن کر فوراً پیشکش کی۔

"بس تو پھر بلوا ہی لواتے ہیں تاکہ ڈی ایس پی پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے یہ قصہ نمٹ جائے۔" وکی نے گرہ جڑ دی۔

"کیوں معاذ؟" ساتھ ہی معاذ کی رائے بھی لی۔

"بالکل بلوالو۔" معاذ نے بھی تائید کی تو لالہ نے اصغر کو اس سلسلے میں ہدایات جاری کردیں۔ بشریٰ کی آمد تک وہ ڈی ایس پی ظہیر کے متعلق رپورٹ کی روشنی میں اس پر ہاتھ ڈالنے کے سلسلے میں لائحہ عمل طے کرتے رہے۔ تقریباً سوا گھنٹے بعد بشریٰ کو وہاں لایا گیا تو معاذ اسے دیکھ کر پوری جان سے کانپ گیا۔ یہ وہ خوش شکل اور چہکتی بلبل سی بشریٰ تو تھی ہی نہیں جو اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھا کرتی تھی۔

وہ بشریٰ تو شرق و مغرب کے حسن کا بہترین امتزاج تھی۔ اس کی گوری رنگت، بھوری آنکھیں اور تیکھے نقوش دیکھنے والے کو دوبارہ پلٹ کر دیکھنے پر لازماً مجبور کرتے تھے۔ پلٹ کر لوگ شاید اب بھی دیکھتے ہوں لیکن اب دیکھنے والی آنکھوں میں ستائش کے بجائے ترحم یا کراہیت کے سوا بھلا

مجھے کیوں گھیر رہے ہیں؟" اس نے فوراً اپنا پینترا بدل لیا۔

"آپ سیاست کا بڑا نام جن جھتے ہیں عرفان اللہ صاحب! پھر سائیں صداقت شاہ سے آپ کے اختلافات کی وجہ سے بھی آپ کی رائے اس معاملے میں اہمیت رکھتی ہے۔"

"میری رائے تو بس یہی ہے کہ میرے نزدیک سائیں صداقت شاہ ایک ناقابلِ اعتبار آدمی ہے اور میں اس جھوٹے انسان کی کسی بات کا یقین نہیں کرسکتا۔ قانون کی ذمے داری ہے کہ اس شخص اور اس کے حواریوں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹے ورنہ آگے بھی یہ اور اس جیسے لوگ ملک کی بدنامی کا سبب بنتے رہیں گے۔" عرفان اللہ کا لفظ لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔

"مجھے یقین ہوگیا ہے کہ بازل اسی ملعون کی اولاد ہے۔ جیسے گندے بندے کی اولاد بازل جیسی ہی گھٹیا ہوسکتی ہے۔" وکی نے ٹی وی کی آواز بند کی اور دانت کچکچاتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"مجھے تو اس صورت حال کو دیکھ کر اعظم کے سلسلے میں سخت تشویش ہورہی ہے۔ جس طرح پولیس اس کی بازیابی سے مکر رہی ہے، اس کو دیکھتے ہوئے تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ اعظم کو میڈم ایکس کے حوالے کرچکے ہیں یا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہے نا کہ میڈیا بھی اس معاملے میں کیسے خاموش تماشائی بن گیا ہے اور سوائے اس چینل کے جسے طاہر نے اپروچ کیا تھا، کسی نے اس سلسلے میں کوئی آواز نہیں اٹھائی۔" معاذ نے تشویش کا اظہار کیا۔

"ہمارا نام نہاد آزاد میڈیا ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے۔ ان کی آزادی کی حقیقت بس اتنی ہے کہ یا تو یہ ڈنڈا پیر کی مانتے ہیں یا پھر پیسا پیر کی۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی دین ایمان نہیں ہے۔" وکی بہت تپا ہوا تھا۔

"ان حالات میں ہم یہ امید نہیں رکھ سکتے کہ قانونی طور پر اعظم کا حصول ممکن ہوسکتا ہے۔ ہمیں خود اس کے حصول کے لیے کوئی عملی قدم اٹھانا ہوگا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ کرتے ہیں کچھ پلان۔" وکی فوراً تیار ہوگیا۔

"ہمیں سب سے پہلے تو یہ کھوج لگانا ہوگی کہ اعظم ہے کہاں؟"

"اس... ڈی ایس پی کی گردن پکڑتے ہیں۔ وہی کم ظرف بتائے گا کہ بچے کو کہاں غائب کیا ہے۔" وکی نے ڈی ایس پی کے لیے گالی نکالی۔

"لالہ سے کہو کہ اس کی ریکی کروائے پھر ہم خود اس

کیا ہوتا ہوگا۔ اس کا داغ دار چہرہ، لقوے کے مریض کی طرح ٹیڑھا منہ، دائیں ہاتھ کی ٹیڑھی میڑھی انگلیاں اور لنگڑاہٹ زدہ چال...... ہر ہر تبدیلی نے معاذ کے دل کو تڑپا کر رکھ دیا۔ وہ بے ساختہ ہی اس کا نام پکارتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ بشریٰ بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکی اور تڑپ کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ معاذ کی کیرتھر میں گمشدگی کے بعد وہ اس سے پہلی بار مل رہی تھی اور اس عرصے میں وہ بے تحاشا آزمائشوں اور تکالیف سے گزری تھی۔ اس نے اپنے عزیز والدین کو کھویا تھا، باڈل کی ہوس کا نشانہ بنی تھی، ایک شریف اور باوقار لڑکی سے بارلی جیسی نک گرل بننے پر مجبور ہوئی تھی اور آخرکار باڈل کے ہاتھوں ایسی زک اٹھائی تھی کہ اپنا روپ، صحت اور آزادی سب کھو دی تھی۔ ان سب تکالیف سے گزرتے ہوئے وہ غصے اور انتقام کی آگ سے تو بھری رہی تھی لیکن اسے وہ غمگسار شانہ نہیں ملا تھا جس پر آنسوؤں کی صورت اپنا غم بہا سکتی۔ آج میسر آیا تو وہ اتنا ٹوٹ کر روئی کہ معاذ کی قمیص اس کے آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ اس کا ہر آنسو تیزاب کی طرح معاذ کے سینے پر گرا اور وہ اتنی شدید اذیت سے گزرا کہ خود پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" غم و غصے کی انتہا پر پہنچ کر اس نے روتی ہوئی بشریٰ کو خود سے الگ کیا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ لیے اس سمت بڑھا جہاں باڈل کو قید میں رکھا گیا تھا۔ وکی اس کا ارادہ دیکھ کر اس کے پیچھے ہی لپکا تھا۔ اس کے اشارے پر تہ خانے کا راستہ کھولا گیا اور معاذ اور بشریٰ سمیت وہ بھی نیچے پہنچا۔ یہاں ایک چھوٹے سے حصے میں سلاخیں لگا کر باڈل کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا گیا تھا۔ معاذ، بشریٰ کا ہاتھ چھوڑ کر اس حصے میں گھسا اور بندھے ہوئے باڈل پر ٹوٹ پڑا۔ باڈل اس اچانک ٹوٹنے والی آفت پر بوکھلا کر رہ گیا۔ بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے بچاؤ کی ویسے ہی کوئی گنجائش نہیں تھی اوپر سے معاذ کا غصہ بھی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ ایک ڈیڑھ منٹ میں ہی اس کی ناک اور ہونٹوں سے خون بہتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

"باندھ کر مارنے کو ہیرو گیری سمجھتا ہے۔ اتنا زور ہے بازوؤں میں تو مجھے کھول کر مجھ سے مقابلہ کر۔" باڈل کی نظر سلاخوں کے پار کھڑی بشریٰ پر پڑی تو ساری صورت حال سمجھ گیا اور کٹیلے لہجے میں معاذ کو چیلنج کیا۔

"کھول، کھولو اسے۔ میں بتاتا ہوں اسے کہ کمزور عورتوں کو زیر کرنے اور کسی مرد سے مقابلہ کرنے میں فرق ہوتا ہے۔" معاذ، وکی کی طرف دیکھ کر زور سے چیخا۔ وکی اس حکم کو ماننے میں ذرا سا متامل ہوا لیکن پھر اس نے وہاں ڈیوٹی پر موجود شخص کو باڈل کی زنجیریں کھول دینے کا اشارہ کیا۔ جب تک وہ شخص زنجیریں کھولتا رہا، معاذ قدرے فاصلے پر کھڑا باڈل کو کینہ توز نظروں سے گھورتا رہا۔ سلاخوں سے باہر بشریٰ بھی دم بخود کھڑی سرخ آنکھوں سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس سے اس نے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کی تھی۔

جیسے ہی زنجیریں کھلیں، باڈل نے سب سے پہلے زنجیریں کھولنے والے شخص کو اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کی۔ معاذ کے لیے اس کی یہ حرکت غیر متوقع نہیں تھی۔ اس نے اپنی لات گھمائی اور اس زور سے باڈل کے منہ پر رسید کی کہ وہ جا کر سلاخوں سے ٹکرا گیا۔ ایک طرف منہ پر پڑنے والی لات نے اس کے جبڑے کو ہلا کر رکھ دیا تو دوسری طرف سلاخوں سے ٹکرانے کے باعث اس کی کنپٹی پر نیل پڑ گیا لیکن وہ باڈل تھا، کوئی عام آدمی نہیں جو چوٹ کھا کر ڈھے جاتا۔ وہ زور سے دھاڑا اور تڑپ کر معاذ پر جوابی حملہ کیا۔ وہ اپنے سر کی ٹکر سے معاذ کے پیٹ کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ معاذ نے صرف اتنا کیا کہ عین وقت پر پھرتی سے ایک طرف ہوگیا۔ باڈل اپنے ہی زور میں سلاخوں سے جا کر ٹکرایا تو اس کا سر گھوم کر رہ گیا۔ معاذ نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے اس کی پسلیوں میں ایک زوردار ٹھوکر لگائی۔ ٹھوکر اتنی شدید تھی کہ باڈل کے پورے وجود میں درد کی لہر دوڑ کر رہ گئی اور وہ مغلظات پر اتر آیا۔

"جس دہانے سے ہر وقت گند ابلتا رہتا ہے اسے بند کر دینا ہی مناسب ہے۔" معاذ غرایا اور پے در پے کئی گھونسے اس کے منہ پر رسید کر ڈالے۔ ان گھونسوں کے نتیجے میں جانے کتنے دانت ٹوٹے اور کہاں کہاں سے زبان کٹی۔ اس کا منہ خونم خون ہوگیا۔ باڈل نے اس موقع پر اپنے دفاع کے لیے ہاتھ پیر چلانے کی کوشش کی لیکن معاذ اس وقت جس طرح سراپا قہر بنا ہوا تھا، اس پر کسی چیز کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے بدن پر پڑنے والی باڈل کی ضربات کو ایک بے حس سے انداز میں سہا اور پھر باڈل کا گریبان پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ وہ پھٹتا ہی چلا گیا۔ اگلے چند ثانیوں میں وہ باڈل کی قمیص اس کے جسم سے الگ کر چکا تھا۔ اس پھٹی ہوئی قمیص کا اس نے ایک گولا سا بنایا اور باڈل کو زمین پر گرا کر اس کے سینے پر گھٹنوں کے بل سوار ہوگیا۔ اس کے وزن سے باڈل کا دم سینے میں گھٹنے لگا اور اس نے زور مارا کہ معاذ

کو اپنے سینے سے گرا دے لیکن معاذ اس وقت ایسا عفریت بنا ہوا تھا کہ باذل جیسا جنونی بھی اس سے مقابلہ کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ اس کی تمام تر کوشش کے باوجود معاذ نہ صرف اس کے سینے پر سوار رہا بلکہ اس کا جبڑا پکڑ کر اس کے منہ میں کپڑے کا وہ گولا بھی ٹھونس دیا جسے اس نے باذل کی قمیص سے ہی بنایا تھا۔ اس گولے کے ٹھونسے جانے کے بعد وہاں موجود افراد کی سماعتیں باذل کے منہ سے اگلنے والی غلاظت سے محفوظ ہو گئیں۔

''میں سمجھتا تھا کہ دنیا کے برے سے برے انسان میں بھی اچھائی کی کوئی نہ کوئی رمق تو ہوتی ہے لیکن تُو نے اپنے اعمال سے ثابت کر دیا کہ تجھ جیسے حرام کی پیداوار کی رگ رگ میں صرف خباثت بھری ہوئی ہے اور اس خباثت کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ اس دنیا کو تجھ جیسے ناپاک انسان سے نجات دلا دی جائے۔'' اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ باذل کے سامنے اپنی نفرت کا اظہار کیا اور ایک بار پھر اس پر ٹوٹ پڑا۔ اب وہ اس کے جوڑوں پر وار کر رہا تھا۔ گھٹنے، ٹخنے، کہنی...... ہر ہر جوڑ پر لگنے والی یہ ضربیں ایسی تھیں کہ بندے کی روح کانپ جائے لیکن بدن کا قفس توڑ کر آزاد نہ ہو سکے۔ یہ سب کچھ اسے دشمنوں ہی نے سکھایا تھا۔ وہ تو پڑھنے لکھنے، طرح طرح کے ہنر سیکھنے اور نت نئے تجربات کرنے والا ایک حسن مزاج لڑکا تھا جسے رنگوں، پھولوں، موسیقی اور انسانوں سے محبت تھی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی یوں تشدد کو اپنا شیوہ بنائے گا۔ اس نے کسی حد تک لڑائی بھڑائی سے متعلق فنون سیکھے بھی تھے تو محض ایک کھیل کے طور پر لیکن زندگی آج اسے اس مقام پر لے آئی تھی کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ایک انسان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کر رہا تھا کیونکہ اس انسان نے خود ثابت کیا تھا کہ وہ انسان کہلانے کے لائق ہے ہی نہیں۔

''معاذ!'' چونکہ منہ میں کپڑا ٹھنسے ہونے کے باعث باذل کی چیخیں اس کے حلق میں ہی دم توڑ دیتی تھیں تو وہ بدترین تشدد کے باوجود صرف تڑپ پھڑک سکتا تھا، شور نہیں مچا سکتا تھا اس لیے تہ خانے کی فضا میں مجموعی طور پر خاموشی ہی تھی۔ اس خاموشی کو بشریٰ کی آواز نے توڑا۔ وہ معاذ کے بالکل قریب کھڑی اس کا بازو تھامے اسے پکار رہی تھی۔ اس کے لمس اور پکار نے معاذ کو اس جنونی کیفیت سے نکال کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔

''بس کرو۔'' اسے اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر بشریٰ نے اس سے آہستہ سے کہا۔

''میں اس دھرتی کو اس کے بوجھ سے نجات دلائے بغیر بس نہیں کروں گا۔'' اس نے ماتھے پر آئے پسینے کے قطرے بازو سے صاف کرتے ہوئے وحشت زدہ لہجے میں جواب دیا۔

''اس نے سب سے زیادہ ظلم میرے ساتھ کیا ہے اور اس کے لیے سزا کے تعین کا حق سب سے زیادہ مجھے حاصل ہے۔'' بشریٰ نے رسان سے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم دے لو اسے سزا لیکن اس کی جان بخشی کی بات نہ کرنا۔ نہ ہی اس کے لیے آسان موت تجویز کرنا۔'' وہ اس وقت بہت برہم ہو رہا تھا۔

''میں اس کو سزائے موت نہیں دینا چاہتی۔'' بشریٰ نے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا۔

''لیکن یہ اسی کا حقدار ہے۔'' معاذ کا لہجہ احتجاجی تھا۔

''موت اس کو ایک جھٹکے میں ساری تکالیف سے نجات دے دے گی۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ زندہ رہے لیکن اس صورت کہ ہر لمحے اپنے لیے موت کی تمنا کرے اور موت اس پر مہربان نہ ہو۔'' اس بار نفرت کا ایک طوفان تھا جو اس کے لہجے میں کروٹیں لے رہا تھا۔

''کیا چاہتی ہو؟'' معاذ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''سب سے پہلے تو اس سے اس کی اس مردانگی کا زعم چھین لو جو اسے شریف عورتوں کی عزتیں پامال کرنے پر اکساتا ہے۔'' اس نے فرمائش کی تو ایک پل کے لیے معاذ سمجھا نہیں پھر سمجھ کر دم بخود رہ گیا۔ باذل جیسے خبیث حرام کے لیے واقعی یہی سزا جچتی تھی۔

''اس کے بعد اسے ہاتھ پیروں اور زبان سے معذور کر کے شہر کے ایسے حصے میں پھینکنا جہاں عورتوں کا بہت گزر ہو۔ یہ اپنے آس پاس سے عورتوں کو گزرتا دیکھے لیکن اس میں اتنی ہمت نہ ہو کہ انہیں انگلی بھی لگا سکے۔ اسے دیدۂ عبرت بنا دو لیکن اس لائق نہ چھوڑو کہ یہ اپنا دکھ درد کسی سے کہہ سکے۔'' بشریٰ کے اندر کی نفرت پوری طرح باہر نکل آئی تھی اور باذل کے لیے اس سزا کا تعین کیا تھا جو واقعی موت سے بدتر تھی۔

☆☆☆

''آج چار بج کر پندرہ منٹ پر تحسیر خان ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے اپنے دفتر سے نکلے گا۔ میٹنگ کے لیے اسے اس جگہ پہنچنا ہے۔'' لالہ کے آدمیوں کی فراہم کردہ رپورٹ کی روشنی میں وہ گوگل میپ نکال کر بیٹھا ہوا تھا اور نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے میٹنگ کے مقام کی

نشاندہی کی تھی۔

"اپنے دفتر سے نکل کر وہ جو بھی روٹ اختیار کرے، یہ طے ہے کہ منزل پر پہنچنے کے لیے اسے اس ندی والے پل پر سے ضرور گزرنا پڑے گا۔ پل کے فوراً بعد جو سڑک ہے، اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے کیونکہ انڈسٹریل ایریا سے نکلنے والے لوڈرز اور کنٹینرز کا لوڈ ہمارے ایماندار ٹھیکیداروں کی بنائی سڑکیں سہار ہی نہیں سکتیں۔ اس سڑک پر رش صرف صبح اور شام کے اوقات میں ہوتا ہے یا رات کو ہیوی ٹریفک کا زور ہوتا ہے۔ ظہیر خان اس جگہ سے متوقع طور پر ساڑھے چار سے پونے پانچ کے دوران گزرے گا یعنی رش آورز شروع ہونے سے بھی کوئی بیس پچیس منٹ پہلے۔ اس لیے ہمارے پاس گنجائش ہے کہ ہم اسے اس مقام پر گھیر لیں۔" وکی نقشے پر ایک سڑک کی نشاندہی کرتے ہوئے روانی سے بولتا جا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، جگہ کا تعین ہو گیا۔ اب ٹیم اور طریقہ کار کا تعین کرو۔" معاذ نے گویا اس کے منصوبے کی منظوری دیتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

"ٹیم میں ہم تینوں تو لازمی ہوں گے۔ اس کے علاوہ چار سے پانچ ماہر اور بے جگر بندے ہمیں اصغر سلیکٹ کر کے دے گا۔ گاڑیاں، اسلحہ اور بارود سب اے ون کوالٹی کا استعمال ہوگا۔"

"بارود.....؟" معاذ چونکا۔

"بارود تو استعمال کرنا پڑے گا معاذ بھائی! ڈی ایس پی ظہیر خان کی گاڑی کے ساتھ سیکیورٹی کے لیے الگ سے پولیس موبائل ہوگی۔ ہمیں زیادہ الجھن میں پڑنے سے بچنے کے لیے موبائل کو اڑانا پڑے گا۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔" معاذ نے سر کو زور سے نفی میں جنبش دی۔

"یہ تو ہمیں کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر ہمارے لیے ظہیر خان تک رسائی ممکن نہیں ہوگی۔" وکی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں ہرگز بھی اس بات کی منظوری نہیں دے سکتا۔ وہاں یہ پولیس والے ہمارے ہم وطن ہیں جو روزی روٹی کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر وی آئی پیز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ بے چارے مر جائیں گے تو پیچھے ان کے گھر والوں کا کوئی والی وارث نہیں ہوگا۔ حالات کچھ بھی ہوں، میں ہر صورت میں اپنے وطن سے محبت کرتا ہوں اور کسی طرح اس بات کو قبول نہیں کرسکتا کہ دہشت گردوں کی طرح بے قصور لوگوں کو بلاتفریق اڑا کر رکھ دوں۔" اس نے شدت سے وکی کے منصوبے کی مخالفت کی۔

"بات تو بالکل ٹھیک ہے۔ اگر کسی ملک کے شہری ہی اپنی املاک اور افراد کو نقصان پہنچانے لگیں تو وہ ملک تو بالکل تباہ ہو کر رہ جائے گا۔" جارو نے معاذ سے اتفاق کیا۔

"یہاں آل ریڈی ہی یہ کام ہو رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم اس ڈی ایس پی کے اغوا کی منصوبہ بندی ہی کیوں کر رہے ہوتے۔ یہ شخص کرپٹ ہے اور اپنی وردی اور اختیارات کو مظلوم کے حق میں استعمال کرنے کے بجائے ظالم کے حق میں استعمال کر رہا ہے تاکہ اپنے عہدے کی قیمت کھری کر سکے۔ میں تو کم از کم اپنے دل میں ایسے شخص کے لیے کوئی ہمدردی نہیں رکھتا۔" وکی نے منہ بناتے ہوئے قدرے تلخ لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

"فردِ واحد کے عمل کا بدلہ بے قصور لوگوں سے نہیں لیا جاسکتا۔ ڈی ایس پی ظہیر کرپٹ ہے تو ہمیں صرف اسی کا احتساب کرنا ہوگا۔"

"مگر کیسے؟ وہ تو اپنے محافظوں کی فوج کے بغیر نکلتا ہی نہیں ہے۔" وکی جزبز ہوا۔

"ہم اس کو اس کے گھر پر گھیریں گے۔" معاذ نے فیصلہ سنایا۔

"گھر پر؟ لیکن وہاں تو اور بھی زیادہ سیکیورٹی کے انتظامات ہوں گے۔" وکی حیران اور معترض ہوا۔

"اس کا ہم انتظام کر لیں گے۔ بہتر ہے کہ تم لالہ کو اس میٹنگ میں شامل کر لو تاکہ ہم اس سے پوچھ سکیں کہ وہ ہمیں کیا کچھ فراہم کر سکتا ہے اور کیا نہیں۔" معاذ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ تھوڑی دیر میں لالہ ان کے درمیان موجود تھا اور معاذ کا تجویز کردہ منصوبہ توجہ سے سن رہا تھا۔

"یہ ایک اچھا منصوبہ ہے جس پر ہم تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں۔" اس نے اپنی رائے دی۔

"کیسی تبدیلی؟" معاذ نے سوال کیا۔

"ڈی ایس پی کے گھر میں بے ہوش کرنے والی گیس کا دخول اور ہم لوگوں کا ماسک پہن کر اندر داخل ہونا عملی طور پر اتنا سادہ نہیں ہے۔ گھر اچھے خاصے وسیع رقبے پر قائم ہے اور ہم اتنی بڑی مقدار میں نہ تو بے ہوش کرنے والی گیس حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی کامیابی سے اسے پورے گھر پر اپلائی کر سکتے ہیں۔ خاص طور پر وہ ملازمین جو رات کی ڈیوٹی پر اوپن ایریا میں گھومتے رہتے ہیں یا اپنے کوارٹرز میں سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا اس سے کچھ نہیں بگڑے

گا۔" لالہ نے انہیں منصوبے کے کمزور پہلو سے آگاہ کیا۔

"دوسری صورت میں ہمیں وہی روایتی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا کہ ڈی ایس پی کے کسی ملازم کو توڑیں اور کھانے یا کسی مشروب میں خواب آور دوا ملا کر تمام مکینوں اور ملازمین کے بے ہوش ہونے کا انتظام کریں۔" معاذ نے مضطرب سے انداز میں پلان بی پیش کیا۔

"یہی مناسب رہے گا۔"

"لیکن اس پر فوری طور پر عمل کرنا مشکل ہوگا۔ ملازمین میں سے ایسے فرد کو منتخب کرنا جو اس کام کو انجام دے سکے اور لالچ کے تحت ٹوٹ بھی جائے اپنی جگہ ایک وقت طلب کام ہے۔" لالہ نے منظوری دی تو وکی نے اعتراض اٹھایا۔

"یہ تو وکی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمارے پاس وقت ضائع کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ پہلے ہی ہمیں کچھ تاخیر ہو چکی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ مزید تاخیر کی صورت میں ہمارے لیے اعظم تک رسائی مشکل نہ ہو جائے۔" معاذ کے لہجے میں اندیشے بول رہے تھے۔

"صرف ایک دن کا انتظار کرلو۔ کل رات تک میں سارے انتظامات مکمل کرلوں گا۔" لالہ نے یقین دہانی کروائی تو اسے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دن کی تاخیر پر آمادہ ہونا پڑا۔ انتظار کا یہ سارا وقت انہوں نے اپنے منصوبے کی خامیاں ڈھونڈتے ہوئے گزارا۔ وارم اپ کے لیے ورزش اور جاگنگ وغیرہ بھی کرتے رہے۔ وکی، نیلی کی عیادت کے لیے بھی گیا۔ اسے علاج اور خدمت کے لیے بہترین سہولیات فراہم کی گئی تھیں اس لیے زخم بہترین حالت میں تھے لیکن جذباتی طور پر وہ اب بھی بُرے حال میں تھی۔ سومی کی دائمی جدائی کے صدمے نے اسے بالکل نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ غم و اندوہ کی تصویر نظر آتی تھی۔ وکی اس سے ملنے پہنچا تو وہ اسے بنا کچھ کہے خالی نظروں سے تکتی رہی۔

"کچھ تو بولو، نیلی!" وکی اکیلے بولتے بولتے تھک گیا تو اس سے التجا کی۔

"بولنے کو کچھ رہا ہی نہیں۔ میں تو بس اس بات پر حیران ہوں کہ اس کے بغیر میری سانسیں کیسے چل رہی ہیں۔" اس کے لہجے میں ایسی کراہٹ تھی کہ وکی کو اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہوا اور ایسا لگا کہ تسلی کے سارے لفظ کہیں کھو گئے ہوں۔

"اس روز جب وہ اور میں کھیتوں میں چھپے ہوئے تھے اور پولیس ہمیں ڈھونڈتی ہوئی وہاں پہنچ گئی تھی تو پتا ہے کیا ہوا تھا؟ پولیس والوں کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ وہ سیدھے مجھ تک پہنچے تھے اور وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر چھپا ان کی نظروں سے بالکل محفوظ تھا لیکن مجھے پولیس والوں کی نظروں میں آتے دیکھ کر اس سے برداشت نہیں ہوا اور خود کی پروا کیے بغیر مجھے تحفظ دینے کے لیے میرے سامنے آ گیا۔ ان ظالموں نے اسے میرے سامنے چھلنی کر ڈالا لیکن میں اس خوش فہمی میں مبتلا رہی کہ جیسے میں ایک بھی گولی کھا کر بھی زندہ رہی ہوں وہ بھی بچ گیا ہوگا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود میرا دل نہ اس وقت اس کی موت قبول کرنے کے لیے تیار ہوا تھا اور نہ ہی اب ہوتا ہے۔ میں ہر وقت اپنے اردگرد اس کی خوشبو محسوس کرتی ہوں اور ہر بار سونے کے لیے آنکھیں بند کرتے ہوئے میرے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ جب دوبارہ آنکھیں کھولوں گی تو وہ میرے سامنے ہوگا لیکن وہ نہیں ہوتا اور اس وقت میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا سر دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنی جان دے دوں۔" وہ بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔ اس کا ہر لفظ وکی کے دل پر تازیانہ بن کر لگا لیکن وہ ضبط کیے اسے سنتا رہا کہ جانتا تھا اگر وہ نہ بولی تو اس کا دل صدمے سے پھٹ جائے گا یا وہ سوچ سوچ پاگل ہو جائے گی۔

"میں نے بنا ماں باپ کے یتیمی کی حالت میں پرورش پائی اور دنیا کے بہت سے سرد گرم دیکھے اس لیے میں سمجھتی تھی کہ میں دنیا کی دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہوں۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ مجھ جیسی مضبوط لڑکی کو توڑنے کے لیے قسمت میں اتنا بڑا امتحان لکھا ہوا تھا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک کر اس کے ہاتھوں پر گرنے لگے۔ اس موقع پر وکی خود پر قابو نہیں پا سکا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر جذباتی لہجے میں بولا۔

"نیلی، میری بہن! مجھے تمہارے آنسوؤں کی قسم ہے کہ میں سومی کے قاتلوں کو ہرگز بھی معاف نہیں کروں گا اور وہ میرے ہاتھوں کتے کی موت مریں گے۔"

"شاید اس سے میرے دل کو تھوڑا سا سکون مل جائے لیکن یہ سوال تو اپنی جگہ ہے کہ میں سومی کے بغیر کیسے جیوں؟ میں نے تو اس کے بغیر بھی زندگی کا تصور ہی نہیں کیا۔" اس کے لبوں پر ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب وکی کے پاس بھی نہیں تھا۔

"مجھے اس کی قبر پر لے چلو وکی! میں وہاں اس کے پاس بیٹھ کر اس سے کچھ دیر باتیں کروں گی تو شاید میرے دل کو تھوڑا سا سکون مل جائے گا۔" وہ بڑے دلگیر لہجے میں

تھی ہوئی تو وکی اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

''پلیز وکی!'' اس نے اصرار کیا۔

''ابھی تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے نیلی! بستر سے اٹھ کر قبرستان آنے جانے میں تمہارے زخم خراب ہو سکتے ہیں۔'' اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں اگر وہاں نہیں گئی تو میرا دل پھٹ جائے گا وکی! میں تو آخری بار بھی اسے دل بھر کر نہیں دیکھ سکی تھی۔ اب کم از کم اس کی قبر کی مٹی کو چھو کر اسے محسوس کرنے کا موقع تو دے دو۔'' اس کے لہجے میں ایسا درد تھا جس نے وکی کے دل پر لگے زخموں کو نئے سرے سے تازہ کر ڈالا۔ موحی کی تدفین کے بعد وہ خواہش کے باوجود دوبارہ اس کی قبر پر نہیں جا سکا تھا کہ لالہ کی طرف سے اسے اس کی اجازت ہی نہیں ملی تھی لیکن اب اسے لگ رہا تھا کہ اس کا وہاں جانا ناگزیر ہے۔ نیلی کے ساتھ ساتھ اسے بھی موحی کی قبر کی مٹی کے لمس کی ہڑک ہونے لگی تھی۔

''ٹھیک ہے چلتے ہیں۔ میں نرس کو بھیجتا ہوں۔ تم اس کی مدد سے جانے کی تیاری کرلو۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور نرس کو اس کے پاس بھجوا دیا۔

''میڈم ریڈی ہیں سر! بٹ.....'' تھوڑی دیر میں نرس اس اطلاع کے ساتھ واپس آئی اور ہچکچاتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ہم سے کہا گیا تھا کہ میڈم اس گھر سے باہر نہیں جائیں گی۔ اگر طبیعت زیادہ خراب محسوس ہو تب بھی صرف ڈاکٹر کو کال کیا جائے گا۔''

''ہم صرف تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہے ہیں اور یہ میری ذمے داری ہے کہ میں آپ کی پیشنٹ کو بحفاظت یہاں پہنچاؤں گا۔'' اس نے نرم لہجے میں نرس کو جواب دیا تو وہ خاموشی اختیار کر گئی۔

''میں تمہارے کہنے پر تمہیں موحی کے پاس لے کر جا رہا ہوں لیکن تم مجھ سے وعدہ کرو کہ وہاں خود پر قابو رکھو گی اور ایسا کچھ نہیں کرو گی جو موحی کی روح کو تکلیف دے۔'' اس نے نرس کی مدد سے نیلی کو وہیل چیئر پر بٹھا کر اپنی گاڑی میں منتقل کیا اور پھر وہیل چیئر ڈکی میں رکھ کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے نیلی سے وعدہ چاہا۔ اصل میں اسے ڈر تھا کہ موحی کی لحد پر جا کر وہ اسے منوں مٹی تلے دبا دیکھے گی تو خود کو بکھرنے سے نہ بچا سکے گی اور اس کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا اس لیے احتیاطی تدابیر کے طور پر اس سے یہ وعدہ لے رہا تھا۔

''میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں کھڑی کروں گی۔'' نیلی نے بات کی دھنک پیچ کر اسے یقین دہانی کروائی۔

''اپنے پیاروں کو تکلیف میں دیکھنا دنیا کی سب سے بڑی مشکل ہوتی ہے نیلی! میں تم سے بالکل ویسی ہی محبت کرتا ہوں جیسی محبت مجھے اپنی مری ہوئی بہن سے ہے۔ برسوں گزرنے کے بعد میں اس کا غم آج تک نہیں بھولا تو سوچو تمہیں تکلیف میں کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ تمہارا ہر آنسو میرے دل پر کسی بھاری پتھر کی طرح گرتا ہے اور میں تمنا کرتا ہوں کہ کاش موحی کی جگہ میں جان سے چلا گیا ہوتا تو مجھے یہ وقت تو نہ دیکھنا پڑتا۔'' اس کے لہجے میں موجود گہرے دکھ نے نیلی کو تڑپا دیا اور اسٹیئرنگ پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔

''ایسی باتیں مت کرو وکی! جو قسمت میں لکھا تھا، وہ ہو گیا۔ موحی کی جگہ تم ہوتے تو کیا مجھے کم غم ہوتا۔ وہ شوہر تھا تو تم بھائی ہو اور بھائیوں میں تو بہنوں کی جان ہوتی ہے۔''

''میں جانتا ہوں کہ میری بہن مجھ سے بہت محبت کرتی ہے اور اس محبت کے ناتے مجھے یہ مان ہے کہ تم مجھے تکلیف سے بچانے کے لیے موحی کے غم کو حوصلے سے برداشت کرنے اور بھولنے کی کوشش کرو گی۔'' وہ ہر صورت اسے زندگی کی طرف واپس لانا چاہتا تھا۔

''میں کوشش کروں گی۔ تم دعا کرنا کہ خدا مجھے اس کوشش میں کامیاب کرے۔'' اس نے کوشش کی کہ مسکرا سکے لیکن بس لب بھینچ کر رہ گئے۔ وکی نے اس منظر کو دیکھ کر لب بھینچ لیے لیکن پھر اسے بہلانے کے لیے موضوع بدل کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ قبرستان تک کا راستہ جلد ہی کٹ گیا۔ اس نے گاڑی روک کر ڈکی سے وہیل چیئر نکالی اور اسے اس پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

''قبرستان کی زمین ہموار اور پکی نہیں ہے اس لیے موحی کی قبر تک پہنچتے پہنچتے تمہیں جھٹکے لگ سکتے ہیں۔ میں جتنا ممکن ہوا، تمہیں آرام سے وہاں تک لے جاؤں گا۔ بس تم کرسی کے ہینڈلز مضبوطی سے تھام کر خود کو اس پر اچھی طرح جمائے رکھنا۔'' ساتھ ہی اس نے وہیل چیئر کے ساتھ منسلک حفاظتی بیلٹ بھی اس کی کمر اور پیٹ کے گرد کس دی اور وہیل چیئر کو کھینچ کر آگے بڑھانے لگا۔ کچی زمین میں تھوڑی سی نمی بھی تھی جس کی وجہ سے پہیوں کو حرکت کرنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ ایک آدھ جگہ تو پہیے پھنس ہی گئے لیکن وکی کسی نہ کسی طرح انہیں نکالنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ کچی زمین کے علاوہ دوسری مشکل راستے کی تنگی تھی۔ قبریں ہر طرف

اس طرح پھیلی ہوئی تھیں کہ ان کے درمیان سے وہیل چیئر کو گزارنا مشکل ہوا جا رہا تھا۔ احتیاط کے باوجود ایک بار دائیں جانب کے پہیے ایک اندر کو بیٹھی ہوئی کچی قبر پر سے گزر گئے۔ اس نے دل ہی دل میں قبر میں دفن مردے سے معافی مانگی اور شکر ادا کیا کہ نیلی کو اس بات کا پتا نہیں چل سکا۔ اللہ اللہ کر کے وہ کسی نہ کسی طرح موسیٰ کی قبر پر پہنچ ہی گئے۔ قبر کی مٹی گیلی تھی اور اس پر پڑے گلاب کے پھولوں کی پتیاں بھی تازہ تھیں۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہ سرکس کمپنی کے مالک یا کسی ساتھی کی محبت کا اظہار ہے۔ موسیٰ دوستانہ مزاج کا لڑکا تھا اور اس کے ساتھ کام کرنے والے تمام افراد اس سے محبت کرتے تھے۔ جب وہ سرکس میں کام کے لائق نہیں رہا تھا تب بھی اس کے ساتھی ورکر اس کے ساتھ دوستی نبھانے کے لیے اس سے ملاقات کرنے آتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس کی عدم موجودگی میں نیلی کا بھی بہت خیال رکھا تھا تو قیاس بالکل درست تھا کہ اس کی لحد پر بکھرے پھول انہی کی محبت کا اظہار ہے۔

"ایک بات بولوں وکی!" اس نے قبر کے قریب وہیل چیئر کھڑی کی ہی تھی کہ نیلی اس سے مخاطب ہوئی۔

"ضرور کہو۔" اس نے نیلی کے ضبط سے سرخ پڑتے چہرے سے نگاہ چراتے ہوئے اسے اجازت دی۔

"میرا موسیٰ اعظم کو بچاتے ہوئے اپنی جان سے گیا ہے۔ اس کی یہ قربانی رائیگاں نہ جانے دینا اور اعظم کو اس کی ماں تک ضرور پہنچانا۔ یقین کرو، اعظم وہ بچہ ہے جو بنا ماں بنے ہی میرے اندر ممتا کا احساس جگا گیا تھا۔ میں اسے اس کے دشمنوں کے درمیان تصور کرتی ہوں تو میرا کلیجا منہ کو آنے لگتا ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔ ہم سب مل کر اعظم کی بازیابی کے لیے اپنی بہترین کوششیں کر رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد وہ ہمارے پاس ہوگا۔ تب تم خود اسے لے کر اس کی ماں کے پاس جانا اور اسے بتانا کہ بے شک تم نے اس بچے کو جنم دیا ہے لیکن میری ممتا میں بھی کوئی کمی نہیں ہے۔"

"ہو سکتا ہے اسے برا لگے اور وہ سوچے کہ یہ کون ہوتی ہے چار دن کے ساتھ میں میری برابری کرنے والی۔" اس نے وکی کا مشورہ سن کر خدشے کا اظہار کیا۔

"نہیں، اسے برا نہیں لگے گا بلکہ شاید سکون محسوس ہو کہ اس کے بعد کوئی اسی کی طرح اس کے بچے سے محبت کرنے والی ہستی موجود ہے۔" وکی نے یاسیت سے جواب دیا تو وہ ایک پل کے لیے ساکت ہو گئی۔ موت نے اس سے اس کے موسیٰ ہی کو نہیں چھینا تھا، وہ ایک معصوم سے اس کی ماں کو چھین کر لے جانے کے لیے بھی گھات لگائے بیٹھی تھی۔ موت، اس چیز کا نام تھا جو ہر روز اس کائنات میں بے شمار المیوں کو جنم دیتی تھی۔ اس کے آس پاس دور تک پھیلی قبروں میں دفن مردے اپنے پیچھے جانے کس کس کو بلکتا چھوڑ کر آئے تھے۔ نہ جانے والوں کو رکنے کا اختیار تھا، نہ پیچھے رہ جانے والوں کے آنسو زنجیر بن کر ان کے قدموں میں لپٹنے کی قدرت رکھتے تھے۔ مالک کے فیصلے تھے جن کے آگے جلد یا بدیر سب کو سر جھکانا تھا۔ جو پہلے مرحلے میں سر تسلیم خم کر دیتا، اس کے لیے صبر کا اجر تھا۔ صبر نہ کرنے اور رونے پیٹنے سے بھی قدرت کا فیصلہ تو تبدیل نہ ہوتا، بس صبر کا اجر چلا جاتا اور گریہ وزاری کرنے والا مالک کے پسندیدہ بندوں کی فہرست میں جگہ نہ بنا پاتا۔ جو خود پسندیدہ افراد کی فہرست میں شامل نہ ہو اس کی اپنے پیاروں کے حق میں کی گئی دعا کی قبولیت کی بھلا کیا ضمانت ہو سکتی تھی۔

خیالات کا ایک ریلا سا تھا جو اس کے دماغ سے گزرتا چلا گیا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ ان خیالات کی حیثیت کیا ہے لیکن بس ایک دم سے اس کا دل تھم سا گیا تھا اور وہ جو یہ گمان کر رہی تھی کہ وکی سے وعدہ کرنے کے باوجود موسیٰ کی قبر پر پہنچ کر اپنا ضبط کھو دے گی، حالت صبر میں آ گئی تھی۔ اسی حالت میں اس نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے اور پورے خشوع و خضوع سے موسیٰ سمیت تمام مسلمان بہن بھائیوں کی مغفرت طلب کرنے لگی۔ وکی نے بھی خاموشی سے دعا کے لیے ہاتھ بلند کر لیے اور دونوں ہر طرف سے کٹ کر دعا مانگنے میں مستغرق ہو گئے۔ بہت دیر بعد سر اٹھایا تو وکی کی پہلی نظر ایک ہتھیار بدست شخص کی طرف اٹھی۔ وکی سے نظریں ملتے ہی وہ خباثت سے مسکرایا۔ وکی نے اضطراری طور پر اپنی گن نکالنے کی کوشش کی لیکن اس نے اس کے بالکل قریب ایک ہوائی فائر کیا اور زہر خند لہجے میں بولا۔

"ایسی ویسی کوئی غلطی کرنے کی کوشش مت کرنا میری جان، ورنہ میں بلاتکلف تمہارے جسم میں سے جان نکال لوں گا۔"

"کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟" وکی نے اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہمارا ایک شکار تم ہمارے پنجوں سے نکال کر لے گئے تھے۔ بس اسی کی واپسی چاہتے ہیں۔ ویسے داد ہے اس ذہین دماغ کو جس نے اس قبر کی نگرانی کا مشورہ دیتے ہوئے

دعویٰ کیا تھا کہ کچھ بھی ہو، ہیر ایک دن اپنے رانجھے سے ملنے یہاں ضرور آئے گی۔" اس کے جواب نے واضح کر دیا کہ وہ نیلی کے پیچھے آیا ہے۔

"میرے ہوتے تم اسے انگلی بھی نہیں لگا سکتے۔" وکی سن کر غرایا۔

"تمہارے ہونے کی کیا گارنٹی ہے۔ تم ہر طرف سے گھیرے جا چکے ہو اور اسے بچانا تو دور کی بات، خود اپنی جان بھی سلامت لے کر یہاں سے نہیں نکل سکتے۔" وہ یقینی طور پر پہلے سے وہاں گھات لگائے بیٹھے تھے اور انہیں بہت خاموشی سے گھیرے میں لے لیا تھا۔ صورتِ حال بے حد نازک ہو چکی تھی اور ایسی کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی تھی کہ وہ نیلی کو بہ حفاظت یہاں سے نکال کر لے جا پاتا۔ حقیقتاً اس طرح پھنس جانے پر اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی اور وہ خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔

"میں بغیر کسی مزاحمت کے اس شرط پر تم لوگوں کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں کہ اسے چھوڑ دو اور بخیر و سلامت یہاں سے جانے دو۔" نیلی نے اس موقع پر حیرت انگیز ٹھہراؤ کا مظاہرہ کیا اور مضبوط لہجے میں اس شخص سے مخاطب ہوئی۔

"ایسا بالکل نہیں ہو سکتا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی زندگی پر جس کے بدلے ان ظالموں سے تمہارا سودا کیا جائے۔" وکی نے فوری طور پر اس کی بات کو رد کر دیا۔

"کیا کہنے ہیں بھئی، ایک مر گیا تو دوسرا عاشق جان نثار کرنے کے لیے تیار کھڑا ہے۔" اس شخص نے نہایت لوفرانہ انداز سے تبصرہ کیا جسے برداشت کرنا وکی کے بس میں نہیں تھا۔ وہ کسی بھی طرح کے انجام کی پروا کیے بغیر گالیاں بکتا ہوا اس شخص کی طرف لپکا۔ فوراً ہی فضا میں گولی چلنے کی آواز گونجی اور نیلی کے لبوں سے تیز چیخ برآمد ہوئی۔ اگلا منظر موسیٰ کی قبر پر پڑنے والے خون کے چھینٹوں اور زمین پر تڑپتے ایک انسانی لاشے کا تھا۔ انسان جو بہت بڑبولا اور مغرور ہے لیکن اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ اپنے وجود میں اترنے والی چھوٹی سی گولی کو بھی نہیں سہہ پاتا اور کسی حقیر کینچوے کی طرح خاک میں لوٹنے لگتا ہے۔

☆☆☆

"کیوں کی یہ حماقت؟" لالہ کی قہر برساتی نظریں وکی پر جمی ہوئی تھیں اور وہ لالہ سے نظریں ملانے کی جرأت نہ پاتے ہوئے گردن جھکائے ہوئے بیٹھا تھا۔

"تو نے میرے لاڈ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیشہ اپنی من مانی کی ہے اور کبھی نہیں سوچا کہ تجھے کچھ ہوا تو میرے دل پر کیا گزرے گی۔ ٹھیک ہے نہ سوچ میرے بارے میں...... پر اس کا تو سوچ لے جسے اپنے نام پر ویرانے میں بٹھا کر آیا ہے اور اگر اس کا بھی خیال نہیں ہے تو اس کا سوچ لے جس نے ابھی تیری صورت بھی نہیں دیکھی۔ کیا چاہتا ہے تو، باپ کے نام پر اس کے پاس فقط ایک نام ہو اور وہ کبھی نہ جان سکے کہ باپ کا پیار اور شفقت کس چیز کا نام ہے۔" لالہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا اور اس کی آخری بات نے تو وکی کے دل کو بھی مٹھی میں بھینچ لیا تھا۔ وہ خود بغیر باپ کے پلا تھا۔ اس سے بہتر بھلا کون جان سکتا تھا کہ باپ سے محرومی زندگی میں کون کون سی محرومیوں کو جنم دیتی ہے۔

"اور وہ نیلی...... اس کی حالت ایسی تھی کہ تو اسے اٹھا کر قبرستان لے گیا۔ کیا ارادہ تھا تیرا۔ کیا موسیٰ کے ساتھ ساتھ اسے بھی قبر میں اتارنا چاہتا تھا؟" لالہ کا غصہ کسی طرح کم نہیں ہو کر دے رہا تھا اور وہ وکی کو بے بھاؤ کی سناتا جا رہا تھا۔

"نیلی کی ضد پر ہی اسے لے کر گیا تھا لالہ! موسیٰ کی قبر پر جانے کے لیے بہت بے چین ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا پانچ منٹ کے لیے لے جاتا ہوں۔ شاید اس کے دل کو قرار آ جائے۔" وکی نے پہلی بار منمناتے ہوئے اپنی صفائی دینے کی کوشش کی۔

"وہ نادان لڑکی ہے اور اس وقت بہت بڑے جذباتی بحران سے گزر رہی ہے۔ تیرا کام تھا کہ اس کو سمجھا بجھا کر کسی طرح ٹال دیتا۔ پھر حالات بہتر ہونے پر میں خود اس کو وہاں لے جانے کا انتظام کر دیتا لیکن تو نے تو اس کی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی۔ وہ تو شکر ہے کہ چوکیدار نے تم لوگوں کے نکلنے کے ساتھ ہی اصغر کو فون کر کے اطلاع دے دی اور یہاں سے لوگ تیری اور نیلی کی حفاظت کے لیے پہنچ گئے۔" جس جگہ نیلی کو رکھا گیا تھا، وہاں ان کا ایک آدمی بطور چوکیدار حفاظت کے لیے موجود رہتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر وہ باہر کے چھوٹے موٹے کام بھی نمٹا دیتا تھا لیکن اس کا بنیادی کام سیکیورٹی کا ہی تھا۔ اس کی طرف سے اطلاع ملتے ہی معاذ، اصغر اور مزید چار پانچ آدمی قبرستان کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے یہ ہوشیاری کی تھی کہ اپنی گاڑیاں قبرستان سے تھوڑے فاصلے پر ہی چھوڑ دی تھیں اور پیدل مختلف سمتوں میں پھیل کر قبرستان پہنچے تھے۔ انہوں نے گوریلا لڑائی کے انداز میں نہایت خاموشی سے ان تین افراد کو چھاپ لیا تھا جو وکی اور نیلی کو گھیرے میں لیے بیٹھے تھے۔ چوتھا آدمی بھی اس وقت معاذ کی گولی کا شکار ہوا تھا جب وہ وکی کو نشانہ بنانے جا رہا

تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ ایک ایسا نازک لمحہ تھا جس میں معاذ نے اپنی بے پناہ مہارت سے بے مثال نشانہ لگا کر وکی کی طرف بڑھنے والی موت کو پچھاڑ دیا تھا۔ اگر وہ شخص معاذ کی گولی کا نشانہ نہ بنتا تو سومی کی قبر پر اس کے بجائے وکی کے خون کے چھینٹے پڑے ہوتے۔

"جو ہونا تھا، وہ ہو گیا اور اللہ کی مہربانی سے ہم محفوظ بھی رہے لیکن اب تو مجھے اپنے بچنے پر افسوس ہو رہا ہے۔ نہ بچتا تو کم از کم اس وقت اس طرح ذلیل تو نہ ہو رہا ہوتا۔" وکی نے دیکھا کہ لالہ کا غصہ کسی طرح کم نہیں ہو رہا ہے تو منہ لٹکا کر دکھی سے لہجے میں بولا۔

"ہاں، مر جا سالے! پہلے تیرا باپ تجھے چھوڑ کر مر گیا تھا اب تو اپنے بیٹے کو چھوڑ کر مر جا۔ میں تو پتھر کے دل کے ساتھ قیامت کے بورے سمیٹ کر آیا ہوں نا کہ ایک ایک کر کے میرے اپنے مجھے چھوڑ کر جاتے رہیں گے اور میں پیچھے بیٹھا یتیموں کو پالتا رہوں گا۔" اس کی بات کے جواب میں لالہ جس غصے اور کرب کی شدت کے ساتھ بولا، اس نے وکی کو گنگ کر دیا۔ لالہ خود بھی اپنے الفاظ پر دنگ رہ گیا۔ ساری زندگی جو بات اس نے ظاہر نہیں ہونے دی تھی، وہ اچانک ہی لبوں پر آ گئی تھی۔

"کیا... کیا تعلق ہے تمہارا میرے باپ سے؟" لالہ لاکھ دعا کرتا کہ وکی اس کی بات پر غور نہ کرے لیکن وہ اس کے الفاظ کو پکڑ چکا تھا۔

"کون ہوں میں تمہارا اور کیا رشتہ ہے میرے تمہارے بیچ؟ کیا وجہ ہے کہ تم مجھے اس دیوانگی سے چاہتے ہو کہ مجھ پر اپنا سب کچھ نثار کرنے کے لیے تیار رہتے ہو؟" اس کے سوالوں نے لالہ کے لیے راہ فرار نہیں چھوڑی تھی۔ وہ جو ابھی تک کھڑا کھڑا وکی کو ڈانٹنے ڈپٹنے میں مصروف تھا، تھکے تھکے انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آج سچ بول ہی دو لالہ! میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ تمہارے اور میرے بیچ کوئی خاص تعلق ہے۔ ادب اور احترام نے کبھی مجھے تم سے سوال کرنے کی ہمت نہیں دی لیکن آج سوال میرے لبوں پر آ گیا ہے تو جواب دے ہی دو۔" وکی نے اس سے التجا کی۔

"تو میرا بھتیجا ہے۔ میرے سگے بھائی کا بیٹا۔ میں نے کبھی تم لوگوں سے اپنے تعلق کو ظاہر نہ ہونے دیا کہ کہیں میری دشمنیاں تمہارے حصے میں نہ آ جائیں لیکن قسمت کے لکھے نے تجھے میری ہی گود میں لا ڈالا۔ پہلے بھائی گیا اور پھر بھاوج اور بھتیجی بھی اس ظالم دنیا کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ان کے قاتلوں کو بدترین انجام سے دوچار کیا تھا میں نے اور اس کے بعد ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ تجھے مضبوط اور طاقتور بنانا ہے تاکہ تو اس دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جی سکے۔ تو نے کبھی مجھے مایوس بھی نہیں کیا لیکن تیرے باپ کا خون رنگ دکھاتا ہے تجھ میں۔ تو اسی کی طرح جذباتی اور نرم و نازک احساسات کا مالک ہے اور اکثر اسی کی طرح دماغ کے بجائے دل سے سوچنے لگتا ہے۔" لالہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

"مجھ سے اپنا رشتہ کیوں چھپایا؟" وہ لالہ کے عین سامنے گھٹنوں کے بل آ بیٹھا۔

"کہا نا کہ اپنی دشمنیوں سے بچانے کے لیے۔ دشمنوں کو خبر ہو جاتی کہ تو میرا بھتیجا ہے تو تجھے توڑنے کے لیے تجھے نشانے پر رکھ لیتے۔"

"بے شک ایسا ہو جاتا لیکن میں یتیمی کے اتنے مکمل احساس کے ساتھ تو نہ جیتا۔ مجھے اطمینان ہوتا کہ میرے سر پر باپ نہ سہی، باپ کے بھائی کا ہاتھ ہے۔" وکی نے شکوہ کیا۔

"میں نے تیرا خیال رکھنے میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی۔"

"کسر تو رہ گئی لالہ! میں تیری کسی عنایت کو اپنا حق سمجھ کر وصول نہ کر سکا۔ ساری زندگی احسان کا قرض چڑھتا رہا میرے سر پر۔" اس کے لہجے کے درد نے لالہ کو تڑپا دیا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر گمبھیر لہجے میں بولا۔

"بس یہ سوچ کر معاف کر دے کہ میری نیت بری نہیں تھی۔ جو کیا، تیرے بھلے کے لیے کیا۔"

"معافی مانگ کر شرمندہ کر رہے ہو۔ بیٹا کہہ کر سینے سے کیوں نہیں لگاتے؟" وہ خفا ہو گیا تو لالہ نے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ اس جذبات سے بھرپور لمحے میں دونوں ہی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ایک طرف اپنے کو اپنا سینے سے لگانے کی خوشی تھی تو دوسری طرف ان اپنوں کا غم جنہیں آنکھیں تاقیامت نہیں دیکھ سکتی تھیں۔

☆☆☆

"کیا پوزیشن ہے؟"

"تمام سیکیورٹی کیمرے آؤٹ آف ورک ہو چکے ہیں۔ آپ لوگ آرام سے اندر جا سکتے ہیں۔" اپنے سوال کے جواب میں کانوں میں گونجنے والی آواز نے معاذ کو خاصا پرسکون کر دیا۔ ڈی ایس پی ظہیر خان نے اپنے گھر پر سیکیورٹی کے اچھے خاصے انتظامات کر رکھے تھے اور انہیں ہر انتظام کا "انتظام" کرنا پڑا تھا۔

''ٹیلی فون کے تار کٹ گئے وکی؟'' اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے وکی سے رابطہ کیا۔

''کٹ گئے ہیں اور جیمر بھی کام کر رہا ہے۔''

''گڈ!'' وکی کی رپورٹ سنتے ہی اس نے بے ساختہ داد دی۔ لینڈ لائن کے علاوہ موبائل فونز کو ناکارہ بنانے کے لیے انہیں جیمر کا بندوبست کرنا پڑا تھا اور اب خود آپس میں رابطے کے لیے واکی ٹاکی استعمال کر رہے تھے۔ اندر کے ایک ملازم کو توڑ کر مکینوں اور ملازمین کو بے ہوش کرنے کا کام پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ پروگرام کے مطابق مذکورہ ملازم نے چائے، کافی یا دودھ (گھر والے سونے سے پہلے جس بھی مشروب کا استعمال کرتے) میں بے ہوشی کی دوا ملا کر سب کو دینے کے ساتھ ساتھ خود بھی پی لی تھی تاکہ شک سے محفوظ رہے۔ اندر موجود افراد کا یہ بندوبست کرنے کے ساتھ ساتھ اب وہ سیکیورٹی کے دوسرے انتظامات کو فیل کرنے میں مصروف تھے تاکہ سارا کام خاموشی اور صفائی سے انجام دیا جا سکے۔

''دونوں گارڈز کو آف کر دیا۔'' وہ وکی سے فارغ ہوا ہی تھا کہ جارو کی طرف سے رابطہ کیا گیا۔ ڈی ایس پی جس ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتا تھا اس کا اپنا بھی ایک حفاظتی انتظام تھا۔ سوسائٹی میں داخلے اور اخراج کے صرف ایک راستے کو کھلا رکھا جاتا تھا اور وہاں پرائیویٹ سیکیورٹی ادارے کے تعاون سے باقاعدہ ایک چیک پوسٹ بنائی گئی تھی۔ دن کے اوقات میں بھی سوسائٹی میں داخل ہونے کے خواہش مند ہر باہر کے فرد کو تفتیش سے گزرنا پڑتا تھا اور اس کی طرف سے یہ نشاندہی ہونے کے بعد کہ وہ کس کا ملاقاتی ہے، پہلے اس متعلقہ مکین سے تصدیق کی جاتی تھی پھر اس شخص کو داخلے کی اجازت ملتی تھی۔ رات میں ظاہر ہے یہ احتیاط اور بھی زیادہ بڑھ جاتی تھی اور وہ لوگ تو رات کے جس پہر وہاں آئے تھے اس نے چیک پوسٹ پر موجود گارڈز کو مزید چوکنا کر دیا تھا لیکن انہوں نے یہ چالاکی کی تھی کہ سب کے سب ایک ساتھ وہاں نہیں ٹپک پڑے تھے۔ معاذ اور لالہ کا ایک ساتھی بائیک پر وہاں پہنچے تھے جبکہ باقی ساتھیوں نے اپنی گاڑیاں کچھ فاصلے پر روک کر پیدل پیش رفت کرنے کے بعد اردگرد پوزیشن سنبھال لی تھی۔

''کس سے ملنا ہے؟'' جب معاذ اور اس کا ساتھی چیک پوسٹ پر آ کر رکے تھے تو ایک گارڈ نے انہیں نہایت مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے روکھے لہجے میں پوچھا تھا۔ اس ہاؤسنگ سوسائٹی میں جس طبقے کے لوگ رہتے تھے وہ یا ان کے ملنے جلنے والے عموماً بائیک استعمال نہیں کرتے تھے۔ کچھ شوقین نوجوان استعمال کرتے بھی تھے تو وہ عام بائیکس نہیں ہوتی تھیں۔ وہ کم از کم بھی اس قیمت کی بائیکس ہوتی تھیں جس میں ایک متوسط طبقے کا شخص سیکنڈ ہینڈ کار خرید سکتا تھا تو یوں تھا کہ معاذ اور اس کے ساتھی کی عام سی بائیک نے سیکیورٹی والوں کے لیے ان کی حیثیت کا تعین کرنے میں آسانی کر دی تھی اور وہ ان سے ان کی حیثیت کے مطابق پیش آ رہے تھے۔

''ہمیں ڈی ایس پی ضمیر خان صاحب سے ملنا ہے۔ انہوں نے خود ہمیں بلایا ہے۔'' معاذ نے کسی نیم خواندہ شخص کے انداز میں گارڈ کے سوال کا جواب دیا تھا۔

''اتنی رات کو؟'' اس کا جواب سن کر گارڈ نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

''اب یہ تو صاحب کو معلوم ہے۔ انہوں نے ہمیں ابھی آرڈر کیا ہے تو ہم ابھی آ گئے ہیں۔'' اسے جواب دیتے ہوئے معاذ کے لہجے میں بے نیازی تھی بلکہ اس نے اس بے نیازی کے واضح اظہار کے لیے اپنے شانے بھی اچکائے تھے۔

''ٹھیک ہے، ادھر ہی رکو۔ پہلے ہم ڈی ایس پی صاحب سے تصدیق کر لیں۔'' اس کے اعتماد نے گارڈ کو تھوڑا سا نرم کیا اور وہ لکڑی کے کیبن میں بیٹھے اپنے ساتھی کی طرف پلٹا تاکہ اس سے اس سلسلے میں بات کر سکے۔ طریقہ کار یہی تھا کہ کیبن میں بیٹھ کر ڈیوٹی دینے والے کے پاس سوسائٹی کے تمام مکینوں کے رابطہ نمبر موجود ہوتے تھے اور وہ ہی ضرورت پڑنے پر ان سے رابطہ کرتا تھا۔

''ایک منٹ بات سنو۔'' معاذ نے اسے پکارا اور جیسے ہی وہ پلٹا، معاذ کے ہاتھ میں موجود اسپرے کی بوتل سے ایک پھوار نکل کر سیدھی اس کے چہرے پر پڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھ سکتا، معاذ کے ساتھ موجود شخص اور اندھیرے میں ادھر اُدھر چھپے ساتھی حرکت میں آ گئے۔ پھرتی اور مہارت سے سیکیورٹی گارڈز کو غیر فعال کرتے ہوئے انہوں نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ ان میں سے کسی کو ناقابل تلافی نقصان نہ پہنچ سکے۔ وہ سب بے چارے روزی روٹی کے چکر میں کم سہولیات کے ساتھ کم تنخواہوں میں سیکیورٹی گارڈ کا یونیفارم پہن کر دوسروں کی حفاظت کے لیے اپنا آپ داؤ پر لگا دینے والے وہ لوگ تھے جنہیں کچھ ہو جاتا تو پیچھے ان کے اہل خانہ کو پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ چیک پوسٹ پر موجود ان تین عدد گارڈز کو بے

گولی چلائے بے ہوش کرنے میں کامیاب ہو جانے کے بعد ان کے لیے ڈی ایس پی کے گھر تک رسائی زیادہ مشکل نہیں تھی۔ معاذ اور وکی نے اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ڈی ایس پی کے گھر کی طرف پیش قدمی کی تھی جبکہ جارو کو اس کے ساتھی کے ساتھ ان دو سیکیورٹی گارڈز کو سنبھالنے کی ڈیوٹی سونپی گئی تھی جو سوسائٹی کی چار دیواری کے اندر وقفے وقفے سے راؤنڈ لگا کر مکینوں کی اس تسلی کا انتظام کرتے تھے کہ ہم جاگ رہے ہیں اس لیے آپ بے فکری سے سو سکتے ہیں۔

انہوں نے اپنے دو ساتھی احتیاطاً چیک پوسٹ پر بھی چھوڑ دیے تاکہ اگر کوئی بھی غیر معمولی صورت حال پیش آئے تو اسے سنبھالا جا سکے۔ اتنے سارے انتظامات کے بعد اب وہ ڈی ایس پی ظہیر خان کے گھر کے باہر موجود تھے اور ہر طرف سے قابلِ اطمینان رپورٹس ملنے کے بعد بس اب اندر جانے کے لیے تیار ہی تھے۔

"تم اپنے ساتھی کے ساتھ یہاں میرے پاس آجاؤ۔" معاذ نے دیکھا کہ اس کا ساتھی بجلی کے وہ تار کاٹ چکا ہے جو حفاظتی نقطہ نظر سے گھر کی باؤنڈری وال پر بچھائے گئے تھے۔ اپنے ساتھی کو اس کام پر اشارے سے داد دیتے ہوئے اس نے جارو کو ہدایت کی تھی۔

"او کے۔ ہم آرہے ہیں۔" اس نے جواب دیا اور عین اس وقت پر اس کے پاس پہنچ گیا جب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بس اندر داخل ہونے ہی کو تھا۔

"میں اور وکی اپنی اپنی ٹیم کے ساتھ اندر داخل ہوں گے۔ تم اپنی ٹیم کے ساتھ احتیاطاً باہر موجود رہنا۔" اس نے جارو کو ہدایت دی اور پھر کچھ کہنے کے لیے اپنے ساتھی کی طرف مڑا۔ وہ لوگ آپس میں مختلف ذمے داریاں بانٹ کر دو دو افراد کی ٹیم کی صورت میں کام کر رہے تھے جبکہ پورے مشن کو لیڈ کرنے کی ذمے داری معاذ کے سر تھی۔ اس کا انتخاب لالہ نے خود کیا تھا۔

"ایک منٹ معاذ! ذرا رکو۔" وہ اندر داخلے کے لیے دیوار پر چڑھنے ہی لگا تھا کہ جارو نے اسے روک لیا۔

"کیا ہوا؟" معاذ اس کی طرف پلٹا۔

"مجھے اندر سے کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی ہے۔" جارو نے مضطرب سے لہجے میں اسے آگاہ کیا تو وہ ٹھٹک گیا۔ اس کے حساب سے اندر موجود ہر شخص کو بے ہوش ہونا چاہیے تھا لیکن جارو بتا رہا تھا کہ اسے اندر سے کسی کے چلنے پھرنے کی آواز سنائی دی ہے۔ وہ جارو کی غیر معمولی سماعت سے واقف تھا اس لیے اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

"کس سمت سے آواز سنائی دی ہے؟ اکیلے شخص کے قدموں کی آواز تھی یا ایک سے زیادہ؟" اس نے تشویش اور بے چینی سے پوچھا۔

"ایک ہی شخص تھا اور مجھے بالکل ایسا لگا تھا جیسے کوئی تیز تیز چلتا ہوا ہماری ہی سمت بڑھ رہا ہو لیکن آواز دور کی تھی۔ شاید وہ دوسری منزل پر ہے۔" اس نے گردن اٹھا کر بالائی منزل کی کھلی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہاں اندھیرا تھا لیکن اسے ایسا لگا جیسے اس اندھیرے میں سے کوئی ان کی جانب دیکھ رہا ہے۔

"کیا ہوا جارو؟" معاذ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے مخاطب کیا۔

"شش!" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر معاذ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی سماعت کو پوری طرح اس سمت مرکوز کر دیا جہاں اس نے آخری بار تحرک محسوس کیا تھا۔ اندھیرے کے باعث نظر کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے حساس کانوں نے کھڑکی کا شیشہ سرکنے کی آواز سنی اور اس سے اگلی آواز خوفناک تھی۔ کسی ہتھیار کا سیفٹی کیچ ہٹایا گیا تھا۔

"ڈاؤن۔" وہ تیز لہجے میں بولا اور معاذ کو اپنے ساتھ لیتا ہوا نیچے گر گیا۔ نیچے گرتے گرتے معاذ کھڑکی سے نکلا شعلہ دیکھ چکا تھا۔ یعنی جارو کی سماعت نے بالکل ٹھیک خبر دی تھی اور اندر کم از کم کوئی ایک فرد ایسا تھا جو نہ صرف ہوش میں تھا بلکہ ان سے مقابلے پر بھی آمادہ تھا۔ موجودہ صورت حال میں صرف ایک بات ان کے حق میں جاتی تھی اور وہ یہ کہ فائر بے آواز ہتھیار سے کیا گیا تھا جس کی وجہ سے ارد گرد والے اب بھی بے خبر تھے۔

فائرنگ کا شور ہوتا اور پوری سوسائٹی کے مکین جاگ جاتے تو ان کے پاس فرار کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔

"سب لوگ احتیاط کریں۔ اندر ایک شخص ہوش میں ہے اور ہم پر فائر کر رہا ہے۔" معاذ نے نیچے پڑے پڑے سب سے پہلے ایئر پیس پر اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کیا پھر جارو سے مخاطب ہو کر بولا۔

"کیا کہتے ہو۔ وہ اکیلا ہی ہے یا اس کا ساتھ دینے کے لیے کوئی اور بھی موجود ہے؟"

"مجھے صرف ایک شخص کے حرکت کرنے کی آواز سنائی دی تھی۔ اگر کوئی اور بنا حرکت کیے بالکل خاموشی سے موجود ہے تو میں اندازہ نہیں لگا سکتا۔" جارو نے اسے جواب دیا۔ وہ دونوں اب تک دیوار کی جڑ کے پاس اسی جگہ موجود تھے جہاں فائر سے بچنے کے لیے گرے تھے۔ کھڑکی

سے اس جگہ تک فائر کے لیے زاویہ نہیں بنتا تھا اس لیے وہ بالکل محفوظ تھے اور یقیناً یہی وجہ تھی کہ دوسرا فائر نہیں کیا گیا تھا۔

"اس سے پہلے کہ یہ شخص ہمارے لیے مسئلہ بنے، ہمیں اندر داخل ہو کر اس پر قابو پانا ہوگا۔" معاذ بڑبڑایا اور پھر اپنے ساتھیوں کو اندر داخل ہونے کے سلسلے میں ہدایات دینے لگا۔ چونکہ وہ تین ٹولیوں میں تھے اس لیے بیک وقت تین مختلف مقامات سے باحتیاط اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا گیا۔

"ہم اسے اپنے ساتھ انگیج رکھیں گے تاکہ باقی لوگوں کو اندر داخل ہونے کا موقع مل سکے۔" اس نے جارو سے سرگوشی میں کہا۔ اس وقت ٹیموں کی ترتیب تھوڑی سی بدل گئی تھی۔ جارو کو اس نے اپنے ساتھ رکھا تھا جبکہ اس کے اور اپنے ساتھی کی ایک ٹولی بنا کر انہیں دائیں جانب سے اندر داخل ہونے کی ہدایت کی تھی۔ وکی کو اپنے ساتھی کے ساتھ بائیں سمت سے کوشش کرنا تھی جبکہ وہ اور جارو عقب میں موجود تھے۔

"میں دیوار پھلانگوں گا۔ تم مجھے کور دینا۔" اس نے جارو کو ہدایت دی۔

"ہم اندر داخل ہونے لگے ہیں۔" اس کی ہدایت کے مطابق دونوں ٹولیوں کی طرف سے آخری لمحات میں اطلاع دی گئی۔

"اوکے۔ پانچ تک گنتی گنو پھر جمپ کر جاؤ۔" اس نے ہدایت دی اور جارو کو اشارہ کر کے خود کسی بندر کی سی پھرتی کے ساتھ دیوار پر چڑھ گیا۔ جارو نے اس جانب فائر کیا جہاں ایک کھڑکی سے انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان کے پاس موجود ہتھیار بھی بے آواز تھے اس لیے فائرنگ کا شور ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ دوسری احتیاط اس نے یہ کی تھی کہ براہِ راست کھڑکی کا نشانہ لینے کے بجائے دیوار کا نشانہ لیا تھا۔ فائر سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹتا تو رات کے سناٹے میں آواز دور تک جاتی اور شور کسی طور ان کے حق میں نہیں تھا۔

معاذ اندر پہنچ گیا تو اس نے جارو کے اندر داخل ہونے کے لیے اسے کور دیا۔ جارو بھی بخیر و عافیت اندر پہنچ گیا۔ اس دوران حیرت انگیز طور پر ان پر ایک بھی فائر نہیں کیا گیا۔

"ہم اندر پہنچ چکے ہیں۔" باقی دونوں ٹولیوں کی طرف سے بھی انہیں باری باری اطلاع دی گئی۔

"ابھی اپنی جگہ رکے رہو۔" اس نے انہیں حکم دیا اور خود جارو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کچھ کہنا مشکل ہے۔ شاید اس نے ہمارے اندر داخل ہونے کے دوران اپنی جگہ بدل لی ہے لیکن میں اب اندازہ نہیں لگا پا رہا کہ وہ کس جگہ موجود ہے۔" اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں۔" اسے احساس ہوا کہ وہ جارو کی صلاحیت پر ضرورت سے زیادہ انحصار کر رہا ہے اس لیے اس کا شانہ تھپک کر اسے ریلیکس کیا اور خود اندر داخل ہونے کے سلسلے میں ساتھیوں کو ہدایات دینے لگا۔ چاردیواری سے اصل عمارت کے درمیان گھاس کے قطعات تھے۔ انہوں نے رینگتے ہوئے درمیانی فاصلہ طے کیا اور اپنے اپنے طور پر اندر داخل ہونے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ اس نے اور جارو نے عقبی حصے میں موجود ایک کھڑکی کا شیشہ کاٹ کر اندر جانے کا راستہ بنایا۔ وکی نے اپنی درختوں اور دیگر اونچے مقامات پر چڑھنے کی صلاحیت کا استعمال کیا اور رسی لگا کر سیدھا چھت پر پہنچ گیا۔ وہاں سے سیڑھی کے راستے اندر پہنچنا اس کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ ان کے ساتھیوں کی تیسری ٹیم نے نسبتاً آسان راہ اختیار کی تھی اور گھوم کر مرکزی دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازے کا لاک توڑ کر داخل ہونا خاصا آسان تھا۔ تینوں ٹولیاں ایک ایک کر کے گھر کے لاؤنج میں جمع ہو گئیں۔ پورے گھر میں اندھیرے اور سناٹے کا راج تھا اور انہیں روشنی کے لیے ٹارچیں جلانا پڑی تھیں۔

"سارے کمروں کو چیک کرو لیکن احتیاط سے۔ یہاں کم از کم ایک مسلح فرد چھپا ہوا ہے اور کسی بھی سمت سے ہم پر فائر کر سکتا ہے۔" اپنے ساتھیوں کو ہدایت دے کر معاذ خود ایک سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا اور ایک ایک کر کے سارے بٹن دبا ڈالے۔ نہ کوئی پنکھا چلا اور نہ روشنی ہوئی۔ اس طرح اس کے اس اندازے کی تصدیق ہو گئی کہ گھر کا مین سوئچ جان بوجھ کر آف کر دیا گیا تھا۔ جس شخص نے یہ حرکت کی تھی، ظاہر ہے وہ ان کے مقابلے میں اس گھر سے اچھی طرح واقف تھا اور اندھیرے میں بھی آسانی سے حرکت کر سکتا تھا۔ وہ سب ہی ہوشیاری سے گھر کا جائزہ لینے لگے۔ حلیے سے ملازمہ دکھائی دینے والی ایک عورت باورچی خانے میں رکھی چھوٹی ڈائننگ ٹیبل پر سر رکھے سوتی دکھائی دی۔ ایک ملازم لاؤنج کے قالین پر ہی لمبا لیٹا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں دو نوجوان لڑکیاں یوں ایک دوسرے کے

شانے پر سر رکھے سو رہی تھیں جیسے باتیں کرتے کرتے اچانک شدید نیند آگئی ہو۔ اگلے کمرے میں لڑکیوں سے عمر میں کچھ بڑا دکھائی دینے والا لڑکا رائٹنگ ٹیبل پر سر رکھے سو رہا تھا اور اس کا لیپ ٹاپ سامنے کھلا رکھا تھا۔ ایک خواب گاہ میں درمیانی عمر کی خاتون سر سے پیر تک چادر اوڑھے محو خواب تھی۔ حقیقت میں گھر سوئے ہوئے محل کا منظر پیش کر رہا تھا یعنی ان کے لیے کام کرنے والے بندے نے پوری طرح کام انجام دیا تھا اور کہیں کوئی نہیں جاگ رہا تھا لیکن نہیں...... اس گھر میں ایک شخص ایسا تھا جو جاگ رہا تھا اور ان کی یہاں آمد سے واقف بھی تھا۔

"وہ ڈی ایس پی شمیر خان ہے۔" جائزہ دینے کے بعد انہیں اس شخص کا نام بھی پتا چل گیا تھا اور بالائی منزل کے اس کمرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جس میں اس نے خود کو بند کر رکھا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اس تک پہنچنے کی تدبیر کرتے، پولیس کی گاڑیوں کا ہوٹر سنائی دیا۔ وہ چونک کر کھڑکیوں کی طرف لپکے۔ باہر گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس چمک رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ کسی زخمی درندے کی طرح فرش پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اسے اپنے یوں بے بس کر کے قید کر دیے جانے پر بہت طیش تھا اور چاہتا تھا کہ سامنے آنے والے ہر شخص کو چیر پھاڑ کر رکھ دے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے ہاتھ پیروں میں بیڑیاں ڈال کر اسے کچھ بھی کرنے کے لائق نہیں چھوڑا گیا تھا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم اس حال میں خوش نہیں ہو۔ اپنا بے بس ہو جانا کسی کو بھی خوش نہیں کر سکتا لیکن تمہارے جیسا شخص جو ہمیشہ دوسروں کو بے بس کر کے ان کی بے بسی سے لطف اٹھاتا رہا ہو، اس تجربے کا حق دار ہے۔ یاد رکھنا میں تمہیں بے بسی کی اس انتہا پر لے جاؤں گا جہاں پہنچ کر تم ان سب مظلوموں کی تکلیف محسوس کر سکو جن پر تم نے اپنے شوقِ تماشا میں بے پناہ مظالم ڈھائے تھے۔"

اسے اس حال میں یہاں ڈالتے ہوئے یہ الفاظ معاذ نے ادا کیے تھے۔ وہ ان الفاظ کو بھول بھی جاتا تو بشریٰ کی نفرت بھری نگاہوں کو نہیں بھول سکتا تھا۔ ان نظروں میں انتقام کی وہ چاہ تھی جو اس جیسے شخص کا دل بھی ایک پل کے لیے لرزا کر رکھ دیتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ان میں سے کسی کے بھی کام کا نہیں ہے۔ آپ اپنے دشمن کے لیے کارآمد نہ ہوں اور وہ پھر بھی آپ کو زندہ رکھے تو اس کا صاف مطلب ہوتا ہے...... وہ آپ کے روز جینے اور روز مرنے کا لطف لینا چاہتا ہے۔ وہ ایک دفعہ مرنے کو تیار تھا لیکن اس اذیت سے گزرنے کے لیے راضی نہیں تھا۔ اس نے اتنی بار انسانوں کو اپنی اذیت پسندی کی بھینٹ چڑھایا تھا کہ اسے ان کے سارے ردعمل حفظ ہو گئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اذیت سے گزرتے انسانی جسم کیسے اینٹھتے ہیں، کیسے انہیں جھٹکے لگتے ہیں۔ کیسے وہ اپنے آپ میں سکڑ کر بچنے کی کوشش کرتے ہیں، کیسے دم گھٹنے پر آنکھیں باہر کو نکلتی ہیں، کیسے حلق سے چیخیں برآمد ہوتی ہیں اور کیسے درد کے ناقابلِ برداشت ہو جانے پر ہوش و حواس ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ سب جانتا تھا کیونکہ اس نے کسی عام مجرم کی طرح لوگوں کو صرف ڈرانے، سزا دینے یا ان کی زبان کھلوانے کے لیے تشدد کا نشانہ نہیں بنایا تھا، وہ ان کی بے بسی اور تکلیف سے لطف کشید کرنے کے لیے انہیں اذیت کے مراحل سے گزارتا تھا۔ تو پتا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ اذیت سے گزرتا انسانی جسم کن مراحل سے گزرتا ہے اور وہ خود کو ان مراحل سے گزارنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے کسی شکاریوں کے نرغے میں آئے ہوئے چالاک درندے کی طرح اس نرغے سے نکل جانے کی تدبیر سوچتا رہتا تھا۔ بہت سوچنے پر بھی اب تک اسے ایسی کوئی تدبیر نہیں سوجھی تھی جو محفوظ ہو اور چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ انجام قریب، بہت ہی قریب ہے اس لیے اس نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا اور اب وہ داؤ کھیلنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس قید میں اسے چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار خوراک مہیا کی جاتی تھی اور اس کی بائیولوجیکل کلاک خوراک دیے جانے والے اس مخصوص وقت کے ساتھ ہم آہنگ ہو چکی تھی اس لیے وہاں کسی گھڑی کی موجودگی کے بغیر بھی اسے اندازہ ہو جاتا تھا کہ خوراک فراہم کیے جانے میں کتنا وقت باقی ہے۔

اس مخصوص وقت کے آنے میں اندازاً آدھا گھنٹا باقی تھا جب اس نے اپنے منصوبے پر عمل کرنا شروع کیا۔ وہ بیڑیاں جو اسے قید کیے ہوئے تھیں، اس کی آزادی کی جدوجہد کا حصہ بن گئیں۔ ان کی نپی تلی ضربات سے اس نے خود کو زخمی کرنا شروع کر دیا۔ اپنے آپ کو زخمی کرنا آسان نہیں تھا لیکن خود کو اس سے بڑی اذیت سے بچانے کے لیے وہ اس مرحلے سے گزر رہا تھا۔ تھوڑی ہی کوشش کے بعد وہ اس حد تک کامیاب ہو گیا کہ چھوٹے چھوٹے زخموں سے نکل کر بہنے والا خون اس کے چہرے کو تر کرنے لگا۔ اس نے اس خون کو اپنے ہاتھوں سے چہرے پر پھیلا کر مزید نمایاں

کیا اور پھر کسی مُردہ چھپکلی کی طرح ہاتھ پیر پھیلا کر یوں فرش پر لیٹ گیا جیسے جسم سے جان نکل چکی ہو۔ اس حالت میں پڑے پڑے کچھ دیر گزری تھی کہ اس کے حساس کانوں نے آہٹ سنی۔ پھر کوئی آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگا۔

"ہائے اور بابا یہ کیا ہوا؟" سیڑھیاں اترنے والا یقیناً حسبِ معمول سلاخوں کے پاس آ کھڑا ہوا تھا اور وہیں سے ہاتھ ڈال کر خوراک کا پیکٹ اندر رکھنے لگا تھا جب اس کی نظر باذل کے خون آلود چہرے پر پڑی اور گھبرا کر بے ساختہ بولا۔ باذل نے خود کو اس حد تک ساکت کر لیا کہ اپنی سانس بھی روک لی۔

"کہیں یہ مر تو نہیں گیا۔ اگر ایسا ہوا تو لالہ میری کھال کھینچ لے گا۔" اس نے بلند آواز میں خود کلامی کی۔ ساتھ ہی باذل کو اس کے متحرک قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس کے دل میں اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ صورت حال کی آگاہی کے لیے کسی کو بلانے واپس اوپر نہ چلا جائے۔ ایسا ہوتا تو اس کے لیے اپنے منصوبے پر عمل کرنا مشکل ہو جاتا۔

پلکوں میں احتیاط سے جھری بنا کر اس نے اس شخص کی طرف دیکھا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ دوبارہ اوپر جانے کے بجائے وہیں ایک کونے میں رکھا ڈنڈا اٹھائے واپس سلاخوں کی طرف آ رہا ہے۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں موند لیں۔ حسبِ توقع اس کے بدن سے ڈنڈا آ کر ٹکرایا۔ یقینی طور پر اس شخص کو اس کے متعلق خصوصی ہدایات دی گئی تھیں اس لیے وہ بھی سلاخوں کا تالا کھول کر اندر نہیں آتا تھا۔ اب بھی وہ باہر کھڑا اس کے بدن کو لے ڈنڈے سے چھو چھو کر اس کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"رب جانے مر گیا ہے یا صرف بے ہوش پڑا ہے۔" باذل نے اپنے جسم کو بالکل کسی مُردے کے جسم کی طرح اکڑا لیا تھا اس لیے وہ اس کے بارے میں کوئی حتمی نتیجہ قائم نہ کر سکا اور تذبذب کی کیفیت میں وہیں کھڑا رہا۔ اس کا یوں کھڑا رہنا باذل کے لیے مسئلہ خیز تھا۔ اصولاً اسے اس واقعے کی اطلاع دینے اوپر جانا چاہیے تھا لیکن وہ نہیں گیا تھا تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی تو سبب تھا۔ اس سب پر غور کرنے سے زیادہ وہ اس وقت اس شخص کے رد عمل پر توجہ مرکوز کیے ہوئے تھا چنانچہ جیسے ہی لوہے سے لوہا ٹکرانے کی ہلکی سی کھنکھناہٹ کانوں میں اتری، دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس شخص نے اوپر جا کر کسی کو مطلع کرنے کے بجائے خود اندر آ کر اسے چیک کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ فوراً الرٹ ہو گیا اور

اس کی اندھیرے میں شکار پر جھپٹ پڑنے کی ساری صلاحیتیں جاگ گئی تھیں۔ بند آنکھوں کے باوجود صرف آوازوں کے بل بوتے پر وہ تصور کی آنکھ سے سب دیکھ رہا تھا۔ تالے کے سوراخ میں چابی گھمائے جانے کی آواز، کنڈے سے تالا نکالے جانے کی آواز، کنڈی کھولے جانے کی آواز، سلاخوں والا دروازہ دھکیلے جانے کی آواز اور کسی کے اپنی جانب بڑھتے قدموں کی آواز۔ یہ آوازیں ایک مکمل تصویر تھی جس نے اس کے لیے پورا منظر واضح کر دیا تھا۔ جب ہی تو جیسے ہی وہ شخص اس کے قریب آ کر اس پر جھکا، اس نے اس بلا کی طرح آنکھیں کھول دیں جو صدیوں سے اپنے معبد میں بند کسی ایسے لمحے کی منتظر ہوتی ہے جب کسی کی غلطی اسے موت کی تاریکی سے نکال کر زندگی کی روشنی عطا کر دے اور وہ اپنے خونی پنجوں کی گرفت سے لوگوں میں خوف اور موت بانٹنے لگے۔

یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ اس پر جھکے شخص نے اس کے اچانک آنکھیں کھول دینے پر یکدم گھبرا کر پیچھے ہٹنا چاہا لیکن اسے موقع نہیں ملا اور بلا کو آزاد ہونے کا موقع فراہم کرنے کی غلطی کا خمیازہ اس طور بھگتنا پڑا کہ اس کی گردن باذل کی دونوں ہتھکڑیوں کے درمیان موجود زنجیر کی پکڑ میں اس طرح پھنس گئی کہ اس کا جسم پھڑک پھڑک گیا لیکن گردن کو اس وقت تک آزادی نہ ملی جب تک جسم پھڑکنا چھوڑ کر بے جان نہیں ہو گیا۔ اس کے بے جان لاشے کو فرش پر ڈال کر باذل نے جلدی سے اس ساری جدوجہد کے دوران نیچے گر جانے والا چابیوں کا گچھا اٹھایا اور اپنی بیڑیاں کھولنے لگا۔ اگلا مرحلہ یہاں سے باہر نکلنے کا تھا۔ اس نے مردہ پڑے شخص کے جوتے اتار کر اپنے پیروں میں پہنے اور اس کی قمیص سے اپنے خون آلود چہرے کو کسی حد تک صاف کر کے اس جانب بڑھا جہاں اس تہ خانے سے باہر لے جانے والی سیڑھیاں موجود تھیں۔ بیڑیاں بطور ہتھیار اس کے ہاتھ میں تھیں۔ مر جانے والے شخص کے نرم سول کے جوتوں نے اس کے قدموں کی احتیاط کے ساتھ مل کر اسے بالکل بے آواز اوپر تک پہنچا دیا۔ ایک ایک آواز پر کان دھرتے وہ خود بے آواز قدموں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ مرنے والے کے جوتے اس کے پیروں میں ایسے فٹ آئے تھے کہ لگتا تھا اسی کے ہوں۔ یہ آرام دہ جوتے اسے بڑی کامیابی سے لمحہ بہ لمحہ آزادی کے نزدیک لے جا رہے تھے۔ چند قدم مزید چل کر اسے احساس ہوا کہ وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں ہے اور شاید یہی وجہ تھی کہ مرنے والا کسی سے مدد طلب کرنے اوپر

نہیں آیا تھا۔
عمارت میں کسی کی بھی غیر موجودگی کا یقین ہو جانے کے باوجود وہ بے آواز قدموں چلتا خارجی راستے کی طرف بڑھا اور دروازہ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ باہر کم پاور کا بلب جل رہا تھا اور اس کی روشنی میں گیٹ کے قریب کرسی پر بیٹھا مسلح چوکیدار صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ عمارت اس طرز کی بند عمارتوں میں سے تھی جن میں آمد و رفت کے لیے چھوٹی گیٹ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ چوکیدار سے سامنا کیے بغیر باہر نکل سکے۔ چوکیدار سے نمٹنے کے لیے اس نے دماغ لڑایا اور اپنے ہاتھوں میں موجود چابیوں کو زور سے زمین پر پھینکا۔ شور اتنا تھا کہ گیٹ کے قریب بیٹھے چوکیدار کے کانوں تک بخیر و خوبی پہنچ گیا۔
"کیا کرتا پڑا ہے رومی استاد؟" اس نے وہیں سے آواز لگا کر پوچھا۔ رومی یقیناً اسی شخص کا نام تھا جو تہ خانے میں مردہ حالت میں پڑا تھا اور جس کے جوتے اس کے پیروں کو رومی کی بخشش تھے۔
"ذرا ادھر آؤ، میری مدد کرو۔" اس نے کوشش کی کہ اس کے حلق سے رومی جیسی ہی آواز نکل سکے۔ اس کی کوشش اس لیے بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی کہ باہر بیٹھے چوکیدار کو ایک فیصد بھی وہاں رومی کے سوا کسی کی موجودگی کا گمان نہیں تھا۔
"آ رہا ہوں استاد!" اس نے اپنی بندوق وہیں کرسی کے ساتھ ٹکائی اور ڈھیلے ڈھالے انداز میں اندر کی طرف بڑھا۔ بادل دروازے کی آڑ میں اس کا منتظر تھا۔ جیسے ہی چوکیدار نے قدم اندر رکھے، اس کی گردن بھی رومی کی طرح جکڑی گئی لیکن وہ رومی کے مقابلے میں زیادہ طاقتور اور جسیم تھا۔ آزاد ہونے کے باوجود بادل کو اس کو ٹھنڈا کرنے میں زیادہ جدوجہد کا سامنا کرنا پڑا۔ جب تک وہ شخص بے جان ہو کر زمین پر گرا، خود اس کا دم پھول چکا تھا۔ چند گہری سانسیں لے کر وہ خود کو معمول پر لایا اور اس کی کمر سے بندھے ہولسٹر سے ریوالور کھینچ کر اپنی کمر میں اڑس لیا۔ اب وہ یہاں سے جانے کے لیے بالکل آزاد تھا لیکن جب قسمت کی دیوی مہربان تھی تو دشمن کو بھاری زک پہنچائے بغیر ایسے ہی چلے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے شیطانی دماغ کی منصوبہ ساز فیکٹری سے فوری طور پر ایک منصوبہ برآمد ہوا اور وہ سوچتا ہوا اس عمارت کے کچن میں پہنچ گیا۔ اگلے لمحے وہ چولہے کی طرف جاتا گیس کا پائپ کھینچ کر نکال چکا تھا۔ پائپ نکلتے ہی گیس ایک شوکتی ہوئی آواز کے ساتھ تیزی سے خارج ہونے لگی۔ اس نے صفائی کے طور پر استعمال ہونے والا ایک کپڑا اور چولہا جلانے کے لیے استعمال ہونے والا لائٹر اٹھایا اور کچن سے باہر آ گیا۔ گیس اتنی تیزی سے خارج ہو رہی تھی کہ کچن کے باہر بھی اس کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے لائٹر سے کپڑے میں آگ لگائی اور اسے وہیں کھڑے کھڑے کچن میں اچھال کر خود تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ بند کر کے مین گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے اسے یقین تھا کہ اس بند عمارت میں خارج ہوتی گیس آگ کے ساتھ ملنے پر اس پوری عمارت کو خاکستر کیے بغیر نہیں رہے گی۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ رات کے اس پہر آس پاس والوں کو آگ لگنے کی خبر فوری طور پر ہونا مشکل تھا۔ وہ جوں جوں قدم اٹھاتا دور جا رہا تھا، اس کے دل میں اس خیال سے ٹھنڈک پڑتی جا رہی تھی کہ رہتے دنوں کی تکلیف کا اچھا بدلہ اتار کر جا رہا ہے۔
"ناظم آباد چلو گے؟" کافی آگے جا کر اسے ایک چوک پر ٹیکسی میں اونگھتا ڈرائیور دکھائی دیا تو اس کا شانہ جھنجھوڑ کر اس سے پوچھا۔
"چلوں گا پر کرایہ میٹر سے دوگنا ہوگا۔" ڈرائیور جانتا تھا کہ رات کے اس پہر سفر کے خواہشمند کی کوئی مجبوری ہوگی اس لیے منہ پھاڑ کر مطالبہ کیا۔
"بے فکر رہو۔ مجھ سے تمہیں وہ ملے گا جو آج تک کسی نے نہیں دیا ہوگا۔" وہ پچھلا دروازہ کھول کر نشست پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اندرونی بتی جلائی۔ عقب نما آئینے میں اسے ایک ایسا شخص دکھائی دیا جس کے سر کے بال الجھے ہوئے بے ترتیب تھے اور شیو خودرو جھاڑیوں کی طرح بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی۔ ان دونوں چیزوں کو اس نے نیم تاریکی میں بھی محسوس کیا تھا اور نظر انداز کر گیا تھا لیکن اب روشنی میں ان دو چیزوں کے ساتھ ساتھ بادل کے چہرے پر اب بھی کہیں کہیں لگے خون کے داغ اور پوری طرح چھائی وحشت نمایاں ہوئی تھی تو ٹیکسی ڈرائیور نے اپنے اندر خوف کی ایک لہر سی دوڑتی محسوس کی تھی۔
"ناظم آباد میں کہاں پہنچاؤں آپ کو؟" اسے اپنی ٹیکسی سے اتارنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈنے کے لیے اس نے سوال داغا۔
"کہیں بھی نہیں۔" بادل جو اس کے خوف اور تذبذب کو بھانپ چکا تھا، اطمینان سے بولا۔
"کیا مطلب؟" وہ حیران پریشان ہوا۔

"مطلب یہ کہ میں نے تمہارے ساتھ جانے کا فیصلہ تبدیل کر لیا ہے۔" اس کا جواب تو ٹیکسی ڈرائیور کے لیے اطمینان بخش تھا لیکن ہونٹوں پر دوڑتی پُراسرار مسکراہٹ پریشان کن تھی۔ پریشانی پر خوف اس وقت غالب آیا جب باذل نے ریوالور نکال کر یکدم ہی اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

"اب تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گے، صرف تمہاری ٹیکسی جائے گی۔ چلو اترو نیچے۔"

"رحم کرو صاحب! میرے پاس روزگار کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے۔" مجبوری نے خوف کے باوجود اسے منت سماجت پر آمادہ کیا اور اس کے آگے ہاتھ جوڑنے لگا۔

"آج کے بعد تمہیں کمانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔" ہنسی کے پیچھے کی پُراسراریت بڑھتی جا رہی تھی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے صاحب! جینے کے لیے کمانا تو پڑتا ہے۔" غریب کے لیے اس کی باتیں سمجھنا مشکل تھا۔

"نیچے اترو ورنہ گولی مار دوں گا۔" اس بار وہ اپنے مخصوص انداز میں غرایا۔ ارد گرد اگرچہ سناٹا تھا لیکن بہت دیر تک اس تماشے کو جاری رکھنا پھر بھی مناسب نہیں تھا۔ ڈرائیور بے حد مجبوری کے عالم میں ٹیکسی سے باہر نکلا اور ابھی نکلا ہی تھا کہ زوردار دھماکے کے ساتھ اس کا بھیجا اڑ گیا۔

"جینے کے لیے کمانا پڑتا ہے۔ جب جینا ہی نہیں ہے تو کمانے کا تکلف کس لیے؟"

اس نے ریوالور کو واپس اڑسا اور اگلی نشست پر منتقل ہوتے ہوئے انجن اسٹارٹ کر دیا۔ گولی چلنے کی آواز پر متوجہ ہو کر کوئی اس طرف آ کر بے چارے ڈرائیور کی لاش تک پہنچتا، اس سے قبل ہی ٹیکسی کو اس علاقے سے دور نکل جانا تھا۔

☆☆☆

"پھنس گئے۔ تم سالے سب کے سب چوہے دان میں پھنس گئے۔ تمہاری ہوشیاری نے خود ہی تمہیں یہاں لا پھنسایا ہے۔" وہ پولیس کی گاڑیوں کا سائرن سن کر ابھی کھڑکیوں کی طرف بھاگے ہی تھے کہ بند دروازے کے پیچھے سے ڈی ایس پی ظہیر خان کے چلانے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آنے لگیں۔

"تم لوگ پوزیشن سنبھالو لیکن میری طرف سے اشارہ ملنے سے قبل فائر نہ کرنا۔" معاذ نے ظہیر خان کے الفاظ سنے تھے لیکن فی الحال انہیں نظر انداز کر کے اپنے ساتھیوں کو ہدایت دینے لگا تھا۔ وہ اس وقت ایک حرام خور اور ملک دشمن پولیس والے کے گھر میں موجود تھا لیکن اپنے ہی ملک کے کسی ادارے کے خلاف گولی چلانے میں جھجک کا شکار تھا۔

"تم کیا ظہیر خان کو تر نوالہ سمجھ کر یہاں دوڑے آئے تھے۔ کیا تم نے سمجھ لیا تھا کہ میرا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے یا میں بے وقوف ہوں جو اپنے دشمنوں کی طرف سے چوکنا نہیں رہوں گا۔ ارے جاہلو! یہاں گارڈ روم سے ہر گھنٹے بعد میرے دفتر کال جاتی ہے کہ یہاں سب ٹھیک ہے۔ کال نہ جائے تو مطلب گڑبڑ ہے۔ تم نے میرے گارڈز سمیت سب کو بے ہوش کرنے کا انتظام کرتے ہوئے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اس سے آگے میرا اپنا انتظام کام کرنا شروع کر دے گا۔" ظہیر خان جو اب تک کسی ڈرے ہوئے چوہے کی طرح گھر کے کونے کھدروں میں چھپتا پھر رہا تھا، اپنے حواریوں کی آمد پر شیر ہو کر بڑھکیں مارنے لگا تھا لیکن اس شیر میں اب بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ دروازہ کھول کر بات کر پاتا۔

"ٹیم بند کرواؤ۔" معاذ نے ایک نظر بند دروازے کی طرف دیکھا اور اپنے پاس موجود ایئرپیس سے حکم صادر کیا۔ موجودہ حالات میں کوئی بھی قدم اٹھانے سے قبل وہ ایک بار لالہ کو آگاہ کرنا ضروری سمجھ رہا تھا۔ اس آپریشن کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر لالہ اپنی ایک ٹیم کے ساتھ بالکل تیار ایک قریبی ٹھکانے پر موجود تھا تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں ان کی مدد کے لیے پہنچ سکے اور وہ ایمرجنسی آ گئی تھی اس لیے اس کا لالہ سے رابطہ کرنا ضروری تھا۔

"ہاں بول، کیا مسئلہ ہے؟" دوسری طرف سے لالہ نے پہلی گھنٹی مکمل ہونے سے بھی پہلے کال ریسیو کی اور اس لہجے میں پوچھا کہ جیسے اسے تسلی دے رہا ہو کہ مسئلہ ہے بھی تو کوئی بات نہیں، وہ سارے مسئلے حل کر سکتا ہے۔

"باہر پولیس آ گئی ہے اور انہوں نے ہر طرف سے ہمیں گھیر لیا ہے۔" اس نے باہر سے سنائی دیتے ہوٹرز اور ناچتی روشنیوں کی وحشت کو پرے دھکیلتے پُرسکون لہجے میں لالہ کو اطلاع دی۔

"تم لوگ تھم کر رہو۔ میں بس پہنچ رہا ہوں۔" لالہ نے مختصر ہدایت دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اسی وقت باہر سے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا جانے لگا۔

"تم لوگوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ پولیس نے تمہیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ تم لوگ اپنے ہتھیار پھینک کر اور ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاؤ ورنہ دوسری صورت میں پولیس تمہارے خلاف کارروائی کرے گی۔" پولیس کی آمد سے جو

اچھل پڑی تھی، اس نے آس پاس کے مکینوں کو بھی نیند سے جگا دیا تھا جس کے باعث کئی گھروں کی بتیاں روشن ہونے لگی تھیں۔ یہ روشنیاں ظہیر خان کے تاریک گھر کو تو روشن نہیں کر سکی تھیں لیکن باہر موجود پولیس والوں کی حرکات و سکنات نظر میں آنے لگی تھیں۔

''تم لوگ کیسے ہو؟'' معاذ کو اپنے ان دو ساتھیوں کی فکر ہوئی جنہیں وہ سوسائٹی کی چیک پوسٹ پر چھوڑ آیا تھا چنانچہ ان سے رابطہ کر کے ان کا احوال جاننے کی کوشش کی۔

''ہم ایک قریبی گھر میں گھس گئے ہیں اور اس کے لان میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ ہمارے لیے کوئی حکم ہے تو بتائیں۔'' وہاں سے ملنے والا جواب اطمینان بخش تھا۔

''فی الحال انتظار کرو۔'' انہیں ہدایت دے کر اس نے ایک بار پھر اس بند دروازے پر نگاہ ڈالی جس کے پیچھے خود کو محفوظ تصور کرتا ظہیر خان مسلسل کچھ نہ کچھ بکواس کیے جا رہا تھا۔

''وکی!'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے وکی کو پکارا اور اس کے قریب آنے پر اسے سرگوشی میں کچھ ہدایات دیں۔ اگلے لمحے اس نے جو کیا وہ اندر بند ڈی ایس پی اور باہر موجود پولیس والوں دونوں کے لیے ایک شاک تھا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے صرف لاک نہیں توڑا تھا بلکہ دونوں فریقین کو لرزا کر بھی رکھ دیا تھا۔ ڈی ایس پی کی طرف سے تو فوری ردعمل بھی آیا اور اس نے جواباً ایک ساتھ کئی فائر جھونک دیے لیکن وہ لوگ اس کے لیے تیار تھے۔ ان کی طرف سے جواباً اس سے بھی زیادہ شدید فائرنگ کی گئی۔ اس فائرنگ کا مقصد ظہیر خان کو ہلاک یا زخمی کرنا نہیں، بلکہ محدود کرنا تھا۔ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ ظہیر خان کی طرف سے کوئی ردعمل نہیں آیا۔ یقیناً وہ خود کو کسی اندھی گولی کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے کہیں کونے کھدرے میں دبک گیا تھا۔ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر معاذ کمرے میں داخل ہونے میں کامیاب رہا تھا جبکہ وکی مسلسل اسے کور دے رہا تھا۔

''اندر کیا ہو رہا ہے؟ اگر کسی بھی شخص کو کوئی نقصان پہنچا تو تم لوگوں کو اس کا سخت خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔'' پولیس پارٹی کا لیڈر فائرنگ کی آوازوں سے گھبرا کر انہیں دھمکیاں دے رہا تھا۔

''اگر پولیس ایک انچ بھی آگے بڑھی تو ڈی ایس پی اور اس کی فیملی کے افراد کی لاشیں ایک ایک کر کے تمہارے سامنے ڈھیر کر دی جائیں گی۔'' اس اعلان کا جواب نے بہ آواز بلند جواب دیا تو اسے لگا کہ باہر یکدم سناٹا سا چھا گیا ہو۔ ادھر معاذ اور وکی اندر داخل ہو کر ڈی ایس پی کو قابو کر چکے تھے۔

''یہ سب تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔'' وہ دھمکیوں پر اتر آیا۔

''ہم سے زیادہ تمہاری پوزیشن نازک ہے ظہیر خان! تم ہماری فکر نہ کرو۔ ہم تو نکلے ہی مرنے یا مار دینے کا سوچ کر ہیں لیکن تم اپنے بیوی بچوں کا سوچو جو تمہاری حرکتوں کی وجہ سے آج اپنے گھر کی چار دیواری میں محفوظ نہیں۔''

''ہاتھ مت لگانا میرے بیوی بچوں کو۔ ان کا اس ساری لڑائی سے کوئی تعلق نہیں۔'' معاذ کی جوابی دھمکی ایسی نہیں تھی کہ ظہیر خان خود کو پرسکون رکھ سکتا۔

''عورتوں اور بچوں کا عموماً لڑائی سے تعلق نہیں ہوتا لیکن یہ ہم مرد ہی ہوتے ہیں جو انہیں اپنی لڑائی میں گھسیٹ لاتے ہیں۔ اب تم خود کو ہی دیکھ لو۔ ایک معصوم بچے کو اس کے گھر کی امان سے نکال کر اپنے قبضے میں لے لیا ہے اور چاہتے ہو کہ تمہارے بچوں کو کوئی کچھ نہ کہے۔''

''کون بچہ......؟ میرے پاس کوئی بچہ نہیں ہے۔'' اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا۔

''سائیں صداقت شاہ کے نواسے اعظم شاہ کو بھول گئے ہو ڈی ایس پی؟'' معاذ نے اس کی ٹھوڑی پر پسٹل کی نال کا دباؤ ڈالا۔

''وہ میرے پاس نہیں ہے۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''کیا یہ بھی نہیں جانتے کہ اسے کس کے حوالے کیا تھا؟'' اندر ڈی ایس پی ظہیر خان سے یہ گفتگو جاری تھی تو باہر پولیس والوں کے ساتھ بھی کشمکش چل رہی تھی۔ کچھ پولیس والوں نے کوشش کی تھی کہ چوری چھپے مکان کے اندر داخل ہو سکیں لیکن وہ جس طرف سے آگے بڑھتے تھے، وہاں قریب میں کوئی گولی آ کر گرتے ہوئے انہیں باور کروا دیتی تھی کہ اندر محصور ہو جانے والے پوری طرح چوکنے ہیں اور گھر جانے کے باوجود اتنے بے بس نہیں ہوئے ہیں کہ خود تک انہیں آسانی سے رسائی دے دیں۔

''بولو، کس کے حوالے کیا ہے اعظم کو؟'' وہ اس ایک سوال کے جواب کے حصول کے لیے جنونی ہو رہا تھا کہ ہر گزرتا دن نگل کی زندگی کی مہلت کو مختصر کرتا جا رہا تھا اور وہ ہر صورت مرنے سے قبل اسے اس کے بیٹے کی شکل دکھانا چاہتا تھا۔

"میرے ساتھ یہ سلوک کر کے تم کچھ حاصل نہیں کر پاؤ گے۔ جلد یا بدیر پولیس اندر آجائے گی اور تم سب کے سب یا تو مارے جاؤ گے یا زندگی بھر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑو گے۔" اپنے جبڑے پر پے در پے اس کے کئی مکّے کھانے کے بعد بھی ظہیر خان میں اتنا دم تھا کہ انہیں دھمکیاں دے رہا تھا۔

"یہ ایسے نہیں مانے گا۔ میں اس کے بیٹے کو لے کر آتا ہوں۔ اس کے سامنے بیٹھ کر اس کے بیٹے کا ایک ایک ریشہ الگ کریں گے تو یہ خود ہی اپنی زبان کھولنے پر مجبور ہو جائے گا۔" اب تک خاموش وکی نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا تو ظہیر خان کی رنگت زرد پڑ گئی اور وکی کے کمرے سے باہر نکلنے سے قبل ہی اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"مجھے اس کام کے لیے عرفان اللہ نے کہا تھا اور میں نے بچہ اس کے حوالے کر دیا ہے۔"

"اس نے بچے کا کیا کیا؟"

"میں نہیں جانتا۔ میری اتنی حیثیت نہیں کہ ایسے سوال جواب کر سکوں۔"

"جتنا پروٹوکول تمہیں ملا ہوا ہے، اسے دیکھ کر تو تمہاری حیثیت کے بہت اونچا ہونے کا اندازہ ہو رہا ہے۔ اتنی تام جھام سے کوئی عام ڈی ایس پی تو نہیں رہ سکتا۔" معاذ نے اس کا جواب سن کر طنز کیا۔

"میری جتنی دشمنیاں ہیں اس کے حساب سے سیکیورٹی کا تھوڑا انتظام کرنا پڑتا ہے لیکن آج کل تم لوگوں کے چکر میں کچھ زیادہ انتظام کیا گیا ہے۔ یہ ہر گھنٹے بعد کال والا سلسلہ بھی حال ہی میں شروع ہوا ہے۔" وہ یقیناً کمزور شخصیت کا مالک تھا جو بتانے پر آیا تو پھر سب کچھ ہی بتاتا چلا گیا تھا۔ ایسے لوگ دوسروں پر ظلم کرنے میں بہت آگے ہوتے ہیں لیکن جب خود پر اور اپنے اہل خانہ پر بات آتی ہے تو ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

"کیا تم لوگوں کو اندازہ تھا کہ ہم یہاں آئیں گے؟"

"بالکل، ویسے ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ نگی جعفری کی قبر پر ضرور آئے گی اور اس کے ساتھ تم میں سے کوئی نہ کوئی ضرور ہوگا۔"

"وہاں گھات لگا کر بیٹھنے کا فائدہ تو نہیں حاصل کر سکے تم لوگ۔"

"ہاں، میں مانتا ہوں کہ تم ہم سے زیادہ اسمارٹ ثابت ہوئے تھے لیکن دیکھو ایک بار پھر تم جال میں آ پھنسے ہو۔ سمجھنے والے سمجھتے تھے کہ اعظم تک پہنچنے کے لیے میں ہی تمہارے پاس واحد ذریعہ ہوں اس لیے تم میرے پیچھے ضرور آؤ گے اور تم آ گئے۔ اب یہ سوچو کہ باہر اتنی فورس کے ہوتے ہوئے تم یہاں سے نکلو گے کیسے؟ آخر کو اونٹ پہاڑ کے نیچے آ ہی گیا ہے۔" اسے ایک اطمینان سا تھا کہ وہ لوگ کچھ بھی کر لیں، آخرکار پکڑے جائیں گے۔

"تم باقی لوگوں کی طرح بے ہوش کیوں نہیں ہوئے تھے؟" باہر سے وقفے وقفے سے آوازیں آرہی تھیں جن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جادو اینڈ کمپنی پولیس والوں کی دھمکیوں اور اعلانات کے جواب میں مناسب ردعمل دے رہے ہیں اور انہوں نے ابھی تک پولیس کو ایسا کوئی موقع فراہم نہیں کیا ہے کہ وہ اندر تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس طرف سے اطمینان ہونے کے باعث وہ آرام سے ظہیر خان سے سوال جواب کر رہا تھا۔

"ویسے تو مجھے اس اتفاق نے بچایا کہ میں ایک فائل کی اسٹڈی میں مصروف ہونے کی وجہ سے خود کو سرو کی جانے والی کافی پینا بھول گیا اور کافی یونہی رکھی رکھی ٹھنڈی ہو گئی۔ کافی دیر بعد میں نے دوسری کافی کے لیے انٹرکام پر کچن سے رابطہ کرنا چاہا تو وہاں سے کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں کچھ غصے میں اپنی اسٹڈی سے باہر نکلا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس وقت پورے گھر میں صرف میں ہوں جو اپنے ہوش و حواس میں ہوں اور باقی سارے لوگ بے ہوش پڑے ہیں۔ قدرتی طور پر میں نے سب سے پہلے فون پر مدد کے لیے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن [illegible] کام کر رہا تھا اور نہ ہی مجھے سیٹ [illegible] باہر [illegible] پاتا اس سے قبل ہی [illegible] مجھے اندازہ ہو گیا کہ گھر کے باہر کچھ لوگ موجود ہیں جو [illegible] کر رہے ہیں۔ اس کے بعد میں نے جو کچھ کیا، وہ تم لوگ جانتے ہی ہو۔" اس نے ایک سوال کے جواب میں پوری کہانی سنا ڈالی۔

"تم نے کہا ویسے تو..... اس ویسے تو کا کیا مطلب ہے؟" معاذ نے اپنے ذہن میں اس کے اٹک جانے والے الفاظ کا مطلب پوچھا۔ یوں بھی ابا کی طرف سے کوئی پیغام آنے تک ان کے پاس وقت تھا اور اس وقت کو سوال جواب میں گزارا جا سکتا تھا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا۔ باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

انسان کس قدر نادان ہے کہ جانے کس زعم میں اپنی نام نہاد قابلیت کا نہ صرف پرچار کرکے خوش ہوتا ہے بلکہ دوسروں سے بھی یہی توقع لگاتا ہے کہ لوگ اس کی باخبری اور قابلیت سے مرعوب ہوں گے... لیکن کبھی کبھی اس قابلیت کا ایسا بھگتان بھی بھگتنا پڑتا ہے جیسا کہ اس نے بھگتا۔

ذراسی بات کا فسانہ بنا کر جیل کی ہوا کھانے والے نادان کا قصہ

ذراسی بات

غلام قادر



اردو ادب کے تمام بڑے مصنفین نے خاکے لکھے ہیں لیکن یہ خاکے مشہور لوگوں کے بارے میں لکھے گئے... یہ وہ لوگ ہوتے تھے جن کے بارے میں لوگ مزید جاننا چاہتے تھے لیکن میں ایسے شخص کے بارے میں لکھنا چاہ رہا ہوں جو قطعی مشہور نہیں ہے... یعنی اس کی شہرت ایسی نہیں ہے کہ اس کے محلے سے آگے پہنچی ہے۔

اس کا اصل نام کیا تھا؟ اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے... غلام محمد تھا یا غلام عباس یا پھر غلام اکبر... لیکن ہم نے ہمیشہ لوگوں کو اسے غلامو کے نام سے پکارتے سنا تھا۔ کچھ بچوں کے لیے جن میں، میں بھی شامل تھا، وہ غلامو چاچا تھا۔ کچھ بچے اس کے نام کے ساتھ ماموں کا لاحقہ بھی لگاتے تھے... بڑے البتہ اسے غلامو کے نام سے ہی پکارتے

تھے۔ موصوف کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کے سامنے کچھ بھی کہا جائے، وہ کہتے تھے۔ ”میں تو پہلے ہی جانتا تھا۔“ یہ فقرہ وہ محفل میں شریک لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے کہتے تھے لیکن کئی بار انہیں اس کے سنگین نتائج بھی بھگتنا پڑے۔ مثلاً محلے کی ایک لڑکی سحرش نے کورٹ میرج کرلی تو محلے میں ایک شور سا بلند ہوا۔ ہر کوئی خاص طور پر سحرش کی فیملی اس پر بہت رنجیدہ تھی۔ ایسے ماحول میں چاچا غلامو نے محلے میں رات میں سجنے والی محفل میں جب اپنی عادت کے مطابق سحرش کا ذکر آنے پر کہا۔ ”میں تو پہلے سے ہی جانتا تھا۔“ تو تمام لوگوں نے انہیں حیرت سے دیکھا۔ اس بیٹھک میں سحرش کے دو بھائی بھی شریک تھے۔ دونوں میں بڑا بھائی تو پھر بھی خاموش رہا لیکن چھوٹے نے غلامو چاچا کا گریبان پکڑلیا۔

”اگر تم پہلے سے جانتے تھے تو ہمیں کیوں نہیں بتایا؟“ اس نے غلامو چاچا کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔

وہاں موجود کچھ بڑوں نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی تو چھوٹے بھائی نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ شخص کل ہمارے گھر آیا تھا اور اس نے رات کا کھانا بھی ہمارے گھر ہی کھایا تھا لیکن ایک لفظ بھی اس بارے میں نہیں کہا۔ اب کہہ رہا ہے میں تو پہلے سے جانتا تھا۔“

کچھ دنوں بعد معاملہ کچھ ٹھنڈا ہوا لیکن دوبارہ اس وقت گرم ہوا جب سحرش نے کینیڈا سے اپنے گھر فون کیا اور بتایا کہ وہ کینیڈا میں ہے اور بہت خوش ہے۔ اس بار سحرش کے گھر والوں نے بیٹی کے اغوا کی رپورٹ درج کروائی اور لڑکے کے گھر والوں کو جرم میں شریک ٹھہرایا۔ غلامو چاچا کی گردان اب بھی جاری تھی۔ ”میں تو پہلے ہی جانتا تھا۔“ پولیس نے چاچا غلامو کو بھی تھانے میں بلوایا لیکن بیان وغیرہ لے کر چھوڑ دیا۔

اس فقرے نے غلامو چاچا کو جو سب سے زیادہ تکلیف دی وہ ان کی ٹیلی فونک گفتگو تھی۔ پی آئی اے کا طیارہ اغوا ہوا تو غلامو چاچا کے کسی جاننے والے نے انہیں فون پر اطلاع دی کہ پی آئی اے کا طیارہ اغوا ہو گیا ہے۔ غلامو چاچا نے اپنی عادت کے مطابق کہا۔ ”میں تو پہلے ہی جانتا تھا۔“ اب یہ نہیں معلوم کہ فون غلامو چاچا کا ٹیپ ہو رہا تھا یا ان صاحب کا فون ٹیپ ہو رہا تھا جو اطلاع دے رہے تھے لیکن اسی رات پولیس غلامو چاچا کے گھر آ گئی اور انہیں گرفتار کرلیا اور کچھ دن بعد وہ جیل شفٹ کر دیے گئے۔

تفتیش کے دوران ان سے ایک ہی سوال کیا جاتا رہا۔ ”آپ کیسے جانتے تھے کہ طیارہ اغوا ہوگا؟“

غلامو چاچا اس کے مختلف جواز دیتے رہے مگر تفتیش کرنے والے ان کے کسی جواز سے مطمئن نہیں ہوئے اور انہیں طیارہ اغوا سازش کیس میں ملزم نامزد کر دیا۔

غلامو چاچا نے عدالت میں وہی کچھ دہرایا جو اس سے پہلے وہ تفتیش کرنے والوں سے کہتے رہے تھے۔ عدالت نے گواہ طلب کیے تو غلامو چاچا نے محلے کے کچھ لوگوں کے نام دیے۔ ان میں سے بیشتر نے اپنی جان یہ کہہ کر چھڑائی کہ وہ عدالتوں کے چکر کاٹنا نہیں چاہتے۔ صرف سحرش کے دونوں بھائیوں نے گواہی دی اور پھر پورا واقعہ دہرایا جو ان کے ساتھ پیش آیا تھا۔

سحرش کے بھائیوں اور محلے کے چند معززین کی گواہی کے بعد عدالت اس نتیجے پر پہنچنے ہی والی تھی کہ ”میں تو پہلے ہی جانتا تھا“ غلامو چاچا کا تکیہ کلام ہے اور وہ ہر بات سن کر یہی فقرہ دہراتے ہیں کہ غلامو چاچا نے ایک نئی مصیبت اپنے گلے میں ڈال لی۔ جیل میں وہ اپنی بیرک میں بیٹھے تھے کہ ان کے ایک ساتھی قیدی نے اطلاع دی کہ طیارہ اغوا کرنے والوں نے ایک مسافر کو شوٹ کر کے اس کی لاش طیارے سے باہر پھینک دی ہے۔

چاچا غلامو نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنا تکیہ کلام نہ دہرائیں لیکن وہ اپنی تمام کوششوں میں ناکام ہوئے اور انہوں نے دہرا دیا۔ ”میں تو پہلے ہی جانتا تھا۔“

ساتھی قیدی نے کوئی انتظار کیے بغیر یہ فقرہ وہاں مامور پولیس والے کو پہنچا دیا۔

اب تفتیش کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چاچا غلامو لاکھ کہتے رہے کہ میں یہاں جیل میں ہوں۔ مجھے کس طرح معلوم ہو سکتا تھا کہ طیارہ ہائی جیک ہونے والوں نے کسی مسافر کو جان سے مار دیا ہے؟ لیکن تفتیش کرنے والے ان کی کسی بات کو ماننے تو کیا سننے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔ اس بار ان کی وہ درگت بنی کہ چاچا غلامو کو جیل کے اسپتال منتقل کرنا پڑا۔

ان کے گھر والے ان کی عیادت کے لیے اسپتال پہنچے تو چاچا غلامو نے روتے ہوئے ان سے اپنا حال بیان کیا۔ اس بار ان کی بیٹیوں سے برداشت نہیں ہوا پھر جب پندرہ دن بعد غلامو چاچا کو دوبارہ عدالت میں پیش کیا گیا تو ان کی بیٹیوں نے رو رو کر جج سے فریاد کی۔ اس پر جج نے سوال کیا۔ ”آپ چاہتی کیا ہیں؟“

چاچا غلامو کی بیٹیوں نے کہا۔ ”آپ یا تو ہمارے

والد کو رہا کر دیں یا انہیں عمر قید کی سزا دے دیں۔"

جج صاحب نے بیٹیوں کی زبان سے باپ کے بارے میں یہ سنا تو انہوں نے چاچا غلامو سے کہا۔ "آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی اولاد آپ سے کس قدر تنگ ہے کہ وہ آپ کی عمر قید کا کہہ رہی ہیں۔"

چاچا غلامو نے پہلے تو سنجیدگی سے جج کی بات سنی پھر کہا۔ "میں تو پہلے سے ہی جانتا تھا کہ میرے ساتھ یہ ہوگا۔"

جج صاحب نے غلامو چاچا کا بیان سنا اور انہیں دوبارہ جیل بھیج دیا۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ گزر گیا۔ ان کی دو درخواستِ ضمانت بھی مسترد ہو گئیں اور اس وقت جب ان کے اپنے گھر والے ان کی واپسی سے تقریباً مایوس ہو گئے تو ایک روز شام کے وقت چاچا غلامو گھر آ گئے۔

محلے والے ان کے گھر گئے اور ان سے معلوم کیا۔ "چار برس بعد ایسا کیا ہوا کہ وہ رہا ہو گئے؟"

غلامو چاچا نے کہا۔ "مجھے کچھ نہیں معلوم۔ بس ایک سپاہی میرے پاس آیا اور اس نے کہا آج بہت سے قیدی رہا ہو رہے ہیں۔ آپ کا نام بھی ان میں ہے۔ آپ اپنا سامان پیک کر لیں۔ بس مجھے اپنا بستر اور چند جوڑے جو میرے پاس تھے، لے کر سپرنٹنڈنٹ کے دفتر لے جایا گیا جہاں مجھ سے چند کاغذات پر دستخط لے کر مجھے موبائل میں بیٹھنے کا حکم دیا گیا اور میں یہ سمجھ بیٹھا کہ شاید مجھے عدالت میں پیش کیا جائے گا یا دوسری جیل شفٹ کرنے والے ہیں لیکن جب موبائل گلی کے کونے پر رکی تو مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے رہا کر دیا گیا ہے۔"

اتنا کچھ کہنے کے بعد چاچا غلامو نے ایک بار پھر وہی دہرایا جس کی وجہ سے انہیں طویل عرصہ جیل میں رہنا پڑا تھا۔ "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ میری رہائی یقینی ہے کیونکہ میں نے کوئی جرم کیا ہی نہیں۔"

لیکن وہ آخری بار تھا جب چاچا غلامو نے وہ فقرہ ادا کیا تھا۔ جب چاچا غلامو جیل میں تھے تو ان کی دونوں بیٹیوں کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ چاچا جب جیل سے گھر آئے تو ان کی بڑی بیٹی کو طلاق ہو گئی لیکن چاچا نے وہ فقرہ نہیں کہا کہ "میں تو پہلے سے ہی جانتا تھا کہ طلاق ہو گی۔"

چاچا اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ان کے انتقال کو اب پندرہ برس ہو چکے ہیں مگر ہمارے کان اب تک وہ فقرہ سننے سے محروم ہیں کہ "میں تو پہلے سے ہی جانتا تھا کہ ایسا ہو گا۔"

⌘⌘⌘

بے تحاشا

مرزا امجد بیگ

دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب اس کے کردار... بالکل سچ کہا ہے جو ہر دور کے منظر نامے پر فٹ بیٹھتا ہے۔ کھیل عشق کا ہو یا معاملہ قتل کا... حالات رقابت کو ظاہر کریں یا معالج اور مریض کی نفسیاتی الجھنوں کا احوال... ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اپنے حصے کا کردار ادا کرتے ہوئے کہیں حق تلفی کی کہانی رقم کردیتا ہے اور کہیں انتقامی کارروائیاں نیا محاذ کھول دیتی ہیں۔ وہ بھی ایک خوش گمان ایکٹر تھا جسے لگتا تھا کہ وہ بھیس بدل کر کچھ بھی کرلے... کبھی کسی کے ہاتھ نہیں لگ سکتا اور بس یہیں سے قدرت کے انتقام کی شروعات ہوجاتی ہے... کیونکہ انسان کتنا ہی بڑا اداکار کیوں نہ بن جائے مگر... پل بھر کی غفلت میں مارا جاتا ہے۔

رقابت اور لالچ کے ہاتھوں ایک معصوم قتل کی عبرت اثر روداد

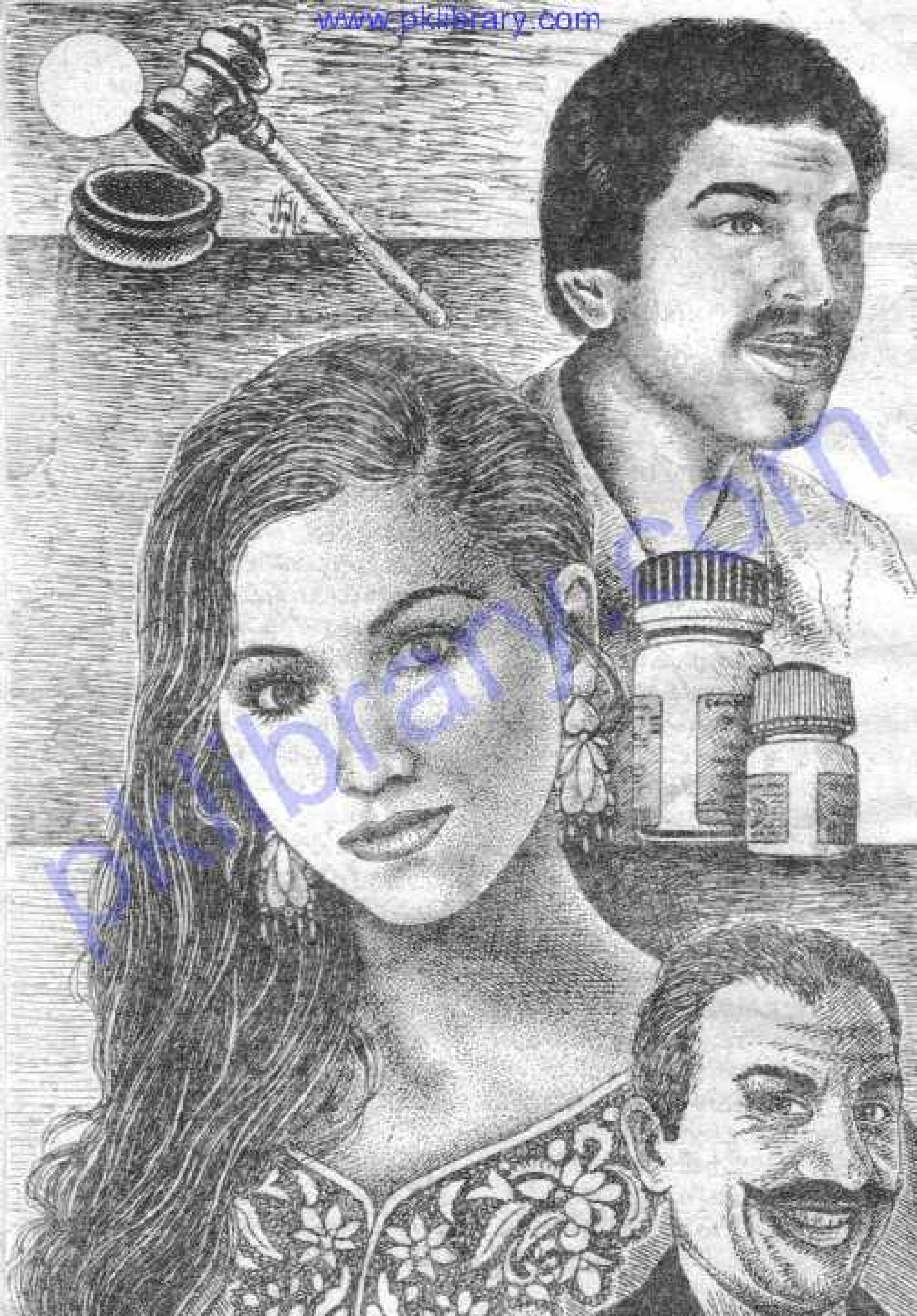
کیس کو عدالت میں گئے کم و بیش ایک ماہ ہوگیا تھا لیکن آج اس کی پہلی باقاعدہ سماعت تھی۔ میرا موکل ایک نفسیاتی معالج تھا اور وہ اپنی ایک پیشنٹ کے قتل کے الزام میں گرفتار ہوکر عدالت تک پہنچ گیا تھا۔

میں نے اچھی طرح اسٹڈی کرنے کے بعد ہی اس کیس میں ہاتھ ڈالا تھا۔ میری مخصوص پیشہ ورانہ تحقیق نے مجھے بتایا تھا کہ ملزم ڈاکٹر تابش بے گناہ تھا اس لیے میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اسے اس جھمیلے سے نکالنے کی تیاری کررکھی تھی۔ جیسا کہ میں نے ابتدا میں بتایا، آج پہلی باقاعدہ کارروائی تھی۔

جج کرسیِ انصاف پر متمکن ہوچکا تو اس نے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔

”پروسیکیوشن!“

”جنابِ عالی!“ وکیل استغاثہ نے کھنکھار کر گلا صاف کرنے کے بعد کہا۔ ”ملزم نے پوری منصوبہ بندی کے ساتھ مقتولہ تابندہ کو موت کی نیند سلایا ہے حالانکہ ایک ڈاکٹر کا کام انسان کی زندگی بچانا ہوتا ہے مگر بعض مسیحا اندر سے اتنے گھناؤنے ثابت ہوتے ہیں کہ لوگوں کا انسانیت کے ان محسنوں پر سے بھروسا اٹھ جاتا ہے۔ میری معزز عدالت سے درخواست ہے کہ کٹہرے میں کھڑے اس سفاک قاتل کی ضمانت کی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے



اس مقدمے کی کارروائی کو آگے بڑھایا جائے تاکہ اس خطرناک مجرم کو قرار واقعی سزا مل سکے۔"

وکیل استغاثہ نے پہلے ہی اوور میں لگاتار دو تین باؤنسرز گرا دیے تھے۔ میں نے پولیس کے تیار کردہ چالان کو بڑی باریک بینی سے پڑھا تھا اور مجھے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ استغاثہ کی کون سی شارٹ پچ ڈیلیوری کو کیسے اور کہاں پُل کرنا ہے۔

وکیل استغاثہ کی بات ختم ہوئی تو جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ڈیفنس پلیز!"

"یور آنر! اپنے موکل کی ضمانت کے حق میں کچھ کہنے سے پہلے میں وکیل سرکار کی بعض جذباتی معاندانہ غلطیوں کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو...... کیونکہ اگر کسی عمارت کی بنیاد میں کوئی کمی یا کمزوری رہ جائے تو اس کی پائیداری اور تکمیل کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ عدالت میں آنے والا ہر کیس بھی ایک عمارت کے مانند ہی ہوتا ہے جس کی نیو استغاثہ کے ہاتھوں سے رکھی جاتی ہے پھر دونوں جانب کے وکلا، اپنی اپنی طاقت، ہنر اور تجربے کی مدد سے اس عمارت کی تعمیر میں حصہ ڈالتے ہیں۔"

جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "پرمیشن گرانٹیڈ!"

"یور آنر! وکیل استغاثہ کے بیان کی روشنی میں، میں ان سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ انہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ ملزم نے کسی منصوبہ بندی کے تحت مقتولہ کو موت کی نیند سلایا ہے؟" میں نے معتدل انداز میں اپنے کام کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "کیا اس سلسلے میں ملزم نے میرے فاضل دوست سے کسی نوعیت کی مشاورت کی تھی؟ اور کیا جب مقتولہ کی موت واقع ہوئی تو اس وقت وکیل استغاثہ نے اپنی آنکھوں سے وہ بھیانک منظر دیکھا تھا کیونکہ ان کے لہجے کے اعتماد اور جوش سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ "موت کے منظر" کے عینی شاہد ہیں۔"

وکیل استغاثہ نے معاندانہ نظر سے مجھے گھورا اور خفگی بھرے لہجے میں بولا۔ "استغاثہ کے پاس ایسے ٹھوس ثبوت موجود ہیں جو ملزم کو گناہ گار ثابت کر دیں گے۔ میں نے کوئی بھی بات ایسے نہیں کہہ دی۔"

"ٹھوس ثبوت تو دونوں جانب کے وکلاء کے پاس ہوتے ہیں میرے فاضل دوست!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور ہر وکیل کو اس امر کا یقین بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے ٹھوس ثبوت کو پیش کر کے مخالف پارٹی پر سبقت اور فتح حاصل کرے گا لیکن اصل مسئلہ تو اس ٹھوس ثبوت کو معزز عدالت کی نظر اور معیار پر کھرا ثابت کرنے کا ہے۔ عموماً یہی ہوتا دیکھا گیا ہے کہ ایک طرف سے پیش کیے گئے ثبوت کو وکیل مخالف اپنے ٹھوس دلائل کے ذریعے پلک جھپکنے میں ریت کی دیوار بنا کر زمین بوس کر دیتا ہے۔ تو میرے فاضل دوست....!" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"خدارا! آپ اس کیس پر تھوڑا رحم کھائیں اور جب تک آپ کے ٹھوس ثبوت اس عدالت سے اعتبار کی سند حاصل نہیں کر لیتے، آپ میرے موکل کو ملزم ہی رہنے دیں۔ آپ نے اس کے لیے سفاک قاتل، خطرناک مجرم، انسانیت کا دشمن، معاشرے کا گھناؤنا کردار، جلاد، جلاد...... جیسے جو نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں، وہ ملزم کے ساتھ کھلی زیادتی ہے۔ آپ اپنی وکیلانہ توانائی کو عدالتی کارروائی کے لیے بچا کر رکھیں تو اسی میں آپ کی بھلائی ہے۔"

"پراسیکیوشن!" جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ غیر ضروری اور قبل از وقت الفاظ کا استعمال ترک کر کے اپنی بات جاری رکھیں۔"

"جناب عالی! استغاثہ کے گواہوں اور دیگر ٹھوس ثبوت کو وقت آنے پر عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔" وکیل استغاثہ نے برا سا منہ بنا کر مجھے دیکھنے کے بعد جج سے کہا۔ "فی الحال میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ ملزم کی درخواست ضمانت کو رد کرتے ہوئے اسے جوڈیشل کسٹڈی میں دے دیا جائے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔"

"جناب عالی! میرا موکل اور اس کیس کا ملزم اس معاشرے کا ایک معزز شہری ہے اور اس کا تعلق ایک معتبر پیشے سے ہے۔" میں نے ضمانت کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔ "تابندہ مرڈر کیس کی وجہ سے اس کی ساکھ اور شہرت کو بہت زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے لہٰذا انصاف کا تقاضا تو اس کی ضمانت کی منظوری کا متقاضی ہے۔"

"ملزم ایک با اثر شخص ہے یور آنر!" وکیل استغاثہ نے ایک بار پھر میرے موکل کی ضمانت رکوانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے آزاد رہنے سے زیر سماعت مقدمے پر منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔"

"یور آنر! میرے فاضل دوست تیز دھار تلوار کی مدد سے اڑتی ہوئی ایک مکھی کو قتل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "حالانکہ یہ بات انہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ معاشرے کے بااثر افراد کسی بھی قسم کی گرفت میں ہوں یا پھر آزاد، ان کے اختیارات اور رسائی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ مجھے یقین ہے ملزم کی ضمانت منظور ہوجانے سے اس کیس کے حوالے میں کوئی بدیہی تبدیلی نہیں آئے گی۔"

"یور آنر! یہ قتل کا مقدمہ ہے اور ملزم......؟"

"آپ کے پاس کوئی ایسا ثبوت ہے جس کی بنا پر ملزم کی درخواست ضمانت کو مسترد کرنا ناگزیر ہو جائے؟" جج نے وکیل استغاثہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔

وہ "آئیں، بائیں، شائیں" کرتے ہوئے پرانی گھسی پٹی باتوں کو دہرانے لگا۔ اس کے خاموش ہونے پر جج نے پچاس ہزار کے ذاتی مچلکوں پر ڈاکٹر تابش کی ضمانت بعد از گرفتاری کو منظور کرلیا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر کارروائی کا آغاز ہوا تو کمرۂ عدالت سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ گزشتہ پیشی پر میں نے اس کیس کی پہلی کامیابی حاصل کرلی تھی جس کا نام تھا...... اپنے موکل کی منظوری ضمانت۔ قتل کے کیس میں ملزم کی ضمانت کرانا ناممکن کی حد تک مشکل ثابت ہوتا ہے۔ بہرکیف یہ مشکل کام ہوچکا تھا۔ میرا موکل ایک آزاد ملزم کی حیثیت سے اس وقت اکیوزڈ باکس میں کھڑا تھا۔

جج نے فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کردیا۔

اس کے بعد ملزم کا بیان حلفی ریکارڈ کیا گیا۔ یہ تقریباً وہی بیان تھا جو وہ اس سے پہلے پولیس کو دے چکا تھا۔ بس، میری ہدایت پر ملزم نے اس بیان میں بعض نئی چیزیں شامل کرلی تھیں جن کی ایک مخصوص قانونی اور تکنیکی حیثیت تھی جو آگے چل کر ملزم کے لیے مفید ثابت ہونے والی تھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں پوسٹ مارٹم اور کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتولہ تابندہ کی موت سات جنوری کی دوپہر دو اور تین بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس کی موت کا سبب ایک خطرناک، سریع الاثر زہر "آرسینک ٹرائی آکسائیڈ" تھا۔ مقتولہ کے معدے میں آرسینک ٹرائی آکسائیڈ کی بھاری مقدار پائی گئی تھی۔ مقتولہ کی عمر تیس کے آس پاس تھی۔ وہ نہایت ہی پرکشش اور حسین و جمیل عورت تھی۔ اس کی لاش ایک مقامی ہوٹل کے کمرے میں پائی گئی تھی۔

ملزم کا بیان ریکارڈ ہوچکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اکیوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا۔ میرے موکل اور اس کیس کے ملزم تابش کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ درمیانے قد اور بھرے بھرے جسم کا مالک ایک صحت مند اور خوش شکل مرد تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی تھی اور یہ اس کے پیشے کا تقاضا بھی تھا۔ وہ ایک ماہر نفسیات تھا۔ اپنے کلائنٹس کو مطمئن اور صحت یاب کرنے کے لیے اس کی ذات اور زبان کا پُرتاثیر ہونا ضروری تھا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ مقتولہ آپ کے زیر علاج تھی؟" وکیل استغاثہ نے پہلا سوال کیا۔

ملزم نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"مقتولہ کب سے آپ کے پاس آرہی تھی؟" وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "اور اسے کون سی بیماری تھی؟"

"وہ لگ بھگ ایک سال سے میرے کلینک پر آرہی تھی۔" ملزم نے جواب دیا۔ "ایک صدمے نے اس کے دماغ کا کباڑا کردیا تھا۔"

"اور آپ اس کے دماغ کے کباڑخانے کی فرنشنگ میں مصروف تھے۔" وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "وہ اس ٹریٹمنٹ سے آپ کے قریب ہوتی چلی گئی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ڈاکٹر تابش؟"

"ایک ڈاکٹر خصوصاً ماہر نفسیات کا کام یہی ہے کہ وہ اپنے کلائنٹ کو اس صدمے سے باہر نکالے جس کے سبب اس کی زندگی کی صورت جہنم بن چکی ہوتی ہے۔" ملزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ "آپ بالکل درست فرمارہے ہیں کہ مقتولہ ہر گزرتے دن کے ساتھ میرے نزدیک ہوتی جارہی تھی۔ وہ دنیا میں سب سے زیادہ بھروسا مجھ پر کرنے لگی تھی اور یہی میرے علاج کی خاصیت اور کامیابی تھی۔ میں اسے ایک ایسے جذباتی صدمے سے باہر نکال لایا تھا جو اس کے لیے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ وہ میرے ٹریٹمنٹ سے تقریباً نوے فیصد ٹھیک ہوچکی تھی۔ زندگی کی حقیقت اس کی سمجھ میں آگئی تھی اور اب وہ ایک نئی امنگ اور ترنگ کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی تھی۔"

"اور وہ اس نئی امنگ اور ترنگ کا نام تھا ڈاکٹر تابش!"

وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" ملزم نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"آپ نے مقتولہ کو اپنی میٹھی اور چکنی چپڑی باتوں کے جادو میں اس طور جکڑ لیا تھا کہ اسے آپ کے علاوہ اس دنیا میں اور کوئی قابل بھروسا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔" وکیل استغاثہ نے سخت تیز انداز میں کہا۔ "وہ ساری زندگی آپ کی مہربان رفاقت میں گزارنے کا خواب دیکھنے لگی تھی۔ آپ نے اس کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن جب آپ نے یہ دیکھا کہ وہ آپ کے لیے مصیبت بنتی جا رہی ہے تو پہلے آپ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر آپ کی ہر نصیحت بے اثر ثابت ہوئی۔ آپ کی جس سائیکو تھراپی نے پہلے مقتولہ کو مایوسی کے اندھیرے سے نکال کر جینے کا حوصلہ دیا تھا، اب وہی تھراپی کسی کام کی نہیں رہی کیونکہ مقتولہ نے آپ کو حاصل کرنے کی ٹھان لی تھی اور آپ ایسا نہیں چاہتے تھے لہٰذا جب آپ کے تمام نفسیاتی حربے اور ترکیب ناکام ہو گئے تو آپ نے مقتولہ سے جان چھڑانے کا فیصلہ کر لیا۔"

"وکیل صاحب! آپ کی بیشتر باتیں درست ہیں سوائے آخری بات کے کہ مقتولہ کی موت کا ذمے دار میں ہوں۔" ڈاکٹر تابش نے تحمل لہجے میں جواب دیا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ ایک ماہر نفسیات اپنے کلائنٹ کی دماغی صحت کو نارمل کرنے کے لیے اس کے جذباتی معاملات کے انتہائی قریب ہو جاتا ہے اور اسے یہ احساس دلا دیتا ہے کہ وہ اس پر اندھا اعتماد کر سکتا ہے۔ نفسیاتی علاج میں پیشنٹ کا اپنے معالج پر کامل بھروسا کرنا بہت ضروری ہے ورنہ کوئی بھی تھراپی نتیجہ خیز اور کارآمد ثابت نہیں ہو پاتی۔ مقتولہ کے کیس میں بھی یہی معاملہ تھا۔ اس نے میرے زیر علاج رہتے ہوئے یہ تمام نفسیاتی مراحل طے کیے تھے تبھی میں اسے مایوسی کے گھپ اندھیرے سے نکال کر زندگی کی طرف لانے میں کامیاب ہو پایا تھا۔ باقی جہاں تک آپ کی آخری بات کا تعلق ہے تو..." وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"وہ آپ کے ذہن کی اختراع ہے۔ یہ حقائق سے تعلق نہیں رکھتی۔ میں نے مقتولہ کے اندر جینے کی امنگ اور حوصلہ ضرور پیدا کیا تھا مگر اسے ایسی کوئی امید نہیں دلائی تھی جس سے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ میں اس کی ذمے داری اٹھانے کو تیار ہوں اور میں نے اس کے اندر بھی ایسی کوئی چیز محسوس نہیں کی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ میری زندگی کا حصہ بننے کی خواہش مند ہے۔"

"وقوعہ سے چند روز پہلے..." وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "مقتولہ آپ سے ملنے آپ کے اپارٹمنٹ تک چلی آئی تھی۔ آپ نے اسے بہت جلدی فارغ کر دیا تھا لیکن اس کے جانے کے بعد آپ دونوں میاں بیوی میں زبردست جھگڑا ہوا تھا اور اس جھگڑے کا سبب مقتولہ ہی تھی؟"

"ہاں... بالکل!" ملزم نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "ایسا واقعہ رونما ہوا تھا۔ مقتولہ کا نفسیاتی علاج مکمل کرنے کے بعد میں اس سے رابطے میں نہیں رہا تھا اس لیے وہ مجھ سے ملنے گھر چلی آئی تھی۔"

"گھر پر ہی کیوں؟" وکیل استغاثہ نے تیز آواز میں استفسار کیا۔ "وہ آپ کے کلینک پر بھی تو آپ سے ملنے آ سکتی تھی۔"

"بالکل اصولی طور پر تو اسے کلینک پر ہی آنا چاہیے تھا۔" ملزم نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "وہ میرے گھر پر کیوں چلی آئی تھی، اس کا جواب آپ کو مقتولہ ہی دے سکتی ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

میرا موکل ایک تعلیم یافتہ، ذہنی امراض کا معالج تھا۔ وہ جچے تلے الفاظ میں کمال اعتماد کے ساتھ وکیل سرکار کی جرح کا سامنا کر رہا تھا۔ مجھے ابھی تک ایک بار بھی اس کی مدد کے لیے مداخلت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں ملزم کی کارکردگی سے پوری طرح مطمئن تھا۔

"کیا اس سے پہلے بھی مقتولہ کبھی آپ کے گھر آئی تھی؟" وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

ملزم نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں۔"

"یعنی وہ مقتولہ اور آپ کی بیوی نادرہ کی پہلی ملاقات تھی؟"

"جی ہاں۔"

"حیرت کی بات ہے۔" وکیل استغاثہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "آپ کی بیوی مقتولہ کو پہلے سے نہیں جانتی تھی۔ وہ دونوں پہلی بار ملی تھیں پھر مقتولہ کے جانے کے بعد آپ دونوں میاں بیوی کے جھگڑے کا سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ معزز عدالت آپ کی زبان سے حقیقت جاننا چاہتی ہے۔"

"دراصل بات یہ ہے کہ نادرہ مقتولہ کو میری کلائنٹ کی حیثیت سے غائبانہ طور پر جانتی تھی۔" ملزم نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "نادرہ ایک شکی مزاج عورت ہے۔ وہ

میری جو فیملی کلائنٹ کو شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔ سائیکو تھراپی کو پراثر بنانے کے لیے ایک نفسیاتی معالج کو اپنے کلائنٹ کے ساتھ بہت زیادہ گھلنا ملنا پڑتا ہے۔ اسے یہ احساس دلانا پڑتا ہے کہ معالج کو اس کا بہت زیادہ خیال ہے تبھی جا کر دماغی مریض جذباتی صدمے سے باہر نکل پاتا ہے۔ میری اپنے کلائنٹ کے ساتھ اسی انسیت اور لگاؤ کو نادرہ منفی نظر سے دیکھتی ہے۔"

"تمام کلائنٹس نہیں ڈاکٹر صاحب...!" وکیل استغاثہ قطع کلامی کرتے ہوئے چبھتے لہجے میں بولا۔ "صرف فیمیل کلائنٹس... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"ہاں، آپ کا اندازہ درست ہے۔" ملزم نے مختصر جواب دیا۔

"اور خاص طور پر وہ فیمیل کلائنٹس جو کلینک کے بجائے گھر آنا شروع کردیں۔" وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا مقتولہ سے پہلے بھی آپ کی فیمیل کلائنٹس آپ سے ملنے آپ کے گھر آتی رہتی ہیں... مطلب، آتی رہی تھیں؟"

"نہیں، ایسا پہلی بار ہوا تھا۔"

"پھر تو آپ کی بیوی کے شک میں خود بخود وزن بڑھ جاتا ہے۔" وکیل استغاثہ نے ذومعنی انداز میں کہا۔

"آپ اپنے انداز میں سوچنے کے لیے آزاد ہیں وکیل صاحب!" ملزم نے بے پروائی سے کہا۔

"میں آپ کی بیوی کی سوچ کی بات کر رہا ہوں۔" وکیل استغاثہ نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ "مقتولہ پہلی مرتبہ آپ کے گھر پہنچی تو اس کی آمد کو لے کر آپ کی بیوی نے خوب ہنگامہ مچایا تھا۔ مچایا تھا یا نہیں؟"

"مچایا تھا۔" ملزم نے رسانیت بھرے انداز میں کہا۔

"کیونکہ آپ کی بیوی کو شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ آپ کا مقتولہ کے ساتھ کوئی سنجیدہ چکر ہے۔" وکیل استغاثہ نے تیز آواز میں کہا۔ "آپ کی رہائش گلشن اقبال کے علاقے تیرہ ڈی میں ہے اور آپ کا کلینک بلاک ٹو پی ای سی ایچ ایس میں واقع ہے جبکہ مقتولہ کا گھر خداداد کالونی میں ہے۔ آپ کا کلینک، مقتولہ کے گھر کے انتہائی نزدیک پایا جاتا ہے لیکن وہ کلینک کے بجائے کئی کلومیٹر دور آپ کے گھر پہنچ گئی۔ آپ کی بیوی کا شک کرنا تو بنتا ہے نا ڈاکٹر صاحب!"

وکیل استغاثہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ میرے موکل کو کارنر کرنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن ملزم ابھی تک اس کے دباؤ میں نہیں آیا تھا۔

"نادرہ میرے اور مقتولہ کے تعلقات کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے، یہ آپ اسی سے پوچھ لیجیے گا کیونکہ مجھے پتا چلا ہے نادرہ کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل ہے۔" ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "باقی جہاں تک میری سوچ کا تعلق ہے تو میں اس بارے میں آپ کو واضح طور پر بتا چکا ہوں۔"

"آپ کی بیوی کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں اس لیے موجود ہے کہ وہ اس واقعے کے بعد آپ کو چھوڑ کر جا چکی ہے۔" وکیل استغاثہ نے جارحانہ انداز میں کہا۔ "وہ اس وقت اپنے میکے میں ہے اور آٹھ سالہ کرن بھی اس کی کسٹڈی میں ہے۔ کوئی بھی بیوی یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ اس کا شوہر پرائی عورتوں سے راہ و رسم بڑھائے اور وہ نامحرم عورتیں گھر تک بھی آنے لگیں۔"

"نادرہ کا روٹھ کر میکے چلے جانا آپ کا تراشا ہوا افسانہ ہے وکیل صاحب!" ملزم نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہم میاں بیوی کے درمیان ہونے والی لڑائی کا تعلق مقتولہ کے میرے اپارٹمنٹ پر آنے سے ہرگز نہیں ہے۔"

"تو پھر کس سے تعلق ہے؟" وکیل استغاثہ نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

"یہ جاننا آپ کے لیے ضروری نہیں ہے۔" ملزم نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "وہ ہماری نوعیت کا ایک خانگی معاملہ تھا۔"

"اوہ، اچھا...!" وکیل استغاثہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "آپ یہ تو تسلیم کرتے ہیں نا کہ نادرہ آپ کی دوسری بیوی ہے۔ آپ کی پہلی شادی عارفہ نامی ایک عورت سے ہوئی تھی جو ایک انتہائی امیر باپ فرقان حمید کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بزنس مین فرقان حمید نے اپنی بیٹی کی خوشی اور آرام و آسائش کی خاطر آپ کو اس مقام تک پہنچانے میں اپنی دولت کا بے دریغ استعمال کیا تھا۔ آپ کی نفسیات کی پڑھائی رہی ایک طرف لیکن اگر معاشرتی اور معاشی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس وقت آپ کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ آپ کے خسر اول فرقان حمید ہی کا عطا کردہ ہے۔"

"ہاں، یہ ایک حقیقت ہے۔" ملزم نے تصدیقی انداز میں کہا۔ "انکل فرقان کے احسانات کا شمار ممکن نہیں ہے۔"

"آپ نے ان کے احسانات کا صلہ بھی خوب دیا تھا۔" وکیل استغاثہ نے زہریلے انداز میں کہا۔ "آپ کی پہلی بیوی اور فرقان حمید کی اکلوتی بیٹی عارفہ کی موت کے بعد بعض لوگوں کی انگلیاں آپ کی جانب اٹھی تھیں۔"

"آبجیکشن یور آنر!" میں نے بہ آواز بلند کہا۔ "میرے فاضل دوست اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ اس وقت عدالت میں "تابندہ سرور کیس" کی سماعت جاری ہے اور اس معاملے کا ملزم کی زوجۂ اول اور زوجۂ دوم سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اگر وکیل سرکار مقتولہ تابندہ کو ملزم کی ہونے والی تیسری متوقع بیوی سمجھ بیٹھے ہیں تو یہ ان کا دماغی فتور ہے۔ میرے خیال میں اس قسم کی فضول بحث معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ویٹس آل یور آنر!"

"آبجیکشن سسٹینڈ!" جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ "پراسیکیوشن غیر ضروری باتوں میں الجھے بغیر جرح کا عمل جاری رکھے۔"

وکیل استغاثہ نے ناپسندیدہ نظر سے مجھے گھورا اور دو چار مزید سوالات کے بعد اپنی جرح کے اختتام کا اعلان کر دیا۔ "مجھے ملزم سے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!"

زیر سماعت کیس سے متعلق سوالات تو وکیل استغاثہ نے پہلے دن سماعت ہی میں ملزم سے پوچھ لیے تھے۔ اس کے بعد اپنی جرح کو بھاری بھرکم بنانے کی محض ایک بھونڈی اور بے اثر کوشش ہی تھی اور جج کی تاکید کے بعد اس کوشش کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔

اپنی باری پر میں اکیوزڈ باکس کے نزدیک چلا گیا۔ اگر دیکھا جائے تو مجھے اپنے موکل سے کچھ بھی نہیں پوچھنا تھا مگر وکیل سرکار نے نادرہ اور عارفہ کے معاملات کو اچھال کر ملزم کی پوزیشن کو کمزور اور مشکوک بنانے کی جو سعی کی تھی، اس کا جواب عدالت کے ریکارڈ پر آنا بہت ضروری تھا تاکہ سند رہے اور آئندہ عدالتی کارروائی کے دوران میں استغاثہ کی جانب سے ایسی مزید کسی کوشش کا امکان باقی نہ رہے۔

"تابش صاحب!" میں نے اپنے موکل کو مخاطب کرتے ہوئے نرم لہجے میں استفسار کیا۔ "آپ نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وفات سے پہلے مقتولہ کم و بیش ایک سال سے آپ کے زیر علاج تھی مگر ابھی تک اس کے دماغی مرض کا کہیں ذکر نہیں ہوا۔ کیا آپ اپنے کلائنٹ کے مسئلے پر تھوڑی روشنی ڈالیں گے؟"

"تابندہ بہت زیادہ اذیت سے گزر رہی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ایک بوڑھے باپ کے سوا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ اس کی ماں فضیلہ بیگم پانچ سال پہلے فوت ہو گئی تھی۔ اس کا باپ ظہور حسین ایک ریٹائرڈ سرکاری اہلکار ہے۔ وہ اپنی زندگی میں مقتولہ کا گھر بسانے کے لیے کوشاں تھا۔ تابندہ ایک پرکشش اور نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی تھی۔ تیس سال کی ہو جانے کے باوجود بھی وہ بائیس تیئس سے زیادہ کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بہرحال ظہور حسین نے ایک جگہ اس کا رشتہ طے کر دیا۔ یہ مقتولہ کی وہ ہسٹری ہے جو اس کے باپ ظہور حسین نے خود مجھے بتائی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو علاج کی غرض سے میرے کلینک پر لے کر آیا تھا اور مجھ سے منت کی تھی کہ میں کسی بھی طرح مقتولہ کو نارمل کر دوں۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"مقتولہ کا رشتہ جس لڑکے کے ساتھ طے ہوا اس کا نام جمشید تھا اور وہ تابندہ سے پانچ سال چھوٹا تھا۔ جب انہیں ملنے اور بات چیت کا موقع ملا تو مقتولہ کو اپنے منگیتر سے محبت ہو گئی پھر دیکھتے ہی دیکھتے مقتولہ کی محبت میں بے انتہا شدت پیدا ہو گئی۔ یہ وہی وقت تھا جب منگیتر کے ایک غیر متوقع فیصلے نے مقتولہ کے دماغ کے پرخچے اڑا دیے تھے.....!"

"ایسا کیا ہو گیا تھا؟" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے سوال کر دیا۔

"جمشید نے یہ رشتہ توڑنے کا اعلان کر دیا تھا۔" ملزم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے انکشاف انگیز انداز میں جواب دیا۔ "اسے اپنی ایک گرین کارڈ ہولڈر کزن زیادہ پسند آ گئی تھی۔ اس امریکا پلٹ کزن کا نام راحیلہ تھا اور وہ جمشید سے عمر میں نہ صرف تین سال بڑی تھی بلکہ واجبی سی شکل و صورت کی حامل ہونے کے علاوہ بے انتہا موٹی اور بے ڈھنگی بھی تھی۔ بیشتر لحاظ سے راحیلہ میں صرف ایک ہی خوبی تھی کہ وہ گرین کارڈ ہولڈر تھی اور شادی کرنے پاکستان آئی ہوئی تھی۔ جمشید نے وقتی فائدے اور امریکا میں قانونی قیام کے لالچ میں آ کر مقتولہ کی محبت کو جوتے کی نوک پر مارا اور دو ماہ کے اندر ہی وہ راحیلہ کے ہمراہ کراچی سے ٹیکساس پہنچ گیا۔"

"اوہ..... یہ تو بہت برا ہوا۔" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ "اس ٹریجڈی نے مقتولہ کی دماغی حالت کو نقصان پہنچایا ہوگا۔"

"کوئی ایسا ویسا نقصان وکیل صاحب!" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "اس کی محبت کا کانچ محل تو کرچی کرچی ہوا ہی تھا، اس پر مستزاد یہ کہ وہ کم ظرف جمشید اس کی انا اور خودداری پر بھی کوڑے برسا گیا تھا۔ اگر راحیلہ عمر، صحت، تعلیم، خوبصورتی یا کسی بھی زاویے سے مقتولہ سے برتر ہوتی تو شاید وہ جمشید کے اس فیصلے سے اتنا زیادہ متاثر نہیں ہوتی

مگر وہ کمینہ اتنی سی کی ایک دھوبن کی خاطر اسے ٹھکرا کر چلا گیا تھا۔ صرف اور صرف امریکی شہریت کے لالچ میں۔"

"میں اور گرانے عدالت میں موجود ہر ذی شعور مرد و زن یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس ناخوشگوار بلکہ واہیات واقعے نے مقتولہ کے جذبات و احساسات کو کیسی کیسی جاں سوز آزمائشوں سے گزارا ہوگا۔" میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

"اس حادثے نے مقتولہ کے دماغ کو بری طرح تباہ و برباد کر دیا تھا۔" ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اسے اپنی محبت پر بلکہ خود پر بھی اعتبار نہیں رہا تھا۔ وہ جب بھی اس واقعے کے بارے میں سوچتی تو اسے غش (دورے) پڑنے لگتے تھے۔ جب تہور حسین اسے میرے پاس لے کر آیا تو اس کی دماغی اور جسمانی صحت ٹوٹنے کی کگار پر تھی۔ مقتولہ کی سوچ میں اس نکتے کو جاگزیں کرنے میں مجھے ایک سال لگ گیا کہ...... "محبت، پیار اور عشق انسانی دماغ میں وقوع پذیر ہونے والے ایک کیمیائی ردعمل (کیمیکل ری ایکشن) کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے......!"

"یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "ظاہر ہے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آپ نے اسپیچ تھراپی کے علاوہ مخصوص ادویات کا استعمال بھی کیا ہوگا۔"

"میڈیکیشن، نفسیاتی علاج کا ایک حصہ ہی ہے۔" اس نے معتدل انداز میں بتایا۔ "ایک جانب مقتولہ کی دماغی حالت تباہ تھی تو دوسری طرف اسے دورے بھی پڑنے لگے تھے۔ دو تین بار تو اسے میرے کلینک پر بھی دورہ پڑا تھا جو اپی لیپسی (مرگی) کے دورے جیسا تھا۔ ہاتھ پاؤں خطرناک انداز میں مڑے ہوئے، گردن ٹیڑھی اور منہ سے جھاگ جاری۔ یہ ڈپریشن اور اپی لیپسی کی ملی جلی شکل تھی لہٰذا اس کیفیت سے باہر نکالنے کے لیے میں نے مقتولہ کو اینٹی ڈپریسنٹ اور اینٹی فٹس ادویہ ایک ساتھ استعمال کرائی تھیں۔"

"جب مقتولہ کی لاش ایک مقامی ہوٹل کے کمرے سے دریافت ہوئی تو اس کی عجیب حالت تھی۔ اس کے پرس میں سے آپ کی تجویز کردہ میڈیسنز بھی برآمد ہوئی تھیں۔" میں نے ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیمیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی موت "آرسینک ٹرائی آکسائیڈ" نامی ایک خطرناک زہر سے واقع ہوئی تھی۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ آپ نے اپنی پیشنٹ کو جو ادویہ استعمال کرنے کا مشورہ دیا تھا ان میں سے کسی کے اندر آرسینک کا کوئی مرکب تو موجود نہیں تھا؟"

"ہرگز نہیں وکیل صاحب!" وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ "میں آپ کو اپنے لکھے ہوئے نسخے کے مندرجات بتا دیتا ہوں۔ آپ کسی بھی لیبارٹری سے ان میڈیسنز کا تجزیہ کروا سکتے ہیں۔"

اس کے بعد ملزم ڈاکٹر تابش نے دو اہم دوائیوں کے نام نوٹ کرا دیے۔

"استغاثہ نے اس بات پر بہت زیادہ زور دیا ہے کہ آپ کے علاج کے دوران میں مقتولہ آپ کی شخصیت سے اس قدر متاثر ہوئی تھی کہ وہ آپ سے محبت کرنے لگی تھی حتیٰ کہ اس نے آپ سے شادی کے خواب دیکھنا بھی شروع کر دیے تھے۔" میں نے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔ "معزز عدالت یہ جاننے میں دلچسپی رکھتی ہے کہ استغاثہ کے اس موقف میں کس حد تک صداقت ہے؟"

"ویسے تو میں پبلک پراسیکیوٹر کے مختلف سوالات کے جواب میں اپنی صفائی پیش کر چکا ہوں۔" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "لیکن آپ کے سوال کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا وکیل صاحب! سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ......" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کر دیا۔

"میں مقتولہ کو جس سائیکالوجیکل تھیوری کی مدد سے زندگی کی طرف واپس لانے میں کامیاب ہو پایا تھا، اس تھیوری کی بنیاد صرف ایک اٹل پر کھڑی ہے یعنی...... محبت، پیار اور عشق کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ انسانی دماغ میں وقوع پذیر ہونے والا ایک کیمیکل ری ایکشن ہے جو اس کے احساسات، جذبات اور خیالات کے تابع ہوتا ہے...... اس سچائی کو سمجھ لینے یا قبول کر لینے کے بعد مقتولہ کا میری محبت میں گرفتار ہو جانا کسی دیوانے کی بڑ یا پھر استغاثہ کی بہتان کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہاں، البتہ مقتولہ وقتاً فوقتاً میرے کافی نزدیک آگئی تھی اور مجھ سے مسلسل ملاقات کو جاری رکھنا چاہتی تھی لیکن میں نادرہ کی فطرت اور مزاج سے اچھی طرح واقف تھا لہٰذا میں نے اپنے گھر کا امن و امان قائم رکھنے کے لیے مقتولہ کو خود سے دور رکھنے کی پالیسی اپنائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے ملنے گھر پر آگئی تھی۔"

"اور آپ کی بیوی نادرہ کے دھتکار کے پیچھے چھپے کا اصل سبب کیا ہے؟" میں نے ایک خاص مقصد سے یہ سوال کیا۔ "اور اب تو وہ آپ کے خلاف گواہی دینے والی بھی ہے۔"

"ایک شام میں نے غصے میں آکر نادرہ کو تھپڑ مار دیا تھا۔" ملزم نے بتایا۔ "نادرہ نے اپنے بھائی شاکر علی کو گھر

پر بلالیا۔ اس واقعے کی وجہ سے کافی بدمزگی ہوئی تھی اور نادرہ میری آٹھ سالہ بیٹی کرن کو لے کر شاکر کے ساتھ چلی گئی تھی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ موقع پر موجود میرے ایک خیرخواہ نے صلاح دی تھی کہ تم لوگ چند دن الگ رہ کر اچھی طرح اپنے رویوں اور معاملات پر غوروفکر کرو۔ اس کوشش سے کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہوگا۔ مجھے اس دوست کا یہ مشورہ بالکل مناسب لگا اسی لیے میں نے نادرہ کو جانے دیا۔ اس وقت مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ نادرہ اپنی امی کے گھر جا کر اپنے گھر واپسی کا راستہ ہی بھول جائے گی۔ آہ.....'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر فلسفیانہ انداز میں بولا۔

''یہ دنیا رشتوں ناتوں کی ایک ایسی منڈی ہے کہ جہاں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ دیکھتا ہوں وہ استغاثہ کے ہاتھ مضبوط کرنے کے بعد میرے خلاف کیا زہر اگلتی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

☆☆☆

استغاثہ کے گواہوں کی جانب سے پہلے کبیر خان کو پیش کیا گیا۔ کبیر خان اس ہوٹل کا ریسپشنسٹ تھا جس کے ایک کمرے میں مقتولہ ناہید کی لاش پڑی ملی تھی۔ کبیر خان کی عمر چالیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد اور مضبوط کاٹھی کا مالک تھا۔ وہ اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کراچکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا۔

''سات جنوری کا دن تو یاد ہوگا آپ کو؟'' وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔

''میں بھلا اس دن کو کیسے بھول سکتا ہوں وکیل صاحب!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''یہ وہی تاریخ ہے جب ہمارے ہوٹل کے ایک کمرے سے ایک عورت کی لاش ملی تھی۔''

''کون سے کمرے سے خان صاحب؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

گواہ نے جواب دیا۔ ''کمرا نمبر ایک سو چار۔''

اس کمرے میں کون ٹھہرا ہوا تھا؟''

''یہ ڈاکٹر صاحب.....!'' کبیر خان نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ'' وکیل استغاثہ نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''کیا ملزم اکثر آپ کے ہوٹل میں قیام کیا کرتا تھا؟''

''جی، مہینے میں ایک دوبار۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''اور یہ ہمیشہ کمرا نمبر ایک سو چار ہی لیا کرتا تھا۔''

''اس کا کوئی خاص سبب؟''

''ایک بار میں نے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ ''پانچ'' اس کا لکی نمبر ہے اور ایک سو چار کا مجموعہ بھی پانچ ہی بنتا ہے۔''

''لکی نمبر.....!'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں دہرایا۔ ''کیا ملزم نے آپ کو بتایا تھا کہ مذکورہ کمرا اس کے لیے کس حوالے سے لکی ثابت ہوتا ہے؟''

''نہیں بتایا۔'' گواہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''حالانکہ میں نے پوچھا بھی تھا مگر اس نے مسکرا کر میرے سوال کو ٹال دیا مگر میں سمجھ گیا تھا۔''

''آپ سمجھ گئے..... زبردست۔'' وکیل استغاثہ نے پُرجوش انداز میں کہا اور گواہ کے چہرے پر نگاہ جما کر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''معزز عدالت بھی ملزم کی خوش بختی کا راز جاننے سے دلچسپی رکھتی ہے۔ آپ نے اس کی معنی خیز مسکراہٹ سے جو نتیجہ اخذ کیا، وہ عدالت کو بھی بتا دیں۔''

''یہ ڈاکٹر جب بھی ہمارے ہوٹل کا کمرا نمبر ایک سو چار لیتا تھا تو اس کے ساتھ کوئی عورت بھی ہوا کرتی تھی۔'' گواہ نے جواب دیا۔ ''یہ اس عورت کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہا کرتا تھا جیسے وہ اس کی بیوی ہو۔ بس میں سمجھ گیا کہ یہ ان عورتوں کے ساتھ دل پشوری کرنے ہمارے ہوٹل میں آتا ہے اور [illegible] اسی لیے کمرا نمبر ایک سو چار [illegible] ہے۔''

گواہ کی بات ختم ہوئی تو حاضرین عدالت کی ''کھی کھی'' کی آواز سے عدالت کی [illegible] اور لوگ آپس میں چہ میگوئیاں بھی کرنے لگے۔ ملزم اس صورتحال سے بے نیاز اکیوزڈ باکس میں جامد صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی پریشانی تھی اور نہ ہی انداز میں کسی قسم کی کمی۔

''آرڈر..... آرڈر.....!'' جج نے چوبی ہتھوڑے کی مخصوص ضرب کے ساتھ تحکمانہ انداز میں کہا۔

اگلے ہی لمحے کورٹ روم میں خاموشی نے پَر پھیلا دیے۔ اس سناٹے میں وکیل استغاثہ کی زہریلی آواز ابھری۔ وہ اپنے گواہ سے مخاطب ہوکر کہہ رہا تھا۔

''بعض لوگ خود کو اس لیے بھی بچتے ہیں کہ ان کے کالے کرتوت منظرعام پر نہیں آپاتے۔ یہی منافق اور بدکردار لوگ پرائی نامحرم عورتوں کو دادِ عیش دیتے ہیں اور

اپنی شریکِ حیات کو چھوڑ مارتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ نامحرم عورتوں کے ساتھ ہمیشہ وفادار رہتے ہیں۔ وہ بس مطلب برآری کے لیے انہیں ساتھ رکھتے ہیں اور اگر ان میں سے کوئی مصیبت بننے لگے تو اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے بولا۔

''مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی!''

اپنی باری پر میں جج کی اجازت سے وٹنس باکس کے نزدیک چلا گیا اور استغاثہ کے گواہ کبیر خان کے چہرے پر نظر جما کر اپنی جرح کا آغاز کر دیا۔

''خان صاحب! کیا آپ قسمت پر یقین رکھتے ہیں؟''

''جی بالکل۔'' وہ توانا لہجے میں بولا۔ ''اچھی اور بری قسمت تو ہوتی ہے۔''

''اور ستارے، برج وغیرہ؟''

''ان کا مجھے زیادہ علم نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''لیکن ابھی تو آپ نے اس موضوع پر اپنے علم کے دریا بہا دیے ہیں۔'' میں نے چبھتے لہجے میں کہا۔ ''ملزم کے کی نمبر ''پانچ'' کی آپ نے ایسی تفصیل بیان کی ہے کہ کوئی ماہرِ علم الاعداد بھی اتنی جامع شرح پیش کر سکے گا۔''

''وہ..... وہ تو میں نے وہی بتایا ہے جو اس بندے نے مجھ سے کہا۔'' وہ ایک مرتبہ پھر ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا جناب!''

''تم نے اپنی طرف سے بہت کچھ کہا ہے۔'' میں چشم زدن میں ''آپ'' سے ''تم'' پر اتر آیا۔ ''کیا یہ تمہارے الفاظ نہیں ہیں کہ ملزم پرائی عورتوں کے ساتھ اس طرح گھل مل کر باتیں کیا کرتا تھا جیسے وہ اس کی بیویاں نہ ہوں۔ اس سے تم نے سمجھ لیا کہ وہ نامحرم عورتوں کے ساتھ دل پشوری کرتے ہوئے بھی پکڑا نہیں گیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بہت لکی ہے۔ تمہارا یہ بیان عدالت کے ریکارڈ پر آ چکا ہے۔ تم اپنے الفاظ سے پھر نہیں سکتے۔''

''یہی بات ہے وکیل صاحب.....!'' وہ میرے تابڑ توڑ حملوں سے گھبرا کر جلدی سے بولا۔ ''یہ سب میرا ذاتی تجزیہ تھا۔ ملزم نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔''

''ٹھیک ہے، ہم تمہارے ذاتی تجزیے کو تھوڑی دیر کے لیے ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور اپنی توجہ ہوٹل کے کمرا نمبر ایک سو چار پر مرکوز کر کے عدالتی کارروائی کو آگے بڑھاتے ہیں۔'' میں نے استغاثہ کے گواہ کبیر خان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا جائے وقوعہ یعنی تمہارے ہوٹل کے کمرا نمبر ایک سو چار کے علاوہ دوسرے کمروں میں بھی رنگ رلیاں منانے کا پروگرام چلتا رہتا ہے؟ لوگ نامحرم عورتوں کے ساتھ وہاں قیام کرتے ہیں اور دل پشوری کر کے چلے جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ!''

اس کا رنگ اڑ گیا۔ ''ایسی باتیں نہ کریں وکیل صاحب!'' وہ حد درجہ ہراساں لہجے میں بولا۔ ''ورنہ ہمارا ہوٹل سیل کر دیا جائے گا اور میں بھی بے روزگار ہو جاؤں گا۔ میں نے جو کہا، اسے بھول جائیں۔''

بات کے اختتام پر اس کی صورت رونے جیسی ہو گئی تھی اور وہ رحم طلب نظر سے مجھے تک رہا تھا۔ کسی بھی اکھاڑے میں مدمقابل پر ترس کھانا، اپنی شکست پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ میں استغاثہ کے اس گواہ کو ہرگز ہرگز کوئی ڈھیل نہیں دے سکتا تھا تاہم میں نے ایک محفوظ راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

''تم نے دل پشوری کرنے والی بات معزز عدالت کے روبرو کی ہے اور یہاں پر ایک پولیس آفیسر بھی موجود ہیں۔'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا بیان عدالت کے ریکارڈ کا حصہ بن چکا ہے۔ وہ تمہاری تردید کے بعد ہی غیر موثر ہو سکتا ہے۔''

''میں تہہ دل سے معافی مانگتا ہوں سر!'' کبیر خان جج کی طرف دیکھتے ہوئے ندامت بھرے انداز میں بولا۔ ''میں نے ملزم کے دل پشوری کرنے والی جو بات کی ہے، اس کا میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بس وہ ایسے ہی میرے منہ سے نکل گیا تھا۔ ہمارے ہوٹل میں کبھی بھی غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام نہیں ہوتا۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔''

وکیل استغاثہ کی حالت دیدنی تھی کیونکہ اس کے گواہ کی الٹی قلابازی استغاثہ کو کمزور کرنے کا موجب بن رہی تھی۔ انکوائری آفیسر نے بھی گھور کر کبیر خان کو دیکھا۔ جج نے مجھ سے کہا۔

''ڈیفنس پلیز، پروسیڈ فردر!''

''کبیر خان!'' میں نے استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا تمہارا ہوٹل وہاں ٹھہرنے والے مہمانوں کا کوئی ریکارڈ بھی رکھتا ہے؟''

''جی بالکل!'' وہ قدرے سنبھلتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ہوٹل کے ریسپشن پر موجود رجسٹر میں ہر آنے اور

جانے والے مہمان کا مکمل اندراج کیا جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وقوعہ کے روز یعنی سات جنوری کو تم نے ملزم اور مقتولہ کی ہوٹل میں آمد کا اندراج بھی کیا ہوگا؟"

"جی ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"پولیس کی جانب سے عدالت میں اس کیس کا جو چالان پیش کیا گیا ہے اس میں تمہارے ہوٹل والے رجسٹر کے اس صفحے کی نقل شامل نہیں ہے جہاں تم نے مقتولہ اور ملزم کی آمد کا اندراج کیا تھا۔" میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ایسا کیوں کبیر خان؟"

"اس بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا وکیل صاحب!" وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ "میں نے تو رجسٹر میں ملزم کا نام درج کیا تھا۔"

"صرف ملزم ہی کا نام کیوں؟" میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔ "تمہارے بیان اور استغاثہ کے دعوے کے مطابق تو ملزم اور مقتولہ دونوں وہاں پہنچے تھے۔"

"کمرے کی بکنگ ملزم نے کرائی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "اس لیے میں نے رجسٹر میں صرف اسی کا نام درج کیا تھا۔"

"کیا ملزم نے خود تمہارے ہوٹل آکر وہ کمرا بک کرایا تھا؟"

"نہیں۔ ہماری فون پر بات ہوئی تھی۔" اس نے بتایا۔ "ملزم نے مجھ سے کہا تھا... خان صاحب! آج دوپہر سے شام تک کے لیے ہوٹل کا کمرا نمبر ایک سو چار چاہیے۔ میری ایک دوست پہلے ہوٹل پہنچے گی بعد میں، میں بھی آجاؤں گا۔ اس نے اپنی دوست کا نام تابندہ بتایا تھا۔"

"بکنگ کے لیے ملزم نے کتنے بجے فون کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ٹھیک گیارہ بجے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ فون کرنے والا ملزم ہی تھا؟"

"جی ہاں، میں اس کی آواز کو پہچانتا ہوں۔"

"مقتولہ وقوعہ کی دوپہر کتنے بجے ہوٹل پہنچی تھی؟" میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے استفسار کیا۔

"اس وقت دن کا ایک بج رہا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے خود مقتولہ کو کمرا نمبر ایک سو چار میں پہنچایا تھا۔"

"اور ملزم کے بارے میں کیا کہتے ہو؟" میں نے سپاٹ آواز میں سوال کیا۔ "وہ کتنے بجے ہوٹل آیا تھا؟"

"میں ملزم کی ہوٹل میں آمد کے وقت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ گھبراہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ "میں نے اسے ہوٹل میں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ "کیا تم ملزم سے کسی قسم کا پردہ کرتے ہو۔ تم نے اسے دیکھتے ہی اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں اس لیے وہ آتے اور جاتے ہوئے تمہیں نظر نہیں آیا۔"

"ایسی بات نہیں ہے وکیل صاحب!" وہ ہراساں نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "پھر کیسی بات ہے؟"

"مقتولہ کو کمرا نمبر ایک سو چار میں پہنچانے کے بعد میں ظہر کی نماز ادا کرنے چلا گیا تھا۔ جب میں نماز سے فارغ ہوا تو میں نے ہوٹل کی پارکنگ میں ملزم کی کار کھڑی دیکھی تھی۔ میں یہی سمجھا کہ وہ اپنی دوست تابندہ کے پاس پہنچ چکا ہوگا۔ میں مطمئن ہوکر کھانا کھانے چلا گیا۔ جب میں نے دوبارہ ریسپشن سنبھالا تو تب تک ملزم ہوٹل سے رخصت ہوچکا تھا۔ اب پارکنگ میں اس کی کار موجود نہیں تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ملزم بل ادا کیے بغیر کیسے چلا گیا۔ وہ اکثر ہمارے ہوٹل میں آ رہا تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے کمرا نمبر ایک سو چار کا رخ کیا تاکہ دیکھوں کہ وہاں اس کی دوست تابندہ موجود ہے یا نہیں اور اگر وہ کمرے میں موجود ہے تو اس سے پوچھوں کہ ڈاکٹر کہاں چلا گیا ہے۔"

لمحاتی توقف کرکے اس نے دوتین گہری سانسیں لیں پھر وحشت بھرے انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، میں نے مقتولہ کو بیڈ کے اوپر مردہ پڑے پایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور حالت عجیب سی ہورہی تھی۔ پھر میں نے پولیس کو فون کرکے ہوٹل بلالیا۔ بس میں اتنا ہی جانتا ہوں۔"

"تمہاری سنائی ہوئی کہانی استغاثہ کی نظر میں متاثر کن ہوسکتی ہے کبیر خان مگر میرے نزدیک بالکل نہیں۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "تم چاہے کتنی بھی کہانیاں بنالو مگر خود کو اس معاملے سے الگ نہیں کرسکتے۔ تم گردن تک اس کیس کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہو۔"

"میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" وہ وحشت بھرے لہجے میں بولا۔ "قتل کی اس واردات سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔"

"تمہارے محض زبان سے کہہ دینے سے لاتعلقی ثابت نہیں ہوجاتی۔" میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ "تم دیدہ و دانستہ اس مرڈر کیس میں ملوث ہو یا پھر کسی شاطر شخص نے بڑی مہارت سے تمہارا استعمال کیا ہے۔ اس کا فیصلہ بہت

جلد ہو جائے گا لیکن تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ تم نے کئی مقامات پر قانون شکنی کی ہے۔ خصوصاً کمرا نمبر ایک سو چار کی بکنگ کرتے وقت۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے باری باری وکیل استغاثہ اور انکوائری آفیسر کی طرف دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''ہوٹل لائن کے لیے بعض قانون ایسے بنائے گئے ہیں جن کو توڑنا سنگین جرم تصور کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی بھی مقامی شخص کو اپنے شہر کے کسی بھی ہوٹل میں کمرا نہیں مل سکتا۔ ہوٹل میں قیام کے لیے ضروری ہے کہ مسافر / مہمان کا تعلق کسی دوسرے شہر / علاقے سے ہو اور جوڑوں کے قیام کے لیے تو خصوصی انکوائری بھی ضروری ہے مگر تم نے ایسی کوئی زحمت نہیں کی۔ تم اچھی طرح جانتے تھے کہ ملزم کراچی شہر کا باسی ہے۔ اس کے باوجود بھی تم نے اس کے لیے ہوٹل کا ایک کمرا بک کر ڈالا اور وہ بھی فون پر۔''

''میں اس قانون کے بارے میں جانتا ہوں۔'' وہ مریل سی آواز میں بولا۔ ''لیکن شادی کی بعض تقریبات کے لیے اسی شہر کے لوگ ہوٹل کا کمرا بک کراتے ہیں۔ وہ مقامی ہوتے ہیں اور شب زفاف ہوٹل کے کمرے میں گزارنا چاہتے ہیں۔ دولہا دولہن کے لیے ایسے کمرے بک کرنے میں کوئی قانونی رکاوٹ نہیں ہے۔''

''میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن موجودہ کیس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ مقتولہ اور ملزم دولہا اور دلہن کی حیثیت سے تمہارے ہوٹل میں شب زفاف منانے نہیں آنے والے تھے اور اس بات کی بھی کوئی گارنٹی نہیں کہ تم سے فون پر بات کرنے والا میرا موکل ڈاکٹر تابش ہی تھا۔ تم لنگڑی وضاحتوں اور لولی مثالوں سے خود کو نہیں بچا سکتے۔''

استغاثہ کا گواہ بے حد گھبرائی ہوئی نظر سے اپنے وکیل کو دیکھنے لگا۔ میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔

''دیٹس آل یور آنر۔''

کبیر خان کی جان میں جان آئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ ''یہ نہیں سمجھنا کہ اس پیشی کے بعد زیر سماعت کیس سے تمہارا تعلق ختم ہو گیا۔ آئندہ سماعت کے دوران میں جب جب بھی تمہاری گواہی کی ضرورت محسوس ہوگی، تمہیں یہاں حاضر ہونا پڑے گا اور۔۔۔'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"اور کیا وکیل صاحب؟"

"جھوٹ...... غلط بیانی...... دروغ گوئی اور منافقت سے جتنا اجتناب برتو گے، تمہارے حق میں بہتر رہے گا۔" میں نے سنسناتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس وقت بھی تم زیر سماعت کیس کی دلدل میں گردن تک دھنسے ہوئے ہو۔ تمہاری کوئی بھی چھوٹی سی غلطی تمہیں مکمل طور پر نیست و نابود کرسکتی ہے۔"

وہ یکایک "نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن" ایسی حالت میں نظر آنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے اگلی پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ از ایڈجارنڈ!"

☆☆☆

ماہر نفسیات تابش کا یہ کیس اس کے ایک دوست ڈاکٹر وجے کمار کے توسط سے مجھ تک پہنچا تھا لہٰذا اس حوالے سے میں وجے کمار کو گاہے بگاہے اپ ڈیٹ کرتا رہتا تھا۔ وجے کمار آئی سرجن تھا اور ڈاکٹر تابش کا ایک مخلص اور وفادار دوست بھی۔ وہ ہر حال میں تابش کی باعزت بریت کا خواہاں تھا اور میرے اشارے پر وہ مجھ سے ہر نوعیت کا تعاون کر رہا تھا۔ میں ڈاکٹر تابش کے ایمی بیگم کے علاوہ کسی اور عزیز رشتے دار یا دیگر تعلق دار کو نہیں جانتا تھا۔

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے مقتولہ کے باپ ظہور حسین کو گواہی کے لیے پیش کیا جانے لگا تو میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے احترام بھرے انداز میں کہا۔

"جناب عالی! میں استغاثہ کے گواہ کے بیان سے قبل اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ پچھلی پیشی پر استغاثہ کے گواہ کبیر خان نے کئی ایک ایسی باتیں کی ہیں جو میرے موکل کے خلاف تیار کی گئی چارج شیٹ سے لگا نہیں کھاتیں لہٰذا انکوائری آفیسر کا موقف ہی ان معاملات کی تردید یا تصدیق کرسکتا ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں عدالت کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

میں نے جج سے کوئی انوکھی یا ناممکن فرمائش نہیں کی تھی۔ انکوائری آفیسر کی حیثیت کسی بھی کیس میں استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں لازمی حاضر رہنا پڑتا ہے کیونکہ وہ استغاثہ کا اصلی وارث بھی ہوتا ہے۔

جج نے میری درخواست کے جواب میں فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھاری بھرکم لہجے میں کہا۔ "پرمیشن گرانٹڈ!"

اگلے دو منٹ کے اندر تفتیشی افسر وٹنس باکس میں موجود تھا۔ وہ عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ اس کی صحت قابلِ رشک اور شخصیت متاثر کن تھی۔ میں اس کے قریب چلا گیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"آئی او صاحب! وقوعہ کے روز یعنی سات جنوری کی سہ پہر کبیر خان نے فون پر آپ کو مقتولہ کی موت کی اطلاع دی تھی۔ یہ استغاثہ کے گواہ کبیر خان کا بیان ہے۔ کیا آپ اس بیان کی تصدیق کرتے ہیں؟"

"جی بالکل۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "ہمارے روزنامچے کے مطابق وہ فون کال تین بجے موصول ہوئی تھی اور اس واقعے کی اطلاع دینے والا اس ہوٹل کا منیجر کم ریسپشنسٹ کبیر خان ہی تھا۔"

"آپ کتنے بجے کرائم سین پر پہنچے تھے؟"

"میں دو کانسٹیبل کے ساتھ لگ بھگ ساڑھے تین بجے جائے واردات پر پہنچ گیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"کبیر خان آپ کو اس ہوٹل کے کمرا نمبر ایک سو چار میں لے گیا تھا۔" میں نے معتدل انداز میں کہا۔ "اس نے آپ کو بتایا کہ مذکورہ کمرے میں مقتولہ اور ملزم ٹھہرے ہوئے تھے۔"

"جی، ایسا ہی ہوا تھا۔"

"کبیر خان کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں آپ نے سمجھ لیا کہ ملزم مقتولہ کو موت کی نیند سلا کر ہوٹل سے نکل گیا ہے۔" میں نے آئی او کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ٹھوس انداز میں کہا۔ "یا آپ نے اپنے طور پر بھی کوئی انکوائری کی تھی؟"

"ہوٹل کے منیجر کا بیان اپنی جگہ مگر میں نے اپنے حساب سے بھی وقوعہ کی کارروائی مکمل کی تھی۔" وہ بڑے فخر سے بولا۔ "یہی وجہ ہے کہ اسی شام میں نے ملزم کو اس کے کلینک واقع پی ای سی ایچ ایس بلاک نو سے گرفتار کرلیا تھا۔"

"میں کارروائی کی نہیں، انکوائری کی بات کر رہا ہوں آئی او صاحب!" میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ "آپ کس انکوائری کی بات کر رہے ہیں وکیل صاحب؟"

"وہ انکوائری جو اپنے حساب سے نہیں بلکہ قانون اور قاعدے کے مطابق خالص تفتیشی اصولوں پر کی جائے۔"

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں نے اپنے فرائض سے غفلت برتی ہوگی؟“

”غفلت کا لفظ آپ نے برمحل استعمال کیا ہے آئی او صاحب!“ میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اس سے مجھے ایک خوش گوار راستہ مل گیا ہے... استغاثہ کی دھجیاں اڑانے کا۔“

وہ خفگی بھرے لہجے میں بولا۔ ”آخر آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“

”کسی بھی شخص کو کیس سے بھی گرفتار کر لینا پولیس کے لیے چٹکی بجانے جیسا کام ہے۔“ میں نے آئی او کی خفگی کو اپنے دائیں کے جوتے کی نوک پر دھرتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ نے ملزم کو وقوعہ کی شام اس کے ٹھکانے سے گرفتار کر لیا تھا تو اس میں آپ کا ایسا کوئی کمال نہیں جس کے لیے آپ کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا جائے۔ وقوعہ کی کارروائی میں آپ نے جو مجرمانہ پیشہ ورانہ غفلت برتی ہے، وہ آپ کو کہیں کا نہیں چھوڑے گی آئی او صاحب!“

”کون سی پیشہ ورانہ غفلت؟“ وہ چیخ کر بولا۔

”غفلت ہی نہیں بلکہ غفلتان!“ میں نے تیکھے انداز میں کہا۔ ”میں نمبروار گنوا رہا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو جواب دیں۔ آپ کے پاس دفاع کا کوئی جواب نہ ہو تو پاس بھی کر سکتے ہیں۔ یہ ”پاس“ کسی ”قتل“ کا تفتیش نہیں ہے۔“

”ہاں، میں پاس کرنے کا مطلب سمجھتا ہوں۔“ وہ جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ”آپ اپنی بات جاری رکھیں۔“

”نمبر ایک... اس کیس کی فائل میں ملزم کے فنگر پرنٹس کی رپورٹ نظر نہیں آ رہی؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم نے ہوٹل کے کمرا نمبر ایک سو چار کے اندر سے ملزم کی انگلیوں کے نشانات اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ کوشش سودمند ثابت نہیں ہو سکی تھی۔“ آئی او نے جواب دیا۔ ”اب یہی ہو سکتا ہے کہ یا تو ملزم نے واردات کے وقت اپنے ہاتھوں پر دستانے پہن رکھے تھے اور یا پھر اس نے کمرا چھوڑنے سے پہلے ان تمام مقامات کو اچھی طرح صاف کر دیا تھا جہاں جہاں اس کے ہاتھ لگے تھے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“

”بالکل بھی نہیں۔“ میں نے کاٹ دار لہجے سے جواب دیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”نمبر دو... پولیس کے تیار کردہ چالان میں اس امر کا سرسری سا ذکر موجود ہے کہ ملزم مقتولہ کے ساتھ ہوٹل کے کمرا نمبر ایک سو چار میں ٹھہرا تھا لیکن اس ذکر کو مستند بنانے کے لیے ہوٹل کے رجسٹر کے اس صفحے کی نقل کہیں بھی نظر نہیں آتی جس پر ہوٹل کے منیجر کبیر خان نے ملزم کی ٹیلی فونک بکنگ کا اندراج کیا تھا۔ جس طرح کسی پولیس اسٹیشن میں آپ کے روزنامچے کی اہمیت ہے، بالکل ویسے ہی کسی ہوٹل کے لیے وہ رجسٹر اہم ہوتا ہے جس میں وہاں ٹھہرنے والے مہمانوں کی آمد و رفت کا اندراج کیا جاتا ہے؟“

آئی او کے پاس جواب میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا پھر بھی کمالِ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بولا۔

”میں نے اس صفحے کی فوٹو کاپی کرائی تو تھی اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے اس فوٹو کاپی کو کیس کی فائل میں بھی لگایا تھا۔ پتا نہیں، وہ بیچ کہاں چلا گیا۔“

”وہ بیچ بلیک ہول میں جا چکا ہے اس لیے آپ اپنے دماغ کو تکلیف نہ دیں کیونکہ آگے اس سے بھی زیادہ کٹھن مرحلہ درپیش ہے۔“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”جب آپ کے پاس میرے سوال کو ”پاس“ کرنے کی سہولت موجود ہے تو پھر کیا پریشانی؟“

اس نے گھور کر معاندانہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اس کے کھولتے ہوئے جذبات اور سلگتے ہوئے احساسات کی پروا کیے بغیر اپنا کام جاری رکھا۔

”نمبر تین... میں نے خاص طور پر اس ہوٹل کا دورہ کیا ہے جس کے کمرا نمبر ایک سو چار سے مقتولہ کی لاش پائی گئی تھی۔ وہ ایک دو منزلہ ہوٹل ہے جس کی ہر منزل پر آٹھ کمرے بنے ہوئے ہیں اور ان میں سے کچھ کمرے ہمیشہ آباد رہتے ہیں۔ میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق اس ہوٹل کا اسٹاف پانچ افراد پر مشتمل ہے جس میں آپ کا گواہ کبیر خان بھی شامل ہے لیکن آپ نے صرف کبیر خان کے بیان پر ہی انحصار کر کے ملزم کو اس کے ٹھکانے سے گرفتار کر لیا حالانکہ اس نے ملزم کو ہوٹل میں آتے یا جاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ...“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”آپ موقع کی کارروائی میں چند اسٹاف کے ممبرز اور چند وہاں قیام کرنے والے مہمانوں کے بیانات کے لیے بھی جگہ نکال لیتے۔ اس سے آپ کو کوئی ایسا گواہ بھی شامل مل سکتا تھا جس نے وقوعہ کے روز میرے موکل اور اس کیس کے ملزم

نظر آیا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

"وقوعہ سے چند روز قبل ایک شام ملزم نے آپ کے گال پر جو تھپڑ رسید کیا تھا، اس کا تذکرہ تو دو تین مرتبہ ہو چکا۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ ملزم کی اس اضطراری، جذباتی اور غیظی حرکت کا اصل سبب کیا تھا؟ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ بتانا پسند کریں گی؟"

"میں حقیقت بیان کر چکی ہوں۔" وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مقتولہ تابندہ ایک روز اچانک ملزم سے ملنے ہمارے اپارٹمنٹ پر آ گئی تھی۔ مقتولہ کے جانے کے بعد ہم میاں بیوی میں شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا تھا۔ اس فساد کی جڑ مقتولہ ہی تھی۔ جب ملزم کے پاس کہنے کو کچھ نہ بچا تو اس نے طیش کے عالم میں مجھے طمانچہ مار دیا تھا۔"

"یہ وہ یکطرفہ بیان ہے جو آپ نے اپنی پوزیشن کو کلیئر کرنے کے لیے اچھی طرح رٹ رکھا ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "لیکن حقیقت تو کچھ اور ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بڑی تیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "اگر میں جھوٹی ہوں تو پھر حقیقت آپ ہی بیان کر دیں قابل اور ہونہار وکیل صاحب!"

میں نے اس کے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دینے کے بعد نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"کیا مقتولہ ملزم سے ملنے آپ لوگوں کے تیرہ ڈی گلشن اقبال والے اپارٹمنٹ پر آئی تھی؟"

"جی، بالکل۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "ملزم کا صرف ایک وہی اپارٹمنٹ ہے۔"

"وہ کتنے بجے آئی تھی؟"

"دوپہر کے بعد۔" اس نے جواب دیا۔ "لگ بھگ سہ پہر میں۔"

میں نے پوچھا۔ "اور آپ دونوں کے بیچ جھگڑا اسی شام میں یا رات میں ہوا تھا۔ ہیں نا؟"

"ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"اسی تیرہ ڈی والے اپارٹمنٹ میں؟"

وہ زچ ہو کر بولی۔ "جی ہاں۔"

"جھگڑے کے وقت آپ دونوں میاں بیوی کے علاوہ اپارٹمنٹ میں اور کون کون موجود تھا؟"

"صرف کرن!" اس نے بتایا۔ "وہ ہمیں لڑتا دیکھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔"

"کرن کے علاوہ اور کوئی باہر کا بندہ یا بندی؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ پوری قطعیت سے بولی۔

"آپ کسی احمد غفار کو جانتی ہیں؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"نن..... نہیں.....!" اس نے بے ساختہ نفی میں گردن ہلائی پھر کسی فوری خیال کے تحت اپنے پہلے بیان کی تردید کرتے ہوئے بولی۔ "ہاں، جانتی ہوں۔ احمد غفار، تابش کا ایک دوست ہے اور کورٹ میں کام کرتا ہے۔"

"کیا اس روز احمد غفار بھی آپ کے اپارٹمنٹ پر موجود تھا؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"وہ جھگڑے کے وقت موجود نہیں تھا۔" وہ جلدی سے بولی۔ "تابش نے اسے بعد میں بلایا تھا۔"

"کس لیے؟" میں نے کڑے لہجے میں سوال کیا۔

"ہم دونوں کے بیچ جاری جھگڑے کو نمٹانے کے لیے۔" اس نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

"اور اس موقع پر آپ کا بھائی شاکر علی بھی وہاں موجود تھا۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر پوچھا۔ "شاکر وہاں تھا یا نہیں؟"

"تھا۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

میں نے طویل سوال کیا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ شاکر علی کو آپ ہی نے گھر آنے کو کہا تھا؟ وہ اپنے ساتھ تیرہ ڈی والے اپارٹمنٹ کی فائل بھی لے کر آیا تھا۔ شاکر نے مذکورہ فائل کو ملزم کے سامنے پھینکنے کے بعد بڑی بے رخی سے کہا تھا......

"یہ لیں وہ منحوس فائل جس کی وجہ سے آپ نے میری بہن کو تھپڑ مارا ہے؟"

"جی۔" وہ بس اتنا ہی کہہ پائی۔

میرے تابڑ توڑ سوالات نے استغاثہ کی گواہ کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اپنی جرح کی رفتار کو بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تیرہ ڈی والے اس اپارٹمنٹ کی مارکیٹ ویلیو اس وقت بارہ لاکھ روپے ہے۔ ملزم اسے فروخت کر کے پی ای سی ایچ ایس میں ایک بنگلا خریدنا چاہتا تھا تاکہ رہائش اور کلینک ایک دوسرے کے نزدیک ہو جائیں۔ اس نے بنگلے کی خریداری کے لیے ضروری اضافی رقم کا بھی بندوبست کر لیا تھا مگر آپ نے "تھری ڈی ای" والے اس لگژری اپارٹمنٹ کی فائل کو اپنی امی کے گھر واقع ناظم آباد میں پچھلے ایک سال سے دبا رکھا تھا۔ اس دوران میں ملزم نے کئی بار آپ سے مذکورہ فائل کا تقاضا بھی کیا لیکن ہر مرتبہ

آپ نے ایک نیا بہانہ کر کے اسے ٹال دیا تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"تو پھر میں کیا کرتی؟" وہ جھلاہٹ بھرے لہجے میں بولی۔ "میں تابش اور تابندہ کے چکر سے آگاہ ہو چکی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے اپنی پیشنٹ سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا تو میں کہاں جاؤں گی۔ شروع میں، میں نے ملزم کی "شادیاں کرنے کی عادت" سے ڈر کر اس فائل کو اسی کے پاس رکھوا دیا تھا لیکن جب مقتولہ کے ساتھ ملزم کے تعلقات بڑھنے لگے تو میں نے اٹل فیصلہ کرلیا کہ چاہے میری جان چلی جائے، وہ فائل میں کسی بھی حال میں تابش کے حوالے نہیں کروں گی۔"

"تو گویا وہ زنانے وار تھپڑ اسی فائل کے ذیل میں تھا۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "ملزم جب آپ سے مذکورہ فائل مانگ مانگ کر تھک چکا تو اس کا پیمانۂ صبر و برداشت لبریز ہو گیا اور اس رات غصے میں اس کا ہاتھ اٹھ گیا تھا۔"

جواب دینے کے بجائے وہ اضطراری انداز میں اپنے ہونٹوں کا کباڑا کرنے لگی۔ اس کی پراسرار اور مجرمانہ خاموشی نے میرے سوال کا جواب "ہاں" میں دے دیا تھا۔ میں نے اس آخری سوال کے ساتھ اپنی جرح کو موقوف کر دیا۔

"نادرہ صاحبہ! کیا آپ کے گھر میں ٹیلی فون کی سہولت موجود ہے؟"

اس نے اقرار میں گردن ہلا دی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دو ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ از اِیڈ جارنڈ!"

آج ہمارے کیس کو بہت زیادہ وقت نہیں ملا تھا۔ میں نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے سادہ سے لہجے میں کہا۔

"جناب عالی! معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ آئندہ پیشی پر استغاثہ کے باقی ماندہ گواہوں کو ایک ساتھ عدالت میں پیش کرنے کے احکامات صادر کیے جائیں تاکہ اس کیس کو جلد از جلد اس کے منطقی انجام تک پہنچایا جائے۔ دیٹس آل یور آنر!"

جج، انکوائری آفیسر، وکیل استغاثہ اور دیگر متعلقہ عدالتی عملے کو ہدایات دے چکا تو وکیل استغاثہ نے غیر دوستانہ انداز میں مجھ سے پوچھا۔

"میرے فاضل دوست! آپ کے گواہوں کی کیا صورت ہے؟"

"ایک...... یا زیادہ سے زیادہ دو...... اور وہ بھی جب ضرورت۔" میں نے گول مول جواب دیا۔ "آپ کو ڈیفنس کے گواہوں کے لیے فکرمند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ میں انہیں لائن اپ کر کے رکھوں گا۔"

وہ خشم آلود نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔

☆☆☆

استغاثہ کا آخری گواہ اور میرے موکل کا اکلوتا سالا شاکر علی تھا۔ وہ بھی اپنی باجی نادرہ کی طرح ایک دراز قامت، گندمی رنگت والا شخص تھا۔ اس کی عمر تیس سے متجاوز تھی۔ شاکر علی کا حلفیہ بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے نزدیک چلا گیا۔

"شاکر صاحب! آپ اس بندے کو کب سے جانتے ہیں؟" وکیل استغاثہ نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"اچھی طرح سے یا عام سی جان پہچان؟" جواب دینے کے بجائے گواہ نے الٹا اپنے وکیل سے سوال کر ڈالا تھا۔

شاکر کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس وقت کمرۂ عدالت میں ایک "ارینج سین" چل رہا تھا۔ بہرحال، میں ایک تماشائی کی طرح چپ چاپ کھڑا اس ڈرامائی سین سے "محظوظ" ہوتا رہا۔

"کیا ان دونوں "جانکاری" میں کوئی فرق ہے؟" وکیل استغاثہ نے زور دے کر استفسار کیا۔

گواہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ "بہت بڑا فرق ہے؟" "معزز عدالت اس فرق کا خلاصہ چاہتی ہے۔"

"دیکھیں جناب......!" شاکر علی معتدل انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ملزم سے میری عام جان پہچان تو عرصہ دس سال سے ہے جب باجی (نادرہ) کی اس سے شادی ہوئی تھی۔ اس وقت میں اس شخص کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا پھر کچھ عرصے کے بعد اس کی پہلی بیوی عارفہ کی پراسرار موت کا معاملہ سامنے آیا۔ بعض لوگوں نے عارفہ کی موت کے حوالے سے ملزم پر شک بھی کیا لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں نے اس ایشو کو اتنا سنجیدہ نہیں لیا تھا۔ یہ بندہ میری باجی کے ساتھ ٹھیک چل رہا تھا اسی لیے میں اس کی طرف سے مطمئن رہا لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کی ذات کی خرابیاں کھل کر سامنے آنے لگیں۔ باجی کی زبانی ہمیں پتا چلنے لگا کہ ملزم غصے کا بہت تیز ہے اور اشتعال کی کیفیت میں اسے

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002660248	گجرات	03016215229	سیالکوٹ	0524568440
لاہور	03004009573	وزیرآباد	03456892591	میرپور AK	03460397119
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	اٹک سٹی	057210003
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	دیپالپور	03004854922
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	لیہ	03002373988
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	قصبہ [illegible]	03083360600
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	03006946782	عارف والا	03008758799
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	لورالائی	03023844266
راولپنڈی	03335205014	بورے والا	03347193958	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	جلالپور پیروالا	03338303131
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	ہری پور	03321905703
رحیم یار خان	03055872626	ڈیرہ غازی خان	03336481953	چکوال	03348761952
بہاولپور	0622730455	بہاول نگر	03336320766	ربوہ	03346383400
گوجرانوالہ	03316667828	[illegible] شہر	03329776400	حافظ آباد	0307-6479946
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	واہ کینٹ	0301-5497007
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	ایبٹ آباد	0992335847
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	[illegible]	03454678832
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	مانسہرہ	0333-5021421
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	[illegible] آباد	0301-7681279	کوٹ رادھا کشن	03004992290
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	قصور	0300-6575020
حجرہ شاہ مقیم	03006969881	ٹوبہ ٹیک سنگھ	0315-6565459		

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C [illegible] 35896313

E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا بول رہا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال وہ واقعہ ہے جب اس شخص نے ایک معمولی فائل کے لیے باجی کو تھپڑ رسید کر دیا تھا۔"

"ہاں، یہ واقعہ عدالت کے ریکارڈ پر آچکا ہے جس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ملزم ایک ماہر نفسیات سے زیادہ ایک نفسیاتی مریض ہے۔" وکیل استغاثہ نے بڑی ہنرمندی سے جلتی پر تیل کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا۔ "جو معالج اپنے جذبات پر ہی قابو نہ رکھ سکے، وہ کسی مریض کا کیا خاک علاج کر پائے گا۔ بہرکیف، آپ اپنی بات جاری رکھیں۔"

"عام جان پہچان کا تو میں نے ذکر کر دیا وکیل صاحب!" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "اب میں آپ کو 'اچھی طرح' والی جانکاری کے بارے میں بتاتا ہوں۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"اس جانکاری کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب ملزم نے مقتولہ کا علاج شروع کیا۔ میں نے ایک روز ان دونوں کو ایک شاپنگ مال میں دیکھا تو اسے ایک اتفاق سمجھا پھر یہ لوگ مجھے ریسٹورنٹ اور پارک وغیرہ میں بھی نظر آئے تو میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی کیونکہ اتفاقات اتنے تواتر سے نہیں ہوا کرتے۔ میں نے باجی کو صورت حال سے آگاہ کرنا ضروری جانا۔ باجی نے یہ سب سنا تو حد درجہ پریشان ہو گئیں۔ اس معاملے کی تصدیق کے لیے انہوں نے مجھے ملزم کی جاسوسی کرنے کو کہا۔ میں نے یہ کام نہایت ہی احتیاط کے ساتھ کر ڈالا۔ اس تحقیق اور تفتیش سے ثابت ہو گیا کہ ڈاکٹر اور پیشنٹ میں کوئی سنجیدہ معاملہ بڑی تیزی سے پیچیدہ ہو رہا ہے۔ باجی نے امی سے مشورہ کیا تو امی نے انہیں صلاح دی کہ مرد ایک ایسا اڑیل سانڈ ہوتا ہے کہ کوئی عورت ہمیشہ کے لیے اسے اپنے کھونٹے سے باندھ کر نہیں رکھ سکتی۔ ملزم کو مجبور اور کمزور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کی کسی اہم شے کو اپنے قبضے میں کر لو۔ باجی نے کہا کہ ملزم کو کرن سے بہت زیادہ محبت ہے اور کرن پوری طرح میرے قابو میں ہے۔ اس پر امی نے زور دے کر کہا کہ میں کسی مادی قیمتی چیز کی بات کر رہی ہوں۔ کرن تو تم دونوں کی بیٹی ہے۔ اسے مہرہ بنا کر کھیلو گی تو کامیابی اور ناکامی کے امکانات ایک جیسے ہوں گے۔ امی کا اشارہ فوراً باجی کی سمجھ میں بیٹھ گیا اور باہمی مشاورت کے بعد باجی نے تیرہ ڈی والے اپارٹمنٹ کی وہ فائل امی کے پاس رکھوا دی کیونکہ انہی دنوں ملزم نے اس اپارٹمنٹ کو فروخت کرنے کی بات شروع کر دی تھی۔ اس نے باجی کو بتایا تھا کہ وہ اپارٹمنٹ کو فروخت کرنے کے بعد پی ای سی ایچ ایس میں اپنے کلینک کے نزدیک ایک بنگلا خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اس کی سنائی ہوئی کہانی پر یقین نہیں آیا تھا کیونکہ انہی دنوں ملزم، مقتولہ سے برابر ملاقاتیں کر رہا تھا اور یہ معاملات اتنے زیادہ آگے بڑھ گئے تھے کہ وقوعہ سے چند روز قبل مقتولہ، ملزم کے گھر پر بھی آ گئی تھی۔ اس کے بعد ہی ملزم اور باجی میں شدید نوعیت کا جھگڑا ہوا تھا۔"

استغاثہ کے گواہ نے اپنا طویل جواب مکمل کیا تو وکیل استغاثہ نے اپنی جرح موقوف کرنے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یور ونس پلیز!"

میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد استغاثہ کے گواہ کے نزدیک پہنچ گیا پھر اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

"شاکر صاحب! ابھی آپ نے ملزم کی بیوی سے بے وفائی اور اپنی شرلاک ہومزی کی جو داستان معزز عدالت کو سنائی ہے، میں اس کے ایک حصے سے خاصا متاثر ہوا ہوں۔"

"کون سے حصے سے......؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں وکیل صاحب!"

"میں سمجھاتا ہوں۔" میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ "دیکھیں، جہاں تک آپ نے ملزم اور مقتولہ کی غیر نصابی آؤٹ ڈور اینڈ ان ڈور ملاقاتوں کا ذکر کر کے اسے اپنی باجی سے بے وفائی قرار دیا ہے، میں آپ کے بیان کے اس حصے کو ایک وہم یا وسوسہ اور جھوٹ کا پلندہ سمجھتا ہوں کیونکہ ملزم نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا بلکہ یہ تو وقوعہ کے روز اس ہوٹل میں بھی نہیں گیا تھا جس کے کمرا نمبر ایک سو چار سے مقتولہ تابندہ کی لاش ملی تھی البتہ......" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"البتہ آپ کے بیان کا وہ حصہ جس میں آپ کسی سراغ رساں کے مانند متحرک نظر آتے ہیں، اسے میں نے آپ کی 'شرلاک ہومزی' سے تعبیر کیا ہے اور یہی حصہ میرے لیے متاثر کن اور ناقابل یقین ہے۔ میں کسی پراپرٹی ایجنٹ سے ایسی دھانسو کارکردگی کی توقع نہیں رکھتا تھا۔"

وہ میرے گہرے طنز کو بالکل بھی نہیں سمجھ پایا اور اسے اپنی تعریف جان کر انشراحی لہجے میں متشکر ہوا۔

"آپ کو کیسے پتا کہ میں رئیل اسٹیٹ کا کام کرتا ہوں؟"
"یہ شخص سب جانتا ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔
"سب... کیا سب...؟" وہ چونکتے ہوئے لہجے میں بولا۔
"یہی کہ آپ اسٹیٹ کے دھندے میں پچھلے تین سال سے ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے آپ اداکاری کے شعبے سے وابستہ تھے۔ میری جانکاری غلط تو نہیں ہے شاکر صاحب؟"
"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں نے لگ بھگ دس سال تک اسٹیج پر کام کیا ہے۔ پھر جب پرفارمنگ آرٹ رفتہ رفتہ زوال پذیر ہونے لگا اور اس پیشے سے گھر چلانا ممکن نہ رہا تو میں نے رئیل اسٹیٹ کا کام شروع کر دیا تھا۔ آپ کی جانکاری غلط نہیں ہے۔"
میں نے گولی کو چلنے سے پہلے ضروری مسالا جات سے "مزین" کر دیا تھا لہٰذا اپنی جرح کی رفتار بڑھاتے ہوئے میں نے استغاثہ کے گواہ سے پوچھا۔
"آپ کے بیان سے صاف جھلک رہا ہے کہ آپ کی شرلاک ہومزانہ تحقیق سے آپ اور آپ کی باجی نادرہ نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ ملزم عنقریب مقتولہ سے شادی کرنے جا رہا ہے۔ ایسا تھا یا نہیں؟"
"ایسا ہی تھا۔" وہ کمال ڈھٹائی سے بولا۔
"اگر ایسا ہی تھا تو پھر یہ عدالت جاننا چاہتی ہے کہ..." میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے سوال کیا۔ "ملزم نے... استغاثہ کے موقف کے مطابق... مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے اس ہوٹل کے کمرا نمبر ایک سو چار میں کیوں بلایا تھا۔ وہ تو عنقریب مقتولہ سے شادی کرنے والا تھا۔ ہیں نا؟"
میرے اس کڑے استفسار نے استغاثہ کے گواہ شاکر علی کو حد درجہ بوکھلا دیا۔ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔
"مجھے نہیں معلوم۔ کوئی تو وجہ ہوگی۔"
"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ فوراً اپنے گواہ کی مدد کو لپکا۔ "میرے فاضل دوست، استغاثہ کے معزز گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسی حرکت سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔"
"جناب عالی! میں نے تو ایک سیدھا سادہ سوال کیا ہے جو گواہ کے بیان سے میل کھاتا ہے۔ پھر اس میں گواہ کو ہراساں کرنے والی کون سی بات ہے؟" میں نے وکیل مخالف کے اعتراض کے جواب میں کہا۔ "اس انداز میں سوچنے کے لیے نیوٹن یا آئن اسٹائن کے دماغ کی ہرگز ضرورت نہیں کہ ایک شخص اس عورت کو کیوں قتل کرے گا جس سے وہ شادی کا ارادہ رکھتا ہے۔ اب دو ہی امکان ہیں۔ نمبر ایک... ملزم اور مقتولہ کے درمیان ایسا کوئی بھی جذباتی تعلق نہیں تھا جو ان کی شادی پر منتج ہوتا۔ نمبر دو... اس حوالے سے استغاثہ کا موقف اور گواہ شاکر علی کی جاسوسی ایک من گھڑت کہانی کے سوا کچھ نہیں ہے جس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ کسی گہری سازش کے تحت میرے معزز موکل کو اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حقیقت وہ نہیں جو استغاثہ کی جانب سے دکھائی جا رہی ہے مگر میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ...!" لمحاتی توقف کر کے میں نے وکیل استغاثہ اور انکوائری آفیسر کی طرف دیکھا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔
"مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے... میں حقیقت کو سامنے لا کر ہی دم لوں گا جناب عالی!"
"آبجیکشن اوور رولڈ!" جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو رد کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "پلیز پروسیڈ فردر۔"
"شاکر صاحب!" میں استغاثہ کے گواہ پر حملہ آور ہوا۔ "کیا آپ کی رہائش ناظم آباد میں ہے؟"
"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔
"اس رہائش گاہ میں کل کتنے کمرے ہیں؟" میں نے اس کے ذہن کو غیر ضروری زاویوں پر مصروف رکھنے کے لیے ایک خاص مقصد کے تحت فضول سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔
"وہ دو بیڈروم کا ایک چھوٹا سا فلیٹ ہے۔" گواہ نے جواب دیا۔
"اس چھوٹے سے فلیٹ میں کل کتنے افراد رہتے ہیں؟"
"دو... میں اور امی۔" اس نے بتایا۔ "لیکن اب نادرہ باجی اور کرن بھی اسی فلیٹ میں ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔"
"آپ کی امی کا نام کیا ہے؟"
میرے ان پے در پے غیر متعلق سوالات پر وکیل استغاثہ برہم تو ہو رہا تھا مگر اس نے کسی قسم کی مداخلت سے مکمل پرہیز ہی کیا تھا۔
"شاہدہ پروین۔" گواہ نے میرے سوال کا جواب دیا۔
میں نے پوچھا۔ "شاہدہ صاحبہ کی عمر کتنی ہوگی؟"

"پینسٹھ سال۔"

"کیا آپ کے گھر میں ٹیلی فون کی سہولت موجود ہے؟"

"جی نہیں۔"

"مگر آپ کی نادرہ باجی نے تو اس سوال کا جواب 'ہاں' میں دیا تھا؟" میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔

"باجی نے اپنا والا اپارٹمنٹ سمجھا ہوگا۔" وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "گلشن والے اس گھر میں ٹیلی فون لگا ہوا ہے۔"

میرا مقصد پورا ہوگیا تھا چنانچہ میں نے "آپ" سے "تم" پر آتے ہوئے ٹھوس لہجے میں استفسار کیا۔

"اس کا مطلب ہے وقوعہ کے روز مقتولہ کو اس ہوٹل کے کمرا نمبر ایک سو چار میں بلانے کے لیے تم نے میرہ وڈی والے اپارٹمنٹ سے فون کیا تھا؟"

"جی ہاں......" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا لیکن جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ "میں...... میں بھلا مقتولہ کو...... فون کیوں کروں گا......" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میرا مقتولہ سے کیا لینا دینا۔"

"تیر کمان سے اور الفاظ زبان سے نکل جائیں تو کسی بھی قسم کی لیپا پوتی انہیں واپس نہیں لا سکتی۔" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہاری یہ لولی لنگڑی اور اندھی بہری وضاحت معزز عدالت کو متاثر نہیں کر سکتی۔"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ کی تیز آواز کمرۂ عدالت میں گونجی۔ "میرے فاضل دوست نے غیر ضروری اور غیر متعلق سوالات کرکے استغاثہ کے گواہ کے ذہن کو بری طرح الجھا دیا تھا اس لیے بے دھیانی میں اس کے منہ سے 'جی ہاں' نکل گیا۔ معزز عدالت اس پوائنٹ کو نوٹ کر سکتی ہے کہ زیر سماعت کیس کا بھلا گواہ کی والدہ کے نام اور عمر سے کیا تعلق...... اور پھر یہ بھی ممکن نہیں کہ میاں بیوی کے جھگڑے یا علیحدگی کے بعد ملزم، گواہ کو اپنے گھر میں گھسنے اور اپنے فون سے مقتولہ کو کال کرنے کا موقع فراہم کرے۔ ڈیفنس اپنی واضح شکست کو چھپانے کے لیے اس قسم کی بھونڈی اور عامیانہ حرکتیں کر رہا ہے۔"

"آپ اس بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے وکیل صاحب!" جج نے مجھ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، بہت کچھ جناب عالی!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ بات معزز عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ میں نے استغاثہ کے ایک گواہ اور مقتولہ کے والد گرامی ظہور حسین سے جرح کے نام پر ایک سوال بھی نہیں کیا تھا بلکہ جب پبلک پراسیکیوٹر نے مجھے جرح کی دعوت دی تو میں نے یہ کہتے ہوئے گواہ کا انٹرویو کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا...... 'ظہور حسین کے بیان سے میں مکمل اتفاق کرتا ہوں۔'"

"تو اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟" وکیل استغاثہ نے معاندانہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے بدستور جج سے مخاطب رہتے ہوئے اپنی وضاحت کا عمل جاری رکھا۔

"میرے اس 'مکمل اتفاق' کا مرکزی خیال یہ تھا کہ ظہور حسین کے بیان کے مطابق وقوعہ کے روز ملزم نے اپنے گھر والے فون سے کال کرکے ان کی بیٹی مقتولہ تابندہ کو ملاقات کے لیے ایک مقامی ہوٹل میں بلایا تھا۔ یہ بات مقتولہ نے اپنے والد کو بتائی تھی اس لیے گواہ کو یاد بھی رہ گئی۔ کل ملا کر نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ کال ملزم کے گھر والے نمبر ہی سے کی گئی تھی۔"

"استغاثہ نے کب کہا کہ وہ کال کہیں اور سے کی گئی تھی؟" وکیل استغاثہ نے تمسخر آمیز انداز میں کہا۔ "آپ تو خواہ مخواہ معاملے کو الجھا رہے ہیں میرے دوست! وقوعہ کے روز ملزم ہی نے اپنے گھر سے کال کرکے مقتولہ کو مذکورہ ہوٹل پہنچنے کے لیے کہا تھا۔"

"آئی ایم سوری مائی ڈیئر فرینڈ!" میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ٹھوس لہجے میں کہا۔ "وہ کال ملزم کے گھر سے ضرور کی گئی تھی مگر کال کرنے والا ملزم ڈاکٹر تابش ہرگز نہیں تھا۔ وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا...... بالکل نہیں۔"

"پوزیشن میں کیوں نہیں تھا؟" وکیل استغاثہ نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیا اس کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگی ہوئی تھی یا کسی خطرناک روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کی ہڈیاں چور چور ہوگئی تھیں؟"

میں وکیل استغاثہ کی بے بسی اور جھنجلاہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔ میں اسے ایک ایسے پوائنٹ پر لے آیا تھا جس کے بعد اپنے بال نوچنے اور دیوار میں ٹکریں مارنے کا مرحلہ شروع ہوتا تھا۔

"یہ دونوں ہی وجوہ نہیں تھیں میرے فاضل دوست!" میں نے ایک دم شائستہ لہجے میں کہا۔ "بلکہ وہ کوئی تیسرا ہی معاملہ تھا۔"

"اب یہ کیا۔" وہ جھنجلا کر رہ گیا۔ "آپ کون سے تیسرے معاملے کی بات کر رہے ہیں؟"

"اس معاملے کا نام ہے ملزم کی حیدرآباد یاترا۔" میں نے ڈرامائیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "ملزم کے ایک ڈاکٹر دوست وجے کمار حیدرآباد میں ہوتے ہیں۔ وجے کمار آئی سرجن ہیں۔ انہوں نے حیدرآباد میں اپنا "آئی اسپتال" کھولا ہے۔ اسی اسپتال کی افتتاحی تقریب میں شرکت کے لیے مورخہ سات جنوری کی صبح ملزم لگ بھگ نو بجے حیدرآباد کے لیے روانہ ہو گیا تھا اور اس کی واپسی سہ پہر پانچ بجے ہوئی تھی۔ وہ گھر آنے کے بجائے سیدھا اپنے کلینک چلا گیا تھا۔ اسی شام پولیس نے ملزم کو اس کے کلینک سے مقتولہ تابندہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ اب یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ۔۔۔" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی پھر جج سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"جو شخص وقوعہ کے روز یعنی سات جنوری کے دن صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک کراچی شہر میں موجود ہی نہیں تھا، وہ اپنے گھر والے ٹیلی فون سے مقتولہ کو کال کیسے کر سکتا ہے اور اسی دوران میں وہ سہ پہر دو اور تین بجے کے درمیان ایک مقامی ہوٹل کے کمرا نمبر ایک سو چار میں پہنچ کر مقتولہ کو ایک سریع الاثر زہر آرسینک ٹرائی آکسائیڈ کیسے دے سکتا ہے۔ کیا ہم اس پراسرار معاملے کو فورتھ ڈائمینشن اور "ٹائم اینڈ اسپیس" کے کھاتے میں ڈال سکتے ہیں؟"

"فورتھ ڈائمینشن کیا بلا ہے؟" وکیل استغاثہ نے حیرت بھرے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔

"آپ نے بجا فرمایا میرے فاضل دوست!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "فورتھ ڈائمینشن واقعی بہت بڑی بلا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو کل گیارہ ڈائمینشنز میں تخلیق کیا ہے۔ عام طور پر انسان تین ڈائمینشنز میں زندگی گزارتے ہیں۔ کروڑوں اور اربوں میں کوئی ایک انسان فورتھ ڈائمینشن کا حربہ سمجھنے کا اہل ہوتا ہے اور ایسے افراد میں غالب تعداد اللہ کے دوستوں کی ہے۔ وہ برگزیدہ لوگ فورتھ ڈائمینشن کے توسط سے زمان و مکان (ٹائم اینڈ اسپیس) کی قید سے آزاد ہو کر ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ مقامات پر موجود رہ سکتے ہیں مگر افسوس کہ اس کیس کے ملزم کا شمار ان شرف یافتہ اولیاء اللہ میں نہیں ہوتا لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ وہ بیک وقت کراچی اور حیدرآباد میں موجود ہو۔"

"کسی کے ولی اللہ ہونے کے بارے میں آپ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔" وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ایسے معاملات صرف اللہ ہی جانتا ہے۔"

"ایگزیکٹلی یو ڈی۔۔۔!" میں نے اس لفظ کو خوب کھینچ کر تحقیر بھرے انداز میں کہا۔ "میں نے ملزم کو اولیاء اللہ میں شمار نہیں کیا تو آپ نے فوراً مجھ پر اعتراض جڑ دیا۔ چلیں، اب میں کہتا ہوں کہ ملزم ایک مستند ولی اللہ ہے۔ میرے اس بیان کے بعد بار ثبوت آپ کے کندھوں پر آ جاتا ہے میرے دوست!"

"کس ثبوت کا بوجھ؟" وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"آپ نے معزز عدالت کے سامنے یہ ثابت کرنا ہے کہ کوئی اللہ کا ولی منصوبہ بندی کر کے کسی جیتے جاگتے انسان کو آرسینک ٹرائی آکسائیڈ کے ذریعے زہریلی موت سے ہمکنار کر سکتا ہے۔"

وکیل استغاثہ اپنے ہی پھیلائے ہوئے جال میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس کے پاس میرے اس منطقی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ بے بسی سے بغلیں جھانکنے لگا۔

"انٹرسٹنگ!" جج کی ستائش بھری آواز میری سماعت تک پہنچی۔ "یہ بات تو واضح ہو جائے گی کہ ملزم، مقتولہ کی موت کے وقت جائے واردات سے کئی کلومیٹرز دور حیدرآباد میں تھا مگر اس کے لیے آپ کو کوئی ایسا مستند اور معتبر گواہ عدالت میں پیش کرنا پڑے گا جس نے ملزم کو مذکورہ روز حیدرآباد میں دیکھا ہو۔"

"میں ایک سے زیادہ گواہ بھی پیش کر سکتا ہوں مگر سردست میں نے ملزم کے دوست آئی سرجن کو طلب کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر وجے کمار اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہیں۔ عدالت کا جب حکم ہو گا، انہیں وٹنس باکس میں کھڑا کر دیا جائے گا۔"

میرے اس سنسنی خیز انکشاف نے حاضرین عدالت کے علاوہ انکوائری آفیسر، وکیل استغاثہ اور ان کے گواہ شاکر علی کو مشکل میں ڈال دیا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کورٹ روم میں آگے کیا ہونے جا رہا ہے۔

"وکیل اپنے گواہ وجے کمار آئی سرجن کو گواہی کے لیے پیش کریں۔" جج کی آواز کمرۂ عدالت میں گونج اٹھی۔

آئندہ پانچ منٹ میں یہ انتہائی اہم اور نازک مرحلہ بھی گزر گیا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"وکیل صاحب! یہ تو ثابت ہو گیا کہ مقتولہ تابندہ ظہور کی موت کا ذمے دار ڈاکٹر ثاقب نہیں ہے مگر اصل سوال

اب بھی اپنی جگہ پر سر اٹھائے کھڑا ہے کہ ملزم کی غیر موجودگی میں اس کے گھر والے فون سے مقتولہ کو کس نے کال کی تھی اور وہ بھی ملزم کے لب و لہجے میں۔ جبھی تو مقتولہ اس مقامی ہوٹل کے کمرا نمبر ایک سو چار میں پہنچی تھی۔“

”جناب عالی! میرا کام تھا اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کرنا اور میں نے اپنا یہ فرض خوش اسلوبی سے نبھا دیا ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”باقی جہاں تک مقتولہ کے قاتل کو ڈھونڈنے کا معاملہ ہے تو یہ سراسر استغاثہ کی ذمے داری ہے۔ ہاں، البتہ میں اس سلسلے میں ایک راہنما اشارہ دے سکتا ہوں۔ اگر میرے فاضل دوست کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔“

بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ میری اس کاری چوٹ پر وہ ندامت آمیز انداز میں دوسری سمت تکنے لگا۔ انکوائری آفیسر نے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

”آپ کس اشارے کی بات کر رہے ہیں وکیل صاحب؟“

”یہ تو طے ہو چکا کہ وقوعے کے روز ملزم کے گھریلو نمبر سے مقتولہ کو کال کی گئی تھی۔“ میں نے پُراعتماد لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ”اس دن ملزم اپنے گھر میں موجود نہیں تھا لہٰذا یہ بھی طے ہی سمجھیں کہ وہ کال کرنے والا کوئی ایسا شخص ہے جسے مذکورہ اپارٹمنٹ تک رسائی ہو یعنی اس کے پاس اپارٹمنٹ کی ڈپلی کیٹ چابی ہو اور ایسی ہستی ایک ہی ہے اور وہ ہے ملزم کی بدچال بیوی نادرہ خاتون...... لیکن مقتولہ کو کال کسی مرد نے کی تھی۔ کوئی ایسا مرد جو ملزم کی آواز کی نقل کرنا جانتا ہو۔ اگر آپ میری اس تھیوری کو گہری توجہ سے دیکھیں گے تو آپ کی نگاہ صرف اور صرف ایک شخص پر آ کر ٹک جائے گی۔“ میں نے دانستہ ڈرامائی انداز میں اپنی بات کو ادھورا چھوڑا تو کورٹ روم میں موجود ہر شخص کی نگاہ مجھ پر ٹک گئی۔

”آپ کس شخص کی بات کر رہے ہیں وکیل صاحب؟“ انکوائری آفیسر نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

اس موقع پر وکیل استغاثہ بھی چپ نہ رہ سکا۔ اس کی اضطراری آواز میری سماعت تک پہنچی۔ ”اگر آپ کو معلوم ہے تو اس کے بارے میں کھل کر بتائیں۔“

”میں نے اشارہ دینے کی بات کی تھی میرے فاضل دوست!“ میں نے جھنجھلے لہجے میں کہا۔ ”اور واضح اشارہ یہ ہے کہ مذکورہ شخص ایک اسٹیج آرٹسٹ ہے۔ وہ دوسرے افراد کی آوازوں کی نقل کا ماہر ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ شخص اس وقت کمرائے عدالت میں موجود ہے۔ ایس آئی ویر آنرا“

آخری جملہ میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا مگر میری بات ختم ہوتے ہی کورٹ روم مچھلی بازار کا نقشہ پیش کرنے لگا۔ ہر کوئی اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔ اس شور و شغب اور ہنگامے کا فائدہ اٹھا کر استغاثہ کے گواہ شاکر علی نے وٹنس باکس سے نکل کر کمرائے عدالت کے دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔ اور کسی کا اس کی طرف دھیان گیا یا نہیں مگر میں نے اسے مسلسل اپنی نگاہ میں رکھا ہوا تھا۔

”پکڑو...... قاتل بھاگ رہا ہے......!“ میں نے حلق کی پوری قوت سے چیخ کر کہا۔ ”جانے نہ پائے......!“

میرے بعد جج کی تحکمانہ آواز ابھری۔ وہ متعلقہ عدالتی عملے کو ہنگامی نوعیت کی ہدایات جاری کر رہا تھا۔ ان ہدایات کی روشنی میں مسلح اہلکاروں نے شاکر علی کو دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی دبوچ لیا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے موکل کو باعزت بری کر دیا۔ گزشتہ پیشی کے اختتامی لمحات میں کورٹ روم کے اندر جو ہنگامی صورت حال پیدا ہوئی تھی اس کے بعد جج نے استغاثہ کے دو گواہوں شاکر علی اور کبیر خان کو شامل تفتیش کرنے کے احکامات صادر کیے تھے۔

شاکر علی کو تو موقع پر ہی گرفتار کر لیا گیا تھا مگر کبیر خان کی گرفتاری کے لیے سندھ پولیس کو پنجاب پولیس کی مدد لینا پڑی تھی کیونکہ وہ اپنی گواہی دینے کے بعد اپنی چھٹی پر گاؤں چلا گیا تھا۔ شاکر علی نے کبیر خان کے تعاون سے ہی یہ مذموم منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا۔

جب اصل مجرم پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو پھر اس کی زبان کھلوانے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی۔ نادرہ کے عدم تحفظ کے احساس، شوہر پر شک اور فطری بدمزاجی نے جو گل کھلائے تھے، انہوں نے ہنستے بستے چمن کو اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ شاکر نے اپنی باجی کے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے غلط راستے کا انتخاب کیا اور پھر وہ اس راستے پر بے تحاشا دوڑتا چلا گیا۔

مال و جائداد کی ہوس اور نفرت و عداوت کی تپش انسان کو اندھا دھند عمل پر مجبور کر دیتی ہے اور یہی بے تحاشا پن اس کی بربادی کا سبب بن جاتا ہے۔

(تحریر: حسام بٹ)

میں نوشین کو ڈاکٹر ارشد کے ساتھ پنج ستارہ ہوٹل کے فیملی کیبن سے نکلتے دیکھ کر ذرا ٹھٹک سا گیا۔ میں ان دونوں کو ایک ساتھ پچھلے کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت رات کے دس بجے کا وقت تھا اور میرے اندازے کے مطابق وہ دونوں غالباً پرتکلف ڈنر کرکے ہی فارغ ہوئے تھے۔

"آصف یہ..... نوشین تو نہیں ____ سیٹھ افتخار احمد کی بیوی ____ ہاں" میری بیوی نادرہ نے بھی شاید اسے دیکھ لیا تھا۔ ہم بھی اس وقت ڈنر سے فراغت کے بعد اب واپسی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ہمارا نو سالہ بیٹا معیز اور سات سالہ بیٹی نادیہ بھی ہمراہ تھے۔ یہ ہمارا اکثر یا ہفتے کے بعد کا معمول تھا کہ اپنی فیملی سمیت مذکورہ ہوٹل میں آکر چکن جنجر کھاتے تھے جو یہاں کی ایک مشہور ڈش تھی۔

زور محبت

اے آر راجپوت

یہ کائنات "اس ہاتھ دو اور اس ہاتھ لو" کی منہ بولتی تصویر ہے... ہر ایک کی زندگی اہم ہے مگر... افسوس ہر ایک کے لیے نہیں ہوتی... قتل و غارت ایک ایسا جرم جس کی سزا دنیا کا منصف نہ بھی دے سکے تو قدرت کی لاٹھی کوئی بھی سزا بن کر قاتل کو گھیر لیتی ہے... گویا معافی کسی بھی صورت نہیں ملتی۔ اسے بھی نہیں ملی... کیونکہ انسان جو بوتا ہے، اسے وہ کاٹنا تو پڑتا ہے۔

بے خبری میں جان لینے والے قاتل کی بے خبری

میں جان دینے کی تیاریوں کا قصہ



"ہاں۔" میں اپنی بیوی کی بات پر مختصراً بولا۔

"توبہ ہے.... کیسی عورتیں ہوتی ہیں یہ...... جو غیر مردوں کے ساتھ پھر سے اڑاتی پھرتی ہیں۔" ناعمہ نے متعلق سا تبصرہ کرتے ہوئے کہا اور میں جواباً چہرے سے استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنا سر ہلا کر رہ گیا۔ جس پوش علاقے میں ہمارا چھوٹا سا میڈیکل سینٹر تھا، اس سے ایک دو بلاک چھوڑ کر ایک ایسی جگہ پر ڈاکٹر ارشد کا بھی کلینک تھا جہاں ایک متوسط علاقہ بھی تھا جو اپنے اندر خاصی کثیر آبادی رکھتا تھا۔ ڈاکٹر ارشد جنرل پریکٹیشنر تھا لہٰذا زیادہ تر اس کے کلینک میں متوسط علاقے کے لوگوں کا ہی رش رہتا تھا۔ وہ ایک جوان اور خوبرو شخص تھا۔ اس کی رہائش کسی دوسرے علاقے میں تھی۔ میں نے اپنے میڈیکل سینٹر کے لیے "ہمارا" کا صیغہ اس لیے استعمال کیا تھا کہ وہاں میرے علاوہ میری بیوی بھی بطور لیڈی ڈاکٹر پریکٹس کرتی تھی جس میں فیملی پلاننگ کا شعبہ سرفہرست تھا۔ وہ صبح میں شفٹ کی جگہ میں شام کو...... اور پھر رات کو ایمرجنسی لائٹ روشن کر کے گویا مریضوں کو چوبیس گھنٹوں کی سروس فراہم کر دی جاتی تھی کیونکہ نائٹ ڈیوٹی ایک قریشی ایم بی بی ایس ڈاکٹر آ کر سنبھالتا تھا۔ ہمارے میڈیکل اینڈ میٹرنٹی ہوم اسپتال میں لیبر روم اور لیبارٹری اور الٹراساؤنڈ کی بھی سہولیات موجود تھیں۔ تین سو گز کے پلاٹ کے اس میڈیکل سینٹر کی اوپری منزل میں ہماری رہائش بھی تھی۔ میں چونکہ میڈیکل اسپیشلسٹ تھا اسی لیے میرے ہاں متمول طبقے کے مریضوں کا بغرض علاج زیادہ آنا جانا تھا۔

نوشین ایک جواں سال اور انتہا درجہ حسین لڑکی تھی۔ وہ سیٹھ افتخار احمد سانچے والا کی بیوی تھی جس کا میں عائلی طبیب (فیملی ڈاکٹر) تھا۔ میرا اور اس کا تعلق ایک ڈاکٹر اور مریض سے بڑھ کر بے تکلف دوستی میں بدل چکا تھا۔ سیٹھ افتخار اپنے پروفیشن کے متضاد ایک سیدھا سادہ اور مرنجان مرنج قسم کا شخص تھا۔ سب سے بڑی یا کم از کم میرے لیے یہ حیران کن بات تھی کہ اس نے گزشتہ چالیس بیالیس سال تک "تجرد" کی زندگی گزارنے کے بعد اچانک شادی کی بھی تو اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی سے...... اور وہ بھی نوشین جیسی لڑکی سے...... دونوں ہی مزاجاً و طبعاً ایک دوسرے کی ضد تھے۔ سیٹھ افتخار سنجیدہ رو شخص تھا جبکہ نوشین انتہائی شوخ و چنچل تھی۔ شاید عمروں کے تفاوت نے نوشین کو بے وفائی کا مرتکب بنایا ہوا تھا۔ میں بھی اسی انداز میں سوچتا اور خود ہی بعد میں اپنے اس فلسفے کو غلط گردانتا کیونکہ نوشین بہرحال بچی نہیں تھی۔ باقی دونوں کا ماضی اندھیرے میں تھا۔

جی میں تو آتا کہ کسی دن سیٹھ افتخار سے سب کچھ کہہ گزروں کہ اس کی دلنواز اور دلنشین نوشین کے روز و شب کس کے ساتھ بیت رہے تھے لیکن پھر نہ جانے کیوں میں خاموش ہو رہتا۔

ایک دن میں رات کو وزٹ کرنے سیٹھ افتخار کی کوٹھی پہنچا تو حسب معمول وہ اکیلا تھا۔ میں نے محسوس کیا وہ گزشتہ کئی دنوں سے کچھ زیادہ ہی کمزور اور مضمحل سا نظر آ رہا ہے۔

"افتخار صاحب! میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی صحت دن بہ دن گرتی ہی جا رہی ہے۔" میں نے ازراہ تشویش کہا اور پھر اس کے بیڈ پر پہنچ کر دراز ہوتے ہی اپنے میڈیکل باکس سے سیٹھ افتخار کا چیک اپ کرنے کے لیے الیکٹرانک بی پی اپریٹس اور اسٹیتھو اسکوپ نکالنے لگا۔

"شاید تم درست کہتے ہو۔" وہ ایک بے رونق سی مسکراہٹ اپنے چہرے پر بکھیرتے ہوئے بولا۔ ڈاڑھی مونچھ سے مبرا اس کا گورا چہرہ مجھے جانے کیوں کسی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کا غماز نظر آیا۔ وہ قدرے دوستانہ لہجے میں بولا۔ "آپ ہی کا زیر علاج ہوں ڈاکٹر صاحب...... اب دیکھیے آپ کیا کرتے ہیں اس سلسلے میں۔"

میں نے اس کے بلڈ پریشر کی ریڈنگ پڑھتے ہوئے اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی تو وہ مجھے درحقیقت کسی اور ہی بات کی جھلک سا محسوس ہوا تاہم میں پہلے سے طے شدہ تسلیت سے بولا۔

"تو ٹھیک ہے...... پھر میں آپ کے خون کا ٹیسٹ کرانا چاہوں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے باکس سے پانچ سی سی کی ڈسپوزیبل سرنج نکالی۔ میں ابھی اس پر اپنا شبہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا جو پچھلے کچھ دنوں سے اس کی دن بہ دن اور تیزی سے گرتی ہوئی صحت اور اس کی جوان العمر بیوی نوشین اور ڈاکٹر ارشد کے درمیان پروان چڑھتی ہوئی قربت کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ بہرطور، میں نے سوئی اس کی نس میں اتار کر پانچ سی سی خون نکالا اور پھر اسے ایک چھوٹی سی بوتل میں منتقل کر دیا پھر ڈھکن کو وہ بوتل کو اچھی طرح ہلانے کے بعد اپنے باکس میں رکھ کر لوٹ آیا۔

گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے میں سیدھا لیب میں آ گیا جہاں نائٹ شفٹ پر مامور ٹیکنیشن نیاز موجود تھا۔ میں نے اسے سیٹھ افتخار کے بلڈ کیمیکل کی شیشی تھماتے ہوئے فوری رپورٹ بنانے کی ہدایت کی اور خود بھی وہیں موجود رہا۔ یہ ایک عام سا بلڈ ٹیسٹ تھا جس کی رپورٹ ذرا دیر میں تیار ہو گئی۔

میں نے جب اس کا رزلٹ پڑھا تو میرے ذہن کی

تصدیق ہوگئی۔ سیٹھ افتخار کو "سلو پوائزن" دیا جارہا تھا۔ اس کے خون میں ہیموگلوبن کی مقدار تیزی سے کم ہورہی تھی اور R.B.Cs (خون میں موجود سرخ ذرات) تیزی کے ساتھ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہورہے تھے۔ میں فی الحال سیٹھ افتخار کے سامنے اپنے اس شبے کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ ابھی اپنی تسلی کی خاطر میں اپنے ایک اور دوست ڈاکٹر قمیر کی لیبارٹری سے بھی پوری تصدیق کروانا چاہتا تھا کیونکہ وہ ایک بہترین پیتھالوجسٹ تھا۔

میں اگلے دن پھر خلافِ معمول رات ساڑھے دس بجے اس کی کوٹھی میں پہنچا جہاں وہ حسبِ توقع اپنے پُرتعیش بیڈروم میں بستر پر لیٹا ریموٹ ہاتھ میں لیے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس کی جواں سال بیوی نوشین بھی وہاں موجود تھی اور میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ میری اس اچانک آمد پر کچھ زیادہ خوش نہیں تھی۔ خود میں بھی ذرا خفیف سا ہوا تھا البتہ سیٹھ افتخار ضرور مجھے دیکھ کر غیر محسوس انداز میں چونکا تھا۔ میں نوشین کی موجودگی پر بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔

"آیئے ڈاکٹر صاحب! خیر تو ہے نا..... میں تمہارے لیے اتنا اہم مریض کیسے ہوگیا کہ اپائنٹمنٹ سے پہلے ہی آپ نے مجھے شرفِ ملاقات بخشا۔" وہ ہمیشہ کی طرح زندہ دلی سے بولا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ نوشین کے سامنے ہی مجھ سے اپنے خون کی میڈیکل رپورٹ کے بارے میں استفسار نہ کر بیٹھے کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ نوشین کو ذرہ برابر بھی کسی شک میں مبتلا کروں۔ یہی وجہ تھی کہ میں جلد سے جلد نوشین کے وہاں سے کھسکنے کی دعائیں مانگنے لگا۔

"ارے یار..... ! تو کیا ضروری ہے کہ میں ہر مرتبہ ایک معالج ہی کی حیثیت سے آیا کروں۔ کیا کسی اور حیثیت سے آنا ممنوع ہے؟" میں نے دوستانہ لہجے میں لمحہ بھر توقف کے بعد قدرے بے تکلفی سے جواب دیا۔ اتنے میں...... اس کی بیوی نوشین کمرے سے چلی گئی اور میں نے سکون کا سانس لیا۔

قدرے عجلت میں، میں نے سیٹھ افتخار سے دوبارہ اس کا خون بطور مزید ضروری ٹیسٹ لینے کے لیے کہا تو وہ عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ میری جانب دیکھ کر بولا۔ "میں دیکھ رہا ہوں، تم میرے علاج کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہے ہو۔ بہرحال اس کے لیے میں تمہارا تہِ دل سے مشکور ہوں۔ ایک تو تم ڈاکٹر حضرات کھل کر اپنے مریضوں کو اس کی بیماری کے بارے میں نہیں بتاتے ہو۔ یار! کم از کم میں تو تمہارا اب دوست بن چکا ہوں۔ مجھے صاف صاف بتا کیوں نہیں دیتے کہ..... آخر تم میرے شریر کے اندر کس قسم کی کھوج کر رہے ہو؟"

اس کی بات سن کر چند ثانیے کے لیے میں تذبذب میں مبتلا رہا پھر بولا۔ "کچھ کہنے سے قبل میں ابھی مزید تمہارے خون کا کیمیائی تجزیہ کروانا چاہتا ہوں تاکہ جو بات میں تم سے کہوں اس میں وہ محض شبہ نہ ہو بلکہ یقین ہو۔"

اس سمے مجھے نوشین کے دوبارہ آنے کا دھڑکا بھی لگا رہا مگر پھر میں نے اندازہ لگایا کہ وہ جس طرح اپنا منہ بسور کر وہاں سے چائے وغیرہ لانے کے لیے اٹھ کر گئی تھی..... اسے مدنظر رکھتے ہوئے اس کی واپسی ناممکن ہی نظر آرہی تھی۔

معاً کمرے میں گھنٹی کی دستک ہوئی اور پھر ایک ملازمہ چائے وغیرہ کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر آگئی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ ملازمہ نے چائے کا ایک کپ میری جانب بڑھایا جبکہ سیٹھ افتخار نے فی الحال چائے پینے سے انکار کیا پھر ملازمہ کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے چائے کی چند چسکیاں لینے کے بعد کچھ کہنا چاہا مگر درمیان میں سیٹھ افتخار بول پڑا۔ "ڈاکٹر صاحب! میں ایک بار پھر تمہارا مشکور ہوں کہ تم میری بیماری کے سلسلے میں غیر معمولی طور پر فکرمند ہو اور اچھی طرح مجھے شفا بہم پہنچانے کی ہر ممکن تگ و دو میں بھی مصروف ہو۔"

اتنا کہہ کر وہ چند ثانیے کے لیے رکا۔ اس کی غلافی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے تشکر و امتنان کے آثار محسوس ہوئے مگر میں نے دیکھا کہ اس کا لہجہ بھی کچھ پُراسرار سا ہوتا جارہا تھا۔ وہ دوبارہ سنجیدہ اور گمبھیر لہجے کے ساتھ بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری بیماری کے سلسلے میں کسی بات کا شبہ ہورہا ہے۔ تم یہی سوچ رہے ہو کہ مجھے "سلو پوائزننگ" دیا جارہا ہے؟" میں اس کی بات پر بری طرح ٹھٹک گیا۔ "اور ڈاکٹر صاحب...... ! میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھے کون دھیرے دھیرے زہر دے کر مارنا چاہتا ہے......" وہ اپنی لے میں بولے جارہا تھا اور میں مجسم حیرت و استعجاب کی تصویر بنا یک ٹک اس کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ اس نے آخر میں ایک اور دھماکا کرتے ہوئے بتایا۔ "اور ڈاکٹر صاحب...... ! تمہارے اندر پلنے والا یہ شبہ بھی سو فیصد درست ہے کہ میری رگوں میں رفتہ رفتہ زہر اتار کر موت اتارنے والا اور کوئی نہیں بلکہ...... خود میری اپنی بیوی نوشین ہے۔" اتنا کہہ کر وہ تھم گیا۔

میرا عالم یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میں اپنی جگہ مبہوت سا ہوکر رہ گیا تھا۔ میں نے دیکھا سیٹھ افتخار احمد

سانچے والا اب ہولے ہولے ہانپ رہا تھا۔ اس کے چہرے کا خالی پن کسی گہرے دکھ اور اداسی کی غمازی کر رہا تھا۔ میں نے ایک گہری اور طویل سانس کھینچی اور دھیرے سے اسے مخاطب کر کے مستفسر ہوا۔

"سیٹھ افتخار! تمہیں یہ سب معلوم ہے...... اور پھر بھی تم انجان بنے ہوئے ہو۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔ بھلا جانتے بوجھتے ہوئے تم کیوں موت کو گلے لگانے پر تلے ہوئے ہو؟"

میری بات پر اس کے چہرے کا خالی پن اچانک کسی اندرونی جذبے کی شدت سے تمتمانے لگا اور جب وہ بولا تو اس کی آواز میں کپکپی صاف طور پر جھلک رہی تھی۔

"اب میں تمہیں دوست کہہ کر ہی پکاروں گا کیونکہ تم اب میرے ایک اہم راز سے واقف ہو چکے ہو۔ سنو میرے دوست! محبت جو ہوتی ہے نا...... یہ اپنے اندر اَن گنت بھید رکھتی ہے۔ یہ ایک خوشی اور راحت کا مرقع ہوتی ہے جس کے بطن میں کہیں دور غم کا بیج بھی ساتھ ساتھ نمو پاتا رہتا ہے اور در حقیقت یہی وہ غم ہے جو اپنی انتہا کو پہنچنے کے بعد پھر غم نہیں رہتا بلکہ ایک قسم کی لذت بن جاتا ہے جو محبت کے جذبے کو ناقابلِ تسخیر قوت بخشتا ہے۔" وہ پھر چپ ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ اب جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ ایک عجیب سے جذباتی ارتعاش کا شکار نظر آ رہا تھا جس کی لو پڑ رہی اسے کسی اور ہی جہانوں میں گم کیے ہوئے تھی۔

"لیکن...... یہ تو سراسر ظلم کر رہے ہو تم اپنے ساتھ......" بالآخر میں اس کی صراحت بھری عجیب گفتگو کا ماخذ نکالتے یا سمجھتے ہوئے بولا۔

"سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہ تمہیں قطرہ قطرہ زہر دے کر موت کی وادی میں دھکیلا جا رہا ہے اور...... اور...... تمہیں زہر دینے والی تمہاری اپنی بیوی نوشین ہے...... پھر بھی...... تم اپنی موت کے کھیل کے خاموش تماشائی بنے ہوئے ہو۔ مقامِ حیرت ہے یہ میرے لیے......"

"محبت صرف پانا نہیں...... ایثار اور قربانی بھی مانگتی ہے۔" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے یہ گھسا پٹا فلمی جملہ کس بنا پر دہرایا تھا۔ بہر طور، وہ خود پر قابو پاتے ہوئے دوبارہ بولنا شروع ہوا۔ "میں جانتا ہوں کہ مجھے ہلاک کرنے والی میری بیوی ہی ہے مگر مجھے اپنی بے لوث اور سچی محبت کی قوت کا بھی اندازہ ہے جو ایک دن ضرور اپنا رنگ دکھائے گی...... اور...... جن ہاتھوں سے مجھے نوشین زہر دے رہی ہے پھر ایک رات انہی ہاتھوں سے مجھے تریاق بھی دے گی۔" وہ خاموش ہوا تو مجھے اچانک ہی اس کی دماغی حالت پر شک سا ہونے لگا کہ کہیں یہ پاگل تو نہیں ہو گیا...... عجیب دیوانوں اور فرزانوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔ تاہم مجھے یہ گوارا نہیں ہو رہا تھا کہ میں اپنی آنکھوں کے سامنے یہ سب ہوتا دیکھوں لہٰذا میں بالآخر سختی لیے لہجے میں بولا۔

"دیکھو افتخار! جو کچھ بھی نوشین تمہارے ساتھ کر رہی ہے، وہ بہرحال درست نہیں اور مزید یہ کہ میں یہ سب ہوتا نہیں دیکھ سکتا...... اور تمہیں نہ صرف اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنا ہوگی بلکہ میرا تو یہ بھی مشورہ ہے کہ تمہیں ایسی عورت سے بھی فوراً چھٹکارا پانا ہوگا جو تمہاری جان کی دشمن بنی ہوئی ہے۔ تمہیں پتا ہے کہ......" میں اسے ایک اور کربیہ اور دردناک پہلو کی طرف متوجہ کرنے کی سعی میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ دراصل میں اس پاگل کو اس بات سے بھی آگاہ کرنا چاہتا تھا کہ اس کی "چہیتی" بیوی نوشین...... ڈاکٹر ارشد کے ساتھ پینگیں بڑھانے میں مصروف ہے اور یہ بات اب ڈھکی چھپی بھی نہیں رہی بلکہ خود مجھے تو سو فیصدی اس بات کا یقین تھا کہ افتخار کی آہستہ آہستہ زہر خورانی میں ڈاکٹر ارشد کا بھی ہاتھ ہو سکتا تھا اور یہ زہر وہی نوشین کو فراہم کر رہا تھا۔ نوشین نے یہی سوچا ہوگا کہ بجائے طلاق لینے کے، کیوں نہ اپنے شوہر کو ہی ہلاک کروا دے تاکہ اس کی ساری دولت بھی اسے مل جائے اور دوسری طرف نوجوان ڈاکٹر ارشد کو بھی حاصل کر لے۔ لہٰذا میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی ڈاکٹر ارشد کے ساتھ کس قسم کا تعلق استوار کر چکی ہے مگر جانے کیوں میں چپ ہو گیا۔ شاید یہ سوچ کر کہیں یہ الٹا مجھ پر ہی الزام نہ دھر دے کہ میں اس کی بیوی پر اب کیچڑ بھی اچھال رہا ہوں۔

"ڈاکٹر ارشد کو بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں......" معاً چند لمحوں بعد اس نے پھر ایک دھماکا کیا اور میں خاصا ٹھٹکا سا گیا۔

"وہ ایک دن مجھے دیکھنے کی غرض سے آیا تھا یہاں...... اسے میں نے ہی نوشین کے ایما پر بلایا تھا اپنے معائنے کے لیے بلکہ...... آگے تم خود ہی سمجھ لو......" اس نے اپنی بات میرے سمجھنے کے لیے دانستہ ادھوری چھوڑ دی تاہم وہ پھر بول پڑا۔

"درحقیقت یہ نوشین کا ہی اصرار تھا کہ میں اپنا معالج بدل لوں کیونکہ مجھے تم سے کوئی خاص افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس کی بات غلط ہے۔" وہ میری جانب معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر ارشد کو کیسی

نگاہوں سے بار بار دیکھ رہی تھی۔'' آخر میں سیٹھ افتخار کے لہجے میں درد سا سمٹ آیا اور بے اختیار مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ ''اسی لیے تمہیں ڈاکٹر...... یہ جتانے کی ضرورت نہیں کہ میری بیوی نوشین، ڈاکٹر ارشد سے کس نوعیت کا تعلق استوار کر چکی ہے۔ میں تم سے پھر بھی یہی کہوں گا کہ اگر میری محبت میں طاقت اور قوت کشش ہوگی تو نوشین ایک دن دوبارہ میری جانب ہی پلٹ آئے گی...... میں بہرحال تمہارے انسانی ہمدردی والے جذبے کی قدر کرتا رہوں گا کہ تم نے ذاتی اور اضافی دلچسپی لیتے ہوئے انسانیت اور دوستی کے ناتے میری مدد کرنے کی کوشش کی...... مگر اب میری تم سے یہ عاجزانہ درخواست ہے کہ...... اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھنا اور صبر کے ساتھ انتظار کرنا۔ جو ہوگا ان شاء اللہ بہتر ہی ہوگا۔'' اتنا بتا کر وہ خاموش ہوا اور میں ایک طویل ہنکارا بھرتے ہوئے خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔

اگرچہ میرا ضمیر ایک عجیب اور لرزہ خیز ڈرامے سے چشم پوشی کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا مگر میں خود کو مجبور بھی محسوس کر رہا تھا کیونکہ خود سیٹھ افتخار کو ہی جب اس کی پروا نہیں تھی تو مجھے کیا ہوتی۔

☆☆☆

وقت...... ہر نئے دن کو پرانا کرتا گزرتا رہا۔ اس معاملے میں، میں نے سردست چپ سادھ لی تھی لیکن...... پھر کچھ عرصے بعد میں نے اچانک ایک حیران کن تبدیلی محسوس کی...... میں دیکھ رہا تھا کہ سیٹھ افتخار اب حیرت انگیز طور پر روبہ صحت ہو رہا تھا...... پہلے تو میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی لیکن جب میں واضح طور پر سیٹھ افتخار کو ہشاش بشاش اور بالکل توانا محسوس کرنے لگا تو آپوں آپ میں اس حیران کن تبدیلی پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ کہاں تو کچھ عرصے پہلے سیٹھ افتخار لب گور نظر آ رہا تھا...... مگر اب تو جیسے راحت اور مسرت اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس کی اس تبدیلی پر میں بھی بہت خوش ہوا۔

''حیرت انگیز...... سیٹھ افتخار...... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟'' ایک دن مجھ سے رہا نہ گیا اور متحیر ہو کر اس سے یہ کہہ ہی ڈالا۔ ''اب تو شاید تمہیں میری ضرورت بھی نہیں رہی۔''

میری بات سن کر پہلی مرتبہ اس کے چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ ابھری اور وہ بولا۔ ''ہاں، ڈاکٹر صاحب! تمہیں شاید یاد ہو...... کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ میری بے لوث محبت کی قوت ایک روز ضرور رنگ لائے گی۔''

میں چپ رہا تاہم بغور میری نگاہیں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔ اس کی آنکھوں میں اب زندگی کی چمک عود کر آئی تھی۔

''تو کیا نوشین......؟'' میں کہتے کہتے رک گیا۔

''دھیرج ڈاکٹر...... بس تھوڑا سا اور انتظار...... تم سب کچھ خود دیکھو گے...... پھر تمہیں زیادہ لطف آئے گا کہ محبت کا کرشمہ کیا ہوتا ہے۔'' وہ میری بات کا گلا گھونٹتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولا...... اور ہماری باتوں کا سلسلہ یہیں پر موقوف ہو گیا۔

☆☆☆

کچھ عرصے بعد میں نے ایک دن پھر نوشین اور ڈاکٹر ارشد کو ایک ساتھ دیکھا اور بری طرح چونک گیا۔

اس دن میں حسب معمول پنج ستارہ ہوٹل میں اپنی فیملی کے ساتھ ڈنر کر رہا تھا اور ہاتھ دھونے کے لیے باہر نکلا تو میری نگاہ ان دونوں پر پڑی۔ میرا فاصلہ ان سے زیادہ نہ تھا۔ وہ ہوٹل کے نکاسی والے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ڈاکٹر ارشد مجھے پہلے سے کچھ کمزور کمزور سا نظر آ رہا تھا پھر اچانک باہر کی طرف نکلتے ہوئے نوشین کی نگاہ مجھ پر پڑی، تب اس نے چلتے چلتے ذرا رک کر ڈاکٹر ارشد سے کچھ کہا اور ڈاکٹر ارشد جواباً اثبات میں دھیرے سے اپنا سر ہلاتا ہوا باہر کو ہولیا جبکہ نوشین اب میرے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ پہلے ہی کی طرح دلکش اور ترو تازہ تھی مگر اپنی طرف دیکھتے ہوئے میں نے اس کی مسکراتی آنکھوں میں اس بار بجائے ناگواریت کے، اپنے لیے ممنونیت کے آثار پھیلے پائے دیکھے...... پھر وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے اسی لہجے میں بولی۔

''ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی بدولت ممنون ہوں کہ آپ کی وجہ سے میں ایک سچی محبت سے محروم ہوتے ہوتے بچ گئی...... اگر اس دن میں نے آپ کی اور افتخار کی گفتگو نہ سن لی ہوتی تو شاید میں اپنے شوہر کی بے لوث چاہت کو ہمیشہ کے لیے کھو دیتی...... ان کی باتوں نے، جو وہ آپ کے ساتھ کر رہے تھے...... میری سوچ اور دنیا ہی بدل ڈالی۔ ڈاکٹر صاحب! وقت کم ہے اس لیے میں آپ سے اتنا ہی کہوں گی کہ...... جو کھیل میں ڈاکٹر ارشد کی ملی بھگت کے ساتھ اپنے شوہر سے کھیل رہی تھی...... اب وہی میں ڈاکٹر ارشد کے ساتھ کھیل رہی ہوں...... مجھے امید ہے آپ اس بات کو راز میں ہی رہنے دیں گے۔ خدا حافظ......

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی اور میں اپنی جگہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔

⌘⌘⌘



محفلِ شعر و سخن

❁ ناہید یوسف...... اسلام آباد

شہر کی بھیڑ سے خود کو تو بچا لاتا ہوں
گو سلامت مرے اعصاب نہیں آتے ہیں

❁ حرا اطہر...... کراچی

رستہ بھی کٹھن، دھوپ میں شدت بھی بہت تھی
سائے سے مگر اس کو محبت بھی بہت تھی
خیمے نہ کوئی میرے مسافر کے جلائے
زخمی تھا بہت پاؤں، مسافت بھی بہت تھی

❁ مہتاب احمد...... حیدرآباد

میری حیرت کا سبب جان گئے
آنکھ سے اشک بھی حیران گئے

❁ خواجہ رسل...... آزاد کشمیر

اب کسی پیڑ کی صورت ہوتے
ہم اگر خاک میں بوئے جاتے

❁ امیر بخش...... نواب شاہ

میں تجھے بھول گیا ہوں اے دوست
تو مگر مجھ کو بھلا مت دینا

❁ شاہ نواز خان...... میانوالی

تم مرے حال پہ حیران ہوئے
بس یہی بات تو حیرت کی ہے

❁ یاسمین غفار...... خانیوال

نظر میں رنگ سے بکھرے ہوئے ہیں
کوئی صورت بنانے میں لگا ہوں

❁ شازیہ حسین...... پشاور

ان محبت گزار آنکھوں میں
کوئی تو خواب ہو ہمارے لیے

❁ فضا خان...... کراچی

ایک ہی باغ میں کھلے ہیں پھول
رنگ سب کے جدا جدا سے ہیں

❁ روبینہ نفیس...... کوٹ ادو

کر چکا ہوں ہزار تدبیریں
ہو سکا حل نہ مسئلہ میرا

❁ سعدیہ زاہد...... ملک وال

میں نہ گر نیند سے باہر آتا
خواب آنکھوں پہ حکومت کرتے

❁ جاوید اقبال...... میرپور خاص

جن درختوں کی جڑیں دل میں اتر جاتی ہیں
ان کا آندھی کی درانتی سے بھی کٹنا مشکل
قوتِ غم ہے جو اس طرح سنبھالے ہے مجھے
ورنہ ٹھہروں کسی لمحے تو سنبھلنا مشکل

❁ اکرم کمال...... حیدرآباد

ہوا کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں
چراغوں سے عداوت ہی کروں گا

❁ رانا شاہد...... بورے والا

بس یونہی دل کی سہولت کے لیے
کر لیے دکھ بھی گوارا میں نے

❁ حسنین شہاب......تونسہ شریف
کھو دیا رات وہ تارا میں نے
دن اسی دکھ میں گزارا میں نے

❁ علی نعمان......سکھر
اک سمندر دور تک پھیلا ہوا
غور سے دیکھو تو پانی بھی نہیں

❁ ذوالفقار بابر......خوشاب
بس ایک نام ہے تیرا جو دل کے گنبد میں
ازل سے گونج رہا ہے کسی اذاں کی طرح

❁ سحر اور یس......فیصل آباد
کیوں ملاقات کے لیے آتے
اتنے ہی بدگمان ہوتے تو

❁ عاصم اختر......بہاولپور
کہیں تو ہوگا شب ہست سوچ کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینہ غم دل

❁ فیاض احمد......اوکاڑہ
تیری عصمت ہو کہ ہو میرے ہنر کی چاندنی
وقت کے بازار میں ہر چیز کے لگتے ہیں دام

❁ منیر شگفتہ......وہاڑی
کافر ادائیں اس کی مجھے بھی عزیز ہیں
لیکن عزیز تر نہیں ایمان کی طرح

❁ عبدالباری......کراچی
کٹ ہی گئی جدائی بھی یہ نہ ہوا کہ مر گئے
تیرے بھی دن گزر گئے میرے بھی دن گزر گئے

❁ عماد ریاض......کراچی
خدایا ہم سے خود داروں کی آخر کیا ضرورت تھی
تیری دنیا سراپا بندگی معلوم ہوتی ہے

❁ جنید ملک......کراچی
کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوع سحر سے ہم

❁ گل نواز خان......سوات
ہزار بار قلم ٹوٹ ٹوٹ جائے گا
جو بات دل میں ہے تم کس طرح لکھو گے اسے

❁ شوکت شاہین......احمد پور شرقیہ
مجھے اور زندگی دے کہ ہے داستاں ادھوری
میری موت سے نہ ہوگی میرے غم کی ترجمانی

❁ امتیاز عالم......فیروز پور
ٹھہرے سمندروں کی طرح تم ہو بے طلب
ابر رواں ہوں مجھ کو تمہاری تلاش ہے

❁ عبدالغفار شیخ......لیہ
یک لخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
جس پیڑ کو آندھی میں بھی ہلتے نہیں دیکھا
کانٹوں میں گھرے پھول کو چوم آئے گی لیکن
تتلی کے پروں کو کبھی چھلتے نہیں دیکھا

❁ جعفر اسحاق......ہری پور
شوخیاں یہ ناز یہ نخرے یہ بانکپن
حسن لاجواب کا حسنِ مکمل ہیں آپ

❁ حسن علی......سیالکوٹ
خوشی ملی تو کئی درد مجھ سے روٹھ گئے
دعا کرو کہ میں پھر سے اداس ہو جاؤں

❁ محمد سرفراز......رو ہڑی
میں ایک پھول ہوں اجڑی ہوئی بہاروں کا
نہ جانے میرے لیے کیوں مچل گیا کوئی

❁ نازیہ کاشف......ہزارہ
غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

❁ فراز احمد خان......ملتان
نہ جانے کون سا آسیب دل میں بستا ہے
جو بھی ٹھہرا وہ آخر مکان چھوڑ گیا

❁ جی ایم قاضی......راجن پور
سب کی ساقی پہ نظر ہو یہ ضروری ہے مگر
سب پہ ساقی کی نظر ہو یہ ضروری تو نہیں

❁ بشریٰ شکیل......کراچی
اپنا ہی تھا قصور کہ طوفاں میں گھر گئے
اک سوچ تھی کہ جس کو کنارہ سمجھ لیا

❁ زاہدہ منیر......چنیوٹ
ہر بستی، ہر گھر پر چنچل چاند نے چہرہ چمکایا
اس جوگی کے حصے میں پر گھور اندھیرا ہی آیا

❁ شاہینہ علی......ڈی آئی خان
رکھتے ہیں جو اوروں کے لیے پیار کا جذبہ
وہ لوگ کبھی ٹوٹ کر بکھرا نہیں کرتے

❁ سنبل خان......ایبٹ آباد
ہم لوگ سمندر کے بچھڑے ہوئے ساحل ہیں
اس پار بھی تنہائی، اس پار بھی تنہائی

❁ غیور احمد......نواب شاہ
قرض کی پیتے تھے مے اور سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

❊ ...... سمبڑیال

برسوں ہوئے جس شخص کی صورت نہیں دیکھی
پھر آج اسی شخص کا گھر ڈھونڈتا رہا ہوں

❊ امجد منیر ...... پنڈی بھٹیاں

اک مدت تیری بانہوں میں گزاری ہم نے
کیسے گزرے گا زمانہ شب تنہائی کا

❊ محمد اویس ...... چکوال

لوگ جو پیار کی دولت کے امیں ہوتے ہیں
ان کی توہین نہیں کرتے ادب کرتے ہیں

❊ نعمت اللہ ...... کوئٹہ

عقل والوں کے مقدر میں کہاں ذوق جنون
عشق والے ہیں جو ہر چیز لٹا دیتے ہیں

❊ مسکان ...... کراچی

وقت کے پاس نہ آنکھیں ہیں، نہ احساس، نہ دل
اپنے پیچھے ہے کوئی درد نہ تحریر کرے

❊ عنبرین خان ...... مری

صحرا کی طرح رہتے ہوئے تھک گئیں آنکھیں
دکھ لیتا ہے اب میں کوئی دریا بھی تو دیکھوں

❊ رابعہ خان ...... راولپنڈی

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

❊ شہباز خان ...... ساہیوال

ہنسنے کی آرزو میں دبایا جو درد کو
آنسو ہماری آنکھ میں پتھر کے ہو گئے

❊ باقر رضوی ...... پھالیہ

کسی کی زلف پریشاں کسی کا دامن چاک
جنوں کو لوگ تماشا بنائے پھرتے ہیں

❊ پرویز رشید ...... منڈی بہاءالدین

پھیلی ہے کی وسیع، عریض دنیا میں
یہ اک خوشی ہی بہت ہے کہ درد اپنا ہے

❊ فیصل ایاز ...... سرگودھا

دید کا ہو جو شوق تو آنکھوں کو بند رکھ
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

❊ ...... لاڑکانہ

ہم تو ہیں اک اجڑے ہوئے شہر کی مثال
آنکھیں بتا رہی ہیں کہ ویران تم بھی ہو

❊ ندا نایاب ...... چنیوٹ

اپنی آوارہ مزاجی کا یہ عالم ہے کہ اب
چار دیواری جو دیکھیں گے تو مرجائیں گے

❊ اشفاق علی ...... مظفرآباد

آنکھ الجھی ہے کہیں اور تماشا ہے کہیں
ڈھونڈتے ہیں ہم ہیں کہیں اور وہ ملتا ہے کہیں

❊ یمنیٰ جاوید ...... کراچی

کچھ مجھے حیرت ہوئی، کچھ ان کی آنکھیں جھک گئیں
ہوتے ہوتے یونہی اظہار تمنا ہو گیا

❊ عارف ...... حیدرآباد

انہیں پتا بھی چلے اور وہ خفا بھی نہ ہوں
اس احتیاط سے کیا مدعا کی بات کریں

❊ نیر علی یوسف ...... کراچی

نہیں ملتے تو اک ادنیٰ شکایت ہے نہ ملنے کی
مگر مل کر نہ ملنے کی شکایت اور ہوتی ہے

❊ نگہت صبور ...... کوہاٹ

سانپ ڈس لے تو ہے تریاق کا امکان بہت
آدمی ڈس لے تو ہر سانس بکھر جاتا ہے

❊ نبیلہ جبین ...... پنڈدادن خان

ثبت ہیں آنکھ میں گھڑیاں تیرے ملنے اور بچھڑنے کی
نقش ہے اب تک میرے دل پر موسم سرخ گلابوں کا

❊ رانا ذیشان ...... مظفرگڑھ

اب اسی چراغ کو بجھنا ہے انتہا مجھے
جو رات بھر کی ہوا سے لڑتے ہوئے

❊ رضوان محمود ...... واہ کینٹ

میں خود یہ چاہتا ہوں کہ حالات ہوں خراب
میرے خلاف زہر اگلتا پھرے کوئی

❊ راشد بٹ ...... کھاریاں

کانٹا سمجھ کے ہم سے نہ دامن بچائیے
گزری ہوئی بہار کی ہم یادگار ہیں

کوپن برائے شمارہ جولائی 2023

محفلِ شعر و سخن

نام: ____________________

پتا: ____________________



چالباز

صائمہ دانش

اگر انسان کو خدا کی قدرت سمجھنے کا سلیقہ آجائے تو ہر معاملے میں اس اثر کا اثر ہے کیونکہ مجرم اپنی ہوشیاریوں اور چالبازیوں سے اس طرح منصوبہ سازی کر جاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جائے لیکن... اسی حیرت کے سمندر میں ایک شک کا قطرہ دھیرے دھیرے اصل مجرم تک رسائی ممکن بنا دیتا ہے کیونکہ... یہی قطرہ تو خدا کی قدرت اور اس کے انتقام کو ظاہر کرتا ہے۔

ایک مجرم کی چالبازیوں اور مکاریوں کا دلچسپ احوال

میں اپنی میز سے اٹھا، ایک ہاتھ سے اپنا ہیٹ اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے دھوپ کا چشمہ۔ جب جینفر پارکر دفتر کے دروازے سے نمودار ہوئی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے اپنے سن گلاسز وہاں ڈالنے کی کوشش کی جو میرے خیال میں میری یونیفارم کی شرٹ کی جیب تھی لیکن ایسا نہیں تھا کیونکہ اگلے ہی پل وہ میرے ڈیسک ٹاپ پر پڑے تھے۔ ٹوپی میرے سینے سے لگی تھی۔ میں نے اسے ایسے تھام رکھا تھا جیسے جھنڈے سے وفاداری کا عہد کرنے والا ہوں۔

"شیرف! کہیں جا رہے ہو؟" جینی پارکر کا رویہ ہمیشہ میرے ساتھ ایسے ہوتا تھا جیسے میں کوئی آٹھ سال کا بچہ ہوں۔ اس بارے میں ذرا تصور کریں، میں شاید آٹھ سال کی عمر سے ہی اس کے پیار میں پاگل تھا۔

"زیادہ دور نہیں، بس یہاں قریب ہی۔" میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔ میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی۔ میں بس ہیلو کہنے آئی تھی۔"

"میں نے رات ایک فلم کو بہت انجوائے کیا۔" جب وہ جانے کے لیے مڑی تو میں نے کہا۔ "میرے خیال سے تمہیں اسے ایک ساتھ ضرور دیکھنا چاہیے... شاید اس جمعے کو۔"

وہ مسکرائی۔ "ہمیں آہستہ چلنا چاہیے، ورنہ ہمیں

ہمارا ماضی یاد رکھتا ہوگا۔“

مجھے یاد آیا۔ کچھ سال پہلے ایک بار پھر سے ہمارا رشتہ، شادی کے لائسنس اور گھر کی خریداری کے لیے خون کے ٹیسٹ تک پہنچ گیا تھا۔ یہاں تک کہ ہماری شادی کے دعوت نامے بھی چھپ چکے تھے۔ ہمارے ہوش میں آنے کا لمحہ تقریباً ایک ہی تھا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ ہم اس کے بچپن کے گھر کے برآمدے میں راکنگ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور خاموشی سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ ہمارے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ ہم کیا کرنے جا رہے ہیں؟ جو چہروں سے بھی صاف ظاہر تھا۔ اتنا اطمینان ضرور تھا کہ کم از کم ہم نے دعوت نامے نہیں بھیجے (وہیں ڈاک پر پچاس روپے بچائے)۔ کاش میں نے پہلے سے ہی انگوٹھی نہ خریدی ہوتی جو ابھی تک میرے چھوٹے سے بکس میں جرابوں کی دراز میں موجود تھی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”چلو بیٹے تک انتظار کرلیتے ہیں۔“

اس کے چہرے پر دلکش سی مسکراہٹ پھیل گئی جو میرے لیے یقیناً حوصلہ افزا بات تھی۔

”میرے ساتھ چلوگی؟“ میں نے ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”آج صبح بھی بہت روشن اور خوشگوار ہے۔“

”کہاں؟“

”میں نہیں جانتا...... یا پھر شاید ہر جگہ ہی ایک اچھی صبح ہے۔“

”میرا مطلب ہے، ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ اس نے وضاحت کی۔

میں نے کوٹ اپنے کندھوں پر ڈالا اور جینی پارکر کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اسٹیچر لیزی کی طرف ہاتھ ہلایا اور سامنے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”باربرا سینڈ لفر نامی خاتون سے ملنے۔ تم اسے جانتی ہو؟“

”تھوڑا بہت۔ جو وِلی سینڈ لفر جو اب حیات نہیں، انہیں جانتی تھی۔“

”وہ اس کے ڈیڈی تھے۔ بظاہر وہ برسوں پہلے یہاں سے چلی گئی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن آج جب اس نے فون کیا تو اس نے کہا کہ وہ پرانے خاندانی گھر میں رہ رہی ہے۔ تھرڈ اسٹریٹ فرینکلن پر۔“

”اس نے کال کیوں کی؟“ جینی نے پوچھا۔

ہم پوسٹ آفس کے ساتھ والے دروازے سے گزرے اور تھرڈ اسٹریٹ پر جنوب کی طرف مڑ گئے۔ کافی خفا تھی۔ ”اس کا کہنا تھا کہ کل رات اسے لوٹا گیا۔“

”کیسے لوٹا...... کیا چوری ہوئی ہے؟“

”ہم اس بارے میں معلوم کرلیں گے۔“ میں نے اگلے کونے پر چھوٹے کریم ہاؤس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہوں۔“ اس نے کہا۔

میں رک گیا۔ ہم فٹ پاتھ پر کھڑے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ کاش میں اپنے سن گلاسز دفتر میں نہ چھوڑتا۔

”میرے ساتھ آؤ۔ اس سے بات کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”جانتا ہوں تمہیں اس قسم کی سچویشن میں کافی دلچسپی ہوگی۔“

”میں اب وکیل نہیں ہوں ارے یاد ہے...... میں ایک رائٹر ہوں۔“

”ایک مسٹری رائٹر۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ یہ تم ہی تھیں جس نے کیلی براؤسن کو جیل بھیجا تھا۔“

”میں خوش قسمت تھی۔ میں نے محض اپنی چھٹی حس کے سہارے وہ کارنامہ سرانجام دیا تھا۔“ اس نے کہا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ قصوروار تھا اور تم نے اس کا صحیح اندازہ لگایا۔“

وہ گھر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر تذبذب تھا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ یہ ٹھیک رہے گا؟“

”اگر مس سینڈ لفر کو کوئی اعتراض ہوا تو میں کہہ دوں گا کہ تم میری ڈپٹی ہو۔“

”جینز، اسنیکرز اور ایک ہلکے کوٹ میں؟ تمہاری اصلی ڈپٹی یہ پسند کرتی؟“ اس نے اپنے حلیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دراصل میری اسسٹنٹ شیرل گربس کو میرے خیال سے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ شیرل کے نزدیک جینی پارکر ایک چھوٹے سے شہر کی لڑکی تھی جس کے پاس قانون کی ڈگری تھی۔ نیو یارک میں فینسی جاب کی اور خود پھر سے اپنے چھوٹے سے شہر میں واپس آ گئی۔

”شیرل کی اس ہفتے آف ہے۔“ میں نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر میں نے براؤن لان کے پار گھر کی جانب قدم بڑھائے۔ دروازے پر دستک دی۔ جینی وہاں میرے پاس ہی کھڑی تھی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

باربرا سینڈ لفر پچاس کے لگ بھگ لگ رہی تھی۔

”آپ یقیناً شیرف ہیں؟“ اس نے ہیلو کے انداز میں کہا۔

"ڈائمنڈ ڈکس؟" میں نے اپنا جیب ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "اور یہ میری ڈپٹی جنیفر پارکر ہے۔"

"ڈپٹی؟" جینی نے مجھے ناراض نظروں سے دیکھا لیکن کچھ نہیں کہا۔

ہم بارب کے پیچھے اندر کی طرف بڑھے۔ وہ ہمیں ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ ہمیں لیدر کے صوفوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ ہمارے سامنے اسی طرح کی رنگ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بارب اور ہمارے درمیان ایک چمکتی نظر آنے والی شیشے کی ٹاپ والی کافی ٹیبل تھی۔ میں نے شیشے میں سے نیچے دیکھا۔ نیچے سے میرے بوٹوں والے پاؤں، جینی کے اسنیکرز اور بارب کے گھر کے جوتے دکھائی دے رہے تھے۔

جینی بڑے غور سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کمرے میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جس کی ہم توقع کر رہے تھے۔

"مجھے یاد ہے..." جینی نے اچانک کہا۔ "آپ نے یہ فرنیچر ریبوروے سے لیا تھا۔"

بارب پہلی بار مسکرائی۔

مجھے بھی یہ یاد تھا۔ بروکلین میں واقع ریبوروے فرنیچر نے دو ہفتے قبل ایک بڑے پیمانے پر تشہیر شدہ مقابلہ منعقد کیا تھا اور فاتح کو مکمل طور پر لیونگ روم کا فرنیچر ملا تھا۔ چمڑے کا صوفہ اور کرسیاں، پیتل کے لیمپ، ہینڈ کرافٹ چاکلیٹ رنگ کے قالین اور ساتھ میں نقد انعام بھی۔

پھر اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ جیسے ماند پڑ گئی۔ بارب سینڈیفر تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ "مجھے اب بھی یقین نہیں ہے کہ قسمت نے میرا ساتھ دیا تھا۔"

کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔ "ایک لڑکا جسے میں جانتی ہوں...... کیلون گن، کل رات آیا اور مجھ سے قرض مانگا۔ لوگ مجھے ویسے ہی قرض واپس کرنے کے لیے پریشان کر رہے ہیں۔" اس نے ایک آہ بھری۔ "بہرحال، میں نے اسے وہاں سے جانے کو کہا لیکن...... ٹھیک ہے وہ مجھے جانتا ہے۔ کیلون جانتا ہے کہ مجھے جوا کھیلنا پسند ہے...... اور میں کبھی کبھار شراب بھی پیتی ہوں اور...... کل رات اس کے آنے سے پہلے بھی میں ڈرنک کر رہی تھی۔"

میں خاموش رہا۔ اسے دیکھتا اور سنتا رہا۔

"تو جب میں نے اسے قرض دینے سے انکار کر دیا...... ویسے بھی یہ "قرض" نہیں ہوتا، اگر آپ میری بات سمجھ رہے ہیں۔ اس نے مجھ سے کارڈ کی چال پر شرط لگانے کو کہا۔ اس کا کہنا تھا اگر میں جیت گئی تو وہ یہاں سے چلا جائے گا اور میں اسے دوبارہ کبھی نہیں دیکھوں گی اور دوسری صورت میں اگر وہ جیت جاتا ہے تو میں اسے دو ہزار ڈالرز قرض دوں گی...... نقد۔"

"یہ کچھ عجیب بات نہیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے تم سے کہا ہے، میں نے تھوڑی بہت پی رکھی تھی۔" بارب نے کہا۔ "بہرحال، اس نے مجھے شرط کے بارے میں بتایا۔ وہ مجھے ڈیک سے کوئی بھی کارڈ لینے دیتا پھر میں کارڈ کو باہر رکھ دیتی تاکہ وہ اس کا پچھلا حصہ دیکھ سکے۔ لیکن، پھر میں اسے واپس ڈیک میں دوں گی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کارڈ کو چھوئے گا بھی نہیں۔"

"اور؟" میں نے کہا۔

"اور وہ مجھے بتائے گا کہ یہ کون سا کارڈ ہے۔"

"اس کی طرف دیکھے بغیر؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، وہ صرف کارڈ کے پیچھے دیکھتا۔"

"اس نے نشان زدہ ڈیک استعمال کیا ہوگا۔"

"نہیں، ہم نے جو کارڈ استعمال کیے تھے، وہ میرے تھے۔ میں نے اسے کچن میں ردی کی دراز سے نکالا تھا۔"

"پھر اس نے کسی نہ کسی طرح خود اسے نشان زدہ کیا ہوگا۔"

"اس نے کارڈز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا، شیرف ایک بار بھی نہیں۔"

میں نے اس کے مسکرانے کا انتظار کیا لیکن وہ چپ رہی۔

"تو پھر کیا ہوا؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

اس نے اپنی ہتھیلیوں کو یوں دبایا جیسے دعا مانگ رہی ہو۔ "میں نے دراز سے اپنا ڈیک نکالا، اسے کچن کی ٹیبل پر رکھا۔ ایک کارڈ نکالا اور اس کی طرف دیکھا۔ یہ ایٹ آف ڈائمنڈز تھا پھر میں نے کارڈ کو ہمارے درمیان میں سامنے رکھا، بالکل اسی طرح۔" اس نے ہم دونوں کی طرف منہ کیا اور ایک بازو بڑھایا۔

"پھر جب کیلون نے ریڈی ہونے کا اشارہ کیا، تب میں نے کارڈ کو اٹھا کر کے نیچے رکھ دیا پھر اس نے میری طرف دیکھا اور کہا...... ایٹ آف ڈائمنڈز۔" جینی اور میں خاموشی سے بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے کہا۔

"ناممکن نہیں۔" جینی بڑبڑائی۔

"تو پھر کیا ہوا؟" میں نے بارب سے پوچھا۔

"میں نے اس پر الزام لگایا کہ وہ مجھے دھوکا دے رہا ہے تو اس نے کہا کہ ہم اسے دوبارہ کر لیتے ہیں۔"

"کیا آپ نے دوبارہ ایسا کیا؟"

"ہم نے تین بار کھیلا اور اس نے ہر بار صحیح کارڈ کا نام لیا۔"

کچھ دیر کے لیے وہاں خاموشی سی چھا گئی۔ میرے خیال سے اس وقت اگر گھر کی بیک سائڈ میں کوئی ٹی وی چل رہا ہوتا تو اس کی آواز یقیناً سن لیتا۔

بالآخر میں نے اس خاموشی کو توڑا۔ "اور آپ نے اسے پیسے دے دیے؟"

"مجھے دینا پڑے۔" اس نے کہا۔ "اس نے شرط جیت لی تھی۔ اس نے بالکل وہی کیا جو اس نے کہا تھا۔"

"لیکن آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کو لوٹا گیا ہے۔"

"ہاں، میں نے کہا تھا۔ اس نے واقعی مجھے دھوکا دیا۔ ہم......" اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ "میں نہیں جانتی کہ کیسے۔"

جینی اور میں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آخر میں، میں نے ہارب کی طرف دیکھا اور ہاتھ اٹھایا۔ "میں بھی نہیں جانتا مس ہینڈرسن! مجھے ہمدردی ہے لیکن میرے پاس یہاں آپ کی مدد کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔"

اس کے چہرے سے غصہ جھلکنے لگا۔ "مجھے معلوم ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن مجھے صرف کسی کو بتانا تھا۔"

"اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے کہا۔ "ہم اس پر نظر رکھیں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ کیا کیلون کوئی اور کام کرتا ہے۔ کہیں اور، کسی اور کے ساتھ یہ چال چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو ہم اسے پکڑنے کی کوشش کریں گے اور اس پر مقدمہ چلائیں گے۔ ٹھیک ہے؟"

اس نے خلا کی طرف گھورتے ہوئے سر ہلایا پھر کہنے لگی۔ "کیلون اتنا ہوشیار نہیں ہے۔ تم جانتے ہو۔ وہ شخص ایک بزدل انسان ہے۔"

مجھے سمجھ نہیں آیا اس کا کیا جواب دوں۔ ہم وہاں کچھ دیر بیٹھے رہے پھر میں نے جینی کی طرف دیکھا اور ہم ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ٹھیک ہے۔" جینی نے کہا۔ جب ہم آفس کی طرف آ رہے تھے۔ "یہ عجیب تھا۔"

"ہاں، تھا تو سہی۔" میں نے سر ہلایا۔ "اور تم جانتی ہو کیا، مجھے اس پر یقین ہے۔"

"تمھیں یقین ہے کہ کیلون نے اس کے ساتھ کوئی چال بازی کی ہے؟"

"ہاں، وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس کافی دولت ہے۔ وہ اس کے جوئے کی عادت کے بارے میں بھی جانتا تھا اور جانتا تھا کہ وہ اسے جیت سکتا ہے۔" میں نے جینی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ "تم ایک جینئس ہو۔ بتاؤ اس نے یہ کیسے کیا ہوگا؟"

"پتا نہیں۔ شاید ہم کچھ مس کر رہے ہیں۔" وہ پُرسوچ لہجے میں بولی۔

"یہ مجھے کچھ یاد دلاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا؟"

"کیلون کا باپ۔"

"اس کا باپ؟"

"ہاں، میں پہلے بھی کیلون گن سے مل چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "زیادہ مجرمانہ نہیں لیکن وہ ہمیشہ پریشانی کا شکار رہا ہے۔ ہارب نے کہا کہ کیلون دھوکے باز ہے۔ اس کا مطلب ہے سیب درخت سے زیادہ دور نہیں گرا۔"

ہم ٹہلتے ہوئے پائن وڈ پوسٹ آفس کے سامنے فٹ پاتھ کی ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ یہ دسمبر کا آغاز تھا۔ کافی ٹھنڈ تھی لیکن ابھی شدید سردی پڑنا شروع نہیں ہوئی تھی۔ سورج کی حرارت بھرپور اور خوشگوار تھی۔ مجھے گلی کے اس پار کیفے سے مٹھے کی خوشبو آ رہی تھی۔ کرسمس کی روشنیوں کی تاریں ہر درخت کو لپیٹے ہوئے تھیں۔

"تمھارے پاس کیلون کے باپ کی کہانی سننے کے لیے وقت ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں یہیں بیٹھی ہوں، ہے نا؟"

میں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ "کئی سال پہلے" میں نے شروع کیا۔ "جب میں یہاں ڈپٹی تھا۔ میں نے کیلون کے ڈیڈی کے بارے میں سنا تھا...... لیسٹر!" میں یاد کرتے ہوئے رکا۔ "لیسٹر گن ایک ڈیلر تھا۔ اس وقت ہمارا شیرف ورائی ٹیل......"

"وہ مجھے یاد ہے۔" جینی نے کہا۔

"آل رائٹ۔ وہ جانتا تھا کہ لیسٹر ہر قسم کے غیر قانونی کاموں میں ملوث ہے لیکن وہ اسے کبھی نہیں پکڑ سکا۔"

"گن کنٹرول ایک مسئلہ ہو سکتا ہے۔" اس نے اتفاق کیا۔

میں نے اپنا ہیٹ اتارا اور اپنا سر کھجانے لگا۔ "تمھیں یہ کہانی سننی ہے یا نہیں؟"

"اچھا...... سوری!" اس نے منہ بند کیا۔

”برسوں پہلے......“ میں نے جاری رکھا۔ ”لیسٹر گن ایسٹ مین پر برٹن کے ایمپوریم میں اسسٹنٹ منیجر کے طور پر کام کرتا تھا۔“ میں نے اپنے ہیٹ سے اشارہ کیا۔ ”وہ اسٹور اب مل کر ختم ہو چکا ہے۔“

”مجھے وہ بھی یاد ہے۔“ اس کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی۔

”ٹھیک ہے۔ لیسٹر شیخی خور تھا، مغرور تھا۔ وہ ہمیشہ اسٹور پر اپنے دوستوں کے سامنے ڈینگیں مارتا تھا کہ اگر وہ چاہے تو اس جگہ سے چوری کر سکتا ہے اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ اس نے ایک بار کسی کے ساتھ شرط لگائی تھی۔ یہ واقعی ایک مہنگی شرط تھی کہ وہ دو تین ہفتوں کے دوران اسٹور سے پانچ سو ڈالر مالیت کا سامان چوری کر سکتا ہے جس کا پتا نہیں چل سکتا۔“

”مزید شرط۔“ جینی نے کہا۔ ”اور؟“

”لیسٹر کے ساتھی کارکنوں میں سے ایک شیرف کا کزن تھا۔“ میں نے کہا۔ ”کزن نے شرط کے بارے میں شیرف ٹیل کو بتایا اور کچھ دن بعد رابی ٹیل نے لیسٹر کو گھر جاتے ہوئے روکا اور اس کی تلاشی لی لیکن رابی کو کچھ نہیں ملا۔ اس نے دوسری تلاشی دو دن بعد لی اور اس کے دو دن بعد اور پھر بھی خالی ہی آیا۔ ایک بار رابی مجھے بھی ساتھ لے گیا تھا اور میں نے خود دیکھا تھا۔“

”لیسٹر نے اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”شیرف کے ذرائع نے شیرف کو بتایا کہ درحقیقت لیسٹر اس صورت حال سے مزے لے رہا تھا کہ وہ کس طرح سب کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ یہاں تک کہ قانون کو بھی۔ خوف زدہ ہونے اور شرط کو ختم کرنے کے بجائے لیسٹر اس پر قائم رہا۔ رابی ٹیل، لیسٹر کو ہر صبح اپنے پائپ اور بریف کیس اور لنچ بیگ کے ساتھ کام پر جاتے دیکھتا اور ہر دوپہر اسے اپنے بریف کیس اور دھوپ کے چشمے اور ایک لنچ بیگ کے ساتھ باہر نکلتے، مسکراتے ہوئے اور بے فکر دیکھتا۔“

”اس کے بریف کیس کو چیک نہیں کیا گیا؟“

”اس کی بھی تلاشی لی گئی تھی۔ اس میں ہمیشہ معمول کا سامان ہوتا اور دوپہر کے کھانے کے خالی پیکٹ ہوتے۔“

”کوئی خفیہ خانہ؟“

”نہیں۔“ میں نے دھوپ سے بچنے کے لیے ہیٹ واپس سر پر رکھا۔ ”اور لیسٹر کی جیبوں میں بھی کوئی مشکوک چیز نہیں ملی۔“

”جیولری کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”وہ ہر روز وہی ٹائمیکس رسٹ واچ پہنتا تھا۔ اس نے بھی انگوٹھیاں، بریسلیٹ نہیں پہنے۔“

”کیا ٹیل نے کبھی ایسی تلاشی نہیں لی جیسے ایئرپورٹ پر لیتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ اس وقت بھی حدیں تھیں لیکن لیسٹر کو چیکنگ دینے کے بہانے اسے ایک بار بھی اس کے کپڑوں میں چھپی ہوئی کوئی خفیہ جیب یا استر میں سلائی کی ہوئی کوئی چیز نہیں ملی۔“

”کیا شیرف روز تلاشی لیتا تھا؟“

”ہر روز نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن تلاشیوں کے درمیان ایک یا دو دن سے زیادہ کا وقفہ کبھی نہیں ہوا اور وہ ہمیشہ غیر متوقع ہوتی تھیں۔ ایسے میں پہلے سے کوئی منصوبہ بندی کرنا تقریباً ناممکن ہوتا تھا...... اور لیسٹر پاگل نہیں تھا۔“

جینی کچھ لمحے خاموش رہی اور سوچتی رہی۔ خاموشی کے دوران میرا اسیل فون میری جیب میں بجنے لگا۔ میں نے اسے باہر نکالا اور لیزی کی آواز سنی۔

”واپس آ جاؤ، ورنے! یہاں تمہارے لیے کچھ ہے۔“

میں نے رابطہ منقطع کیا اور بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”جانا پڑے گا۔“

”ایک منٹ ٹھہرو۔ بتا کر تو جاؤ پھر کیا ہوا؟“

”لیسٹر کے ساتھ؟ وہ پکڑا گیا۔ ہم نے پتا لگا لیا تھا کہ وہ کیا چوری کر رہا تھا۔“

”کیا چوری کر رہا تھا؟“ اس نے بے صبری سے پوچھا۔

”سن گلاسز۔“ میں نے کہا۔ میں آفس کی طرف فٹ پاتھ سے میں فٹ پیچھے تھا جب میں نے اسے اپنے پیچھے بھاگتے ہوئے سنا۔

”میرے سنی......!“ اس نے کہا۔ اب وہ میرے قدموں سے قدم ملا رہی تھی۔

”ہاں۔ دھوپ کے چشمے، ہر روز مختلف جوڑے، ایک ہی انداز، زیادہ تر سیاہ فریم وغیرہ۔ واضح لیکن زیادہ واضح نہیں۔“

”کارڈ کی چال کی طرح۔“

”بالکل۔“ میں نے کہا۔ ہم آفس کی عمارت تک پہنچے اور سیڑھیاں چڑھ رہے تھے جب جینی نے مجھے روکا۔ اس کا دستانے والا ہاتھ میرے بازو پر تھا۔

”تم ہی تھے جس نے اس کا پتا لگایا تھا...... ہے نا؟ تم نے اسے پکڑا تھا۔“

میں نے کندھے اچکائے۔ ”یہ اتنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے لیسٹر کو قریب سے دیکھنا شروع کیا، کلرکوں سے بات کی اور آخر کار مجھے سمجھ آ گیا۔ وہ کام پر جاتے وقت سن گلاسز

نہیں پہنتا تھا۔ نہ ہی اس کی ضرورت تھی۔"

"اور تم نے یہ میرے بغیر حل کیا......" وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تم نیو یارک میں تھیں۔" میں ہلکی آواز میں بولا۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ "گڈ اولڈ کرک، میرا ہیرو۔"

"مجھے دوست کہو۔" میں نے اسے ٹوکا۔ جیسے ہی ہم دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئے میرا خوشگوار موڈ ایک دم بدل گیا۔ لیزی نے اٹھ کر مجھے پیغام دیا۔ میں اور ٹینی نے مل کر نوٹ پڑھا پھر میں اپنے دفتر میں داخل ہوا اور ایک فون اٹھا کر کال ملائی۔

"مسٹر تھمپسن؟" میں نے کہا۔ "ریمنڈ ہلکس — سر — مجھے ابھی آپ کا میسج ملا۔ آپ کی بیوی کے بارے میں سن کر افسوس ہوا۔" میں نے اسپیکر فون کا بٹن دبا دیا تاکہ ہم ایک ساتھ سن سکیں، جب جیکب تھمپسن نے اپنے چھوڑے ہوئے نوٹ سے معلومات کو دہرایا۔

دس منٹ پہلے اس نے اپنی بوڑھی بیوی میگی کو اپنے پہاڑی گھر کے پیچھے کی پتھریلی سیڑھیوں پر مردہ پڑا ہوا پایا۔ اس نے کہا کہ یہ کوئی حادثہ نہیں تھا۔ اسے کسی نے مارا تھا۔ جب وہ مزید کسی تفصیل میں نہیں جا پایا تو میں نے اسے بتایا کہ میں راستے میں ہوں اور فون بند کر دیا۔ میں نے ٹینی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کیا تم یہ سوچنا شروع کر رہی ہو کہ تمہیں آج ہیلو کہنے کے لیے نہیں رکنا چاہیے تھا؟"

وہ وہیں اپنی کہنیوں کو گلے لگائے یوں کھڑی تھی جیسے اب بھی ٹھنڈ ہو۔

"میں نے آج صبح دو کیسز کے بارے میں سنا ہے اور ان میں سے صرف ایک ہی حل ہوا ہے۔ میں تیسرے کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔"

"تمہارا یہ وقت ضائع نہیں جائے گا۔" میں نے ایک دراز کھول کر دیکھا۔ ایک اضافی ڈپٹی بیج مل ہی گیا۔ میں نے اسے اس کی جانب پھینک دیا۔ "یہ تمہارے انڈر کور سے میل کھاتا ہے۔"

جب ہم باہر نکلے تو میں نے لیزی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم اس بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گی، ٹھیک ہے؟"

"بس تم اور کورونر۔" اس نے سر ہلایا۔

جیکب تھمپسن کے گھر تک ڈرائیو کرنے میں اس سے زیادہ وقت نہیں لگا جتنا ہارپ سینڈ لفر کے گھر تک پیدل چلنے میں لگا تھا۔ یہ گھر ایک پہاڑی کے کنارے پر بنایا گیا تھا۔ میں نے کاؤنٹی کورونر کی وین کو مخالف سمت سے گزرنے کے لیے گاڑی تنگ سڑک کے کنارے کر کے گھر کی طرف بڑھائی اور سامنے کے پورچ میں روک دی۔ ہم اتر کر پچھلی طرف آئے تھے۔ جیکب جس نے ہمیں آتے ہوئے دیکھا ہوگا، وہاں ہم سے ملا۔ تعارف اور مزید تعزیت کے تبادلے کے بعد ہم تینوں نے ان سیڑھیوں کا بغور جائزہ لیا جو دو منزلہ گھر کے پچھلے پورچ سے لکڑی کے بنے اس چھوٹے سے کیبن تک چلی گئی تھیں۔ اس کیبن میں فرش تا چھت شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔

"اس کا اسٹوڈیو۔" جیکب نے کہا۔ "اس نے کچھ سال پہلے آرٹ میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ اس گھر میں سب سے زیادہ خوش تھی۔ پہاڑیوں کو پینٹ کر کے اور اپنی کتابیں پڑھ کر۔"

باہر سے اور کچھ فاصلے پر بھی، میں کیبن کے اندر کتابوں سے بھرے شیلف دیکھ سکتا تھا۔

"کئی مہینے پہلے اس کے فالج کے بعد سے وہ دونوں میں سے زیادہ کچھ نہیں کر پائی تھی لیکن وہ صحت یاب ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کمزور ہو گئیں۔" "اور اب یہ۔"

میں کئی سیکنڈ تک احتراماً خاموش رہا پھر اپنا نوٹ پیڈ اور قلم نکالا اور اپنا کام کرنے لگا۔

"آپ نے بتایا کہ اس نے اسٹوڈیو آنا کم کر دیا تھا؟"

"جب سے اس کی صحت کے مسائل شروع ہوئے تھے تب سے۔" اس نے کہا۔ "مجھے شک ہے کہ وہ آج بھی اس طرف نہ آتی اگر ــ" اس نے اپنی نم آنکھوں کو آستین سے پونچھا اور اپنے کوٹ کی جیب سے ایک تہ شدہ لفافہ نکالا۔ "مجھے آج صبح کچن کی میز پر یہ ملا۔ میں اسے کل دوپہر کے آخر میں میل باکس سے باقی لفافوں کے ساتھ لایا ہوں گا اور اس پر توجہ نہیں دی۔ ہم نے کل رات ڈنر کیا۔ ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ اس نے آج صبح اس خط کو دیکھا ہوگا، میرے اٹھنے سے پہلے۔ وہ ہمیشہ سے جلدی اٹھنے کی عادی تھی۔ میں رات کا الو ہوں۔"

لفافے کو کونے سے پکڑتے ہوئے میں نے سامنے سے دیکھا۔ یہ مسز جیکب تھمپسن کے نام تھا۔ نہ واپسی کا پتا، نہ کوئی پوسٹ مارک۔ یہ کل ان کے میل باکس میں ہاتھ سے ڈالا گیا ہوگا۔ اندر کاغذ کی ایک شیٹ تھی۔ اس پر ٹائپ کیے گئے الفاظ تھے۔

"مائیرو فالکن کے صفحات 85 اور 86 کے درمیان ملو"

سمپسن کے لیے ایک ضروری پیغام رکھا گیا ہے۔"

جینی نے میرے کندھے پر سے جھانکتے ہوئے سرگوشی کی۔ "یہ ناول ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں جیکب کی طرف متوجہ ہوا۔ "مجھے لگتا ہے کہ آپ کی بیوی کے پاس اس ناول کی ایک کاپی ہوگی۔"

"جی ہاں۔" اس نے تصدیق کی۔

"اور آپ کو لگتا ہے کہ یہ پیغام اس کی موت سے متعلق ہے؟"

"ہاں.... کیا آپ کو اس سے ایسا نہیں لگتا؟" اس نے خط کی طرف اشارہ کیا۔ "میرا خیال ہے کہ جس نے بھی یہ نوٹ بھیجا تھا وہ جانتا تھا کہ میری بیوی کو ہر قسم کی پراسرار چیزیں اور پہیلیاں پسند ہیں اور یہ کہ اس کے پاس اس ناول کی ایک کاپی اس کے اسٹوڈیو کی کتابوں کی الماری میں موجود ہے۔" اس نے توقف کیا اور پھر جب بولا تو اس کی آواز سخت تھی۔ "مجھے لگتا ہے کہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کتنی کمزور تھی اور یہ کہ ان سیڑھیوں سے اکیلے نیچے جانا اس کے لیے خطرناک تھا۔ خاص طور پر اس موسم میں۔"

"تم کہہ رہے ہو کہ یہ پیغام اسے لالچ دینے کے لیے تھا۔ اس امید پر کہ وہ کیبن کی طرف آئے؟"

جیکب نے سر ہلایا۔ "اس سے بڑھ کر۔ مجھے لگتا ہے کہ بھیجنے والا انتظار کر رہا تھا، اس کے باہر آنے پر اسے پیچھے سے دھکا دینے کے لیے۔" اس نے پتھر کی سیڑھیوں کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ سیڑھیاں لمبی اور چوڑی بھی ہیں اور وہ ہینڈ ریل سے دور بائیں جانب نیچے گری ہوئی تھی۔ حالانکہ مِنی ہمیشہ ہینڈ ریل پکڑی رہتی تھی۔"

"کیا ہوتا اگر اسے یہ لفافہ کل رات ہی نظر آجاتا؟" میں نے کہا۔ "کیا ہوتا اگر وہ تمہیں اپنے ساتھ دیکھنے کے لیے باہر لے آتی؟"

"مجھے نہیں پتا کہ وہ کیا کرتی۔ وہ اسٹوڈیو اس کا علاقہ تھا۔ اس کا ذاتی گوشہ۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جینی نے کہا۔ "اگر یہ سب سچ ہے تو وہ کون ہے جو اسے مارنا چاہتا تھا؟"

جیکب نے ایک گہری سانس لی۔ "صرف دو لوگ۔" اس نے کہا۔ "جو ایک بار ماضی میں اس کے اسٹوڈیو آچکے تھے۔ ایک الزبتھ سون۔ تم اسے جانتے ہو؟ نئی کتابوں کی سینٹر شپ پر اس کی اور مِنی کی لڑائی نے انہیں کاونٹی لائبریرین کے عہدے سے برطرف کر دیا تھا۔ وہ اس سے نفرت کرتا تھا۔"

"اس طرح کے سوچے سمجھے منصوبے کے ساتھ کیا وہ اسے قتل بھی کر دیتا؟"

"میں نے ایسا نہیں سوچا تھا لیکن کون جانتا ہے؟ دوسرا مشتبہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارا بھتیجا، کیلون کن۔"

جینی اور میرے درمیان نظروں کا تبادلہ ہوا۔

"کیلون؟"

جیکب نے منہ بنایا۔ "وہ مِنی کے نکمے بھائی لیسٹر کا بیٹا ہے۔"

"لیکن اس پر شک کرنے کی وجہ؟" جینی نے پوچھا۔

"پچھلے ہفتے کچھ ایسا ہوا — مِنی میرے ساتھ بروکاوین میں ریورو فرنیچر میں تھی۔ وہ بہت اچھا دن تھا۔ تب اس نے کیلون کو بتایا کہ وہ اس کی شراب نوشی سے تنگ آچکی ہے اور اسے اپنی وصیت سے خارج کرنے والی ہے۔"

"رکو۔" جینی نے کہا۔ "کیلون تم دونوں کے ساتھ ریورو فرنیچر میں کیا کر رہا تھا؟"

"کچھ نہیں۔" جیکب نے ہاتھ پھیلائے۔ "وہ وہاں کام کرتا ہے۔"

"کیا؟" جینی کا ردعمل بے ساختہ تھا۔

"ایک اسٹاک بوائے یا ایسا ہی کچھ۔ جس میں زیادہ دماغ لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔" جیکب بولا۔

جینی کسی غیر مرئی شے کو تک رہی تھی۔ اس کا چہرہ خالی تھا۔ "میرے خدا۔" وہ بڑبڑائی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ "میں جانتی ہوں اس نے کیا، کیا۔" اس نے کہا۔ "میں جان گئی کہ کیلون نے ہارب سینڈیفر کو کس طرح دھوکا دیا تھا۔"

میں نے جیکب کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ایک منٹ معاف کرنا۔" پھر جینی کو ایک طرف لے گیا۔ "تم کس بارے میں بات کر رہی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ فرنیچر کی دکان پر کام کرتا تھا ورے!"

"تو؟" میں سمجھا نہیں۔

"اگر اس نے وہاں کام کیا تو اسے معلوم تھا کہ انعام کیا ہے۔ ریورو ے گیووے۔ اسے پہلے سے ہی معلوم تھا کہ ہارب نے کیا سامان جیتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''یاد ہے، ہارب نے ہمیں کیا کہا تھا؟ چال کے دوران اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کارڈ پکڑے جو اس نے اپنے سامنے رکھا تھا۔ ان کے درمیان۔ ٹھیک ہے؟''

''تو؟''

''کیلون جانتا تھا کہ اس کے پاس گہرے رنگ کا قالین ہے، رے! اور ایک شیشے کی ٹاپ والی کافی ٹیبل ہے۔ اسی لیے وہ وہاں گیا تھا۔ قالین کے سیاہ پس منظر نے شیشے کو آئینے کی طرح چمکا دیا تھا تو......''

اچانک ہی میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ ''تو وہ کارڈ کے نیچے کا حصہ شیشے کے ٹیبل ٹاپ میں جھلکتا دیکھ سکتا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔'' اس کے گال اب صرف سردی سے ہی نہیں بلکہ جوش سے تمتما رہے تھے۔ ''وہ صحیح تھی۔ کیلون ہوشیار نہیں ہے۔ وہ صرف ڈرپوک ہے۔ اس نے اسے دھوکا دیا ہے۔'' وہ میرے قریب تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''اسے پیسے کی ضرورت تھی جو ہارب کے پاس تھا اور وہ جانتا تھا کہ اسے اس سے کیسے نکالا جائے۔'' اس نے کہا۔

''بالکل یہاں کی طرح۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے...... یہاں کی طرح؟''

جینی نے پلٹ کر جیکب سے کہا۔ ''تم نے جس وصیت کا ذکر کیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تمہاری بیوی کیلون کو نکالنے والی تھی؟''

''ہاں۔'' جیکب نے کہا۔

''لیکن اس نے ابھی تک یہ کیا نہیں تھا۔ ہے نا؟''

''ہاں...... اور کیلون یہ جانتا تھا۔'' وہ بولا۔

''ہم کتنی وراثت کی بات کر رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت کچھ۔ اس کے والد نے اس کے لیے کافی کچھ چھوڑا ہے۔''

''کتنا؟''

''کیلون کا حصہ سو گرانڈ یا اس سے زیادہ ہوگا۔''

جینی نے دوبارہ میری طرف دیکھا۔ میں اس کے چہرے پر یقین دیکھ سکتا تھا۔ میں نے خود محسوس کیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے کہ ہمیں والٹر ہارمون اور کیلون گن دونوں سے سوال کرنے کی ضرورت ہے۔ مسٹر جیکبسن! کیا آپ اپنی بیوی کے اسٹوڈیو میں ان کی اس کتاب کے صفحات دیکھنے کے لیے گئے ہیں؟''

''نہیں۔ میں نے سوچا کہ مجھے آپ کا انتظار کرنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔ چلو چلتے ہیں۔''

''مجھے چابی لانے دو۔'' اس نے کہا۔ ''وہ گھر میں ہے۔'' وہ جلدی سے واپس پہاڑی پر چلا گیا۔ جب وہ اندر غائب ہو گیا تو جینی نے مجھ سے کہا۔

''تمہیں کتاب بھی دیکھنی پڑے گی۔''

میں نے خود کو جھنجوڑتا محسوس کیا۔ ''کیوں؟''

''کیونکہ وہاں کچھ نہیں ہوگا۔''

''تم کافی پر یقین ہو۔''

''ہاں...... میں ہوں۔'' وہ مسکرائی۔

''تو کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ منی کو کس نے مارا ہے؟''

''ہاں، اگرچہ صرف دو مشتبہ ہیں کیونکہ یہ کام مجھے والٹر ہارمون کا نہیں لگتا۔''

''کیوں نہیں؟''

''کیونکہ مسٹر ہارمون تیس سال سے لائبریرین تھے، رے! اور وہ کتابیں جانتے ہیں۔ آگے پیچھے، کتابوں کے بارے میں سب کچھ اور......''

''اور کیا؟''

''کتابوں کو جاننے والا کوئی بھی ایسا نوٹ نہ لکھتا۔''

''تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟'' میں الجھ گیا۔

جیکب چابی لے کر پہنچا۔ جینی پیچھے ہٹی۔ دعوت دینے کے سے انداز میں ہاتھ بڑھایا اور مجھ سے کہا۔ ''خود ہی دیکھ لو۔''

میں سیڑھیوں سے جیکب جیکبسن کے پیچھے گیا اور جب اس نے اسٹوڈیو کا دروازہ کھولا تو میں سیدھا کتابوں کے شیلف کی طرف بڑھا۔ ایک منٹ بعد میں نے ہیلن فالکن کی ایک خوبصورت ہارڈ کور کاپی اتاری۔ صفحہ 85 پلٹا اور جم گیا۔

''دیکھو، میرا کیا مطلب تھا؟'' جینی نے دروازے سے آواز لگائی۔

جیکب بھی دیکھنے کے لیے جھک گیا۔ جینی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ پچاسی اور چھیاسی صفحات کے درمیان کچھ نہیں تھا۔ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ صفحات پچاسی اور چھیاسی تھے۔ ایک ہی صفحے کے آگے اور پیچھے۔ وہ یہاں بھی درست تھی کہ ایک لائبریرین کو یہ معلوم ہوگا۔

''اگرچہ صرف دو مشتبہ افراد ہیں۔'' اس نے دہرایا۔

''مجرم فریق کیلون گن ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''میں تم پر یقین کرتا ہوں لیکن......''

''لیکن کیا؟''

''ہمیں ثبوت کی ضرورت ہے۔''

اس نے ایک لمحے کو سوچا پھر اپنی گھڑی کی طرف

دیکھا اور میری سمت نظریں اٹھائیں۔ ایک دھیمی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ ”میرے پاس ایک منصوبہ ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیسا منصوبہ؟“

”مسز ہیمپسن!“ اس نے کہا۔ ”تم نے اس بارے میں کسی سے بات نہیں کی؟ کسی سے بھی نہیں؟“

”صرف تم دونوں اور ڈپٹی لیزی۔“

”لیزی خاموش رہے گی۔“ میں نے کہا۔ ”اور گورڈن بھی۔“ جینی نے اپنی نظریں جیکب پر جمائے رکھیں۔ ”ابھی گیارہ بج چکے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ نے اپنی بیوی کی لاش کب دریافت کی؟ دس بجے یا اس سے زیادہ؟“

”یہی وقت رہا ہوگا جب میں نے فوراً شیرف کے دفتر فون کیا۔“

”لیکن قتل تو بہت پہلے ہوا تھا، ہے نا؟“

”ہاں، میں آٹھ کے قریب بیدار ہوا اور اکیلے ہی ناشتا کیا۔ میں نے سوچا کہ منی پیچھے کے بیڈ روم میں ہے جہاں وہ فالج کے بعد سے رہ رہی ہے لیکن یقیناً ایسا نہیں تھا۔ اس لیے میں نے بہت دیر بعد اسے ڈھونڈنا شروع کیا۔ جو کچھ بھی ہوا وہ آٹھ بجے سے پہلے ہوا ہوگا۔“

”کم از کم تین گھنٹے پہلے۔“ جینی نے کہا۔ ”میرا اندازہ ہے، قاتل نے سوچا ہوگا کہ لاش دریافت ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا اور وہ یہ بھی سوچ رہا ہوگا کہ اب تک پائن ووڈ کے ہر فرد کو اس کے بارے میں پتا چل چکا ہوگا۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”لیکن کیلون پائن ووڈ میں نہیں ہے۔ وہ بروکاوین میں کام کرتا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ میں کیا سوچ رہی ہوں؟“

”شاید، ہاں۔“ میں نے کہا۔

دس منٹ بعد میں نے اپنے سیل فون سے ریورڈے فرنیچر کو کال کی اور کیلون گن کے لیے کہا۔ جب وہ لائن پر آیا تو میں نے اسکرپٹ کو دیکھا جو ہم نے تیار کیا تھا اور کہا۔

”مسٹر گن! شیرف ڈگلس، پائن کاؤنٹی، آپ مجھے اپنی آنٹی منی ہیمپسن کے بارے میں کیا بتا سکتے ہیں؟“ میں نے اپنی سانسیں روکے کئی سیکنڈ انتظار کیا۔

”میں اب بھی اس پر یقین نہیں کر سکتا، شیرف! ہم بہت قریب تھے، آنٹی منی اور میں۔“

”میں سمجھتا ہوں، مسٹر گن! لیکن میرے لیے آپ کو بتانا ضروری ہے کہ ہمیں فاؤل پلے کا شبہ ہے۔ اگر آپ کے پاس کچھ ایسا ہو جو مدد کر سکے، کچھ بھی...... براہِ کرم ہم سے رابطہ کریں۔ ٹھیک ہے؟“

”بالکل، شیرف! اور اگر...... اگر یہ حادثہ نہیں تھا تو مجھے امید ہے کہ جس نے بھی یہ کیا ہے، آپ اسے تلاش کر لیں گے اور جلد ہی......“

”ہاں، میں ضرور ڈھونڈ نکالوں گا، مسٹر گن! بہت بہت شکریہ۔“ میں نے رابطہ منقطع کر دیا اور اپنے فون کی ریکارڈنگ آف کر دی۔

ہمارے پاس اب اس بات کا ثبوت تھا کہ کیلون گن کو معلوم تھا کہ منی مر چکی ہے اور وہ یہ بات تب تک نہیں جان سکتا تھا جب تک کہ وہ خود قاتل نہ ہو۔

میں نے جینی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ ”تم جانتی ہو تم کیا ہو؟ تم جینیئس ہو۔“

اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ پھیلی۔ ”میرا خیال ہے کہ تم ابھی ریورڈے جاؤ اور اسے لے آؤ۔ اسے سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہ دو۔“

”تم ساتھ نہیں آؤ گی؟“

”نہیں، مجھے ان کے نیکسٹ گیوڈے کے بارے میں کچھ معلومات لینا ہیں۔“ اس نے بظاہر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”میرا خیال ہے کہ اس فرنیچر کو میں رکھ لوں گا، اپنے لیونگ روم کے لیے۔“

”ہاں، تم رکھ سکتے ہو۔“ اس نے اتفاق کیا۔

مجھے یاد آیا کہ اس نے اپنی کار میرے آفس کے باہر چھوڑی تھی۔ ”میں تمہیں واپس لے جاؤں گا۔ یہ میرے راستے میں ہے۔“

”ٹھیک ہے، لیکن پہلے مجھے بارب سینڈ فرگ کے پاس چھوڑ دو۔ میں اسے یہ خوش خبری خود دینا چاہتی ہوں۔“

”اور کچھ تاش بھی کھیلو گی؟“ میں نے بھویں اٹھائیں۔

”اور ایک دو ڈونٹس بھی۔“ وہ ہنسی۔

ڈرائیو کرتے ہوئے میں نے اپنی آنکھ کے کونے سے دیکھا کہ جینی، پسنجر سیٹ پر اپنے کوٹ کی جیب سے ڈپٹی کا بیج نکال رہی ہے۔ اس نے اسے دیکھا اور اپنا سر جھکا لیا پھر اس سے کھیلنے لگی۔

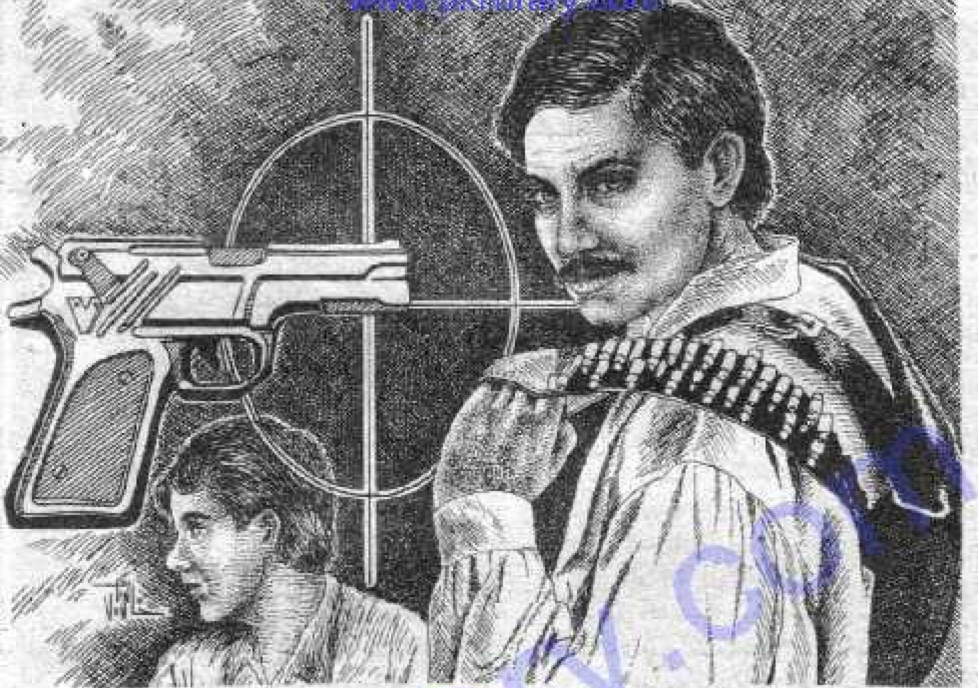
”تم نے ٹھیک کہا تھا۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”میرا وقت ضائع نہیں کیا۔“

”یہ تم رکھ لو۔ تم اسے فخر سے دیکھتے ہوئے لگا سکتی ہو۔“

اس نے میری جانب دیکھا اور مسکرائی۔ ”بیچنے کو؟“

”نہیں...... مجھے کو۔“ میں نے کہا تھا۔

ﷺ ﷺ ﷺ



جنگباز

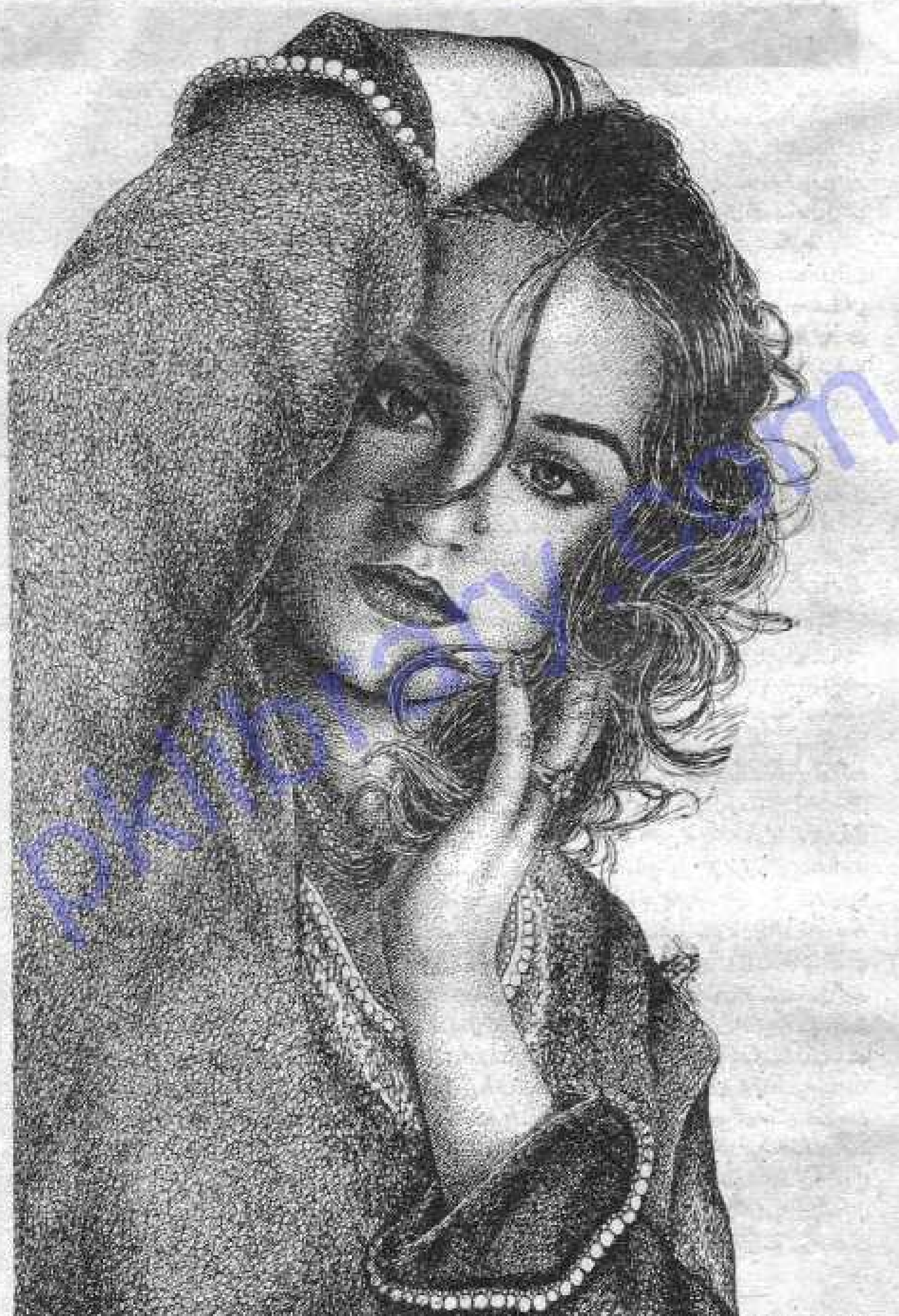
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر16

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم

زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان



روشنیوں کا شہر کراچی...... اس نے جانے کتنے لوگوں کو اپنے دامن میں ماں کی طرح سمیٹ رکھا ہے۔ ان گنت داستانوں کی امین اس مہربان گود کے کسی کونے میں سہراب خان یعنی میں بھی رہتا ہوں جو ایک غریب محلے میں محبت کرنے والی ماں اور ایک سخت گیر طبیعت کے حامل باپ کا ایسا ناخلف بیٹا بھی تھا جو ہر وقت باپ کی بے جا مار پیٹ کا نشانہ بنا رہتا۔ میری ایک بہن بھی تھی راحیلہ مگر نہیں، بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ میری بہن نہیں تھی، خالہ زاد تھی۔ بچپن میں اس کے ماں باپ ایک ناگہانی حادثے میں مر چکے تھے اور ماں نے اسے میرے ساتھ ہی پال پوس کر جوان کیا تھا۔ یہ راز صرف میری ماں اور راحیلہ کو پتا تھا۔ میں تو راحیلہ کو بچپن سے ہی سگی بہن سمجھا کرتا تھا مگر وہ بچپن سے ہی مجھے ایک بھائی کی نہیں بلکہ کسی اور ہی "نگاہ" سے دیکھا کرتی۔ ماں میری شادی اس سے کروانا چاہتی تھی لیکن یہ حقیقت آشکار ہونے کے باوجود بھی میرے اس جذبے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اب بھی اسے ایک "بہن" کے ہی روپ میں دیکھتا تھا۔ راحیلہ نے میرے اس برتاؤ پر برا منایا مگر میں اسے بری طرح جھڑک دیتا۔ میرا باپ، ماں کو مارا پیٹا کرتا تھا۔ ایک دن ماں کو اس نے گہرا زخم دیا تو میں برداشت نہ کر پایا اور باپ کے سامنے سینہ تان کے کھڑا ہو گیا۔ باپ کا یہ دیکھ کر بلڈ پریشر بڑھ گیا اور اس کی دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ وہ جہان سے کوچ کر گیا تو گھر میں سکون ہوا۔ پتا چلا کہ اصل نحوست غربت کی نہیں بلکہ ایک غصہ ور شخص کی روز روز کی دانتا کل کل کی تھی۔ غربت اور باپ کی سخت گیر طبیعت نے مجھے ایک حد تک جرائم کی طرف لڑھکا ضرور دیا تھا مگر چونکہ شاید میری رگوں میں "نسلی" خون دوڑ رہا تھا اسی لیے میں جلد ہی سنبھل گیا مگر اس "سنبھلنے" کی مجھے بڑی قیمت چکانا پڑی۔ میں اور میرا باپ ایک فیکٹری میں معمولی ورکر تھے۔ گلی کے محلے میں ہی تین ہم عمر لڑکے میرے یار کہلائے۔ ایک کا نام سلیم دوسرے کا راجو اور تیسرا ماجد تھا۔ ماجد کی جوان بہن فوزیہ میری پہلی اور آخری محبت ٹھہری۔ ہم چاروں جرائم پیشہ گروہ کے آلۂ کار بن گئے۔ اقبال نامی ادھیڑ عمر شخص ہمارا "باس" کہلایا۔ اس کا نائب سجاد بیگ تھا۔ اسی گروہ نے ہم چار یاروں (سلیم، راجو، ماجد اور مجھے) ایک روز آنکھوں پر پٹی باندھ کر کسی نامعلوم مقام پر بھجوا دیا جہاں ہمیں لڑائی بھڑائی کی خصوصی ٹریننگ دی گئی۔ میں جسامت کے لحاظ سے چھریرا لمبا اور مضبوط کاٹھی کا تھا۔ سلیم مناسب قد و قامت کا جبکہ راجو اور ماجد قدرے گٹھی ہوئی جسامت کے مالک تھے۔ گروہ نے ہمارے ناموں کے ساتھ عجیب و غریب قسم کے "لاحقے" منسلک کر ڈالے۔ میں سہراب لیو کہلایا۔ سلیم کے ساتھ "چھالیا" منسلک ہو گیا۔ راجو "بوری" ہو گیا جبکہ ماجد "ماجا"۔ گروہ دیگر جرائم کے ساتھ بھتا خوری بھی کرتا تھا۔ ہمارے فیکٹری مالک سیٹھ سکندر سے بھتا لینے کے لیے "باس" اقبال نے ہمیں استعمال کیا۔ میری غیرت جاگی۔ میں نے سلیم وغیرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ میرے مخالف ہو گئے۔ جبکہ میں نے سیٹھ سکندر کے ساتھ نمک حلال کیا اور اسے سب باتیں بتا دیں کہ بھتا نہ دینے کی صورت میں اس کی فیکٹری کو بم سے اڑا دینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ میں نے بروقت بم کی اطلاع دے کر جہاں سیکڑوں غریب ورکروں کی جان بچائی، وہیں سیٹھ سکندر کو بھی بھاری مالی اور جانی نقصان سے بچا لیا۔ گروہ سمیت میرے تینوں یار میری جان کے دشمن ہو گئے۔

سیٹھ سکندر کی جواں سال خوب صورت بیٹی سدرہ میری "نمک حلالی" سے متاثر ہوئی۔ سیٹھ سکندر تو تھا ہی میرا معترف۔ عقدہ کھلا کہ سدرہ کا ماموں یعنی سیٹھ سکندر کا سالا، سدرہ کی والدہ کا بھائی، سجاد بیگ ہی جرائم پیشہ گروہ کے باس اقبال کا نائب ہے۔ بعد میں اس راز سے بھی پردہ ہٹا کہ وہ سدرہ کی ماں کا سوتیلا بھائی تھا۔ وہ بھائیوں والی محبت جتا کر سوتیلی بہن کا سب کچھ ہتھیانا چاہتا تھا اور اپنے گروہ کو بھی مالی فائدہ پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی پلاننگ آشکار کر دی۔ وقت تیزی سے بدلا۔ ماں مر گئی۔ ماجد عرف ماجے کے قتل کا الزام مجھ پر لگا۔ فوزیہ مجھ سے متنفر نہ ہوئی تھی کیونکہ بعد میں راحیلہ نے اسے حقیقت بتا ڈالی تھی۔ میں لاک اپ ہوا۔ اسی دوران کوئی "پھوجا خان" نامی اجنبی میری مدد کو آیا۔ اندازہ ہوا کہ یہ گروہ کا کوئی مخالف تھا۔ اس کی مدد سے میں نے کسی طرح قانون سے رہائی پائی۔ باس اقبال، سلیم چھالیا اور راجو بوری میرے خون کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں راحیلہ اور فوزیہ کو لے کر کراچی سے سیالکوٹ ہجرت کرنے لگا۔ وہاں سدرہ کا کوئی مکان خالی پڑا تھا۔ ادھر سدرہ کو اپنے نام نہاد ماموں سجاد بیگ سے بھی جان کا خطرہ تھا۔ سیٹھ سکندر کے دو وفادار محمود قریشی اور مشتاق بھی تھے۔ ٹرین کراچی سے پنجاب کے لیے روانہ ہوئی اور صادق آباد میں فوزیہ اور راحیلہ سے بچھڑ کر میں بااثر "چودھری حق برادران" کے نرغے میں چلا گیا۔ وہاں بھولے سے میری عجیب حال میں ملاقات ہوئی۔ اس کی منگ سے چودھری شالا حق نے زبردستی شادی کر لی تھی۔ اس کا نام نادرہ تھا۔ ہم تینوں فرار اختیار کر گئے۔ راستے میں پولیس اور چودھری حق برادران کے حواریوں سے مقابلے میں بھولا مارا گیا۔ نادرہ میری ذمے داری بن گئی۔ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اسے درحقیقت کسی اور سے محبت تھی۔ اس کا نام بختیار تھا۔ وہ بھولے کو بھی بے وقوف بنائے ہوئے تھی۔ بختیار راجن پور میں رہتا تھا۔ فوزیہ اور راحیلہ کو بھی میں نے کسی طرح تلاش کر لیا۔ جوان عورتوں کو اغوا کرنے والے خطرناک گروہ میں فوزیہ جا پھنسی تھی اور بہت کٹھن مراحل سے گزرتے ہوئے میں نے اسے آزاد کرایا۔ سیالکوٹ میں ایک ماں بیٹی سے میری شناسائی ہوئی۔ وہ مجھے دل لگیں۔ لڑکی نگہت اور ماں شگفتہ خاتون۔ نگہت کسی وسیم نامی لڑکے سے محبت کرتی ہے۔ دونوں فائٹنگ کلب کے ممبر بھی تھے۔ عقدہ کھلا کہ شگفتہ، باس اقبال کی منکوحہ تھی اور نگہت بیٹی مگر شوہر کی مجرمانہ زندگی سے تنگ آ کر شگفتہ اپنی بیٹی نگہت کے ساتھ کراچی سے سیالکوٹ اپنے ماں باپ والے گھر میں آن بسی تھیں۔ ان کی الگ کہانی تھی۔ فائٹنگ کلب کا ایک ماسٹر عرف استاد جو بھی میرا دوست بن جاتا ہے۔ نگہت اب بھی باپ (اقبال) سے ملاقات کرتی ہے۔ سیالکوٹ میں

اقبال چوک پر اس کے باپ جمّی باس کا بنگلا ہے۔ وہاں وہ چوکیدار اور ملازم ارشد وغیرہ ہیں۔ ایک خفیہ گروہ "کالی لہر" سے میرا ٹاکرا ہوتا ہے۔ یہ جادو ٹونے کرنے والا گروہ ہے۔ عدیل جو کہ جگنو ہی شخص کا بھائی ہے ان کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جگنو ایک بڑی سیاسی شخصیت کا آلۂ کار تھا۔ وہ میرا دشمن اور بعد میں دوست بن جاتا ہے۔ کالی لہر کے رانگا پاپا اور میڈم بھی سے میری دشمنی عروج پر ہے اور ان کے میرے خلاف جادو ٹونے بھی۔ میرا دشمن باس اقبال بھی ان کی جادوئی ہانڈیوں کی زد میں آکر اسپتال پہنچ جاتا ہے۔ اس کی بیٹی نگہت میری دشمن بن جاتی ہے جبکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون مجھے بھائی سمجھتی ہے۔ اب میری بیک وقت جنگ بازی۔۔۔۔ باس اقبال کے نائب سجاد بیگ، چوہدری تق برادران اور کالی لہر والوں کے ساتھ جاری ہے۔ میں راحیلہ کا پیچھا کرتے ہوئے رانگا پاپا کے ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہوں اور اسے اٹھا کر فارم ہاؤس لے آتا ہوں۔ رانگا نے منتر پڑھنا شروع کر دیے اور اچانک وہاں ہانڈیوں کی بارش ہونے لگی۔ مجھے سر پر کچھ مار کر بے ہوش کر دیا جاتا ہے اور جب ہوش آیا تو وہ لوگ یاد کرانے لگے کہ میں مر چکا ہوں اور میری روح ان کے قبضے میں ہے۔ عجیب عجیب شعبدہ بازیاں دکھائی گئیں، پھر مجھے حالت بے ہوشی میں قبر میں دفنا دیا گیا۔ وہاں بجو نے حملہ کیا اور جب ہی غیبی مدد ہوئی اور ایک ماں بیٹی نے مجھے قبر سے نکالا۔ میری حالت دگرگوں تھی۔ پھر میری محسن میرا علاج کرنے لگی۔ اس ماں بیٹی کو گاؤں والوں نے دربدر کر دیا تھا۔ وہاں کے چوہدری کا بیٹا صمد یار چنبیلی کے پیچھے پڑا ہوتا ہے۔ وہ وہاں آ کر ہم لوگوں کو ہراساں کرنے لگا۔ اماں میرے علاج کی غرض سے خاص بوٹی لینے سرحد پار نکل گئی۔ صمد یار اور اس کے کارندوں نے ہم پر حملہ کر دیا تاہم میں نے اسے اپنی باتوں میں الجھا کر کسی طرح اپنی اور چنبیلی کی جان بچائی۔ اماں خاص بوٹی لے آئی تھی اور اس نے دوا کا سفوف اور تیل تیار کر لیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میری محسن اماں سرحد پار سے جڑی بوٹی لے آئی تھی اور اس نے میری صحت یابی کے لیے سفوف اور تیل تیار کر لیا تھا اور سارا خیال وہ خود رکھ رہی تھی۔

اس کے بعد جب چنبیلی اور میں نے اسے یہاں کے حالات کے بارے میں بتایا تو میرا اور چنبیلی کا خیال تھا کہ اماں یہ سن کر پریشان ہو جائے گی مگر اس کے برعکس وہ بڑی طمانیت بھری مسکراہٹ سے بولی۔

"مجھے پورا یقین تھا کہ میرا بیٹا سہراب جسم کا ہی نہیں، دماغ کا بھی کم نہیں۔ بے شک اس نے عارضی طور پر ہی سہی، اتنی مہلت تو لے ہی لی ہے کہ اس کے بھلے چنگے ہو جانے کے بعد وہ اس بدبخت صمد یار کو اچھا سبق سکھائے گا۔"

"اماں! تو کیا تم نے اسے صمد یار سے جنگ کرنے کے لیے تیار کیا ہے؟" چنبیلی نے پوچھا۔

"نہیں، جنگ یا جھگڑا ابھی بات تو نہیں ہے بیٹی اگر۔۔۔۔"

"چھوڑو اماں! اس کی باتیں۔۔۔۔" میں نے اماں کی بات کاٹی۔ "یہ بتاؤ کیا میں ان چار دنوں میں ٹھیک ہو جاؤں گا؟"

میری بات سن کر اماں اپنی بوڑھی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔

"اللہ کرے گا تو پہلی ہی خوراک میں ٹھیک ہو جائے گا مگر آخری اور چوتھی خوراک کے بعد تو دیکھنا تیرا انگ انگ کرے گا کہ تو پہاڑ سے بھی ٹکرا جائے۔"

"اچھا اماں!" چنبیلی مجھے چھیڑنے کی خاطر مصنوعی طنز سے بولی۔ "کیا سہراب ٹارزن بن جائے گا؟"

میں نے چنبیلی کو گھور کر دیکھا اور بولا۔ "ٹارزن نہیں، میں دیو بن جاؤں گا اور تجھے کھا جاؤں گا۔" چنبیلی ہنس پڑی۔ اماں بھی ہم دونوں کو اس طرح ہنستے دیکھ کر مسکرانے لگی اور بہت گہری گہری نظروں سے ہمیں تکنے لگی پھر اسی انداز سے بولی۔

"اللہ تم دونوں کو خوش رکھے۔۔۔۔ سدا سکھی رکھے۔"

اماں کے ان الفاظ نے مجھے اور چنبیلی دونوں کو ایک لمحے کے لیے گم صم سا کر دیا پھر چنبیلی کے ہنستے مسکراتے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور خاصی خفگی کے ساتھ اس نے اماں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اماں! تو بھی نا بس، ایسے ہی بولے چلی جاتی ہے۔" اور پھر وہ اٹھ کر خاموشی سے اپنے کوٹھے کی جانب بڑھتی چلی گئی۔

اماں اپنی بیٹی کے ایک دم ناراض ہوتے پر حیران سی ہو گئی اور پھر اس کے جانے کے بعد میری طرف دیکھ کر بولی۔ "کیا تم دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا وغیرہ ہوا تھا؟"

"نہیں اماں! جھگڑا بھلا کیا ہوتا۔ اس بے چاری نے تو میرا بہت خیال رکھا ہے۔" میں نے ہولے سے کہا۔

"جھلی ہے شرما گئی۔" اماں مسکرا کر بولی لیکن پھر شاید اس کی تسلی نہیں ہوئی اور وہ بھی اٹھ کر بیٹی کے پیچھے چلی گئی۔

میں کچھ بھول رہا تھا، ان جذبات اور احساسات کو جو ایک ماں کی اپنی جوان اور کنواری بیٹی کے لیے ہمیشہ سے ہی ہوتے ہیں اور میں شاید یہ بھی بھول گیا تھا کہ مجھے اپنے بارے میں صرف چنبیلی کو ہی نہیں بلکہ اماں کو بھی سب بتا دینا چاہیے تھا۔ جوان بیٹیوں کی مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ انہیں اپنی نہیں، بیٹی کی فکر سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر اماں بھی

میرے اور چنبیلی کے بارے میں ایسا کچھ سمجھ رہی تھی تو یہ ایک فطری بات تھی۔ اس میں کسی کا قصور نہ تھا۔

کھانا کھا کر ہم سو گئے۔ صبح صادق مجھے چنبیلی نے آ کر جگایا اور بوٹی کا بنایا ہوا سفوف کھانے کو دیا۔

"اماں نے کہا تھا کہ سہراب کو کہنا یہ دوا کھانے سے پہلے تین بار بسم اللہ الشافی پڑھ لے۔" چنبیلی بولی۔ ساتھ ہی صراحی سے پانی کا آدھا گلاس بھر لائی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے پڑیا لی اور اپنے منہ میں رکھی۔ چنبیلی کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیا اور دوا کے ساتھ پی گیا۔ دوا بے بو اور بے ذائقہ تھی۔ ابھی دوا کھائے مجھے چند ہی سیکنڈ ہوئے تھے کہ مجھے پیٹ میں درد سا محسوس ہونے لگا۔ میں یہی سمجھا کہ نہار منہ کھانے سے شاید معدے پر زور پڑا ہے۔ میں نے کوئی شکایت نہ کی۔ چنبیلی چلی گئی۔ میرے پیٹ کا درد بڑھنے لگا۔ درد ایسا ہی تھا جیسے اینٹھن ہو رہی ہو اور معدے میں کوئی سوئے سے سوراخ کر رہا ہو۔ مجھے یہ سوچ کر تشویش ہوئی کہیں دوا کا کوئی الٹا اثر یا ری ایکشن تو نہیں ہو رہا۔

میں نے چنبیلی کو آواز دی۔ شاید اس تک آواز نہیں پہنچی تھی۔ میں نے دوبارہ اسے اور اماں کو یکے بعد دیگرے پکارا۔ ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر فرشی بستر پر ہی دوہرا ہو گیا۔ درد اس قدر شدید تھا کہ مجھ سے اب پکارا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میں کراہنے لگا۔

ایسا لگا جیسے میری زندگی ختم ہو رہی ہو۔ دوا نے شاید الٹا اثر دکھا دیا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اماں اور چنبیلی کہاں چلی گئی تھیں؟ کم از کم اماں یا چنبیلی کو تو موجود ہونا چاہیے تھا۔ کوئی نئی یا تجرباتی دوا کھانے کے بعد اس کے مابعد اثرات کے خیال سے اماں کو موجود ہونا چاہیے تھا۔

درد اس قدر شدت اختیار کرنے لگا کہ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا اور حواس جانے لگے۔ کنپٹیوں کی سنسناہٹیں ایک گونج کی صورت سنائی دینے لگیں۔ ایسی بے بسی اور جان کنی والی موت کا تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا...... پھر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

ہوش آیا تو کسی کو میں نے اپنا جسم دھیرے دھیرے سہلاتے پایا۔ میرا اوپری جسم برہنہ تھا۔ اماں میرے کندھوں اور بازوؤں پر مالش کر رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی شیشی قریب پڑی تھی۔ اس میں وہی گہرے سبز رنگ کا محلول تھا جو بقول اماں کے بھاگی بوٹی سے بنایا ہوا تیل ہی ہو سکتا تھا۔

چنبیلی کو بھی میں نے قریب بیٹھے دیکھا۔ تاہم اگلے ہی لمحے میں چونک پڑا۔ ایک تو یہ کہ میرے پیٹ کا درد بالکل ٹھیک ہو چکا تھا اور دوسرا چنبیلی کی کشادہ آنکھوں میں نمی اتری ہوئی تھی اور وہ بڑی درد بھری نگاہوں سے میری جانب تکے جا رہی تھی۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ اپنائیت سے ذرا مسکرائی۔

"اماں! تم دونوں کہاں چلی گئی تھیں؟" میں نے پوچھا۔ "دوا کھاتے ہی میری حالت بگڑ....."

"ہمیں سب معلوم ہے۔" اماں نے میری بات کاٹ کر عجیب سے لہجے میں کہا۔ مجھے دوبارہ حیرت کا جھٹکا لگا۔

"آپ کو معلوم تھا مگر...... پھر آپ دونوں....."

"ہاں۔" وہ پھر درمیان میں بولی۔ "جو شخص پہلی بار یہ بوٹی استعمال کرتا ہے، اسے اسی قسم کا دورہ پڑتا ہے۔ میں نے ہی چنبیلی سے کہا تھا کہ دوا دینے کے فوراً بعد سہراب کے قریب سے اٹھ کر اندر آ جانا۔ بے چاری بہت دکھی ہو رہی تھی تمہارے لیے۔ کئی بار وہ تمہیں سنبھالنے کو لپکی بھی مگر میں نے روک دیا۔ اگر تمہیں یہ تکلیف نہ ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ دوا تم پر بے اثر ہو گئی اور اس کا استعمال جاری رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا مگر خدا کا شکر ہے کہ تمہارے پیٹ میں اٹھنے والی اینٹھن نے اس دوا کا اثر دکھا کر مجھے مطمئن کر دیا۔"

وہ اپنی بات ختم کر کے خاموش ہو گئی۔ میں بے اختیار ایک گہری ہنکاری بھر کر رہ گیا۔ ہر کسی کے علاج کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ حکمت میں شاید ایسا ہی ہو۔ وہ بوٹی بھی تو نایاب تھی اور بقول اماں کے، اس میں جادوئی تاثیر تھی۔

ہاتھوں اور بازوؤں کی مالش کے بعد اماں نے میرے گھٹنوں اور پیروں کی بھی مالش کی۔ مجھے ندامت سی ہو رہی تھی۔ اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔

"اب دیکھنا، آئندہ تو خود مالش کرنے کے قابل ہو جائے گا۔" تیل کی شیشی کو سنبھالتے ہوئے اماں نے اٹھتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"کیا واقعی تو ٹھیک کہہ رہی ہے اماں؟"

"ہاں بیٹا! بھلا میں جھوٹ بول سکتی ہوں تم سے۔" وہ مسکرائی پھر چنبیلی سے بولی۔ "بیٹی! میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔ چولہے پر ہانڈی چڑھی ہوئی ہے، دیکھ لینا۔" وہ ایک کپڑے کا تھیلا سا اور ایک بانس کی چھڑی اٹھائے حجرے سے باہر نکل گئی۔

میں اور چنبیلی اکیلے رہ گئے۔ وہ دروازہ بند کر کے میری جانب ہی پلٹ آئی تھی۔

"میں بھی سمجھی تم ہم سے ناراض ہو جاؤ گے۔" اس

نے دھیرے سے کہا۔

''وہ کیوں؟'' میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہم نے تمہیں تکلیف میں تنہا جو چھوڑ دیا تھا۔''

''اماں نے بتایا تو تھا کہ وہ یہ سب پہلے سے جانتی تھیں اور اس میں میرا فائدہ تھا۔''

''ہاں، مگر میں تمہیں تکلیف میں دیکھ کر تڑپ گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں اماں نے مجھے روکے رکھا تھا۔ کسی کا سہارا ہوتا ہے تو تکلیف یوں بھی کم ہو جاتی ہے۔'' اس نے جواز پیش کیا۔

''ہر ڈاکٹر یا حکیم کو اپنی دوا اور اس کے اثرات کا علم ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور پھر اماں نے تو یہ سب میری بہتری کے لیے ہی کیا ہے۔ ہر کڑوی دوا کا اثر شفا بخش ہوتا ہے۔''

وہ میری طرف دیکھتی رہی پھر عجیب سے گہرے لہجے میں بولی۔ ''سہراب! تم بہت اچھے انسان ہو۔''

''پتا نہیں۔'' میں مسکرایا پھر ایک دم کسی خیال کے تحت پوچھا۔ ''کیا تم نے اماں کو سب بتا دیا؟''

''کیا؟''

''یہی کہ میں کون ہوں..... کیا ہوں؟''

''ہاں!'' وہ ہولے سے بولی۔ ''یہ بتانا ضروری ہو گیا تھا۔''

''میں سمجھا نہیں۔ کیا مطلب کہ یہ ضروری ہو گیا تھا؟''

''اماں تمہیں کسی اور نظر سے دیکھنے اور سمجھنے لگی تھیں۔''

''یعنی چور، ڈاکو یا پڑوسی ملک کا جاسوس؟'' کہتے ہوئے میں تھوڑا سا دانستہ مسکرایا۔

''نہیں، وہ تمہیں ایسی نظروں سے دیکھنے لگی تھی جیسی ہر جوان بیٹی کی مائیں ایک جوان اور شریف لڑکے کو دیکھا کرتی ہیں۔''

''ہم......'' میرے منہ سے نکلا اور میں چپ ہو رہا۔ وہ اٹھ کر رسوئی کی طرف بڑھ گئی۔ میں سوچتا رہ گیا۔

مجھے تاکید کی گئی تھی کہ دوا کھانے اور مالش کے ایک گھنٹے بعد میں تھوڑا ٹہلنے اور چلنے کی کوشش کروں لہٰذا وہ میں کرنے لگا۔ مجھے اپنے لاغر سے جسم میں کچھ افاقہ ہوتا محسوس ہونے لگا۔ بغیر سہارے کے تو میں اب ویسے ہی اٹھنے لگا تھا مگر چلنا اب بھی دوبھر تھا۔ تاہم اب میں دو تین قدم بغیر سہارے کے بھی اٹھا پا رہا تھا۔

اچانک باہر سے کسی نے کھردری مردانہ آواز میں مجھے پکارا۔

''سہراب!''

میں ٹھٹک گیا۔ یہ صمدیار کے گماشتے یاور کی آواز تھی۔

چنبیلی بھی اس آواز پر پریشان سی رسوئی سے نکل کر باہر آ گئی۔ میں نے اسے اشارے سے اندر جانے کو کہا۔ اس کے بعد بڑھ کر دروازہ کھولا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انہیں میری ٹھیک ہوتی حالت کا ذرا سا بھی اندازہ ہونے پائے اسی لیے جان بوجھ کر میں نے خود کو دروازے کی چوکھٹ سے لگا دیا۔ سامنے ہی یاور اپنے ساتھی گماشتے جیجے کے ساتھ کھڑا تھا۔ جیجے کے ہاتھ میں تھیلا تھا۔ وہ اس نے میری جانب بڑھا دیا اور تحکمانہ درشتی سے بولا۔

''اس میں نقشہ بنانے کا سامان ہے۔ چھوٹے سرکار نے کہا ہے کہ آج شام تک یہ بن جانا چاہیے۔ وہ خود یہاں لینے کے لیے آئیں گے۔''

''کیا..... آج شام تک؟'' میں نے حیرانی کی اداکاری کی۔ ''میری حالت دیکھ نہیں رہے ہو۔ اتنی جلدی یہ کہاں ممکن ہوگا۔ تین چار روز لگیں گے۔''

میری بات پر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر کھسر پھسر کی۔ اس کے بعد مزید کچھ کہے بغیر چلے گئے۔ میں تھیلا سنبھالے اندر آ گیا اور اسے ایک جانب کونے میں حقارت سے پھینک دیا۔

''اس میں کیا ہے؟'' ان کے جانے کے بعد چنبیلی نکل آئی۔

''نقشہ بنانے کا سامان بھیجا ہے صمدیار نے۔''

''اچھا۔''

''لیکن اب میں اس کا نقشہ بگاڑنے کی تیاری کروں گا۔'' میں نے دانت پیس کر نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

چنبیلی فکرمند لہجے میں بولی۔ ''دفع کرو اسے۔ صحت یابی کے بعد یہاں سے خیر و عافیت سے نکلنے کی سوچو۔''

''میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اور اماں کو بھی کسی محفوظ ٹھکانے تک چھوڑوں گا۔''

''لیکن تمہیں ایک اور اہم فرض بھی نبھانا ہے جو ہم سے زیادہ ضروری ہے۔'' چنبیلی نے کہا۔ ''کیا تمہیں اپنی منگیتر اور بہن کی فکر نہیں؟ وہ بے چاریاں کہاں اور کس حال میں ہوں گی؟'' وہ متفکر لہجے میں بولی۔

''وہ جہاں اور جس حال میں ہوں گی، ان دونوں کا اللہ مالک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب میرا پہلا فرض تم اور اماں ہو۔''

''ہم ماں بیٹی... بھلا کہاں جا سکتی ہیں؟'' وہ دل مسوس کر بولی۔

''تو کیا تم دونوں کو اس درندہ صفت صمدیار اور بے

حس بستی والوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں؟ ہرگز نہیں۔'' میں نے جوش سے کہا۔ ''اماں کو آ لینے دو۔ میں آج ہی ان سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔''

چنبیلی خاموش ہو گئی اور رسوئی کی جانب مڑ گئی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا مڑھی سے باہر آ گیا۔ آج پہلی بار میں خود اور بغیر کسی سہارے کے اندر سے چل کر باہر آیا تھا۔ ہر طرف خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ دور ترائیوں اور برفیلی پہاڑیوں تک کھلے نیلے آسمان کی تنی ہوئی چادر بھلی معلوم ہوتی تھی۔ چیڑ، صنوبر اور دیودار کے درخت قدرت کی صناعی کا شاہکار پیش کر رہے تھے۔ آبادی سے دھوئیں کی لکیریں وہاں پلتی زندگی کا پتا دیتی تھیں۔ عقب اور دائیں بائیں جنگل میں بھانت بھانت کے پرندوں کی مدھر چہکار چہچہاہٹ دل و دماغ اور اعصاب پر اچھا اثر ڈال رہی تھی۔ ہلکی سی دھند کی چادر بھی کبھی نشیب و فراز کے جنگلات میں تنی دکھائی دے جاتی۔ غرض کہ بہت خوشگوار فضا تھی۔

میں مڑھی سے زیادہ دور نہیں گیا تھا اور خود کو یہاں کھلی فضا میں ''وارم اپ'' کرنے لگا۔ ایک جگہ مجھے درخت کا شہتیر گرا نظر آیا۔ وہاں ایک بڑا سا پہاڑی پتھر بھی پڑا تھا۔ میں اس طرف گیا اور اپنی جسمانی طاقت کو آزمانے کی خاطر اس گرے ہوئے بڑے سے شہتیر کو ہلانے جلانے لگا۔ ساتھ ہی پہاڑی پتھر پر اپنی پشت لگا کر زور آزمائی کرنے لگا۔

اتنی سی مشقت سے ہی مجھے اس سرد موسم میں بھی پسینا آ گیا۔ آج اتنا ہی کافی سمجھ کر میں واپس مڑھی میں آ گیا۔ اتنی دیر میں اماں بھی آ گئی۔ وہ جنگل سے کچھ پھل، سبزی اور اپنے بچھائے ہوئے کانٹا جال میں پھنسے کبوتر بھی لے آئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اماں مسکرائی تاہم اب اس کی مسکراہٹ میں ایک اداسی بھی شامل تھی۔ میں اس کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔

ہم تینوں نے مل کر دوپہر کا کھانا کھایا اور فارغ ہونے کے بعد میں نے اماں سے یہاں سے کوچ کرنے کا موضوع چھیڑ دیا۔

''سہراب بیٹے! تم جہاں جانا چاہو جا سکتے ہو مگر میں اور چنبیلی کہیں نہیں جا سکتیں۔''

مجھے اماں کی بات پر حیرت ہوئی۔ میں نے کہا۔ ''کیوں اماں؟ آپ دونوں کیوں کہیں نہیں جا سکتیں؟''

اماں نے میری طرف دیکھا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر فکر و تشویش تھی۔ وہ بولی۔ ''بیٹا! صمد یار اور اس کے بھیڑیا صفت ساتھی کہیں بھی ہم ماں بیٹی کو چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے اور نہ ہی وہ ہمارا پیچھا چھوڑیں گے۔''

''اماں! تم نے تو بڑی عجیب بات کہی۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں تم کون سا محفوظ ہو؟ کیا تم اس رات والا حملہ بھول گئیں؟ مجھے تو ابھی تک اس کے تصور سے ہی لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ یہ تو اللہ نے مدد کی اور میرے دماغ میں ان سے نجات پانے کی ترکیب آ گئی ورنہ میں کیا کر سکتا تھا۔''

''تمہاری بات بھی ٹھیک ہے لیکن یہاں تم از کم پولیس اور دیگر لوگوں کی مدد کا تو سہارا رہتا ہے۔''

مجھے اماں کی بات بہت ہی بے وقوفانہ لگی۔ حیرت بھی ہوئی کہ اتنی عمر میں بھی ہمت اور حوصلے والی ہو کر اماں ایسا کہہ رہی تھی پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا چنبیلی ماں سے بولی۔

''اماں! یہاں کون سے لوگ مصیبت میں ہماری مدد کو آ جاتے ہیں؟ پولیس بھی ان بڑے لوگوں کی مٹھی میں ہے۔''

''سب ان کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے۔'' اماں نے اپنی بیٹی سے کہا۔ ''ڈھک (گاؤں) کے زیادہ تر لوگ انہیں سخت ناپسند کرتے ہیں۔ وہ تو بے چارے ڈر کر خاموش رہتے ہیں اور پھر یہ تو بتا، بھلا ہم جائیں گے بھی کہاں؟ شہر یہاں سے میلوں دور ہے۔ تب وہاں تک پہنچنے سے پہلے صمد یار اور اس کے آدمی ہمیں راستے میں ہی دھر لیں گے۔ ہم یہاں پھر بھی محفوظ تو ہیں۔ انہیں بھی ڈر رہتا ہے۔''

''اماں! معاف کرنا۔ آپ کی سوچ غلط ہے۔'' میں نے بالآخر اماں سے کہا۔ وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ ''اس رات کے اتنے بڑے واقعے کے بعد بھی آپ یہاں رہنا چاہتی ہیں؟ کیا آپ کو صمد یار کی بدنیتی کا ابھی تک اندازہ نہیں ہو پایا ہے؟ آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ دونوں کو زندہ سلامت یہاں سے نکال کر شہر لے جانے کی ذمے داری قبول کرتا ہوں۔۔۔ بس۔''

چنبیلی احسان مندانہ نگاہوں سے میری طرف تکنے لگی۔ اماں بھی چپ ہو رہی۔ اگلے دن میں نے دوسری خوراک لی۔ بہت جادوئی فرق ہوا تھا ان دو دنوں میں۔ تیل کی مالش ایک بار ہی کرنا تھی۔ دوا اتنی مقدار میں تھی۔ ساتھ ہی صبح و شام میں ورزش بھی کرنے لگا تھا۔ اب درخت کا شہتیر اٹھا کر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی رکھنے لگا تھا۔ بڑے سے پہاڑی پتھر کو بھی سرکانے کے قابل ہو گیا تھا۔ یہی نہیں، آخری یعنی چوتھے روز میں نے دوڑ لگانا بھی شروع کر دی تھی۔

ایک بات نہ جانے میرا وہم تھی یا پھر کچھ اور کہ مجھے ورزش کرتے یا دوڑ لگاتے میں تھکاوٹ کا ایک ذرا بھی احساس نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ سانس بھی نہیں پھولتی تھی۔ اس

شے کو دیکھتے ہوئے جب میں نے قریبی ندی میں ڈوب کر حبس دم کی پریکٹس دہرائی تو دنگ رہ گیا۔ میں پورے پندرہ سے بیس منٹ تک پانی کے اندر سانس روک کے رہ سکتا تھا۔

اپنے اندر پہلے سے بھی زیادہ طاقت اور قوت کے علاوہ چند ایک اضافی تو انائیاں محسوس کر کے جہاں مجھے اس قدر حیرت ہوئی تھی، وہیں خوشی کا بھی احساس ہوا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے رگ وپے میں بجلیاں دوڑنے لگی ہوں۔ دوا کے آخری دن تو میں اپنے اندر جیسے چٹان جیسی... طاقت محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے ورزش کرنے میں بڑا عجیب سا لطف ملتا۔ جی چاہتا نہ رکوں اور دوڑتا رہوں۔ دور بر فیلی اور بلند وبالا چٹانوں تک جا پہنچوں۔ ان کی عظیم بلندیوں تک جا کر چھلانگ لگا دوں۔

ہاں اور چنبیلی مجھے اب چیتے کی طرح جست اور چھلانگیں بھرتے دیکھ کر ہنستیں اور مسکراتی تھیں۔

اس روز مجھے رات میں جانے کیا سوجھی کہ میں مڑھی سے نکل کر ترائی میں چلا گیا جدھر چوڑے پاٹ والی ندی بہہ رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت سرد ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں، بادل گرجنے لگے اور بجلی چمکی۔ ذرا ہی دیر میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ سردی یکدم ہی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ بارش کے بعد برف باری کے سو فیصد امکان ہو چلے تھے۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مجھے سردی کا ایک ذرا احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔ میں جس مقصد کے لیے اتنی رات گئے مڑھی سے نکل کر ندی میں آیا تھا، وہ تک بھول گیا۔ میں وہیں بیٹھ کر بارش کے تھمنے کا انتظار کرنے لگا۔ خدا خدا کر کے وہ تھمی تو جسم کو برما ڈالنے والے سرد ہوا کے جھونکے چلنا شروع ہو گئے لیکن مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس مجھے ایک تراوٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔

آسمان ابھی صاف اور روشن نہیں ہوا تھا مگر میں نے ایک اور بات محسوس کی کہ میں تاریکی میں بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھنے لگا تھا۔ چند فٹ کیا بلکہ چند گز تک میں اندھیرے میں ایک جنگلی جانور کو درخت پر کسی شکار کی تلاش میں چڑھتے ہوئے صاف دیکھ رہا تھا۔ ایکا ایکی مجھے یوں لگا جیسے میں بچپن میں پڑھنے والی کہانیوں کا کوئی واقعی ایسا کردار بن چکا ہوں جیسا کہ ٹارزن اور ہرکولیس ہوا کرتے تھے۔

میں ایک قدرتی چشمے کے قریب آن کھڑا ہوا۔ آسمان اب کچھ صاف اور روشن ہونے لگا تھا۔ میں نے اپنے بدن کے سارے کپڑے اتار دیے اور اپنا عکس چشمے کی سطح میں دیکھنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے پانی کے اندر کوئی "ریسلر" کھڑا مجھے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں خود کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

دفعتاً ایک زوردار چیخ کی آواز ابھری۔ یہ ایک دلدوز چیخ تھی جیسے تاریکی کے سینے میں کسی نے خنجر بھونک دیا ہو۔

☆☆☆

پل کے پل میرے اندر سناٹے اتر آئے۔ وہ چیخ کسی عورت کی تھی مگر چنبیلی کی نہیں۔ ساتھ ہی گولی چلی اور کسی جنگلی جانور کی دہاڑ سے مشابہ چیخ گونجی جواب مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ یوں جیسے کوئی سخت عذاب میں مبتلا ہو۔ وہ فائر دوبارہ ہوئے پھر سکوت طاری ہو گیا۔

یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے آوازوں کی سمت فقط ایک پل کے لیے غور کیا اور مجھے حیرت ہوئی۔ میری سماعتوں نے جلد ہی راستے کا تعین کر ڈالا اور میں نے اسی جانب دوڑ لگا دی۔ عجلت میں میں نے صرف پتلون ہی پہن لی تھی۔

چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ جنگل اسی میں نہایا ہوا تھا۔ برفیلی سرد ہوائیں بدن برما دینے والی تھیں مگر مجھ پر اس کا چنداں اثر نہیں ہوا اور میں چند لمحوں میں وہاں پہنچ چکا تھا جدھر سے چیخ اور گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔

بل کھاتے تنگ سے کچے راستے پر فلیٹ والی جیپ ایک طرف کو الٹی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ انہی جھاڑیوں کی طرف میں نے ایک برفانی تیندوے کو گھسیٹتے ہوئے دیکھا۔ اس طرح کہ اس کے خونخوار جبڑوں میں ایک جوان، صحت مند اور دلکش عورت کا پاؤں دبا ہوا تھا اور وہ شاید مارے دہشت کے اب نیم بے ہوش سی ہو گئی تھی۔

جیپ کے دائیں بائیں آڑ میں دو مسلح افراد تھے جو خود بھی ڈرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ایک اپنے پستول سے تیندوے پر فائر کرنے کے سلسلے میں سخت تذبذب کا شکار تھا کہ کہیں گولی درندے کے بجائے عورت کو نہ جا لگے جبکہ دوسرے کا بھی یہی حال تھا۔ اگرچہ وہ کچھ ذہنی بھی نظر آتا تھا۔

میں نے ایک جست بھری اور تیندوے کا راستہ روک لیا۔ جھاڑیوں کی طرف کھسکتا ہوا تیندوا ایک دم رک گیا اور عورت کی ٹانگ چھوڑ کر مجھے تکنے لگا... وہ شاید ایک نہتے انسان سے ڈر گیا تھا۔

پھر یہی وہ لمحہ تھا جب عورت بھی نیم بے ہوشی سے نکل کر اپنے حواسوں میں آ گئی۔ اس نے لمحہ بھر کو مجھے اور پھر

تیندوے کو دیکھا۔ دوبارہ اس کے حلق سے چیخ ابھری۔ تیندوا بدکا اور اپنی راست اور شکار کھوٹا کرنے کی سزا دینے کے لیے خونخوار غراہٹ کے ساتھ مجھ پر چھلانگ لگا دی۔

مجھے کسی درندے کے ساتھ اس طرح دو بدو لڑائی کا کوئی تجربہ نہ تھا ماسوائے جنگلی کتوں کے..... کوئی اور ہوتا تو تیندوے کی جست کے ساتھ ہی نیچے آ رہا ہوتا مگر میں چٹان کی طرح اپنی جگہ پر تنا کھڑا رہا اور تیندوا میرے تنے ہوئے جسم کے ساتھ چپک گیا۔

غیر ارادی طور پر میرے دونوں ہاتھ دفاع کے لیے اٹھے تو ان کے آہنی شکنجے میں تیندوے کی گردن آ گئی۔ میں ہنوز اسی طرح اپنی دونوں ٹانگوں پر تنا کھڑا تیندوے کی گردن دبوچنے لگا اور وہ اپنے پنجوں سے میرے اوپری برہنہ بدن پر کھرونچے ڈالتا رہا مگر مجھ پر مطلق اثر نہ ہوا اور میں اس کی گردن دبوچے چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کے پنجوں کی ضرب لگانے والی حرکات کمزور پڑتے پڑتے دم توڑ گئیں اور میں نے اسی وقت ہی اسے چھوڑا جب وہ بالکل میرے ہاتھوں پر گردن سمیت جھول نہ گیا۔ اس کے بعد میں نے اس کے مردہ وجود کو ایک جانب اچھال دیا۔

مردہ تیندوے کے گرتے ہی دونوں مسلح افراد نے باری باری دو گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں پھر زخمی عورت کی جانب بڑھے۔ عورت اپنی زخمی ٹانگ کی پروا کیے بغیر زمین پر پڑے پڑے یک ٹک مجھے یوں تکتی رہ گئی جیسے میں کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں۔ اپنی تکلیف اور خوف اس کے خوبصورت چہرے سے عنقا ہو چکا تھا اور اس کی جگہ حیرت نے لے لی تھی۔

”بی بی جی! سنبھلیے.....!“ وہ اسے سہارا دینے کے لیے جھکے۔ وہ دونوں شاید اس کے خدمت گار تھے۔

میں نے ایک نظر اپنے توانا بدن پر پڑی سرخ لکیروں کو دیکھا۔ ان میں جلن ہو رہی تھی جو قابل برداشت تھی۔

”آہ.....“ عورت کراہی۔ ”میری ٹانگ زخمی ہے۔ میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔“

”ٹھہرو.....“ معاً میں نے ان دونوں سے کہا۔ میری آواز پر وہ سیدھے کھڑے ہو گئے اور میری جانب تکنے لگے۔ عورت بھی زمین پر لیٹے لیٹے میری جانب تکنے لگی۔ میں الٹی ہوئی جیپ کی جانب بڑھا۔ اس کے بعد اپنے دونوں ہاتھ اس پر جما دیے پھر دو تین بار اسے ہلایا۔ اس کے بعد زور آزمائی کے انداز میں اپنے گرانڈیل، توانا بدن کی طاقت لگاتے ہوئے جیپ کو سیدھا ٹائروں پر کھڑا کر ڈالا۔ پلٹا تو وہ تینوں حیرت سے آنکھیں پھاڑے میری جانب تکے جا رہے تھے۔

اس کے بعد میں ان کی جانب بڑھا۔ خدمت گار اپنی بی بی جی کے سلسلے میں سخت تفکر اور تشویش میں مبتلا تھے۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سنبھالا دیں۔

”اندر جا کر جیپ کی سیٹ اکھاڑ لاؤ۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں ان سے کہا۔ میرے انداز سے تکلیف یا درد کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ حیرت زدہ کھڑے رہے۔

”جیسا یہ کہہ رہا ہے ویسا ہی کرو..... جلدی۔“ اپنے خدمت گاروں کو گم صم کھڑے پا کر عورت نے کہا۔

مجھے اس کا انداز تحکمانہ لگا۔ تب ہی دونوں چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آئے اور جیپ کی جانب بڑھ گئے۔ میں اس عورت کی جانب بڑھا اور پھر اس کے قریب ذرا اکڑوں بیٹھ کر اس کی زخمی ٹانگ کا جائزہ لینے لگا۔ عورت کی عمر مجھے پینتیس، چالیس کے پیٹے میں ہی لگی تھی مگر بلاشبہ وہ اس عمر میں بھی خاصی دلکش اور حسین تھی۔ اس کی آنکھیں کشادہ، ہونٹ بھرے بھرے اور بال براؤن رنگ کے اور گھنے تھے۔ اس کے متناسب جسم پر کھچی لباس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کسی بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ مجھے اس کے خوبرو چہرے پر ایک خاص قسم کا رعب و دبدبہ بھی جھلکتا محسوس ہوا تھا۔ نہ جانے اتنی رات گئے یہ اپنے دو خدمت گاروں کے ساتھ کہاں نکلی تھی۔ اس کی ٹانگ ٹخنے کی جانب سے تیندوے نے بری طرح چبا ڈالی تھی اور وہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ کچھ عرصہ چلنے پھرنے کے قابل ہو سکتی تھی۔

وہ عورت بھی ایک ٹک مجھے تکے جا رہی تھی۔ اسے شاید اپنی تکلیف کا احساس بھی نہ رہا تھا۔ میں ہونٹ بھینچے اٹھ کھڑا ہوا اور جیپ کی جانب دیکھا تو وہ دونوں افراد ہنوز جیپ کی عقبی لمبی سیٹ اکھاڑنے کے جتن میں مصروف تھے۔ تب میں آگے بڑھا اور انہیں ایک جانب ہٹنے کو کہا پھر باہر کھڑے کھڑے جیپ کے کھلے دروازے سے نصف اندر جھک کر دونوں ہاتھوں سے سیٹ پکڑی اور ایک زوردار جھٹکے سے اکھاڑ ڈالی۔

ان دونوں خدمت گاروں کے منہ ایک بار پھر حیرت سے کھل گئے۔ خود میں اپنی اس نئی تبدیلی پر خوش اور حیرت زدہ تھا مگر ظاہر ایسا ہی کر رہا تھا جیسے یہ زور آوری میرے معمولات میں شامل ہو پھر ایک خدمت گار سے میں نے

عورت کے زخم پر پٹی باندھنے کا کہا۔ اس نے اپنی قمیص اتاری اور اسے پھاڑ کر پٹی بنا کر مجھے دی۔ وہ پٹی میں نے عورت کے زخمی ٹخنے کے گرد اچھی طرح باندھ دی تاکہ جریان خون کسی حد تک بند ہو سکے۔

اس کے بعد سیٹ پر عورت کو لٹا کر جیپ میں لا دیا گیا۔ دونوں خدمت گار اگلی سیٹ پر براجمان ہو گئے اور وہ ایک بار کی کوشش سے جیپ بھی اسٹارٹ ہو گئی۔ میں پلٹنے لگا تو شاید عورت نے اپنے ایک خدمت گار سے کچھ کہا۔ اس نے مجھے آواز دی۔

”ٹھہرو۔ بی بی جی کا حکم ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ حویلی چلو۔“

میں کھڑے کھڑے ان کی جانب گھوما اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”میں کسی کے حکم کا پابند نہیں ہوں۔ تم لوگ جا سکتے ہو۔“

”پلیز......“ اندر سے عورت کچھ کہتے ہوئے کراہی۔ اس نے شاید اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ ”یہ حکم نہیں ہے، درخواست ہے۔ تم میرے محسن ہو۔“ بالآخر عورت نے بمشکل کہا۔ میں قریب آ گیا۔ کھڑکی سے اندر دیکھا۔ وہ اپنی کہنیوں کے سہارے پڑی تھی۔

”آپ آرام سے لیٹ جائیں اور جلدی اپنی حویلی جا کر کسی ڈاکٹر سے رابطہ کریں۔“ میں نے بردباری سے کہا۔

”نہیں، پلیز! تم بھی زخمی ہو۔ اتنی رات گئے کہاں جاؤ گے۔ کل چلے جانا۔“ وہ بولی۔ مجھے وہ پڑھی لکھی لگی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ پوچھا۔

”آپ کہاں رہتی ہیں؟“

عورت کے بجائے آگے بیٹھے اس کے ایک خدمت گار نے مجھ سے کہا۔ ”یہ ریڑھی گاؤں کی چھوٹی نمبردارنی ہیں۔“ اس کی بات پر میں چونکا۔ گویا یہ اس بدمعاش صمد یار کی ماں اور گاؤں کے نمبردار چودھری فتح خان کی چہیتی بیوی شمیلہ خانم تھی۔ ساتھ ہی مجھے حیرت بھی ہوئی کہ وہ ایک جوان بیٹے کی ماں بھی تھی۔ گاؤں دیہاتوں میں چھوٹی عمر میں شادیوں کا عام رواج ہوتا ہے یا پھر آزاد فضا، خوش خوراکی اور آسودہ حالی اس کی وجہ رہی ہو۔

اس کے متعلق چنبیلی کی بتائی ہوئی باتیں فوراً ہی میرے ذہن میں گردش کرنے لگیں اور کچھ سوچ کر میں نے ان کے ساتھ جانے کی ہامی بھر لی۔ تب ہی شمیلہ خانم نے آگے بیٹھے ہوئے اپنے خدمت گار کو پیچھے آنے کا حکم دیا اور مجھے سوار ہونے کا کہا۔

میں اندر ہی اندر کچھ سوچتے ہوئے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اگلے ہی لمحے جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

”تم کون ہو؟“ عقب سے اس کی آواز آئی۔ وہ مجھ سے ہی مخاطب تھی۔

”ایک مسافر۔“ میں نے ہولے سے اور مختصر کہا۔

”مگر یہاں کیا کر رہے تھے؟“

”قریب ایک چشمے میں نہا رہا تھا۔“ میں نے آہستگی سے جواب میں کہا۔ ”آپ کی چیخ اور فائر کی آواز پر دوڑا ہوا ادھر آ نکلا۔“

”تم شہر سے آئے ہو؟“ عورت نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ زخمی ٹخنے پر پٹی بندھنے اور شاید دوسرے سبب وہ اپنی تکلیف کو بھولے ہوئے تھی یا پھر وہ مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔

”آیا نہیں، لایا گیا ہوں۔“ میں نے مبہم لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے پھر کبھی سہی۔“ میرا جواب سن کر وہ چپ ہو گئی۔ میں تقدیر کے اس عجیب کھیل پر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

ذرا دیر بعد ہم آبادی میں داخل ہو گئے۔ یہ ریڑھی گاؤں تھا۔ میں چاند تاروں کی روشنی میں اطراف و اکناف کا جائزہ لیتا رہا۔ جا بجا کچے پکے گھر بنے ہوئے تھے۔ کھیت بھی تھے اور کھلے میدان بھی۔ درختوں کی بھی بہتات تھی۔ ایک نسبتاً الگ تھلگ مقام پر مجھے سرخ پتھروں والی ایک پرانی وضع کی حویلی دکھائی دینے لگی۔ جیپ گیٹ کے سامنے جا رکی۔ وہاں دو خدمت گار اور بھی موجود تھے اور فوراً ہماری جانب بڑھے تھے۔ پھر مجھے اور اپنی ”بی بی جی“ کو اس حالت میں دیکھا تو بری طرح بوکھلا گئے اور ایک خدمت گار اندر حویلی کی جانب دوڑ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد میں نے دیکھا کچھ اور افراد کے ساتھ صمد یار اندر سے برآمد ہوا۔

اس کی نظر ابھی مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ میں خود دانستہ ایسے رخ پر کھڑا تھا کہ فوری طور پر اس کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ اسے شاید اندر بھاگ کر جانے والے مذکورہ خدمت گار نے سب بتا دیا تھا۔ صمد یار پریشان نظر آ رہا تھا۔

”والدہ...... والدہ...... ! کیا ہوا...... آپ کو؟“ کہتا ہوا وہ اس کے قریب گیا۔ میں آہستہ سے کھسک کر تاریکی میں چلا گیا۔ وہ انہیں اندر لے جانے لگے۔ میں باہر ہی کھڑا رہا پھر شاید شمیلہ خانم نے ہی کسی سے کچھ کہا تھا اور اس کی معیت میں اندر جاتے ہوئے چاروں میں سے ایک خدمت گار پلٹ کر

جیپ کی طرف آیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میں تاریکی سے نکل کر قدرے روشنی میں آ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بولا۔

”تم کدھر غائب ہو گئے تھے؟ آؤ میرے ساتھ اندر چلو۔“ میں خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

حویلی بے شک پرانے طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ تھی تاہم بوسیدگی جگہ جگہ سے اپنا آپ دکھاتی نظر آ رہی تھی۔ حویلی ایک منزلہ مگر بلندی زیادہ تھی لیکن رقبے کے لحاظ سے کافی پھیلی ہوئی تھی۔ گیٹ سے اندر وسیع و عریض باغ تھا۔ ایک راستہ اسی باغ کے درمیان سے گزر کر عقبی سمت کو بھی جاتا نظر آیا۔ شاید اس طرف بھی کوئی دروازہ یا چھوٹا گیٹ تھا۔

دائیں جانب بیٹھک نما قدرے بلند چھت والا کمرا دکھائی دیا۔ اس کے بائیں جانب گھوڑوں کا مختصر سا طویلہ تھا۔ شرقی سمت دو بڑی چارپائیاں اور موڑھے رکھے تھے۔ وہیں ایک کار اور بغیر ہڈ والی جیپ کھڑی تھی۔ میں اس جیپ کو پہچان چکا تھا۔ یہ صدیار کی تھی۔

بہرکیف، شمیلہ خانم کو اندر لے جایا جا چکا تھا جبکہ میں ابھی راستے میں ہی تھا کہ مرکزی دروازے پر جیسے ہی قدم رکھا تو سامنے سے صدیار نمودار ہوا اور میری طرف دیکھے بغیر خدمت گار سے مخاطب ہوا۔

”وہ کون آدمی ہے جسے والدہ بلا رہی ہیں؟“

”یہ ہے جی۔“ خدمت گار نے میری جانب اشارہ کیا۔ صدیار کی نظریں مجھ سے ملیں اور پھر جیسے اس کے چہرے پر زبردست اتار چڑھاؤ کے تاثرات ابھرے۔

”تم......!“ اس نے غیر یقینی انداز میں کہا اور پھر اوپر سے نیچے تک مجھے بڑے غور، حیرت اور قدرے ناگواری سے تکتا رہ گیا۔

”کیوں صدیار! نہیں پہچانا مجھے؟ کمال کر دیا تم نے تو یار!“ میں نے دانستہ اس کی حیرانی سے حظ اٹھاتے ہوئے بے تکلفی سے کہا تو وہ ایک دم کرخت لہجے میں بولا۔

”بکواس بند کرو اپنی اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

اسے ابھی تک مجھے اس قدر توانا اور اپنے پیروں پر کھڑے دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ مجھے یاد تھا، اس نے ایک روز اپنی رائفل کی نال سے ٹھوکر لگا کر دیکھا تھا اور انتہائی حقارت سے کہا تھا۔

”تیرا تو تیل پانی ہی ختم ہے۔“

اب میرا تیل پانی اسے شاید اچھی طرح سے نظر آ رہا تھا۔

”تم تو غصے میں آ گئے۔ واپس لوٹ جاتا ہوں۔“

میں نے اسی طرح چڑا دینے والی مسکراہٹ سے اس کی جانب دیکھا اور واپس پلٹا۔

”ٹھہرو۔“ حسبِ توقع اس نے عقب سے مجھے پکارا۔ میں پلٹا۔ ”اگر والدہ کا حکم نہ ہوتا تو میں تمہیں ایک لمحہ بھی یہاں برداشت نہ کرتا۔ میں سب جان چکا ہوں، سمجھے تم؟“ انتہائی نخوت اور حقارت سے کہتے ہوئے اس نے میرے صحت مند اور توانا ڈیل ڈول پر ایک نظر ڈالی۔

میں جان گیا تھا کہ اس کا کس بات کی طرف اشارہ تھا۔ جب میں بھی بے پروا انداز میں گویا اسے مزید تپاتے ہوئے بولا۔ ”جان گئے ہو تو اچھی بات ہے۔“

”میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم خزانے کا ناٹک رچا کر مہلت لینا چاہتے تھے مگر یاد رکھنا، مجھے دھوکے میں رکھنے کی تمہیں قیمت چکانا پڑے گی۔“ وہ انتہائی کینہ پروری سے بولا۔

میں نے اس کی دھمکی کی پروا نہ کی اور مسکراتا رہا۔ یوں جیسے میرے سامنے کوئی بے وقوف کھڑا ہو۔

”اس گنوار کو اندر مہمان خانے میں لے جاؤ اور ذرا ڈھنگ کے کپڑے پہناؤ۔“ صدیار نے خدمت گار سے کہا اور نخوت سے ایک نظر مجھے گھورا اور جھٹکے سے واپس پلٹ گیا۔ میں اس کی جھنجلاہٹ پر اندر ہی اندر لطف لیتا مسکراتا رہا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اس نے جو دھمکی دی تھی، مجھے اس سے محتاط رہنا تھا۔

میں اندر ایک مہمان کمرے میں آ گیا۔ اسی خدمت گار نے مجھے شلوار قمیص لا دی۔ وہ دھلی ہوئی اور صاف ستھری تھی۔ میں نے ایک کونے میں جا کر وہ پہن لی۔ میرا خیال تھا کہ مجھے ابھی شمیلہ خانم کے حضور پیش کیا جائے گا مگر کافی انتظار کے بعد بھی ایسا نہ ہوا تو مجھے بے چینی ہونے لگی کیونکہ اماں اور چنبیلی یقیناً میرا بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں گی۔

میں نے خدمت گار سے کہا۔ ”میں کل صبح آ جاؤں گا۔“

”نہیں جی، یہ چھوٹے صاحب کا حکم ہے کہ آپ کل صبح چھوٹی نمبردارنی سے مل کر ہی جائیں گے۔“ خدمت گار نے مجھے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”افسوس ہے، میں تمہارے چھوٹے صاحب کے حکم کا پابند نہیں ہوں۔“ میں نے بھی کھنڈے ہوئے لہجے میں کہا اور نکاسی کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

خدمت گار میں مجھے روکنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ میں باہر آ گیا اور مڑھی کی جانب دوڑ لگا دی۔ یہاں مجھے ایک بار پھر خوشگوار حیرت ہوئی۔ میں تاریکی میں تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا چند منٹوں میں ہی مڑھی تک جا پہنچا تھا اور میرا ارادہ

سانس تک نہ چھوڑا تھا لیکن مڑھی کے قریب پہنچتے ہی میں بری طرح چونک پڑا۔

وہاں صمد یار کی بغیر ہڈ والی جیپ کھڑی تھی اور اندر سے مجھے اماں اور چنبیلی کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

☆☆☆

پل کے پل میرے اندر ایک طوفان کا بگولا سا اٹھا۔ غیظ و غضب کا ایک لاوا سا تھا جو میرے اندر سے ابل پڑنے کو بے چین ہوا۔ میرے رگ وپے میں خون طوفان کی طرح گردش کرنے لگا پھر اگلے ہی لمحے ایک غضب ناک دہاڑ کے ساتھ میں نے مڑھی کے دروازے سے اندر جست بھری۔

سامنے کا منظر دیکھتے ہی میری حالت اس زخمی شیر کی سی ہونے لگی جو پھاڑ کھانے کے لیے بے چین ہو۔ اس منظر نے میرے اندر کے آتش فشاں کو جیسے ایک دھماکے سے اچھال ڈالا تھا۔ بدطینت صمد یار نے اماں کو فرش پر پٹخ رکھا تھا جبکہ چنبیلی کسی بے بس چڑیا کی طرح اس کے دونوں گماشتوں کے چنگل میں پھنسی بری طرح مچل رہی تھی۔ یہ دونوں گماشتے وہی یاور اور مجھا تھے جو پہلے بھی یہاں شب خون مار چکے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی جیسے صمد یار کو ایک دم سانپ سونگھ گیا۔ مشعل روشن تھی اور اس کی حدت آمیز روشنی میں ان سب کو شاید میرے چہرے اور آنکھوں سے امڈتی ایک طوفانی آگ کا اندازہ ہو چلا تھا۔

"صمد یار......!" میں حلق کے بل دہاڑا اور پلک جھپکتے ہی صمد یار کی گردن دبوچ لی پھر جب تک اس کے گماشتے اپنے ہتھیار سنبھالتے، میں نفرت انگیزی سے اپنے ہونٹ بھینچ کر اس مردود کو قدموں میں گرا چکا تھا اور یہی نہیں، اس کی گردن پر اپنا ایک پاؤں بھی رکھ دیا۔ یاور اور مجھے نے چنبیلی کو چھوڑ کر یکلخت مجھ پر ہتھیار سیدھے کر لیے۔

"خبردار! گولی چلانے کی بھیانک غلطی بھی مت کرنا۔" میں ان کی طرف لہو رنگ نظروں سے گھور کر بولا۔ "صرف ایک جھٹکا اس کی گردن توڑ ڈالے گا۔"

میرے لہجے کی چنگھاڑتی گرج میں جانے ایسا کیا تھا کہ وہ دونوں ہی جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے۔

"ہتھیار پھینک دو۔" میں پھر غرایا۔ وہ میرے پاؤں تلے دبے ہوئے بے بس صمد یار کو تکنے لگے۔ اس کی حالت میرے ایک ہی داؤ نے دگرگوں کر ڈالی تھی۔ اس کے حلق سے صرف ہلکی کراہ ہی نکل پا رہی تھی۔ میرا غیظ وغضب اور اپنے "چھوٹے صاحب" کی حالت دیکھ کر

خدمت گاروں نے گھبرا کر اپنے ہتھیار پھینک دیے۔ میں نے چنبیلی کو اشارہ کیا تو اس نے بھاگ کر اماں کو سنبھالا دیا۔

"دونوں فرش پر لیٹ جاؤ۔" میں نے ان کو اگلا حکم صادر کیا۔ صمد یار میرے ایک ہی پاؤں تلے دبا حقیر کیڑے کی طرح مچل رہا تھا۔ دونوں نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر ڈالی پھر میں نے صمد یار کی گردن سے اپنا پاؤں ہٹا لیا۔ وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ گردن پر دباؤ کے سبب اس کی سانس بے طرح پھولی ہوئی تھی۔ گردن اور چہرہ تک متورم نظر آنے لگا۔ وہ فرش پر ہی بیٹھے بیٹھے اپنی گردن اور سینہ سہلانے لگا۔ میں نے گرے ہوئے ہتھیاروں کو پیروں کی ٹھوکر سے دوسرے گوشے میں سرکا دیا۔

"چنبیلی! اماں کو ادھر لاؤ۔" میرا لہجہ اب بھی غراتا ہوا تھا۔ چنبیلی حیرت سے مجھے تکے جا رہی تھی۔ وہ اماں کو قریب لے آئی۔ میں نے انتہائی نخوت سے صمد یار کو مخاطب کر کے تحکمانہ کہا۔

"اماں کی بے عزتی کے جرم میں تجھے اس کے پیر چھونے ہوں گے، ناک فرش پر رگڑ کر معافی مانگنا ہوگی۔ مولا کی قسم! اس کے بغیر تجھے یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔" میں نے وحشت لہو رنگ لہجے میں صمد یار سے کہا۔

اس کے پاس میرا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ میرے سر پر سوار خون کو پہلے ہی محسوس کر چکا تھا۔

اگرچہ اب بھی اس کے متورم بدہیئت چہرے پر غرور کی جھلک نمایاں ہوتی تھی مگر میرے غضب ناک چہرے اور قہر برساتی آنکھوں نے اسے بہت کچھ باور کرا دیا تھا۔ ناچار وہ بیٹھے بیٹھے ہی اماں کے قدموں کی جانب جانوروں کی طرح سرکا اور اس کے دونوں پاؤں چھونے لگا۔

"فرش پر اپنی ناک بھی رگڑو۔" میں گرجا۔

"بس، بیٹا! رہنے دے۔" اماں نے مجھے روکا۔

"تم چپ رہو اماں!" میں نے ہولے سے کہا۔

صمد یار نے ایسا ہی کیا۔ اس کے دونوں گماشتوں یاور اور مجھے نے اپنے چھوٹے سرکار کی اس بے عزتی پر اپنے چہرے دوسری جانب پھیر لیے۔ تب میں نے ان سے بھی اٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا۔

بے چون و چرا انہوں نے بھی میرے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ اس کے بعد میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے صمد یار کو گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور قہر آلود لہجے میں بولا۔

"اب اگر تو نے یا تیرے کسی کتے نے یہاں ذرا بھی پھٹکنے کی کوشش کی تو اس کا برا حشر کروں گا۔ دفع ہو جا یہاں

ہے۔" کہتے ہوئے میں نے اسے مرجی کے دروازے کی جانب دھکیل دیا۔ وہ چلے گئے۔ میں چند لمحوں تک اسی طرح پھرا کھڑا رہا۔ چنبیلی حیرت ناک نگاہوں سے مجھے تکے جا رہی تھی جبکہ اماں کے چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

"تجھے ہو کیا گیا ہے؟ سنبھال خود کو سہراب!" بالآخر چنبیلی نے مجھے کچھ بڑا۔ "کیا خون لے گا اپنے سر پر؟"

میری واقعی ایسی ہی حالت ہو رہی تھی اور شاید یہ صدیار کی خوش قسمتی ہی تھی کہ وہ میرے ہاتھوں مرنے سے بال بال ہی بچا تھا کیونکہ میں نے اپنی اس خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پا رکھا تھا کہ وہ میرے ہاتھوں مرنے نہ پائے۔

"ہاں، مجھے کچھ ہو گیا تھا۔ یہ مردود یہاں آجائے گا، مجھے اس کا بالکل بھی اندازہ نہ تھا۔" میں نے کہا اور پھر اپنے ساتھ فرشی بستر پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چنبیلی میرے لیے پانی کا گلاس بھر لائی۔ وہ میں غٹاغٹ چڑھا گیا۔

"پر تو اچانک چلا کہاں گیا تھا؟" چنبیلی نے پوچھا۔

"میرا دل کر رہا تھا باہر جا کر دوڑ لگاؤں پھر میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آگیا۔" میں نے کہا۔ میری حالت سنبھل چکی تھی۔

"وہ کیا؟"

تب میں نے سب بتا ڈالا۔ وہ دونوں ماں بیٹی یہ سن کر انگشت بدنداں رہ گئیں پھر چنبیلی بولی۔

"ضرور شمیلہ خانم کو دوا کے بہانے گہری نیند سلا دیا گیا ہوگا ورنہ وہ مجھے ضرور اپنے روبرو پیش کرنے کا حکم دیتیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن صدیار یہاں کیوں آیا تھا؟ اسے تو میں نے خزانے والی چال میں پھنسا رکھا تھا۔" اگرچہ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ میری چال سمجھ چکا ہے تاہم یونہی میں نے چنبیلی کا تبصرہ سننا بھی ضروری سمجھا جو بالکل وہی تھا جس کا مجھے بھی ادراک ہو چکا تھا۔

"وہ تجھے صحت مند اور تیرا کارنامہ دیکھنے کے بعد سمجھ چکا تھا کہ تو اس کے ساتھ محض مہلت لینے کا کھیل کھیل رہا ہے۔" چنبیلی بتانے لگی۔ "کیونکہ آتے ہی اس نے اماں پر بھی الزام دھرا تھا کہ اسی کی وجہ سے سہراب بھلا چنگا ہوا ہے اور یہ بھی کہ وہ اس کی خاطر دو روز سے غائب کیوں تھی۔ یقیناً اس نے اپنا ایک گماشتہ ہماری جاسوسی پر پہلے ہی لگا رکھا تھا۔ اس نے اماں کی واپسی سے تیرے علاج تک سب دیکھ لیا تھا۔"

"بالکل، یہی بات تھی۔" میں نے ہولے سے کہا۔

"حرام خور، احسان فراموش۔" چنبیلی نفرت انگیز لہجے میں صدیار کو کوستے ہوئے بولی۔ "یہ بھی خیال نہ کیا کہ تو نے اس کی ماں کی جان اس خونخوار تیندوے سے بچائی تھی۔"

"اس کی فطرت ہی دودھ پی کر ڈسنے والے سانپ کی سی ہے۔" میں نے بھی تلخ تبصرہ کیا۔ "اب بھی وہ مجھ پر جاسوس اور تم پر خونخوار تیندوا پالنے کا الزام لگائے گا۔"

"کیا یہ وہی تیندوا تھا جس نے اس رات ہماری مرجی پر حملہ کیا تھا؟" چنبیلی نے کہا۔

"شاید۔"

"پر بیٹے! یہ سب اچھا نہیں ہوا۔ ایک طرف تُو نے اس کی ماں کی جان بچائی اور دوسری طرف تو نے شمیلہ خانم کو بھی ناراض کر دیا۔" اماں نے پہلی بار لب کشائی کی۔ "پر بیٹے اب تو حویلی مت جانا اور جلد از جلد یہاں سے جانے کی تیاری کرو۔ اب تم اللہ کے فضل سے بھلے چنگے ہو چکے ہو۔"

"مجھے کوئی پروا نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں یہاں سے اکیلا نہیں جاؤں گا۔" میرا جواب سنگ تھا اسی لیے اماں بھی دوبارہ کچھ نہ بولی۔

چنبیلی بولی۔ "شمیلہ خانم کو اپنے بیٹے کے کرتوتوں کا علم ہوگا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دونوں ماں بیٹا تو کیا چودھری فتح خان بھی ایسا ہی مغرور اور ظالم انسان ہے۔ ان میں صرف زمان خان اچھا اور نیک سیرت آدمی تھا مگر جانے کیوں اچھے اور نیک لوگوں کو اللہ اپنے پاس جلد بلا لیتا ہے۔" چنبیلی نے آخر میں ایک ہنکاری بھری۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ ہم آرام کرنے لیٹ گئے۔ اگلے دن چڑھے تک میں سویا رہا۔ آنکھ کھلی تو چنبیلی نے بتایا کہ شمیلہ خانم نے کار بھیجی تھی۔ اس کے دو خدمت گار تمہیں لینے کے لیے آئے تھے۔

"اوہ..... کیا اسے میری یہاں موجودگی کا علم ہو چکا ہے!" میں بڑبڑایا۔

"ہو ہی گیا ہوگا۔ بھلا اب تم چھپے رستم کہاں رہے ہو۔" چنبیلی مسکرائی۔

"غلط۔ اس کا مطلب ہے کہ میں کمزور ہو چکا۔" میں بھی مسکرایا۔

"اللہ نہ کرے۔ تم اب بالکل صحت یاب ہو بلکہ اماں نے جیسا کہا تھا کہ ان کے علاج کے بعد اب سہراب بیٹا واقعی سہراب بن جائے گا۔"

"ہاں، اس میں کوئی شبہ نہیں رہا۔" میں نے اعتراف

کہا۔ ”میں خود کو اب پہلے سے زیادہ بہتر بلکہ اپنے اندر چند اضافی توانائی اور خصوصیات محسوس کرنے لگا ہوں۔“

”یہ سب بھاگی بوٹی کا کمال ہے۔“ وہ ہنسی۔

میں نے ناشتا کیا اور حویلی جانے کے لیے تیاری پکڑنے لگا۔ یہ دیکھ کر اماں اور چنبیلی حیران اور تشویش زدہ نظر آنے لگیں۔ اماں نے فکرمندی سے کہا۔

”پر بیٹا! تجھے حویلی نہیں جانا چاہیے۔“

”تیرا حکم سر آنکھوں پر اماں!“ میں نے فرماں برداری سے کہا۔ ”لیکن میں خود چاہتا ہوں کہ اس سے ذرا ایک ملاقات کر ہی لوں۔ کوئی قباحت نہیں اس میں۔“

اسی وقت باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔

”وہ آگئے دوبارہ۔ انھوں نے آنے کا کہا تھا۔“ چنبیلی بولی۔

میں تیار ہو چکا تھا۔ میری پرانی والی پینٹ شرٹ اگرچہ چنبیلی نے دھو ڈالی تھی مگر وہ اب کچھ تنگ سی محسوس ہونے لگی تھی اسی لیے میں نے حویلی والی شلوار قمیص ہی پہنے رکھی اور ان دونوں کو تسلیاں دیتا ہوا باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں کار میں حویلی کی جانب جا رہا تھا۔ دونوں خدمت گار وہی تھے جو کل رات شمیلہ خانم کے ہمراہ تھے۔

حویلی تک سفر خاموشی سے کٹا۔ صمد یار اور اس کے دونوں گماشتوں یاور اور بچے سے اب بھی میرا سامنا متوقع تھا مگر حیرت انگیز طور پر وہ تینوں مجھے کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ مجھے بالآخر شمیلہ خانم کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شمیلہ خانم کو ابھی تک گزشتہ واقعات جو اس کے بدقماش بیٹے صمد یار سے متعلق تھے، علم ہوا تھا یا نہیں۔ میں بہرحال چپ تھا۔

ایک بڑے سے شاہانہ آرام دہ کمرے میں شمیلہ خانم بڑی سی مسہری پر گاؤ تکیے سے پشت لگائے نیم دراز تھی۔ میری اندر آمد کی اطلاع اسے کر دی گئی تھی لہٰذا جب میں اندر داخل ہوا تو اس نے ایک دل نشین مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ وہ چند لمحے مجھے گہری گہری نگاہوں سے تکتی رہی۔ نہ جانے اس کی آنکھوں کے راستے اس کے اندر کیا مچل رہا تھا، مجھے اس کا اندازہ یا ادراک کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

میں ایک نشست پر براجمان ہونے ہی والا تھا کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے سرہانے کے قریب والی دوسری نشست پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ میں خاموشی سے وہاں جا بیٹھا۔ کمرے کی فضا میں گہرا اور پرسکون سا سناٹا طاری تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا، نیز بڑے سلیقے سے اطراف اور درمیان میں قیمتی فرنیچر نظر آیا اور چھت کے وسط میں دل آویز فانوس بھی جھولتا دکھائی دیا۔

شمیلہ خانم نے بچا تلا سا لباس پہن رکھا تھا یوں جیسے کسی کے لیے خاص اہتمام کیا گیا ہو۔ حالانکہ جیسی اس کی حیثیت کنڈیشن تھی، اس میں ایسا چمکدار لباس اور بناؤ سنگھار ہی کیا جانا چاہیے۔ میں نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی اور اس کی زخمی ٹانگ جس پر اب باقاعدہ بینڈیج بندھی ہوئی تھی اور اسے سہارے کے لیے ایک اور گداز تکیہ نیچے دے رکھا تھا، دیکھ کر اس کی خیریت پوچھی۔

”اب بہت بہتر ہے۔ ڈاکٹر شعیب کو اسی رات ہی بلایا گیا تھا۔“ وہ مدھم لہجے میں بتانے لگی۔ ”اس کی دوا سے مجھے نیند آ گئی۔ مگر تم کیوں چلے گئے تھے؟“

”میں رات یہاں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔“ میں نے بھی ہولے سے جواب میں کہا۔ ”کچھ لوگ گھر پر میرا انتظار کر رہے تھے۔“

”ہاں، میں جان چکی ہوں کہ وہ کون لوگ ہیں۔“ شمیلہ خانم نے کہا۔ اس بار اس کا لہجہ نرم نہیں بلکہ سپاٹ رہا۔

”ظاہر ہے وہ دونوں ماں بیٹی اسی گاؤں کی رہنے والیاں ہیں تو آپ جانتی ہی ہوں گی۔“ میں بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے میرے بھلے طنز کو محسوس کر لیا تھا یہی وجہ تھی کہ اس کے دلکش چہرے اور کشادہ آنکھوں میں ایک روایتی قسم کی رعونت اور غار کی جھلک نمودار ہوئی تھی مگر صرف چند ایک لمحے کے لیے۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ اس کے سامنے میں بیٹھا تھا۔ وہ خاموش رہی پھر بولی۔

”میں تمہارا کل رات شکریہ ادا نہیں کر سکی تھی اور تمہارا یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھلا سکتی لیکن......“ اس کی بات درمیان میں رہ گئی کیونکہ اسی وقت ایک خادمہ قیمتی سی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر لے آئی۔ اس پر انواع و اقسام کی اشیائے خورد و نوش سجی ہوئی تھیں۔

”آپ کو نہ میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت تھی نہ ہی ان سب چیزوں کی۔ میں تو فقط آپ کے حکم سے یہاں چلا آیا تھا۔“ میں نے ہولے سے کہا۔ اب اسے کیا معلوم تھا کہ میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی تھی یا اپنے کسی مقصد کے لیے چلا آیا تھا۔

اس نے خادمہ کو ٹرالی میرے سامنے کرنے اور چائے بنانے کا کہا۔ میں بھی چپ رہا۔ خادمہ نے چائے بنا کر مجھے دی اور بسکٹ کی پلیٹ بھی بڑھائی۔ میں نے شکریہ کہہ کر ایک بسکٹ اٹھا لیا۔ اس نے متوازن انداز سے

شمیلہ خانم سے بھی کچھ لینے کا پوچھا مگر اس نے انکار کر کے اسے چلے جانے کو کہا۔ خادمہ خاموشی سے واپس لوٹ گئی۔ میں چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔

وہ غور سے میری جانب تکتی رہی پھر بولی۔ "بعد میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے بارے میں گاؤں میں کچھ عجیب وغریب باتیں مشہور ہو چکی ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟"

"وہ کیا؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے نیم دراز حالت میں اپنے جسم اور لباس کو یونہی درست کیا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔

"یہی کہ تم پڑوسی ملک کے جاسوس ہو اور یہ بھی کہ وہ تینوں ماں بیٹے نے ہی کسی خاص مقصد کے لیے پال رکھا تھا جس نے کل رات ہم پر حملہ کیا تھا۔"

"یہ سب جھوٹ ہے۔" میں نے کہا۔ "معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ یہ افواہیں گاؤں والوں نے نہیں، آپ کے اپنے جواں سال لاڈلے بیٹے صمد یار نے ہی پھیلائی ہیں اور اس کے پیچھے اس کا کون سا خاص مقصد تھا، کاش آپ یہ بھی جان لینے کی کوشش کر لیتیں تو آپ پر شاید اس کی ساری حقیقت آشکار ہو جاتی۔" میں نے بلا کسی ڈر یا خوف کے صاف اور کھری بات اس سے کر ڈالی جس مقصد کے لیے میں یہاں آیا تھا۔ چائے کا کپ میں خالی کر چکا تھا اور اسے واپس ٹرالی پر رکھ دیا۔ ساتھ ہی میں نے شمیلہ خانم کے چہرے کو دیکھا۔ اپنے لاڈلے کے بارے میں سن کر لمحہ بھر کو اس کے حسین چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا پھر بولی تو اس کے لہجے میں کراہت آمیز سا ایک سپاٹ پن بھی تھا۔

"میرے بیٹے کا کیا مقصد تھا؟"

جواب میں، میں نے اسے سب کچھ سچ بتا ڈالا۔ اپنے دشمنوں سے لے کر (مگر وہ کون تھے، یہ نہیں بتایا)۔ صمد یار اور اس کے دونوں گماشتوں یاور اور بھیجے کے اس رات مرضی میں شب خون مارنے تک، سب نہایت صراحت کے ساتھ بتا ڈالا۔

میں نے دیکھا کہ یہ سب سن کر اسے یکلخت ایک چپ سی لگ گئی۔ وہ کچھ سوچتی رہی۔ تب ہی وہی ملازمہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے کسی "وڈے چودھری صاحب" کی آمد کی خبر دی اور الٹے پاؤں لوٹ گئی۔

"چودھری صاحب آ رہے ہیں..... میرے سسر۔" شمیلہ خانم یکدم سنبھل کر بولی۔ میں اسی طرح سپاٹ انداز میں اپنی نشست پر براجمان رہا۔

ذرا دیر بعد ہی ہولے سے کسی کے کھنکھارنے کی آواز ابھری۔ میں نے دیکھا دروازے سے ایک لمبا تڑنگا شخص اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس نے سر پر اونچے شملے والی پگڑ باندھ رکھی تھی۔ چہرے پر گھنی مونچھیں اور داڑھی تھی۔ ان میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ بے داغ اجلی شیروانی اور ایک ہاتھ میں سونے کے دستے والی لام لاٹھی اسے روایتی چودھری ظاہر کر رہی تھی۔ رنگ گورا، عمر کا اندازہ لگ بھگ ساٹھ پینسٹھ کے درمیان مگر صحت اور کاٹھی اچھی تھی۔

صورت سے ہی وہ ایک کرخت مزاج اور رعونت آمیز آدمی نظر آتا تھا۔ میں نے شخص بڑے کے احترام میں اٹھ کر اسے سلام کیا۔ شمیلہ خانم بھی ادب سے اسے سلام پیش کر چکی تھی مگر میں نے دیکھا وہ کچھ دبی دبی بھی نظر آ رہی تھی۔ شاید یہ اس کے سسر کے رعب و دبدبے کا اثر ہو۔

"یہ کون ہے بہو؟ یہاں کیا کر رہا ہے؟" چودھری نے جو بلاشبہ صمد یار کا دادا رج خان ہی تھا، میری جانب ایک کڑوی سی نظر ڈال کر شمیلہ سے پوچھا۔

"ابا جانی! یہ وہی شخص ہے جس نے کل رات اپنی جان پر کھیل کر ہماری جان بچائی تھی۔" شمیلہ خانم نے بتایا۔ میں کھڑا رہا کیونکہ ابھی تک وہ بھی نہیں بیٹھا تھا۔

"اچھی بات ہے۔ ہم اس کے مشکور ہیں لیکن..... یہی اس طرح ایک غیر مرد کا یہاں موجود ہونا بڑے گھرانوں کا چلن نہیں..... اسے کوئی انعام و اکرام دے کر کل رات ہی رخصت کر دیا ہوتا۔"

چودھری رج خان نے روایتی نخوت اور تکبر مزاجی سے کہا تو میرا دماغ بری طرح بھنا گیا اور رج خان کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے بولا۔

"معاف کیجیے گا چودھری صاحب! میں کل رات ہی لوٹ گیا تھا مگر آج صبح آدمی بھجوا کر مجھے دوبارہ بلوایا گیا ہے۔ اپنی مرضی سے میں یہاں نہیں آیا اور نہ ہی مجھے کوئی شوق ہے یہاں آنے کا۔ رہی بات انعام کی، تو اس کا لالچ مجھے کبھی نہیں رہا۔ یہ آپ اپنے زرخرید کتوں کو دینے کے لیے بچا کر رکھ لیں۔ اجر کی توقع میں نے ہمیشہ اللہ سے رکھی ہے، اس کے بندوں سے نہیں..... جس کا وہ وقت بدلنے میں لمحہ بھر کی بھی دیر نہیں لگاتا کہ بادشاہ، گدا بن جاتا ہے اور گدا بادشاہ۔"

میری نپی تلی تیز کلامی پر شمیلہ خانم پریشان سی نظر آنے لگی۔ چودھری رج خان کا شملہ ہل کر رہ گیا۔ اس نے بڑی برہمانہ نظر اور سرخ چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھا اور اسی لہجے میں بولا۔

"تم بہت گستاخ معلوم ہوتے ہو نوجوان! لیکن

شاید ہمارے بارے میں تمہیں کوئی اندازہ نہیں۔ کاش تم نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہماری چھت تلے کھڑے ہو کر ایسا کہنے پر تم واپس اپنے پیروں پر نہیں جاتے۔"

"لعنت بھیجتا ہوں میں اس چھت پر چوہدری فتح خان!" میں بھی جھٹ سے اکھڑ گیا۔ میرے اندر کا تند جنگ باز ایک ہی انگڑائی لے کر بیدار ہوا تھا۔

"میں یہاں صرف اس لیے آیا تھا تاکہ آپ کی اکلوتی اولاد صفدر یار کے کالے کرتوتوں کے بارے میں اس کی ماں کو باخبر کر دوں۔" میں نے فتح خان کی برہمی میں گھرتی حالت کی پروا کیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔ "میں نے اسے بہت اچھے طریقے سے سمجھا تو دیا ہے کہ آئندہ اس نے اگر کسی کی جوان بیٹی پر گندی نظر ڈالی تو کل رات سے زیادہ برا حشر کر دوں گا میں اس کا۔ آپ بھی سمجھا دیجیے گا۔ وہ اپنے دلارے سپوت کو... اچھا — چلتا ہوں۔"

کہتے ہوئے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ چوہدری فتح خان کو چپ سی لگ گئی تھی۔

میں حویلی سے واپس پہنچا تو غصے کے مارے بری طرح تلملا رہا تھا۔ اماں اور چنبیلی پریشان کن بے چینی کے ساتھ میری واپسی کی منتظر تھیں۔ مجھے صحیح سلامت واپس لوٹتے دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ میں نے انہیں سب بتا ڈالا کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ چنبیلی تو میری بات سن کر خوش ہو گئی تھی جبکہ اماں کو تشویش سی کھانے لگی۔ اسی لہجے میں مجھ سے بولی۔

"سہراب بیٹا! یہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔"

"سب اچھا ہوا ہے اماں!" چنبیلی بھڑک کر اپنی ماں سے بولی۔ "ہم آخر کب تک ان ظالموں سے ڈرتے رہیں گے۔ ان کے کالے کرتوتوں کا سب کو علم ہونا چاہیے۔"

"لیکن بیٹی! اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ الٹا ہمیں ہی نقصان اٹھانا پڑے گا۔" اماں ہنوز گہری تشویش سے بولی۔

میں نے کہا۔ "اماں! آپ کسی بات کی فکر نہ کریں۔ میں نے انہیں اچھا سبق سکھا دیا ہے۔ اب ان کی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ یہاں کا رخ کریں اور کریں گے بھی تو منہ کی کھائیں گے۔"

"اور کیا۔ اماں نے آخر سہراب کو واقعی سہراب جو بنا دیا ہے۔" چنبیلی شوخی سے بولی۔ اماں کو بے اختیار ہنسی آ گئی اور میں نے مصنوعی غصے سے چنبیلی کو گھورا اور ہلکی سی چٹکی میں اس کا کان پکڑ لیا۔

"اب بول شرارتی چڑیا!"

وہ چلائی۔ "اماں — اماں! تو نے تو اسے سہراب بنا کر غلطی کروائی۔ یہ تو میرے ہی سر ہو گیا۔"

اماں ہمیں لڑتا دیکھ کر بدستور ہنستی رہی یہاں تک کہ ایک دم اس کی بوڑھی آنکھوں میں جانے کیوں آنسو آ گئے اور وہ روایتی ماؤں کی طرح اپنا دکھ چھپانے اپنا چہرہ موڑ کر دوسرے کونے میں چلی گئی۔

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں نے چنبیلی کا کان چھوڑ دیا۔ "چنبیلی! اماں ایک دم ہنستے ہنستے غمزدہ اور اداس سی کیوں ہو جاتی ہیں؟"

چنبیلی نے شاید مجھ سے پہلے اس کی وجہ سمجھ لی تھی۔ آخر کو اس کی بیٹی تھی۔ وہ بھی مغموم نظر آنے لگی اور بولی۔ "ہر جوان بیٹی کی ماؤں کا ایک ہی دکھ ہوتا ہے جو ایک دم سے ان کی مسکراہٹیں چھین لیتا ہے اور ان کی تھوڑی سی خوشیوں کو بھی غمگین کر دیتا ہے۔" یہ سب کہتے ہوئے چنبیلی کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ ایسے میں مجھے وہ کسی مفکر کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔ کسی نے سچ ہی تو کہا ہے کہ حالات سے بڑھ کر کوئی استاد نہیں ہوتا۔

چنبیلی ایک ان پڑھ اور دیہاتی لڑکی تھی لیکن جو بات اس نے کہی تھی وہ ایسی ہی تھی جیسے اس نے شہر کی کسی بڑی یونیورسٹی سے گریجویشن کی ڈگری لی ہو لیکن اس کی یونیورسٹی تو حالات کی وہ گود تھی جس میں وہ پرورش پا رہی تھی۔

میں شاید اس کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا اسی لیے مجھے بھی ایک دم سے چپ سی لگ گئی لیکن میں نے فوراً فضا کی کدورت اور سنجیدگی کو دور کرنے کی خاطر ہی بولا۔ "اماں کو تمہاری فکر نہیں کرنی چاہیے۔ میری نظر میں تمہارے لیے ایک اچھا رشتہ ہے۔ بس ایک بار شہر کا قصد کر لیں۔ میں اماں کی یہ فکر بھی دور کر دوں گا۔ ان شاء اللہ!"

چنبیلی ایک دم سے شرما گئی مگر فوراً ہی غصہ دکھانے کی وہ ایکٹنگ کر رہی تھی۔ میں نے پھر بھی سے اس کے کان کی لو پکڑ لی۔ "زیادہ ڈرامے مت کر۔ جا اماں کو جا کر حوصلہ دے۔"

وہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔ مجھے پتا تھا چنبیلی بھی وہاں جا کر کسی کونے میں دبک کر اداس سی بیٹھ جائے گی۔ ان دونوں ماں بیٹی کو خوشیاں دینا میرے مقاصد میں شامل ہو چکا تھا۔ ساتھ ہی مجھے نوریہ اور راحیلہ کی بھی فکر تھی۔ میرا خیال تھا کہ شمیلہ خانم سے راہ و رسم خواہ کسی بھی طریقے سے بڑھا کر اپنا مقصد حاصل کر لوں کہ وہ کم از کم اپنے لاڈلے بیٹے صفدر یار کو باز رکھ سکے۔ نیز ہمارا بھی یہاں سے نکلنے اور شہر کوچ کر جانے کا کوئی خاطر خواہ بندوبست کر سکے کیونکہ واپسی کے راستے میرے دیکھے بھالے نہ تھے جبکہ بقول چنبیلی کے

یہ راستے بہت خطرناک اور دشوار گزار ہو سکتے تھے۔ وہ خود بھی انجان تھی۔ اماں کو بھی کوئی اندازہ نہ تھا۔

کسی گائیڈ یا راہنما کا ہونا لازمی تھا ورنہ بڑے حادثے کا احتمال رہتا پھر سب سے اہم بات سواری کی بھی تھی۔ خچر یا پھر گاڑی۔ بقول چنبیلی کے شہر تک جانے کے لیے ایک پکی اور نا پختہ سڑک تھی جو بہت آگے جا کر پکی اور چوڑی ہوئی تھی۔ میران پور گاؤں اور پھر ایک اور چھوٹا قصبہ آتا تھا پھر شہر تک راستہ آسان ہوتا۔ تاہم ان سب باتوں کا علم ان لوگوں کو بخوبی ہو سکتا تھا جو گاؤں سے شہر جایا کرتے ہوں گے لیکن چیدہ چیدہ لوگ جو پیسے والے تھے اور جن کے پاس اپنی گاڑیاں تھیں۔

یہ مدد میں شمیلہ خانم سے لے سکتا تھا لیکن افسوس اب اس کی بھی امید نہ رہی تھی۔ بدقسمتی یہی تھی کہ راہ و رسم استوار ہوا بھی تو دشمن ٹھہرائے گئے۔ میں رات گئے بھی سوچتا رہا۔ اس کے بعد جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

شاید کسی کھٹکے سے ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ آگ......

میرے چاروں طرف آگ پھیلی ہوئی تھی اور چیخوں کی آوازیں۔ میں دھک سے رہ گیا۔ میرے چاروں طرف بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں کی زبانیں لپلپا رہی تھیں جو مجھے نگلنے کو بے چین نظر آ رہی تھیں۔

کسی چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ میں اٹھا اور شعلوں کی پروا کیے بغیر تیر کی طرح اندرونی گوشے کی جانب لپکا۔ اندر کا منظر دہلا دینے والا تھا مگر میں نے ایک لمحے کی بھی دیر نہ لگائی۔ اماں اور چنبیلی شعلوں کے درمیان گھری بری طرح چلا اور کانپ رہی تھیں۔ میرے راستے پر بھی شعلے لپک رہے تھے مگر میں نے ان کی پروا کیے بغیر ایک جست لگائی اور جیسے آگ کی دیوار کو چیرتا ہوا ان دونوں تک جا پہنچا۔ اماں کو ایک کاندھے پر اور چنبیلی کو دوسرے پر ڈالا اور اسی تیزی سے واپس پلٹا۔

چند سیکنڈوں کے اندر میں ان دونوں سمیت انگارہ بنی مڑھی سے باہر تھا۔ شعلوں نے اماں اور چنبیلی کے کپڑوں میں آگ بھڑکا دی تھی۔ میرا بھی یہی حال ہوا تھا مگر میں نے اپنی پروا کیے بغیر دونوں کو کچھ دور لے جا کر زمین پر لٹا دیا اور ان پر تیزی سے مٹی پھینکنے لگا۔

تھوڑی بہت جو آگ لگی، وہ میری اس بروقت کارروائی سے بجھ بھی گئی۔ انہیں تپش کے سبب زخم آگئے تھے۔ جسم کے کچھ حصے جلے تھے۔ وہ کراہ رہی تھیں۔ میں انہیں دوبارہ اسی طرح اپنے اوپر لاد کر قریبی چشمے کی جانب دیوانہ وار دوڑ گیا۔ پلک جھپکتے وہاں پہنچا اور دونوں کو پانی میں اتار دیا۔ ان کی حالت کچھ سنبھلی تو میں نے انہیں نکالا۔ میرے کپڑوں میں بھی آگ لگی تھی جو میں نے اتار پھینکے تھے۔ میرے تو اتنا جسم پر صرف جانگیا تھا۔

ان دونوں کا پہلا سوال میرے متعلق ہی تھا کہ میں تو ٹھیک ہوں؟ ہاں، میں بالکل ٹھیک تھا۔ اس افراتفری میں مجھے یہ سوچنے کا خیال اور نہ احساس رہا کہ آگ نے مجھے ایک ذرا بھی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ یہ کیسے ہو گیا تھا؟ کیا یہ اسی جادوئی بوٹی کا کرشمہ تھا؟ یہ ایک بڑی اور چونکا دینے والی بات تھی لیکن نہیں، مجھے آگ اور شعلوں کا احساس ہوا تھا مگر صرف احساس...... گویا میری بلا کی پھرتی اور بجلی کی سی حرکت نے ہی آگ اور تپتے شعلوں سے بچا لی تھی۔

میں نے اماں اور چنبیلی کو وہیں بیٹھے رہنے کا کہا اور دوبارہ دوڑتا ہوا مڑھی تک پہنچا۔ وہ دھوڑ دھوڑ جل رہی تھی۔ آگ تیزی سے اسے کسی...... اژدہے کی طرح نگل رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اپنا ایک ہاتھ آگ میں ڈالا، یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ مجھ پر کتنا اثر کرتی ہے۔ ذرا دیر آگ پر رکھنے سے ہاتھ میں جلن کا احساس ابھرا اور میں نے فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔ بے شک آگ مجھ پر اثر کر رہی تھی لیکن اس وقت جب میں ٹھہر ا رہتا۔ گردش کرتے ہوئے آگ کے شعلے تپش ضرور دیتے مگر نقصان نہیں۔

اپنی اس ایک اور صلاحیت کا علم ہوتے ہی میرے اندر مسرت سی جاگی۔ اس کے بعد قدرتی چشمے کے قریب جا پہنچا۔ وہاں اماں اور چنبیلی ہانپ رہی تھیں۔ آگ کی گرمی اور تپش سے وہ ابھی تک بے حال سی ہو رہی تھیں۔ میں نے انہیں باری باری اپنے دونوں ہاتھوں کی اوک میں پانی بھر کر پلایا۔

''تم کیا کرنے گئے تھے؟'' چنبیلی نے پوچھا۔

''بس یونہی، لیکن یہ آگ کیسے لگی؟ کیا کوئی جلتی ہوئی مشعل یا لالٹین کا شاخسانہ تھا؟'' میں نے جیسے خود سے سوال کیا۔

''نہیں، ایسا کچھ نہیں تھا۔'' اماں نے جواب دیا۔

''تو پھر یہ ضرور صمد یار اور اس کے گماشتوں کی حرکت ہو سکتی ہے۔'' میں نے قہر آلود لہجے میں دانت پیستے ہوئے کہا۔

پھر یہی وہ وقت تھا جب اچانک مجھے قریب ہی کسی گاڑی کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ پل کے پل میرے اندر سناٹے اترے اور جیسے میرے رگ و پے میں بجلیاں دوڑ گئیں۔ جب تک اماں اور چنبیلی مجھ سے

کچھ کہتیں، میں انہیں وہیں ٹھہرے رہنے کی تاکید کر کے اٹھ کر دوڑا۔ میری سماعتیں حیرت انگیز طور پر کام کر رہی تھیں۔ پلک جھپکنے میں مجھے ان کی سمت کا اندازہ ہو گیا۔ وہ لوگ یقیناً ادھر ہی کہیں چھپے ہوئے یہ تماشا دیکھ رہے ہوں گے اور اپنی کارستانی کے نتیجے کے منتظر بھی مگر ناکامی کی صورت میں اب کھسکنے کی کوشش میں تھے۔

میں چند سیکنڈوں میں ہی اس راستے پر جا پہنچا جدھر ایک بغیر ہڈ والی جیپ جاتی دکھائی دی۔ چاندنی مدھم تھی، تارے بھی کم ہی تھے۔ اس کے مقابلے میں تاریکی زیادہ تھی مگر باوجود اس کے میری نظریں تاریکی میں بھی کام کر رہی تھیں۔ میرے اندر جوش سوا ہو گیا۔ میں نے گاڑی کے تعاقب میں دیوانہ وار دوڑنا شروع کر دیا۔ یقیناً انہوں نے بھی مجھے دوڑتا ہوا، تعاقب میں آتا ہوا دیکھ لیا تھا اسی جیپ کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ جیپ بھاگتے ہی میرے اندر غیظ و غضب کی آگ مزید بھڑک اٹھی تھی۔

یہ صمد یار کی جیپ ہی تھی۔ میری تیز نظروں نے اس میں اسے تو نہیں البتہ اس کے دونوں بھتیجوں یاور اور مجتبیٰ کو سوار دیکھ لیا تھا۔ چند لمحے بیتے ہوں گے کہ میں طوفانی رفتار سے اور بغیر تھکے ان کی جیپ تک جا پہنچا اور یہی نہیں، ایک لمبی جست بھی لگا دی۔ اگلے ایک دو لمحے میں، میں جیپ کے عقبی حصے میں چڑھا ہوا ان کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔

وہ مجھے اس قدر قریب دیکھ کر بوکھلا گئے۔ یاور جیپ چلا رہا تھا اور مجتبیٰ اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ دونوں نے بیک وقت گھبرا کر اپنی گردنیں موڑ کر مجھے دیکھا تو جیپ ڈولنے لگی۔

"تو سامنے نظر رکھ یاور!" مجتبیٰ نے اسے ڈپٹا پھر پستول نکال کر مجھ پر گولی چلانے لگا تھا کہ میں نے بلا کی پھرتی سے حرکت کی اور عقب سے اس کی گردن پر چیتا ہاتھ مارا۔ اس کے حلق سے کراہ بلند ہوئی اور وہ وہیں سیٹ پر لڑھک کر بے حس و حرکت ہو گیا۔

اس کا پستول جیپ کے فرش پر گرا جسے میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اچک کر اس کی نال اسٹیئرنگ سنبھالے یاور کی گدی سے لگا دیا اور خونخوار لہجے میں بولا۔

"جیپ روک دے ورنہ تیری کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

میری دہشت اس پر کچھ اس طور سوار تھی کہ اس نے میرے حکم کی تعمیل میں ایک ذرا دیر نہ لگائی اور جیپ روک دی پھر میرے کہنے پر اس نے جیپ کا انجن بھی بند کر دیا۔ یکلخت جنگل جیسے خاموش ہو کر ہولے ہولے سانس لینے لگا۔

"صمد یار نے ہی تم دونوں کو مڑھی میں آگ لگانے کے لیے بھیجا تھا؟" میں نے غرا کر لہجے میں اس سے کہا۔ پستول کی نال ہنوز اس کی گدی سے چپکی ہوئی تھی۔ مارے دہشت اور خوف کے اس کے منہ سے فوری طور پر تو کچھ برآمد نہ ہوا لیکن پھر پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔

"نن...... نہیں...... تو......" میں نے ہونٹ بھینچ کر غصے سے اس کا سر اسٹیئرنگ پر مارا۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی پھر اسی طرح اسے گردن سے دبوچ کر جیپ سے دھکا دیا۔ وہ لڑھک کر ایک درخت سے جا ٹکرایا۔ مجھ پر جنون کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے پھر اسے دبوچ کر اس کا سر درخت کے مضبوط تنے سے ٹکرا دیا۔ اس کی پیشانی لہولہان ہو گئی پھر میں جنونی انداز سے غرایا۔

"تم دونوں یہاں اپنی پھوپی کی شادی دیکھنے کے لیے آئے تھے؟ سچ بولو ورنہ اسی طرح درخت سے تیرا سر ٹکرا کر بھیجے کا قیمہ بنا ڈالوں گا۔"

وہ میری وحشت اور جنون خیزی پر دہشت زدہ ہو گیا اور کراہتے ہوئے بولا۔

"ہ...... ہم حکم کے غلام ہیں جی۔"

"کس نے حکم دیا تھا؟"

"چھ...... چھوٹے سرکار نے۔"

"صمد یار نے کہا تھا کہ جھونپڑی کو آگ لگا دو؟" میں نے اس کے منہ سے پورا بیان نکلوانے کی تصدیق چاہی۔

"ج...... ہاں جی!"

"اسی وقت میرے ساتھ تھانے چل کر تجھے یہی بیان دینا ہو گا ورنہ یاد رکھنا، تجھے بھی میں آگ لگا کر جہنم واصل کر ڈالوں گا۔"

اس کا چہرہ اور پیشانی خون سے تر ہو گئے تھے۔ وہ بولا۔ "جی جی...... میں کیسے کر سکتا ہوں؟"

"اس کے کہنے پر معصوم اور بے گناہ عورتوں کی جھونپڑی میں آگ لگا سکتے ہو۔ انہیں آگ میں جلنے کا تماشا دیکھ سکتے ہو لیکن سچ نہیں بول سکتے۔" میں نے پُرطیش لہجے میں غرا کر کہا اور پھر اسے دوبارہ درخت سے دے مارا۔ اس کے حلق سے کربناک چیخ خارج ہوئی اور وہ جھاڑیوں میں کسی بے جان جانور کی طرح گر کر تڑپنے لگا۔

میں نے کوئی پروا نہ کی اور اسے جھک کر دوبارہ دبوچا اور اٹھا کر درخت سے لگا دیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس پر نیم بے ہوشی سی طاری تھی۔

"کیا کہتے ہو، چلیں تھانے یا پھر ادھر ہی حساب چکتا

کرواؤ گے، کتے کی موت مرکر؟'' میں نے بے رحمی سے کہا۔ ان جیسے ظالموں پر رحم کرنا بھی جرم تھا۔

''بیچ...... چلیں۔'' بالآخر اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''یاد رکھنا، اگر تھانے جا کر تم نے بیان بدلا یا کوئی اور چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو دوسری بار تو میرے شکنجے میں آنے کے بعد زندہ نہیں رہے گا۔'' میں نے تہدید کی پھر اسے اٹھا کر جیپ میں واپس پھینکا۔ خود بھی سوار ہو گیا اور اسے اسٹارٹ کر کے چشمے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں اماں اور چنبیلی کو میں نے ساری بات بتائی اور انہیں بھی جیپ کی پچھلی سیٹ پر سوار ہونے کا کہا تو اماں بولی۔

''سہراب بیٹے! تھانے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ سب ان سے ملے ہوئے ہیں۔ یہ بھی وہاں جا کر صاف مکر جائے گا۔'' اماں کی بات میں سمجھ رہا تھا جس کا مجھے بھی اندازہ تھا۔

میں نے کہا۔ ''کچھ بھی ہو، پولیس کو اس مجرمانہ واقعے کی اطلاع اور اپنا بیان دینا قانونی طور پر ضروری ہے۔''

اماں میری بات سمجھ گئی۔ ہم سب تھانے روانہ ہوئے۔ تھانہ ریڑھی گاؤں کی حدود سے شمالی سمت ایک آدھ میل کے فاصلے پر مختصر سی پرانی عمارت پر مشتمل تھا۔ اس پر سفید اور پیلا رنگ کیا گیا تھا۔ احاطے پر لکڑی کا پھاٹک نظر آیا جو کھلا ہوا تھا اور اندر ایک پولیس جیپ کھڑی تھی۔ چھوٹی سی عمارت کے عقب میں دو تین رہائشی کوارٹر بھی نظر آئے۔ چہار دیواری گارے مٹی کی بنی ہوئی تھی جو کہیں کہیں سے ٹوٹی ہوئی دکھائی دی۔

ہم اندر پہنچ کر رک گئے۔ دو سنتری دکھائی دیے۔ وہ شاید جیپ کو پہچان کر فوراً ہماری جانب بڑھے مگر ہمیں دیکھتے ہی وہ بری طرح چونکے۔ میں ان کی جانب گھورتا ہوا نیچے اتر آیا۔ اندر کچے احاطے کے وسط میں ایک فولادی پول پر بڑا سا سرکاری بلب پیلی روشنی پھیلا رہا تھا جس کے گرد پتنگوں کا جھرمٹ رقصاں تھا۔ باقی برآمدہ اور باہر کی جانب دو چھوٹے بلب مقدور بھر روشنی دے رہے تھے۔

''مجھے تھانہ انچارج سے ملنا ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تم کون ہو اور یہ...... اس کی حالت کس نے بنائی ہے؟'' ایک سنتری نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ پر سوال داغ دیا۔ شاید اپنے ''صاحب'' کی طرح وہ بھی حویلی والوں کا راتب خور تھا۔

''ان دونوں نے......'' جواب میں مجھے اور بے ہوش پڑے یاور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے سنتری سے کہا۔ ''ہماری جھونپڑی کو مصیار کے کہنے پر آگ لگائی گئی ہے۔ میں نے بروقت انہیں وہاں سے بھاگتے ہوئے پکڑ لیا۔''

''اچھا......!'' دوسرا سنتری جو دبلا پتلا اور گورا سا تھا، طنزیہ لہجے میں ''اچھا'' کو کھینچتے ہوئے بولا۔ ''مگر تم ذرا اپنا تعارف تو کرواؤ۔ تم کون ذات شریف ہو؟ پہلے تو کبھی تمہیں یہاں نہیں دیکھا۔''

''سب معلوم ہو جائے گا۔ پہلے آپ بیان لکھیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''او بیان کے ماہے!'' پہلا والا سنتری کڑک کر مجھ سے بولا۔ ''ہم اپنا کام جانتے ہیں۔ ہمیں مت سکھا۔'' کہتے ہوئے اس نے کسی ساجے، کھاپے کو آواز دے کر بلایا۔ وہ سادہ وردی والے آدمی دوڑے ہوئے آئے۔ پہلے والے سنتری نے جس کے سینے پر جواد کا نام لکھا تھا، ان سے حکمانہ بولا۔

''ان دونوں کو کمرے میں لے جاؤ اور ان کی مرہم پٹی کرو۔'' اشارہ یاور اور مجھے کی طرف تھا پھر اپنے ساتھ کھڑے سنتری سے مخاطب ہوا۔

''نوید! تو ذرا ان کے ساتھ جا۔ میں انہیں شب تک اندر لے جاتا ہوں۔''

''چلو اندر۔''

اس نے آخر میں میری طرف دیکھا۔ میں نے بھانپتی ہوئی نظروں سے صاف محسوس کیا تھا کہ اس نے اپنے ساتھی اہلکار نوید کو ایک مخصوص اشارہ بھی کیا تھا۔ بہرکیف، ہم تینوں جواد نامی سنتری کے ساتھ عمارت کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ سیمنٹ کی ساتھ دو سیڑھیاں چڑھ کر مختصر برآمدے میں آئے اور ایک کمرے کی جانب بڑھے جس پر چق پڑی تھی۔ وہ ہمیں اسی کمرے میں لے گیا۔ اندر کوئی نہیں تھا۔ زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ سنتری جواد نے اسی کی روشنی میں سوئچ بورڈ کی جانب ہاتھ بڑھا کر بلب روشن کر دیا۔

یہ بڑا سا کمرا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا اندر کوئی پولیس افسر ہوگا۔ تاہم کمرا کسی تھانہ انچارج کا ہی لگا۔ سامنے بڑی سی کرسی تھی، میز تھی اور اس کے سامنے دو تین کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دائیں جانب پرانی سی بینچ رکھی تھی۔ سنتری نے اماں اور چنبیلی کو وہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور مجھے کرسی دی۔ وہ کچھ سوچتا ہوا سا بن گیا تھا۔

''انسپکٹر صاحب تو یہاں نہیں ہیں۔'' میں نے اس کو

سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اتنے اتاؤلے کیوں ہو رہے ہو؟ صبر کرو ذرا۔ صاحب اپنے کوارٹر میں ہیں۔"

"کیا آپ اس واردات کو معمولی سمجھ رہے ہیں؟" میں نے اس کی جانب دیکھ کر طنز سے کہا۔ اس کے چہرے پر تندی عود کر آئی۔

"تم نے اتنے یقین سے کیسے کہہ دیا کہ کوئی واردات ہوئی ہے؟ سرکنڈوں اور تیلے تیلیوں سے بنائی ہوئی جھونپڑیوں میں اکثر حادثاتی طور پر یا اپنی غلطی سے آگ لگ جایا کرتی ہے۔"

مجھے اس کی بات پر طیش تو بہت آیا مگر ضبط سے کام لے کر بولا۔ "مجرم سامنے ہوں اور وہ اقرار بھی کر چکے ہوں اپنے جرم کا تو کیا پھر کسی اتفاقی حادثے کی گنجائش باقی رہتی ہے؟"

"مار پیٹ کر تو بھونکنے والا کتا بھی چپاؤں چپاؤں کرنے لگتا ہے۔" وہ عجیب خبیثانہ سی مسکراہٹ سے بولا۔ "تم نے اس کی حالت بھی ایسی کر دی ہے مار مار کے۔ یہ مجرم ہے۔"

"بہتر ہوگا آپ انسپکٹر صاحب کو بلا دیں۔" بالآخر میں نے کہا۔ سامنے میز پر رکھی نام کی تختی پر میں نے ایس ایچ او انسپکٹر شاہجہاں پڑھ لیا تھا۔

"آرام سے بیٹھو، صاحب تھکے ہوئے تھے، آرام کر رہے ہیں۔ صرف اس گاؤں کے مسائل ہی نہیں ہوتے، پورا علاقہ ہے جس میں کئی قصبے اور دیہات ہیں۔" جواد نخوت سے بولا۔

"تب پھر میں نے یہاں آ کر غلطی کر ڈالی ہے۔" میں کرسی سے اٹھ کر سپاٹ لہجے میں بولا۔ "مجھے رینجرز چوکی کا رخ کرنا چاہیے یا پھر شہر۔"

میرا خیال تھا وہ میری اس بات سے مرعوب ہو جائے گا مگر اس کے برعکس وہ زہریلی ہنسی سے بولا۔

"بڑے شوق سے لیکن ہمیں تو اپنی کارروائی اب کرنا ہی پڑے گی۔ زخمی بھی تم لائے ہو جس کی مرہم پٹی سرکاری شفاخانے اور پولیس کسٹڈی میں کی جا رہی ہے۔ ہم پھر اپنی رپورٹ تیار کر کے بے فکر ہو جائیں گے۔"

"انسپکٹر صاحب سے کب ملاقات ہوگی اور ہمارا بیان کب نوٹ کیا جائے گا؟" میں نے اندر ہی اندر کھولتے ہوئے کہا۔ مجھے اماں اور چنبیلی کی باتیں درست لگ رہی تھیں۔ یہاں سارا آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا بلکہ حویلی والوں کا زرخرید ہی لگتا تھا۔

"پہلے بیان نوٹ کرواؤ۔ ان دونوں کو بھی آ جانے دو جن کی تم نے غیر قانونی طور پر خوب درگت بنائی ہے پھر کچھ سوچتے ہیں۔" جواد نے کہا۔

وہ چلا گیا۔ ہم بیٹھے رہ گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب اندر آ گئے۔ سنتری جواد، نوید، جمیا اور یاور۔ جمیے کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔ یاور کی پسلی کی ہڈی پر بھی درد کش بینڈیج بندھی نظر آ رہی تھی اور وہ دونوں ہی تکلیف کے سبب ہائے ہائے کر رہے تھے۔ مجھے ان کا یہ سب ڈراما ہی لگا۔ البتہ میں نے سنتری جواد اور نوید کے چہروں پر اب ایک طمانیت سی محسوس کی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ کچھ دبی دبی سی فکر و تشویش کا شکار نظر آتے تھے۔

سنتری جواد کا جمیے اور یاور کو اپنے ساتھی اہلکار نوید کے ساتھ مرہم پٹی کے بہانے دوسرے کمرے میں بھیجنا اور ساتھ ہی اسے مخصوص اشارہ کرنا، یہ سب مجھے کسی کو خفیہ طور پر "باخبری" اور "نمک حلالی" کا ایک انداز ہی لگا تھا۔ میرا یہ اندازہ جلد ہی درست ثابت ہو گیا جب میں نے باہر کسی گاڑی کی دھواں دھار آمد کو محسوس کیا۔ ہم سب متوجہ ہو گئے۔

"لو جی، چھوٹے سرکار بھی آ گئے۔" دفعتاً ہی سنتری نوید کے منہ سے نکلا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھ لیا تھا۔ اس سے شاید غلطی ہو گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سنتری جواد نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا تھا جیسے کہہ رہا ہو "چھوٹے سرکار" کہنے کی اس وقت کیا ضرورت تھی مگر مجھے موقع مل گیا اور میں کاٹ دار طنز سے بولا۔

"اوہ..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ انہیں خبر کر دی جائے گی اور یہ کہ حویلی والے یہاں سرکاری عمارت والوں کے بھی "سرکار" ہیں۔"

جواد نے میرے ذومعنی طنز کو سمجھ لیا اور تپے میں اس نے ایک بار پھر غصیلی نظروں سے اپنے ساتھی اہلکار نوید کو گھورا۔ "دیکھ لیا بے موقع اور بے محل منہ پھاڑنے کا نتیجہ۔" نوید ایک بار پھر اس کی غصیلی نظروں کا مطلب سمجھ کر خفیف سا نظر آنے لگا۔

تیر نکل چکا تھا اور چند لمحوں بعد ہی صمدیار اپنے دو مزید مسلح حواریوں کے ساتھ دندناتا ہوا یوں اندر داخل ہوا جیسے سرکاری تھانہ نہیں بلکہ اس کی حویلی کا کوئی کمرا ہو۔ یہی نہیں، اس کی دھواں دھار اندر آمد پر وہ دونوں سنتری بھی یوں دبے ہوئے دکھائی دینے لگے جیسے وہ ان کا افسر ہو۔

صمدیار نے اندر آتے ہی شعلہ بار نظروں سے منظر پر نگاہ ڈالی اور پھر میری جانب گھورا پھر سنتری جواد سے

درشت لہجے میں بولا۔

”میرے آدمیوں کی یہ حالت کس نے بنائی ہے جواد؟“ سنتری جواد کو اس کے مخاطب کرنے کے انداز سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سے اسی طرح بات کرنے کا عادی تھا اور وہ اس سے دبنے کے۔ واضح طور پر کسی طرح سے تھانے سے ہی صمد یار کو اس کی اطلاع کر دی گئی تھی۔ تیز صمد یار نے محض رسماً ہی پوچھا تھا ورنہ تو اسے سب خبر کر دی گئی تھی۔

”اس نے۔“ سنتری جواد نے یوں جلدی سے میری جانب اشارہ کیا جیسے اگر اسے دیر ہو گئی تو صمد یار اسی کی ٹھکائی کروا دے گا۔

”تم......!“ صمد یار پُرطیش انداز میں میری جانب بڑھا اور مجھے تھپڑ رسید کرنے کے لیے اس نے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا ہی تھا کہ میں نے انتہائی نفرت انگیز انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر اس کی کلائی فضا میں ہی پکڑ کر بری طرح مروڑ کر اسے دوسری جانب پلٹنے پر مجبور کر دیا اور یہی نہیں اسے زور سے دھکا بھی دے ڈالا۔

میری یہ جرأت انگیز حرکت کم از کم دونوں را اب خود سنتری اور صمد یار کے نئے حواریوں کے لیے بالکل ہی غیر متوقع تھی۔ چند ثانیوں کے لیے وہ سب ہی ہکا بکا سے رہ گئے۔ تب ہی صمد یار کے دونوں مسلح حواریوں نے یکلخت اپنے ہتھیار مجھ پر سیدھے کر ڈالے مگر میں اسی طرح پہاڑ بنا ان کے سامنے تنا کھڑا ان دونوں کی جانب شعلہ بار نظروں سے گھورتا رہا۔

”یہ کیا کر رہے ہو تم...... جانتے نہیں یہ کون ہیں؟“ سنتری جواد پریشان ہو گیا اور مجھ سے بولا۔

”ابھی معافی مانگو ان سے۔“

صمد یار کی حالت زخم کھائے سانپ جیسی ہو رہی تھی۔ وہ بل کھائے جا رہا تھا اور سب کے سامنے اپنی اس تذلیل نے اس کا چہرہ غیظ و غضب کے مارے مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ دونوں سنتری ہمارے درمیان آ گئے تھے۔ انہیں ڈر تھا کہیں ادھر ہی گولیاں نہ چل جائیں۔ پھر وہ صمد یار کی طرف بڑھا اور اس کی منتیں کرتے ہوئے بولا۔

”تھوڑا اپنے آپ پر قابو پا کر رکھیں جناب! یہ بہت اوکھا بندہ لگتا ہے۔ ابھی صاحب آ جاتے ہیں، جیسا آپ چاہو گے، ویسا ہی ہو گا۔ بس تھوڑا صبر کر لیں۔ کچھ قانونی معاملات آڑے آ جاتے ہیں۔“

میں سنتری جواد کی صمد یار کو تسلی دینے کے اس انداز سے حیران رہ گیا۔ جس دھڑلے کے ساتھ وہ ہم سب کے سامنے صمد یار کی منتیں کر کے اپنی ”نمک حلالی“ دکھا رہا تھا وہ پولیس وردی میں قانون کی دھجیاں بکھیرنے کے لیے کافی تھا۔

”اسی وقت بلاؤ انسپکٹر شاہجہاں کو، اسی وقت......“ صمد یار غصے میں سے کی دستک سنتری جواد کے سینے پر دیتا ہوا دہاڑ کر بولا۔ تو وہ فوراً حرکت میں آیا اور دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

صمد یار اور اس کے دونوں حواری خارش زدہ جانور کی طرح غصے اور بے بسی سے چابیاں کھاتے رہے مگر میں اسی طرح پورے اعتماد کے ساتھ کھڑا رہا۔ البتہ اماں اور چنبیلی خاصی ہراساں اور متوحش دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے تسلی دینے کی کوشش کی تاہم مجھے ایک تشویش کا سا احساس ہو چلا تھا کہ میں نے یہاں آ کر غلطی تو نہیں کی تھی؟ میری یہاں کیا حیثیت تھی؟ کون مجھے جانتا تھا؟ اور زیادہ سے زیادہ میں کیا کر سکتا تھا۔ ظلم یا ناانصافی پر دلبرداشتہ ہو کر دو چار آدمیوں کو لتاڑ دیتا پھر اصل جرم اور اصل مجرموں پر بڑی آسانی سے پردہ ڈال کر مجھ پر پولیس کیس بنا دیا جاتا۔

قانون تو یوں بھی اصل کے بجائے نقل کے سلسلے میں زیادہ جلدی کرتا ہے۔ اشرافیہ کے بجائے طبقہ ناتواں کے معاملے میں اسے سارے قوانین یاد آنے لگتے ہیں۔ میرے اندر ایک تو اتر سے یہ ساری تلخیاں اترتی جا رہی تھیں۔

میری جانبدار رپورٹ پر پہلے جس لیت و لعل سے کام لیا جا رہا تھا، صمد یار کے آتے ہی وہ ہوا ہو چکی تھی اور انسپکٹر شاہجہاں کو فوری طور پر اسی تھانے میں ”پیش“ کر دیا گیا تھا جس کا وہ انچارج تھا۔

ایک موٹا تازہ پلا ہوا سانڈ جیسا شخص اپنی وردی اور پتلون کی بیلٹ درست کرتا ہوا بوگی کے جن کی طرح آن وارد ہوا تھا۔ کالا بھجنگ، جھلسی ہوئی رنگت، ٹھگنا قد و قامت، نکلی ہوئی توند سے جھانکتی حرام خوری...... اس کا سیل بھی نظر آ رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں سیاہ رول تھا۔

اس کے چہرے پر بڑی بڑی گھنی مونچھیں تھیں اور اس نے آتے ہی سب سے پہلے جھک کر کورنش بجا لا کر صمد یار کو سلام پیش کیا۔ اس کی حالت پر تشویش کے اظہار کے ساتھ اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا گیا پھر وہ میری جانب طوفانی بگولے کی طرح مڑا اور خشمگیں نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

”تم کیا کوئی پھنے خاں ہو یا بڑے تیس مار خاں ہیں...... بولو...... کون ہو تم......؟“ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے رول کو جارحانہ انداز میں میرے سپاٹ چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے گرج کر کہا۔

''انسپکٹر صاحب! میں نہ کوئی پھنے خاں ہوں نہ کوئی بڑا تیس مار خاں۔ مظلوم کی حیثیت سے یہاں آیا تھا رپورٹ لکھوانے۔'' میں نے تحمل سے جواب دیا۔

انسپکٹر شاہجہاں نے مارے طیش کے سیاہ رول میرے چہرے کے سامنے زور سے لہرایا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس سے مجھے بے تحاشا پیٹنا شروع کر دے لیکن شاید اسے جہاں پہلے ہی اس سارے معاملے کی ''بریفنگ'' دے دی گئی تھی تو یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ ناانصافی کی صورت میں، میں آگے کیا کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔

''ہاں..... مظلوم!'' رول ہوا میں لہرانے کے بعد وہ حقارت سے بولا۔ ''تمہارے جیسے دو چار مظلوم اور جمع ہو جائیں تو ہماری تو ہوئی چھٹی۔'' پھر ذرا ٹھہر کر دھمکاتے ہوئے شعلہ بار لہجے میں دوبارہ بولا۔

''یاد رکھو، قانون کو ہاتھ میں لو گے تو سب سے پہلے تمہاری کوشالی ہو جائے گی۔ تمہیں شرم نہیں آتی کہ اس طرح قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر تم شریفوں کی درگت بناتے ہو؟ کیوں مارا تم نے انہیں؟ تم نہیں جانتے یہ غریب تو خود نوکر ہیں کسی کے۔ مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔''

انسپکٹر نے آخر میں مجھے اور یاور کی جانب اشارہ کیا۔ میرا جی چاہا کہ اس حرام خور کی منافقت پر ''ماشاء اللہ.....'' ہی پڑھ ڈالوں تاہم اسی تحمل سے بولا۔

''انسپکٹر صاحب! آپ پہلے میرا بیان.....''

''بیان..... بیان..... ایسی کی تیسی..... بیان کی۔'' وہ میری بات کاٹ کر پُرطیش لہجے میں بولا اور اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بڑے فدویانہ انداز میں صمد یار کو بھی بیٹھنے کا کہا مگر وہ ایک دم ہی تھے سے اکھڑ کر انسپکٹر شاہجہاں سے بولا۔

''آپ اس کے ساتھ مکمل لگے رہیں انسپکٹر صاحب! میں اپنے آدمی لے جا رہا ہوں اور ذرا اس کی اچھی طرح خبر لیں۔ مجھے یہ آدمی دوبارہ باہر نظر نہ آئے۔ میں اس کے بارے میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں۔''

صمد یار یہ کہتا ہوا اور مجھے خونی نظروں سے گھورتا ہوا باہر نکل گیا۔ چھما اور یاور بھی جانے لگے تو میں ان کے راستے میں آ گیا اور حیران ہو کر انسپکٹر شاہجہاں سے بولا۔

''یہ دونوں تو مجرم ہیں اور وہ بھی جو ابھی یہاں سے گیا ہے..... انہیں کیسے جانے دیا آپ نے؟''

''اوئے، مجرم کے ماما!'' شاہجہاں میری بات پر دوبارہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور رول لہراتا میری جانب آیا۔

''اب پہلے تو اپنی فکر کر۔ تجھ پر پہلے ہی ایک پڑوسی ملک کے جاسوس کا پرچہ کٹ چکا ہے۔''

''کب؟ کہاں ہے وہ پرچہ، کس تاریخ کو لکھوایا گیا، کس نے لکھوایا؟ میرے سامنے پیش کرو ان کو۔'' میں نے بھی ترشی سے کہا۔

اماں سے اب یہ سب برداشت نہ ہو سکا اور وہ ایک دم اٹھ کر میرے اور انسپکٹر کے درمیان میں آ کر کھڑی ہو گئی پھر وہ اپنی جھولی اٹھا کر شاہجہاں سے داد فریاد کے انداز میں بولی۔

''انسپکٹر صاحب! ہمیں کسی کے خلاف رپورٹ نہیں لکھوانی ہے۔ ہم کسی کا نام نہیں لیتے۔ تم بس ہمیں جانے دو اور میرے بیٹے سہراب کو معاف کر دو۔''

اماں کی بات سن کر میرے دل پر گھونسا سا لگا مگر انسپکٹر شاہجہاں اپنی فتح پر کمینی مسکراہٹ سے بولا۔

''بڑھیا! یہ تجھے یہاں آنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا، پر شکر کر کہ میں تجھے اور تیری جوان اور خوب صورت بیٹی کو جانے دے رہا ہوں لیکن یہ تیرا بیٹا کب سے ہو گیا؟ یہ تو پڑوسی ملک کا جاسوس ہے۔ یہ نہیں جائے گا یہاں سے۔''

''نہیں..... نہیں انسپکٹر صاحب! یہ جھوٹ ہے۔ یہ بے چارہ تو خود تقدیر کا ستایا ہوا ایک عام انسان ہے۔'' اماں ایک دم تڑپ گئی۔ اماں کو اس انداز سے مخاطب کرنے پر مجھے شاہجہاں پر طیش آ گیا اور میں بپھر کر بولا۔

''انسپکٹر! یہ بزرگ خاتون تیری ماں کے برابر ہے۔ تمیز سے بات کر اس کے ساتھ۔''

انسپکٹر شاہجہاں نے مجھے پُرغیظ نظروں سے دیکھا اور اسی لہجے میں بولا۔ ''اوئے تمیز کے ماما! اپنی خیر منا اب.....''

پھر اس نے دونوں سنتریوں کو حکم دیا کہ مجھے ہتھکڑیاں لگا دیں۔ اماں مجھے بچانے کی خاطر اس سنگ دل اور بے رحم آدمی کے پیروں پر گر پڑی۔

''نہیں..... نہیں انسپکٹر صاحب! یہ ایک بے گناہ کے ساتھ ظلم ہے۔ ایسا مت کرو۔''

اماں کو اس رذیل اور راشی خود انسپکٹر کے قدموں میں گرتے دیکھ کر میرے سر پر خون سوار ہونے لگا اور میں نے اسے گرج دار آواز کے ساتھ للکارا۔

''انسپکٹر..... ! تجھے اس کا حساب دینا پڑ جائے گا۔''

اس دوران جواد اور نوید مجھے ہتھکڑیاں پہنا چکے تھے۔ اماں اٹھ کر میرے آگے ہاتھ جوڑنے لگی اور بولی۔

''بیٹا! خود پر قابو پا لے۔ تو یہاں کے حالات سے

واقف نہیں ہے۔ میں کہتی تھی ڈاکٹر تو جلد سے جلد یہاں سے چلا جا۔ یہاں کوئی تیرا نہیں۔ نہ ہی ہمارا ہے۔" کہتے ہوئے وہ بے بسی اور دکھ سے رو دی۔ میرا دل کٹ گیا۔ چنبیلی بھی انسپکٹر کی منتیں کرنے لگی لیکن اس فرعون صفت افسر پر جوں تک نہ رینگی۔

مجھے لاک اپ کر دیا گیا۔ اماں اور چنبیلی کو زبردستی اور دھکے دے کر نکال باہر کر دیا گیا۔ میں کسی زخمی اور بپھرے ہوئے شیر کی طرح لاک اپ کے پیچھے کھڑا اندر ہی اندر جلتا سلگتا رہ گیا۔ یہی نہیں، میں نے انہیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دینا شروع کر دیں۔ یہ میری غلطی تھی۔

میرا مقصد قوت اور چالبازوں کا مقصد کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ رول لہراتا ہوا اب حظ اٹھانے والے انداز میں میری جانب آیا اور بولا۔

"دیکھنا بچہ جی! اب میں تجھ پر کیسے کیسے خطرناک کیس بناتا ہوں۔ تو مجھے دھمکیاں دیتا ہے۔ اپنے باپ کو......"

"انسپکٹر... میری جان سے دو ہاتھ۔" میں دشمنوں کو کبھی نہیں بھلایا کرتا۔ اب تو بھی ان میں شامل ہو چکا ہے۔"

"ہاہاہا...... ہاہاہا...... چ چ چ... کر کے شامل مجھے بھی۔ کل صبح کا سورج تجھے ایک بند گاڑی میں ایسی جگہ پہنچا دے گا جہاں تیری روح بھی کانپ جائے گی۔"

وہ یہ دھمکی دے کر پلٹ گیا۔ میں بیچین زدہ سے قید خانے میں تنہا رہ گیا۔ مجھے اب اماں اور چنبیلی کی طرف سے پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ ان کی پناہ گاہ بھی اب نہیں رہی تھی۔ ظالموں نے وہ خاکستر کر ڈالی تھی۔ وہ اب کہاں جائیں گی؟ کدھر بسیرا کریں گی؟ بھیڑیوں کے اس جنگل میں اماں اپنی جوان جہان بیٹی کو لے کر اب کس کا دروازہ کھٹکھٹائیں گی؟

ان اذیت ناک سوچوں نے مجھے بالکل ڈھا دیا۔ میرا جی چاہا یہاں سے بھاگ نکلوں۔ سب کو آگ لگا دوں۔ تب ہی میں نے اپنے دونوں ہاتھ لاک اپ کے سلاخ دار دروازے پر جما دیے۔ مختصری اکھڑے فرش والی راہداری میں کہیں سے مدھم روشنی پڑ رہی تھی۔ ڈیوٹی دار پہلے تک وہاں گشت کرتا رہا تھا پھر وہ بھی شاید آرام کرنے کی نیت سے چلا گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ بھلا میں یہاں سے اب کہاں جا سکتا ہوں۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو سلاخوں پر اچھی طرح جمالیا اور میرے اندر کی توانائیاں از خود ہی انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگیں۔ یوں جیسے وہ ہمیشہ مشکل وقت میں میری ساتھی ہوں۔ میں خود اپنی طاقت پر حیران رہ گیا حالانکہ میں نے تو یونہی ایک روایتی جوش تلے سلاخوں کو موڑنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے دیکھا کہ سلاخوں پر ہاتھ پڑتے ہی میرے ہاتھوں اور بازوؤں میں لہریں دوڑنے لگیں۔

زور آزمائی مجھے تراوٹ بخشنے لگی۔ میں زور لگاتا چلا گیا اور بالآخر سلاخیں اس قدر موڑ ڈالیں کہ وہ "آدم گزار" ہو گئیں۔ میں نہایت آہستگی سے باہر نکل آیا۔ ہر سو سکوت طاری تھا۔ وہ سب شاید آرام کرنے چلے گئے تھے۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا برآمدے میں آگیا۔ وہ ایک مسلح سنتریوں کو میں نے سست روی کے ساتھ ادھر ادھر چکر لگاتے دیکھا اس کے بعد میں ان کے مڑتے ہی باہر نکل آیا۔ میں دوڑ کر اماں اور چنبیلی کی تلاش میں جا سکتا تھا مگر ایک خیال آیا کہ جاتے جاتے انسپکٹر شاہجہاں کو سبق سکھا جاؤں لیکن پھر یہ خیال کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دیا۔ درحقیقت مجھے اس وقت اماں اور چنبیلی کی فکر ستا رہی تھی۔ وہ دونوں غریب بے گھر ہو چکی تھیں اور اب نہ جانے کہاں کا رخ کرتیں۔

میں نے جنگل کی طرف دوڑ لگا دی۔ اغلب خیال یہی تھا کہ کیا خبر ان بے چاریوں نے اپنی جلی ہوئی جھونپڑی کا ہی رخ کیا ہو۔ میں خود چشم تصور میں ان دونوں کو اپنے خاکستر آشیانے کے سامنے حسرت زدہ نگاہوں سے تکتے دیکھتا اور کڑھتا رہا۔

جب سڑک پر آیا تو ایک سامنے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں رک گیا پھر جھاڑیوں میں دبک گیا۔ گاڑی قریب آ گئی۔ اس گاؤں میں گاڑی اور گھوڑے کا تصور صرف حویلی والوں کے لیے ہی کیا جا سکتا تھا۔ وہ کار تھی۔ میرا خیال تھا وہ تیزی سے گزر جائے گی لیکن وہ قریب آ کر رک گئی۔ میں نے جھاڑیوں سے ذرا گردن اچکا کر دیکھا اور بری طرح چونک پڑا۔

☆☆☆

کار میں مجھے ایک ہی فرد بیٹھا دکھائی دیا تھا جو اب دروازہ کھول کر باہر اتر آیا تھا۔ اس نے ایک چشمہ بھی ساتھ لگا رکھی تھی۔ وہ ادھر ادھر بڑی بے چینی سے نگاہیں دوڑا رہا تھا یوں جیسے اس نے شاید دور ہی سے کار کی روشنی میں میری جھلک دیکھ لی ہو۔ وہ چہرہ میں سامنے آ گیا۔

مطاہری تصویروں اور ... کی خون ریز سازشوں اور ذہم ذہم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

سیلی نے گوہر کی رسٹ سے دستی گھڑی نکالی۔
''ذرا بتاؤ تو اس وقت کتنے بجے ہوں گے؟''

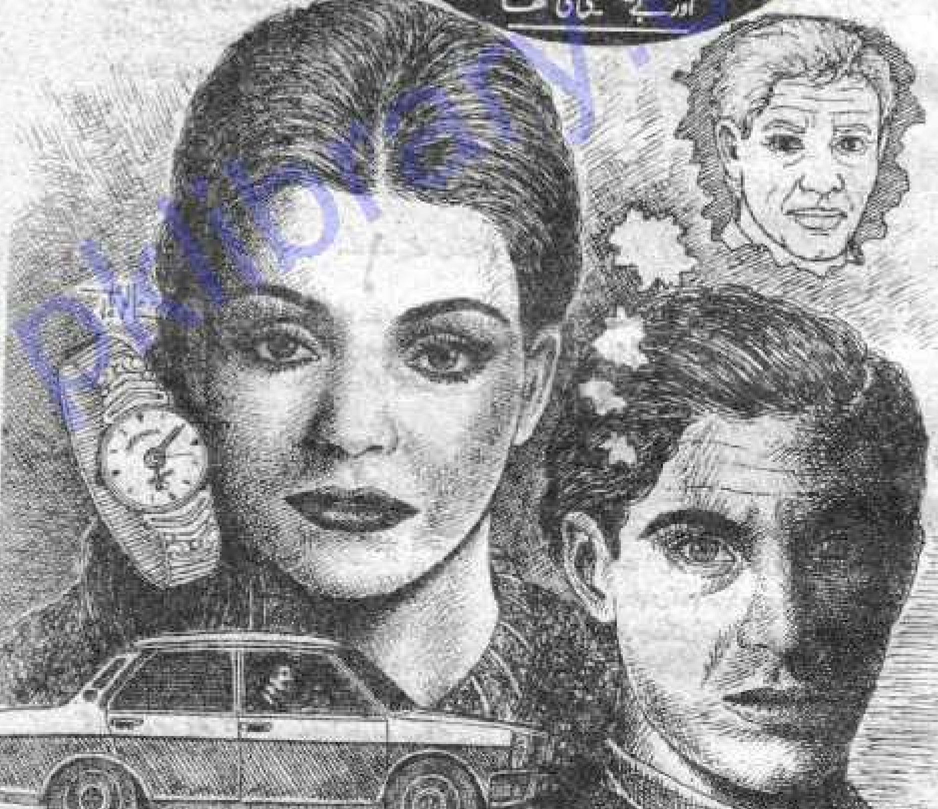
ہیڈی نے آنکھیں بند کرلیں۔ ''2:17... شرط۔''
اس نے خوش ہو کے تالیاں بجائیں۔ ''بالکل ٹھیک تم

قیمتی گھڑی

عائشہ نصیر

بے فکری سے وقت برباد کرنے والوں کو بعض اوقات گھڑی کی سوئیاں اپنے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور کردیتی ہیں... وہ جوڑا بھی وقت کے ایسے ہی پُراسرار گھن چکر میں آچکا تھا جس کا بھید کھولنے کی چابی کسی کے پاس نہیں تھی اور پھر وقت کے ایک خوفناک لمحے میں کچھ اس طرح قید ہوئے کہ آزادی پھر ان کا مقدر نہ بن سکی۔

گردشِ ایام کا شکار ایک جوڑے کی بے بسی
اور بے یقینی کی کتھا



نے لگاتار تیں بار وقت کا ایک دم ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔''

''یہ بس اتفاق ہے۔'' اس نے یوں کندھے اچکائے جیسے یہ اس کے لیے بہت معمولی بات ہو۔

یہ جون 1972ء کا ایک خوشگوار دن تھا اور وہ دونوں میموتھ کیو نیشنل پارک میں اپنے ہنی مون پر تھے۔ انہوں نے کئی گفٹ شاپس کی خاک چھانی جہاں سیلی نے اپنے پورے خاندان کے لیے تحائف خریدے۔ جب وہ واپس گاڑی میں آکر بیٹھے تو سیلی نے ایک بار پھر گھڑی نکالی۔

''وقت کا اندازہ لگاؤ اور دیکھو کہ کیا تم اس بار بھی ٹھیک ٹھیک وقت بتا پاؤ گے۔'' یہ اس کے لیے ایک دلچسپ مشغلے جیسا ہو گیا تھا۔

اس نے جنگل کی طرف دیکھا اور سوچ کر بولا۔

''5:35۔''

''آں... سوری اس بار تم چھ منٹ آگے نکل گئے اس میں 5:29 ہو رہے ہیں۔''

''یہ گھڑی چھ منٹ پیچھے ہے۔ ابھی یقیناً 5:35 ہی ہیں۔'' اس نے بغیر توقف کیے ریڈیو آن کیا اور سیلی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا جب اسی وقت ڈی جے نے بھی یہی اعلان کیا۔

''وقت ہو رہا ہے پانچ بج کر پینتیس منٹ۔''

''تم نے یہ کیسے کیا؟'' گھڑی ٹیڈی کو دیتے ہوئے وہ بے حد حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

''میں لکی ہوں کہ میرے اندازے ہمیشہ ٹھیک نکلتے ہیں۔'' وہ فخر سے مسکرایا۔

اسے اپنی قمیص کی جیب میں ڈالنے سے پہلے اس نے گھڑی چھ منٹ آگے کر دی۔

کچھ دیر بعد ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسے عجیب سا محسوس ہوا جیسے اردگرد کچھ تبدیلی سی آ گئی ہو۔ اس نے سیلی کی سمت دیکھا یہ پوچھنے کی خاطر کہ کیا اسے بھی کچھ مختلف لگ رہا ہے اور...... اس کے اعصاب جھنجھنا گئے۔

سیلی بوڑھی لگ رہی تھی۔ ان چند منٹوں میں ہی اس کی آنکھوں کے نیچے لکیریں نمودار ہو گئی تھیں جس سے وہ اپنی ماں کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سیلی کو نہیں چالیس کی دہائی میں ایک پکی عمر کی عورت کو دیکھ رہا تھا۔

لیکن وہ اور سیلی صرف بائیس سال کے تھے۔

تب ہی اس کا دھیان اپنی کار کی طرف گیا۔ یہ وہ کار نہیں تھی جسے تھوڑی دیر پہلے وہ چلا رہا تھا۔ وہ ایک ایسی کار چلا رہا تھا جس کی فور اسپیڈ مینوئل ٹرانسمیشن کا گیئر شفٹ لیور گاڑی کے فلور پر تھا لیکن اس کے فورڈ ماورک کے کالم پر تھری اسپیڈ تھی۔ یہ اس کی گاڑی نہیں تھی۔ گاڑیوں کے نئے ماڈل جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اس کے آگے پیچھے تیزی سے گزر رہے تھے۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟

سیلی نے ڈیش بورڈ پر ایک مکا مارا۔ ''دیکھو تم کیا کر رہے ہو۔ ریڈ لائٹ دیکھ کر بھی تم نے گاڑی نہیں روکی۔ کیا تم بھول گئے کہ تمہاری دونوں بیٹیاں پچھلی سیٹ پر ہیں اور تم انہیں ڈرا رہے ہو۔''

اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھی دو لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ ایک نو عمر اور ایک پری ٹین...... لیکن وہ اپنی سہاگ رات پر تھا۔

کیا یہ کسی قسم کا خواب تھا؟

وہ ایک ایسے گھر میں آیا جسے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ باقی سب گاڑی سے باہر نکل گئے لیکن وہ وہاں بیٹھا یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہوا کیا ہے۔

یہ ایسا ہی تھا جیسے چارلس ڈکنز کے ناول اے کیرل کرسمس میں جب مستقبل کا بھوت اسکروج کے پاس آیا تھا لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں ہر کوئی ٹھوس گوشت پوست سے بنا اور حقیقی لگ رہا تھا۔

سیلی نے گاڑی کی کھڑکی کے باہر دستک دی۔ وہ چونکا۔ وہ اپنے جھریوں بھرے چہرے کے ساتھ اسے خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی۔ ''صرف یہاں بیٹھے مت رہو، گروسری اتارو۔ میں قسم کھاتی ہوں تم دنیا کے سب سے سست آدمی ہو اور خوش قسمت بھی کہ میں نے ابھی تک تمہیں لات مار کر نکال باہر نہیں کیا۔ جب سے تمہاری نوکری گئی ہے تم نے کوئی ڈھنگ کی جاب تلاش کرنے کی زحمت نہیں کی۔''

وہ سونے کے وقت تک اپنے بارے میں اس کی ساری بکواس سنتا رہا۔ وہ اس سے فاصلے پر لیٹا تھا اور انہوں نے کوئی تعلق قائم نہیں کیا کیونکہ وہ اپنی ماں کی عمر کی کسی عورت سے پیار کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، چاہے وہ اس کی بیوی ہونے کا دعویٰ ہی کیوں نہ کر رہی ہو۔

سوتے وقت اس نے اپنی کلائی کی گھڑی نائٹ اسٹینڈ میں رکھ دی جہاں وہ ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا سکتا تھا لیکن اس نے اسے سیٹ نہیں کیا۔ وہ ایک ایسے بستر پر سویا جو اس نے پہلے کبھی استعمال نہیں کیا تھا اور آخری چیز جو اسے یاد تھی وہ سیلی کی گرفت تھی۔

☆☆☆

جب ٹیڈی جاگا تو اس نے خود کو اسی کیوپٹی کے موٹیل کے روم میں پایا اور سیلی ایک مختصر نائٹی میں اس کے پاس لیٹی تھی۔ ہمیشہ کی طرح جوان اور خوبصورت۔

شاید وہ ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ اس نے سوچا۔

ناشتے کے بعد وہ مونٹیری کے دورے پر گئے اور وہ اپنے پرانے ماورک کو اسی کالم شفٹ کے ساتھ چلا رہا تھا۔ سیلی نے گلوو کمپارٹمنٹ سے پھر اس کی گھڑی نکالی۔

"وقت کا اندازہ لگاؤ۔"

"11:57۔" وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

وہ ہنسی۔ "نہیں، اس میں 11:51 ہیں۔ مجھے لگتا ہے تمہاری گھڑی دوبارہ سست ہو گئی ہے۔"

"ہاں، اسے آگے کرنے کی ضرورت ہے۔"

سیلی نے ریڈیو آن کر دیا۔ اناؤنسر نے بھی 11:57 کا اعلان کیا۔ اس نے اسے گھڑی واپس کر دی۔ "ایسا لگتا ہے کہ تم نفسیاتی ہو یا کچھ اور۔"

خود کو تھوڑا سا بے وقوف محسوس کرتے ہوئے اس نے گھڑی چھ منٹ آگے کر دی۔

یہ بس چند لمحوں کی ہی بات تھی جب اس نے پلکیں جھپکائیں اور خود کو ایک عجیب و غریب کار چلاتے ہوئے پایا۔

وہ حیران تھا۔ کیا انہوں نے ایسی کاریں بھی بنائی تھیں؟ ڈیش بورڈ، اسپیس شپ ٹی وی اسکرین کی طرح لگتا تھا۔ اس نے سیلی کی طرف دیکھا لیکن وہ، وہ نہیں تھی۔

ایک عورت جسے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بال چھوٹے اور بھورے تھے۔ وہ کم از کم پچاس کی ہوگی۔ وہ اس کے ساتھ کیا کر رہا تھا؟

عورت نے اس کے کندھے پر چٹکی دی۔ "ٹیڈی! کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ میں جانتی ہوں کہ تم چائلڈ سپورٹ کی وجہ سے پریشان ہو اور تم نے لڑکیوں کی شادیوں کے لیے پیسے دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن تم دو دو جاب کر رہے ہو اور تمہارے پاس میرے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ مجھے تو لگتا ہے ہم کبھی شادی نہیں کر پائیں گے۔"

اس عمر کی کسی عورت سے شادی؟ لیکن اس نے ابھی ابھی سیلی سے شادی کی تھی۔ یہ پاگل پن تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنا دماغی توازن کھو رہا ہو۔

وہ ہال کے پار ایک اجنبی باتھ روم والے ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں آیا۔ واحد فرنیچر ایک گدا، صوفہ اور کمرے کی ایک فولڈنگ ٹیبل تھی۔ اس نے آئینے میں دیکھا۔ اس کے جو تھوڑے بہت بال رہ گئے تھے، وہ بھی

عورت ماہر ہوتی ہے

☆ ساس کے روپ میں...... بہو سے جھگڑا کرنے میں۔
☆ بیوی کے روپ میں...... ساری تنخواہ اپنی مٹھی میں کرنے میں۔
☆ منگیتر کے روپ میں...... بیلنس منگوانے میں۔
☆ فلم اسٹار کے روپ میں...... اپنی ڈیمانڈ بڑھانے میں۔
☆ نرس کے روپ میں...... تکلیف دینے میں۔
☆ وکیل کے روپ میں...... مقدمہ ہارنے میں۔
☆ ماں بننے کے روپ میں...... شوہر سے دیسی گھی منگوانے میں۔
☆ سہیلی کے روپ میں...... زبان چلانے میں۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

سفید تھے۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟

وہ اپنی گھڑی، اپنی شرٹ کی جیب میں رکھے صوفے پر سونے چلا گیا اور جب جاگا تو کیوپٹی کے موٹیل کے کمرے میں صوفے پر اٹھا۔

ایک نوجوان سیلی بیڈ پر بیٹھی تھی، اپنی خوبصورت ٹانگیں باہر لٹکائے اور اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"ہم اپنے ہنی مون پر ہیں ڈارلنگ مگر لگتا ہے تم یہ بات بھول گئے ہو۔" وہ اس کے صوفے پر سونے سے چڑی ہوئی لگ رہی تھی۔

اس نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور اسے وہ اداس اپارٹمنٹ یاد آیا جس میں اس نے رات گزاری تھی۔۔۔ ناممکن۔

سیلی نے پاس آ کر اس کا شانہ ہلایا۔ "میری طرف دیکھو۔ تم کہاں کھوئے ہو؟"

اس نے سوچا، اگر میں تمہیں بتاؤں تو تم مجھ پر یقین نہیں کرو گی بلکہ اسے خود بھی یقین نہیں تھا اس پر جو اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

اس دن وہ پکنک کے بہترین علاقے کو دریافت کرنے کے لیے پارک میں تھے۔ وہاں کئی ان گنت جگہوں کو سیلی نے مسترد کر دیا تھا۔ کچھ اسے گندی اور گیلی لگ رہی تھیں کچھ پر ہجوم اور باقی کی کچھ زیادہ ہی الگ تھلگ۔ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے کسی مناسب ٹیبل کی تلاش میں اس تنگ

سڑک پر گاڑی چلا رہا تھا اور اس کی شکایت سن رہا تھا۔ اس نے اچانک بریک پر پیر رکھا اور اس کی ماورک چلتے ہوئے ربڑ کی تیز بو کے ساتھ ایک جھٹکے سے رکی۔

"ٹیڈی! تم کیا کر رہے ہو؟ تمہارا موڈ آج کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔"

وہ ایک منٹ کے لیے خاموش رہا پھر بولا۔ "گاڑی سے نکلو۔"

سیلی نے آنکھیں گھمائیں۔ "لیکن میں نے ابھی تک مجھل سلیکٹ نہیں کی۔"

وہ مزید نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ وقت کے ساتھ اور خراب ہو رہی تھی۔ اسے ڈر تھا اس بار وہ اسی سالہ سیلی کو نہ دیکھے۔

"میں نے کہا میری گاڑی سے باہر نکلو...... ابھی!"

سیلی نے خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ گاڑی میری بھی ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ ہم شادی شدہ ہیں؟"

ٹیڈی نے اسے کار کے دروازے کی طرف دھکیلا۔

"میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ ہم شادی شدہ نہیں ہیں۔"

"تم پاگل ہو گئے ہو۔ میرے پاس میرج سرٹیفکیٹ ہے اور تم نے شادی کی قسم کھائی تھی۔" وہ خوفزدہ تھی اور اسے ہونے کا حق تھا۔

"یا تو میری گاڑی سے باہر نکلو...... یا میں خود تمہیں باہر پھینک دوں گا۔"

"لعنت ہو تم پر۔" سیلی نے اسے بازو میں مکا مارنے کی کوشش کی لیکن اس کا وزن صرف نوے پاؤنڈ تھا اور اس میں سے آدھا وزن تو اس کے ہیئر اسپرے کا تھا۔

وہ ہنسا۔ "اب تم مجھے غصہ دلا رہی ہو۔" وہ گاڑی سے نکل کر اس کی سائیڈ پر آیا۔

سیلی نے اپنی گھڑی کا شیشہ بچا لیا۔ "یہ کوئی مذاق کا وقت نہیں ہے۔ تم مجھے ڈرا رہے ہو۔"

اس نے دروازہ کھولا۔ "میں تمہیں ایک آخری موقع دے رہا ہوں، باہر نکلو۔"

سیلی نے بازو سینے پر باندھ لیے۔ "میں کہیں نہیں جا رہی۔"

ٹیڈی اس کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا لیکن وہ سیٹ کے کنارے پر چپک گئی۔ ٹیڈی نے پہلے اس کے ہاتھ پکڑے پھر اسے گاڑی سے باہر نکالا اور اسے گھاس کے ایک قطعے پر پھینک دیا۔

سیلی چیخنے لگی۔ اس نے پیچھے سے اسے لاتیں مارنے کی کوشش بھی کی مگر ٹیڈی دروازے کو لاک کرتے ہوئے بھاگا اور ڈرائیونگ سیٹ پر کود گیا۔ اس نے گیس کے پیڈل پر ٹھوکر ماری اور ٹائروں کی چرچراہٹ کی بھیانک آواز کے ساتھ گاڑی آگے بڑھا دی۔

چند فٹ کے فاصلے پر اسے گاڑی روکنا پڑی۔ آگے ڈیڈ اینڈ تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اسے پنگ گراؤنڈ سے باہر نکلنے کے لیے سیلی پر سے گزرنا پڑے گا۔ ایک تنگ دائرے میں گھومتے ہوئے اس نے ایکسلریٹر پر پیر رکھا۔ سیلی سامنے راستہ روکے کھڑی تھی۔ اپنے بازو لہراتے ہوئے چیخ رہی تھی جسے وہ کچھ نہیں پا رہا تھا۔ پھر اسے گھڑی یاد آئی۔

کچھ نہیں ہوگا۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ وہ سیلی سے جان چھڑا بھی لے تو بس گھڑی چھ منٹ آگے کرنے کی دیر ہے اور وہ مستقبل میں ہوگا جہاں پکڑے جانے کا کوئی خوف، کوئی خطرہ نہیں۔

ہانپتے ہوئے ٹیڈی نے پوری رفتار سے گاڑی آگے بڑھائی۔ سیلی کو آخری لمحے میں احساس ہوا کہ وہ رکنے والا نہیں تھا۔ وہ اس پر گاڑی چڑھانے جا رہا تھا۔ وہ چند سیکنڈز کے فرق سے گھاس میں گھس گئی لیکن وہ بھی اپنے دھندلے چکراتے دماغ کے ساتھ اسی گھاس میں گھس گیا۔

ان کی نظریں ایک لمحے کے لیے ملیں پھر اس کی گاڑی نے سیلی کے جسم کو ہوا میں اچھالا تھا اور ایک دھپ کی آواز کے ساتھ اس کا جسم اس کی ونڈ شیلڈ پر گرا۔ اس کی بے قابو ہوتی کار درخت سے ٹکرا گئی اور اس کا سینہ اسٹیئرنگ وہیل سے۔

اگرچہ اس کی گاڑی برباد ہو چکی تھی لیکن اب اسے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اس کی گھڑی کو دوبارہ موڑنے اور مستقبل کی طرف جانے کا وقت تھا جس میں کوئی سیلی یا بوڑھی عورت شامل نہیں تھی۔

اس نے اپنی شرٹ کے سامنے کی پاکٹ سے اسے نکالنے کی کوشش کی۔ اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے دبے ہونے کی وجہ سے ٹیڈی کو اس سے کافی زور آزمائی کرنا پڑی۔ چمڑے کے بینڈ سے اسے کھینچتے ہوئے گیئرز، اسپرنگس اور دھات کے ٹکڑے اس کی گود میں بکھر گئے۔

اس نے انہیں سمیٹنے کی بے سود کوشش کی لیکن اس کی قیمتی گھڑی اس کے اور اس کے اسٹیئرنگ وہیل کے درمیان دب کر چکنا چور ہو چکی تھی۔

"نو......" اس کے حلق سے نکلنے والی بے ساختہ چیخ دور دور تک گونجی۔

سیلی کے مُردہ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

⌘⌘⌘

جب نیند ٹوٹی/جاگا تو اس نے خود کو اسی کیونسی کے موٹیل کے بیڈروم میں پایا اور سیلی ایک مختصر نائٹی میں اس کے پاس لیٹی تھی۔ ہمیشہ کی طرح جوان اور خوب صورت۔

شاید وہ ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ اس نے سوچا۔

ناشتے کے بعد وہ میوتھ کو کے دورے پر گئے اور وہ اپنے پرانے ماورک کو اسی کالم شفٹ کے ساتھ چلا رہا تھا۔

سیلی نے گلوو کمپارٹمنٹ سے پھر اس کی گھڑی نکالی۔

"وقت کا اندازہ لگاؤ۔"

"11:57۔" وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

وہ ہنسی۔ "نہیں، اس میں 11:51 ہیں۔ مجھے لگتا ہے تمہاری گھڑی دوبارہ درست ہوگئی ہے۔"

"ہاں، اسے آگے کرنے کی ضرورت ہے۔"

سیلی نے ریڈیو آن کر دیا۔ اناؤنسر نے بھی 11:57 کا اعلان کیا۔ اس نے اسے گھڑی واپس کر دی۔ "ایسا لگتا ہے کہ تم نفسیاتی ہو یا کچھ اور۔"

خود کو تھوڑا بے وقوف محسوس کرتے ہوئے اس نے گھڑی چھ منٹ آگے کر دی۔

یہ بس چند لمحوں کی ہی بات تھی جب اس نے پلکیں جھپکائیں اور خود کو ایک عجیب و غریب کار چلاتے ہوئے پایا۔

وہ حیران تھا۔ کیا انہوں نے ایسی کاریں بھی بنائی تھیں؟ ڈیش بورڈ، اسپیس شپ ٹی وی اسکرین کی طرح لگتا تھا۔ اس نے سیلی کی طرف دیکھا لیکن وہ وہ نہیں تھی۔

ایک عورت جسے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بال چھوٹے اور بھورے تھے۔ وہ کم از کم پچاس کی ہوگی۔ وہ اس کے ساتھ کیا کر رہا تھا؟

عورت نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "نیڈی! کیا تم میری بات سن رہے ہو؟ میں جانتی ہوں کہ تم چائلڈ سپورٹ کی وجہ سے پریشان ہو اور تم نے لڑکیوں کی شادیوں کے لیے پیسے دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن تم دو دو جاب کر رہے ہو اور تمہارے پاس میرے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ مجھے تو لگتا ہے ہم کبھی شادی نہیں کر پائیں گے۔"

اس عمر کی کسی عورت سے شادی؟ لیکن اس نے ابھی ابھی سیلی سے شادی کی تھی۔ یہ پاگل پن تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اپنا دماغی توازن کھو رہا ہو۔

وہ ہال کے پار ایک اداس سی باتھ روم والے ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں آیا۔ واحد فرنیچر ایک گندا صوفہ اور گتے کی ایک فولڈنگ ٹیبل تھی۔ اس نے آئینے میں دیکھا۔ اس کے جو تھوڑے بہت بال رہ گئے تھے، وہ بھی

عورت ماہر ہوتی ہے

☆ساس کے روپ میں..... بہو سے جھگڑا کرنے میں۔
☆بیوی کے روپ میں..... ساری تنخواہ اپنی مٹھی میں کرنے میں۔
☆منگیتر کے روپ میں..... بیلنس منگوانے میں۔
☆فلم اسٹار کے روپ میں..... اپنی ادائیں دکھانے میں۔
☆نرس کے روپ میں..... تکلیف دینے میں۔
☆وکیل کے روپ میں..... مقدمہ ہارنے میں۔
☆ماں بیٹے کے روپ میں..... شوہر سے دیسی گھی منگوانے میں۔
☆سہیلی کے روپ میں..... زبان چلانے میں۔
(مرسلہ: محمد انور ندیم، حویلی لکھا، اوکاڑہ)

سفید تھے۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟

وہ اپنی گھڑی، اپنی شرٹ کی جیب میں رکھے صوفے پر سونے چلا گیا اور جب جاگا تو کیونسی کے موٹیل کے کمرے میں صوفے پر اٹھا۔

ایک نوجوان سیلی بیڈ پر بیٹھی تھی، اپنی خوب صورت ٹانگیں بیڈ سے لٹکائے اور اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

"ہم اپنے ہنی مون پر ہیں ڈارلنگ مگر لگتا ہے تم یہ بات بھول گئے ہو۔" وہ اس کے صوفے پر سونے سے چڑی ہوئی لگ رہی تھی۔

اس نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور اسے وہ اداس اپارٹمنٹ یاد آیا جس میں اس نے رات گزاری تھی..... ناممکن۔

سیلی نے پاس آکر اس کا شانہ ہلایا۔ "میری طرف دیکھو۔ تم کہاں کھوئے ہو؟"

اس نے سوچا، اگر میں تمہیں بتاؤں تو تم مجھ پر یقین نہیں کرو گی بلکہ اسے خود بھی یقین نہیں تھا اس پر جو اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔

اس دن وہ پکنک کے بہترین علاقے کو دریافت کرنے کے لیے پارک میں تھے۔ وہاں لگی ان گنت ٹیبلوں کو سیلی نے مسترد کر دیا تھا۔ کچھ اسے گندی اور گیلی لگ رہی تھیں، کچھ پرہجوم اور باقی کی کچھ زیادہ ہی الگ تھلگ..... وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے کسی مناسب ٹیبل کی تلاش میں اس تنگ

نے لگاتار تین بار وقت کا ایک دم ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔"

"یہ بس اتفاق ہے۔" اس نے یوں کندھے اچکائے جیسے یہ اس کے لیے بہت معمولی بات ہو۔

یہ جون 1972ء کا ایک خوشگوار دن تھا اور وہ دونوں یموتھ کے جنگل پارک میں اپنے ہنی مون پر تھے۔ انہوں نے کئی گفٹ شاپس کی خاک چھانی جہاں سیلی نے اپنے پورے خاندان کے لیے تحائف خریدے۔ جب وہ واپس گاڑی میں آکر بیٹھے تو سیلی نے ایک بار پھر گھڑی نکالی۔

"وقت کا اندازہ لگاؤ اور دیکھو کہ کیا تم اس بار بھی ٹھیک ٹھیک وقت بتا پاؤ گے۔" یہ اس کے لیے ایک دلچسپ مشغلے جیسا ہو گیا تھا۔

اس نے جنگل کی طرف دیکھا اور سوچ کر بولا۔

"5:35۔"

"آہ..... سوری اس بار تم چھ منٹ آگے نکل گئے اس میں 5:29 ہو رہے ہیں۔"

"یہ گھڑی چھ منٹ پیچھے ہے۔ ابھی یقیناً 5:35 ہی ہیں۔" اس نے بغیر توقف کے ریڈیو آن کیا اور سیلی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا جب اسی وقت ڈی جے نے بھی یہی اعلان کیا۔

"وقت ہو رہا ہے پانچ بج کر پینتیس منٹ۔"

"تم نے یہ کیسے کیا؟" گھڑی ٹیڈی کو دیتے ہوئے وہ بے حد حیرانی سے پوچھ رہی تھی۔

"میں کہتی ہوں کہ میرے اندازے ہمیشہ ٹھیک نکلتے ہیں۔" وہ فخر سے مسکرایا۔

اسے اپنی قمیص کی جیب میں ڈالنے سے پہلے اس نے گھڑی چھ منٹ آگے کر دی۔

کچھ دیر بعد ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسے عجیب سا محسوس ہوا جیسے اردگرد کچھ تبدیلی سی آ گئی ہو۔ اس نے سیلی کی سمت دیکھا یہ پوچھنے کی خاطر کہ کیا اسے بھی کچھ مختلف لگ رہا ہے اور..... اس کے اعصاب جھنجھنا گئے۔

سیلی بوڑھی لگ رہی تھی۔ ان چند منٹوں میں ہی اس کی آنکھوں کے نیچے لکیریں نمودار ہو گئی تھیں جس سے وہ اپنی ماں کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سیلی کو نہیں چالیس کی دہائی میں ایک پکی عمر کی عورت کو دیکھ رہا تھا۔

لیکن وہ اور سیلی صرف بائیس سال کے تھے۔

تب ہی اس کا دھیان اپنی کار کی طرف گیا۔ یہ وہ کار نہیں تھی جسے تھوڑی دیر پہلے وہ چلا رہا تھا۔ وہ ایک ایسی کار چلا رہا تھا جس کی فور اسپیڈ مینوئل ٹرانسمیشن کا گیئر شفٹ لیور گاڑی کے فلور پر تھا لیکن اس کے فورڈ ماورک کے کالم پر تھری اسپیڈ تھی۔ یہ اس کی گاڑی نہیں تھی۔ گاڑیوں کے نئے ماڈل جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اس کے آگے پیچھے تیزی سے گزر رہے تھے۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟

سیلی نے ڈیش بورڈ پر ایک مکا مارا۔ "دیکھو تم کیا کر رہے ہو۔ ریڈ لائٹ دیکھ کر بھی تم نے گاڑی نہیں روکی۔ کیا تم بھول گئے کہ تمہاری دونوں بیٹیاں پچھلی سیٹ پر ہیں اور تم انہیں ڈرا رہے ہو۔"

اس نے پچھلی سیٹ پر بیٹھی دو لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ ایک نوعمر اور ایک پر بچپن..... لیکن وہ اپنی سہاگ رات پر تھا۔

کیا یہ کسی قسم کا خواب تھا؟

وہ ایک ایسے گھر میں آیا جسے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ باقی سب گاڑی سے باہر نکل گئے لیکن وہ وہاں بیٹھا یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہوا کیا ہے۔

یہ ایسا ہی تھا جیسے چارلس ڈکنز کے ناول آ کیرل کرسمس میں جب مستقبل کا بھوت اسکروج کے پاس آیا تھا لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں ہر کوئی ٹھوس گوشت پوست سے بنا اور حقیقی لگ رہا تھا۔

سیلی نے گاڑی کی کھڑکی کے باہر دستک دی۔ وہ چونکا۔

وہ اپنے جھریوں بھرے چہرے کے ساتھ اسے خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی۔ "صرف یہاں بیٹھے مت رہو، گروسری اتارو۔ میں قسم کھاتی ہوں تم دنیا کے سب سے سست آدمی ہو اور خوش قسمت بھی کہ میں نے ابھی تک تمہیں لات مار کر نکال باہر نہیں کیا۔ جب سے تمہاری نوکری گئی ہے تم نے کوئی ڈھنگ کی جاب تلاش تک کرنے کی زحمت نہیں کی۔"

وہ سونے کے وقت تک اپنے بارے میں اس کی ساری بکواس سنتا رہا۔ وہ اس سے فاصلے پر لیٹا تھا اور انہوں نے کوئی تعلق قائم نہیں کیا کیونکہ وہ اپنی ماں کی عمر کی کسی عورت سے پیار کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، چاہے وہ اس کی بیوی ہونے کا دعویٰ ہی کیوں نہ کر رہی ہو۔

سوتے وقت اس نے اپنی کلائی کی گھڑی نائٹ اسٹینڈ میں رکھ دی جہاں وہ ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا سکتا تھا لیکن اس نے اسے سیٹ نہیں کیا۔ وہ ایک ایسے بستر پر سویا جو اس نے پہلے کبھی استعمال نہیں کیا تھا اور آخری چیز جو اسے یاد تھی وہ سیلی کی گرفت تھی۔

☆☆☆

پر نقصانات اپنی جگہ لیکن اب بھگوڑوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا تھا جس کا جنرل لیسی پر یہ اثر ہوا کہ وہ صلح پر آمادہ ہو گیا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ راہ فرار اختیار کرنے والے روسی سپاہی ثابت قدم اور گوریلا جنگ کے ماہر مجاہدوں کا زیادہ عرصے مقابلہ نہیں کر سکتے۔

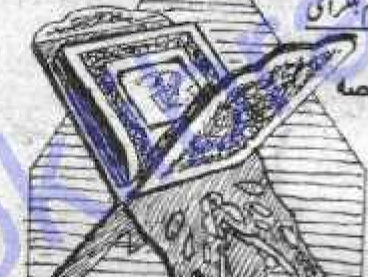
اٹھارہویں صدی کا آخری عشرہ کئی بڑی شخصیات کے حوالے سے بہت یادگار رہا ہے۔ اسی عشرے کے پیدا ہونے والوں نے روس کے ایک خاص طبقے کے خلاف آواز بلند کی اور داغستان اور قفقاز کے مسلمانوں میں اسلامی روح پیدا کی۔ بے وسیلہ اور بے یار و مددگار یہ لوگ تقریباً تیس پینتیس سال تک روس کا مقابلہ کرتے رہے۔ وہ اپنی کوششوں میں کتنے کامیاب ہوئے، یہ ایک علیحدہ سوال ہے اور اس کا جواب ہنوز ہمیں نہیں ملا لیکن جب ہم چیچنیا میں مسلمانوں کو روس سے برسرِ پیکار دیکھتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے خاکستر کی یہی وہ چنگاری ہے جو 1859ء میں دب گئی تھی۔ سر پھرے اور سروں کو ہتھیلیوں پر لیے پھرنے والوں کی داستان۔ اللہ والے جو اللہ کے نام پر مر مٹے۔

مجاہدین کے حوالے سے امام شامل کی کاوشیں۔ گوریلا جنگ کے ماہر اور پہلے مسلمان گوریلا جنرل کی داستان

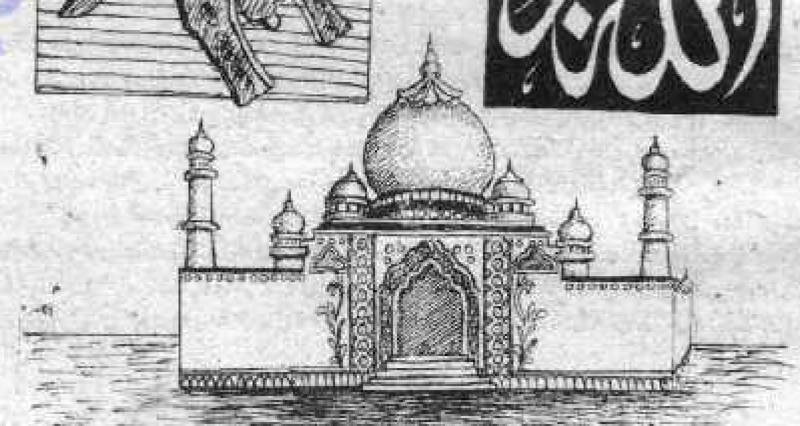
چیچنیا کا عقاب

ضیا تسنیم بلگرامی

تیسرا حصہ







جنرل فیسی نے امام شامل کو صلح کا پیغام بھیجا کہ وہ امام شامل کے اقتدار کو تسلیم کرنے لگا اگر امام شامل اور ان کے ساتھی یہ یقین دلا دیں کہ دونوں میں جو صلح اور معاہدہ ہوگا اس کے مطابق مجاہدین روسیوں کے خلاف کوئی بھی جنگی کارروائی نہیں کریں گے۔

امام شامل اور ان کے ساتھی اس پیغام صلح پر غور کرنے پر اس لیے مائل ہوئے کہ انہیں روسیوں سے جنگ کرنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا اور وہ موجودہ بے سروسامانی کی حالت میں روسی فوج کا مقابلہ زیادہ عرصے تک نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں ہتھیار درکار تھے۔ توپ خانے کی ضرورت تھی۔ خاصی بڑی تعداد میں مجاہد مطلوب تھے۔ ان مجاہدوں کو فوجی تربیت دینا تھی اور ان تمام باتوں کے لیے وقت درکار تھا۔ ان حالات میں جنرل فیسی کی طرف سے صلح کی خواہش اور پیشکش بہت غنیمت تھی۔

امام شامل نے جب یہ گفتگو آگے بڑھائی تو جنرل فیسی نے اپنی برتری برقرار رکھنے کے لیے اور روسی شہنشاہ نکولائی کو مطمئن کرنے کے لیے شرائط صلح میں یہ شرط بھی شامل کر دی کہ دونوں میں جو معاہدہ ہو رہا ہے اس میں جنرل فیسی کو اس وقت تک اطمینان حاصل نہیں ہوگا جب تک امام شامل کی طرف سے کوئی ضمانت نہ دی جائے کہ وہ اس پر دیانت داری سے عمل کریں گے۔

امام شامل نے جنرل فیسی سے یہ معلوم کیا کہ وہ کس طرح یقین کرے گا کہ امام شامل اور اس کے ساتھی اس معاہدے پر ایمانداری سے عمل کرتے رہیں گے۔

جنرل فیسی نے جواب میں کہلوایا۔ ”ہمیں امام شامل اور ان کے دونوں ساتھیوں کی طرف سے تین یرغمالی درکار ہوں گے۔ یہ تینوں ضمانت کے طور پر ہمارے پاس رہیں گے۔“

امام شامل نے جواب میں جنرل فیسی کے آدمی سے کہا۔ ”اب یہ معاہدہ میرے لیے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ ضمانت میں اپنے تین یرغمالی جنرل فیسی کے حوالے کرنے کا یہ مطلب ہوگا کہ میں نے روسیوں سے دب کر صلح کر لی ہے۔“

جنرل فیسی نے امام شامل سے عاجزانہ درخواست کی۔ ”آپ میرا یہ مطالبہ میری درخواست سمجھ کر مان لیں کیونکہ میں جو اتنا بڑا اقدام اٹھا رہا ہوں تو مجھے اس کے لیے اپنے شہنشاہ نکولائی کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا لیکن جب وہ یہ دیکھے گا کہ میں نے آپ سے اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے تین یرغمالی حاصل کر لیے ہیں تو مجھے اپنے شہنشاہ نکولائی کی نظروں میں سرخروئی حاصل ہو جائے گی۔“

امام شامل نے اس سلسلے میں دو خط لکھے۔ ایک کی عبارت تھی۔

”امام شامل، دنا شوف حاجی، کیبت ماہوما، کارازی کے عبدالرحمٰن محمد مرزا وکی اور داغستان کے دیگر علما اور معززین کی طرف سے روسی شہنشاہ سے یہ صلح کا معاہدہ کر رہے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ کوئی بھی فریق دوسرے کو معمولی سا نقصان بھی نہیں پہنچائے گا۔ کسی فریق نے اپنا وعدہ توڑا تو اسے وعدہ شکنی کا مرتکب قرار دیا جائے گا اور وعدہ شکن لوگ اللہ اور اس کی مخلوق کے سامنے ملعون قرار پاتے ہیں۔

”ہم نے اپنی طرف سے محمد مرزا خان کو یرغمالی کے طور پر روسی حکومت کے حوالے کر دیا ہے کہ یہ یقین ہو کہ ہم اس معاہدے کی پابندی کریں گے اور ہمارے اس خط اور طریقے سے ہمارے ارادوں کے درست ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔“

جنرل فیسی نے اس خط اور یرغمالی کو اپنے قبضے میں کیا اور امام شامل کو مطلع کیا۔ ”جناب! اتنے فریقین کی طرف سے صرف ایک یرغمالی روسی شہنشاہ کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا اس لیے مناسب ہوگا کہ امام شامل کی طرف سے بھی کوئی یرغمالی ہو بلکہ کیبت ماہوما اور کارازی کے عبدالرحمٰن کی طرف سے بھی ایک ایک یرغمالی ہمارے حوالے کیا جائے۔“

امام شامل کو جنرل فیسی کی یہ میں میکھ اور ہیر پھیر کی پالیسی پسند نہیں آ رہی تھی لیکن اپنا ایک آدمی جنرل فیسی کے قبضے میں تھا اور امام شامل کے ساتھی بھی تیاریوں کے لیے وقت چاہتے تھے اور اصرار کر رہے تھے کہ فی الحال یہ معاہدہ بہت ضروری ہے۔

چنانچہ امام شامل نے معاہدے کا ایک دوسرا خط لکھا۔

”یہ خط روسی شہنشاہ نکولائی اور بندہ عاجز شامل کے درمیان معاہدۂ امن کی وضاحت کرتا ہے۔ اس معاہدۂ امن کے ساتھ محمد مرزا خان کے علاوہ شامل کی طرف سے اس کا چچازاد بھائی، کیبت ماہوما کی طرف سے اس کا چچازاد بھائی، کارازی کے عبدالرحمٰن کی طرف سے اس کا بیٹا۔ یہ تینوں بھی یرغمالی کے طور پر روسی حکومت کے حوالے کیے گئے ہیں تاکہ یہ معاہدہ دیرپا ہو۔ کوئی فریق کسی قسم کی زیادتی اور بدعہدی کا مرتکب نہ ہوگا کیونکہ بدعہدی کرنے والے اللہ اور اس کی مخلوق کے نزدیک ذلیل اور ملعون ہیں۔“

اب روسی فوج کو واپسی اختیار کرنا تھی۔

جنرل فیسی نے اپنی اس کارروائی کی تفصیل کچھ اس طرح لکھ کر ماسکو روانہ کی جیسے اس نے مجاہدوں کو بالکل ختم کردیا تھا اور امام شامل نے روسی حکومت کی تابعداری قبول کرلی تھی۔

روس میں ہر طرف جنرل فیسی کی واہ واہ ہونے لگی۔ سابق جنرل گلنکو داغستان کے معرکے میں اپنی ایک ٹانگ ناکارہ کرچکا تھا اور اب وہ بیساکھی کے سہارے چل پھر رہا تھا۔ اسے جنرل فیسی کی کامیابی پر نہ صرف رشک آیا بلکہ تکلیف بھی پہنچی کہ جو کام اس کے ہاتھوں ہونا چاہیے تھا اسے جنرل فیسی نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

نکولائی اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ وہ قفقاز کا دورہ کرنا چاہتا تھا۔ امام شامل نے ابھی تک روسی شہنشاہ کی اطاعت قبول نہیں کی تھی جبکہ روسی شہنشاہ واضح طور پر امام شامل کی طرف سے اطاعت گزاری کے الفاظ سننا چاہتا تھا۔

شہنشاہ نے جنرل فیسی کو مطلع کیا کہ وہ عنقریب طفلس کا دورہ کرے گا۔ یہاں امام شامل کو ایک اطاعت گزار کی حیثیت سے شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے۔

جنرل فیسی اور اس کے ساتھی تھکن سے نکلنے کی فکر میں تھے۔ ٹرانسپورٹ مفقود تھی۔ یہاں تک کہ گھوڑوں کی بھی بڑی تعداد ہلاک ہوچکی تھی۔ گولہ بارود بھی ختم ہوچکا تھا۔ پہاڑیوں پر اترنے چڑھنے اور ناہموار راستوں پر مسلسل سفر کرتے رہنے کی وجہ سے جوتے پھٹ چکے تھے اور اکثریت برہنہ پا ہوچکی تھی۔ لباس تار تار تھا اور سپاہی چیتھڑے لگائے پھر رہے تھے۔

اب امام شامل آزادی سے اشیلٹا میں داخل ہوئے۔ انہیں یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ اشیلٹا کھنڈر بن چکا تھا۔ کبھی یہاں پانچ سو گھر ہوا کرتے تھے، اب وہاں ایک مکان بھی نہیں تھا۔ انگوروں کی بیلیں اور باغات جل چکے تھے۔ جس مسجد میں امام شامل کی امامت کا اعلان کیا گیا تھا وہ برباد ہوچکی تھی۔

اسی عالم میں امام شامل کو مطلع کیا گیا کہ شہنشاہ نکولائی موسم سرما میں قفقاز کے دورے پر آرہا ہے۔ اس موقع پر قفقاز میں امن وامان بحال رہنا چاہیے۔

ماسکو سے جنرل فیسی کو خفیہ ہدایات موصول ہوئیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو، امام شامل کو آمادہ کیا جائے کہ وہ شہنشاہ کے دورے کے دوران جس جگہ مناسب سمجھے، اپنی سابقہ زیادتیوں کی شہنشاہ نکولائی سے معافی مانگے اور یہ ضمانت دے کہ آئندہ کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہوگی۔

اس وقت جنرل فیسی جنوبی داغستان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جنرل گلنکو مقامی رسم و رواج سے اچھی طرح واقف ہے۔ بہادری کے ساتھ چالاکی میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ چنانچہ امام شامل سے گفتگو کرنے کے لیے جنرل گلنکو کی خدمات حاصل کی گئیں۔

جنرل گلنکو، امام شامل کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا اور اسے یقین نہیں تھا کہ امام شامل یہ ذلت گوارا کرلیں گے مگر شہنشاہ کے لیے یہ خدمت انجام دینا تھی۔ وہ حکم ملتے ہی علاقے کے پنچوں اور ضمیر فروش سرداروں سے خط و کتابت میں مشغول ہوگیا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ امام شامل سے اس کی ملاقات کروادی جائے۔ باقی معاملات وہ خود طے کرے گا۔

یہ ضمیر فروش امام شامل کو جنرل گلنکو سے ملاقات کرنے پر آمادہ کرنے لگے۔

امام شامل کے سامنے بھی ایک مسئلہ تھا کہ وہ فی الحال امن چاہتے تھے کیونکہ بے سروسامانی کی حالت میں جنگ چھیڑ کر وہ داغستان کے مسلمانوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے کی ذمے داری لینے کو تیار نہ تھے۔

18 ستمبر کو ایک چشمے کے قریب دونوں کی ملاقات طے پائی۔

اس وقت گلنکو کے ہمراہ ڈوگموف نامی ایک افسر، پندرہ کازک سپاہی اور کرسائی کے دس مقامی تھے۔ چشمے پر امام شامل دو سو مسلح افراد کے ساتھ پہلے سے موجود تھے۔

جنرل گلنکو نے ان مسلح افراد کو دیکھا اور اپنے ساتھیوں میں سے ایک مقامی شخص کو اشارے سے قریب بلایا۔ ”تُو ہمارا مترجم ہے۔ امام شامل سے کہہ کہ میں تیرے ساتھ سامنے ٹیلے پر جارہا ہوں۔ امام شامل بھی اپنے ساتھیوں کو یہیں چھوڑ دیں اور ٹیلے پر تنہا آجائیں۔ وہاں گفتگو ہوجائے گی۔“

امام شامل نے مترجم سے کہا۔ ”گلنکو سے کہہ کہ اگر مترجم ان کی مرضی سے مقرر ہوگا اور جب دونوں طرف بے اطمینانی ہو تو کوئی کسی پر اعتبار نہیں کرسکتا اس لیے میرے ساتھ بھی تین آدمی ٹیلے پر جائیں گے۔“

جنرل کلنکو کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے بعد جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“

اس کے بعد یہ چھ آدمی ٹیلے پر پہنچ گئے اور چشمے کے کنارے امام شامل کے مسلح سپاہیوں نے بآواز بلند قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔

ماحول پر دبدبہ اور وحشت طاری ہو گئی۔ ایک طرف روسی فوجی تھے جن کا جنرل مجاہدین سے کئی زخم کھا چکا تھا۔ بیساکھی کے سہارے چل رہا تھا اور چہرے پر بھی گولی کے زخم کا نشان موجود تھا۔ دوسری طرف مجاہد تھے، ان کی عبائیں تھیں، تلاوت کلام پاک کی آوازیں تھیں اور چشمے کی آواز تھی۔

روسی جنرل اور امام شامل نہایت احتیاط سے سوچ سوچ کر لفظوں کا انتخاب کر رہے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ یہاں جو لفظ استعمال ہوں گے، ان کے اثرات دونوں کو فائدہ بھی پہنچا سکتے ہیں اور نقصان بھی۔ اس گفتگو کے بعد امن برقرار رہ سکتا ہے اور جنگ بھی چھڑ سکتی ہے۔

روسی جنرل، شہنشاہ نکولائی کے حق میں دلائل دیے جا رہا تھا اور ترغیب و تحریص کے ذریعے امام شامل کو اطاعت پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

امام شامل، روسی جنرل کی گفتگو کے دوران نہایت مطمئن اور بظاہر پُرامید نظر آتے رہے جس سے جنرل کلنکو کو اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا لیکن خلاف امید امام شامل نے روسی جنرل سے کہا۔ ”میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیے بغیر کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتا۔“

روسی جنرل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”بہتر ہے آپ مشورہ کر لیں اور اپنے ساتھیوں کو بتا دیں کہ شہنشاہ نکولائی کے طفلس آنے پر آپ کی شاہی دربار میں حاضری بہت ضروری ہے۔ اس سے روسی حکومت کو آپ کی دوستی اور وفاداری کا یقین ہو جائے گا۔ رہ گئی جنگ، تو مجاہدین کو اپنے محدود وسائل پر نظر رکھنی چاہیے۔ جنگ جلد ختم ہو یا طول پکڑ جائے، اس کا نقصان مسلمان ہی اٹھائیں گے کیونکہ روس بہت بڑا ملک ہے، فوج بھی بہت بڑی ہے اور فوجی مہارت بھی رکھتی ہے۔ اس کے پاس وسائل کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ یہ جنگ برسوں لڑ سکتے ہیں لیکن آپ اس جنگ کے زیادہ دنوں تک متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ ساری جنگیں آپ کی اپنی زمینوں پر لڑی جائیں گی۔ ہمارا جانی نقصان ہوگا اور سامان جنگ ضائع ہوگا جبکہ یہاں کی جنگوں میں آپ لوگ بھی مارے جائیں گے، سامان جنگ بھی ضائع ہوگا، شہر اور قصبات بھی برباد ہوں گے اور ان کی دوبارہ تعمیر و ترقی مشکل ہو جائے گی جس سے آپ کی معیشت زوال پذیر رہے گی اور رہ گیا جذبۂ جہاد اور حریت پسندی تو یہ ہوشمندی کا تقاضا کرتے ہیں۔ اعلیٰ نصب العین کے لیے اعلیٰ دانائی اور اعلیٰ قیادت بھی ضروری عناصر ہیں۔ آپ یہ ساری باتیں اپنے ساتھیوں کو بتائیں اور انہیں قائل کریں کہ وہ ہماری پیشکش سے فائدہ اٹھائیں۔ روس کی دوستی سے آپ کے علاقے کو بہت زیادہ فائدے پہنچیں گے۔“

بظاہر اس خوشگوار فضا میں امام شامل اٹھے اور جنرل کلنکو نے رخصت ہونے سے پہلے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

امام شامل نے بھی بے خیالی میں ہاتھ ملانا چاہا لیکن ان کے ساتھ آئے ہوئے تین ساتھیوں میں سرخائی خان نامی ایک پُرجوش عقیدت مند بھی تھا۔ اس نے امام شامل کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ ”جناب! یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ مجاہدوں اور مومنوں کا راہنما، کافر کا ہاتھ پکڑے۔“

جنرل کلنکو اپنی اس بےعزتی پر بےقابو ہو گیا اور اس نے اپنی بیساکھی سے سرخائی خان کی پگڑی کو اچھال دینا چاہا۔

امام شامل ان دونوں کے درمیان آ گئے۔ انھوں نے ایک ہاتھ سے روسی جنرل کی بیساکھی کو پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے سرخائی خان کی وہ کلائی پکڑ لی جس کا وار کلنکو پر ہونے والا تھا اور خنجر والا ہاتھ کسی قدر فضا میں بلند ہو چکا تھا۔

یہ خطرناک منظر دور سے مجاہدین بھی دیکھ رہے تھے اور روسی سپاہی بھی۔ روسی افسر وولکوف نے اپنے جنرل کو اس حال میں دیکھا کہ اس کی بیساکھی امام شامل نے پکڑ لی ہے اور دوسری طرف ایک مسلمان مجاہد اپنا خنجر والا ہاتھ بلند کیے ہوئے ہے تو وہ پریشان ہو گیا۔

اب ایک طرف سے مسلمان مجاہد آگے بڑھ رہے تھے اور دوسری طرف سے روسی سپاہی حرکت میں آ چکے تھے۔ جنرل کلنکو سرخائی خان کو مسلسل گالیاں دیے جا رہا تھا۔

امام شامل نے آگے بڑھتے ہوئے مجاہدین کو للکار کر روک دیا اور وولکوف تیزی سے جنرل کلنکو کے پاس آیا اور اس کو

کالر سے پکڑ کر اس مخدوش فضا سے واپس لے گیا۔ گفتگو کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔ گفتگو شورا واپس چلا گیا اور امام شامل نے غمری کی راہ لی۔

کچھ عرصے بعد امام شامل کو جنرل گفتگو کا ایک طویل خط موصول ہوا۔ اس خط میں وہی تمام باتیں دہرائی گئی تھیں جو زبانی ہو چکی تھیں اور امام شامل کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ اپنے ان عاقبت نااندیش ساتھیوں کے اثر سے نجات حاصل کریں۔

جنرل گفتگو کا خیال تھا کہ امام شامل نے اس کی ساری باتیں دل سے مان لی تھیں اور اگر سرخائی خان بے جا دخل نہ دیتا تو معاملہ بن جاتا مگر کچھ عرصے بعد امام شامل کا غیر متوقع جواب جنرل گفتگو کو ملا گیا۔

”اس خط کا مصنف اور کاتب اپنے تمام معاملات اللہ پر چھوڑتا ہے۔ آج 28 ستمبر 1837ء کو یہ خط آپ کو اطلاع کے طور پر لکھا جا رہا ہے کہ میں نے شہنشاہ نکولائی کی آمد پر تفلس نہ جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے بالکل یہ خوف نہیں کہ اس انکار سے میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاؤں گا کیونکہ مجھے آپ کی بدعہدی کا تجربہ حاصل ہے اور آپ کی اس خوبی سے پوری دنیا آگاہ ہے۔“

امام شامل نے جواب دینے کے بعد اپنا وقت ضائع نہیں کیا اور جنگی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ مورچہ بندیاں ہونے لگیں۔ دوسری طرف روسی حکومت بھی کچھ عرصے تک بظاہر خاموش ایک فیصلہ کن حملے کی تیاری کرتی رہی۔ لائق جنرلوں نے کئی طرف سے حملہ کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ ان کے مخبر امام شامل کے علاقوں میں موجود تھے جو مسلمانوں کی تیاریوں اور ان کی دفاعی کوششوں کی خبریں نہایت پابندی سے روسیوں کو پہنچا رہے تھے لیکن بعد میں تجربے نے روسی فوجیوں کو یہ بتا دیا کہ ان کے مخبر زیادہ بھروسے مند اور مستعد نہیں تھے کیونکہ جب مسلمانوں پر تین اطراف سے حملہ کیا گیا تو خوفناک جنگ ہوئی۔ روسیوں کو خاصا نقصان پہنچا۔ یہ جنگ برابر کی نہیں تھی۔ روسی اپنی زیادہ نفری اور اعلیٰ وسائل جنگ سے اپنے سے کمتر وسائل رکھنے والے کم تعداد اور بے ترتیب لوگوں سے جنگ لڑ رہے تھے۔

30 مئی کو روسی توپ خانے نے بھرپور حملہ کیا۔ جنگ نہایت شدت سے ہوتی رہی۔ دوسرے دن صبح روسیوں کو کمک حاصل ہو گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ روسی مسلمانوں کی آبادیوں میں داخل ہو گئے۔ گھروں کے مورچوں میں آتش گیر مادہ پھینکا جانے لگا۔

مسلمانوں نے راستے کے پل تباہ کر دیے تھے جس سے روسیوں کا پیچھے سے رابطہ منقطع ہو گیا اور سپاہیوں کو غذا بھی نہ مل سکی۔

روسی فوج رسوں کی مدد سے دریا کو عبور کرنے لگی۔ چھپتے ہوئے روسی سپاہیوں کو سخت پہنچائے گئے۔

مسلمانوں کا بھی اس جنگ میں بہت نقصان ہوا۔

اخالگو نامی دو شہروں میں یہ جنگ ہو رہی تھی۔ ایک نیا اخالگو تھا اور دوسرا پرانا اخالگو۔ دونوں کے درمیان ایک دریا حائل تھا۔ ایک شہر بلندی پر، پہاڑ پر واقع تھا اور یہاں قلعہ کچھ اس طرح چٹانوں کی آڑ میں تھا کہ توپ خانہ اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اوپر چڑھنے والوں پر فائرنگ بھی ہو رہی تھی اور ان پر اوپر سے پتھر بھی لڑھکائے جا رہے تھے۔

اس معرکے میں اوپر کے مسلمان محصور ہو گئے تھے اور روسی مخبروں نے روسیوں کو خبر دی کہ اوپر مسلمان اپنے مویشیوں کو چارا تک نہیں دے سکتے اور ایندھن کی اتنی کمی ہے کہ وہ کھانا تک نہیں پکا سکتے اور خوراک بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ روسی گولہ باری سے اوپر جو مسلمان مارے گئے ہیں، ان کی لاشیں سڑ رہی ہیں اور بدبو سے پوری آبادی کا برا حال ہے۔ مسلمان غاروں اور تہ خانوں میں چھپ گئے ہیں۔ مسلسل تھکن اور بے آرامی نے انہیں اس لائق ہی نہیں رکھا کہ وہ روسی فوجوں کا مقابلہ کریں۔ امام شامل بھی فرار کے منصوبے بنا رہے ہیں۔

اس امید افزا مخبری کے بعد روسیوں نے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ معرکہ یکطرفہ ہے لیکن جیسے ہی یہ اپنے دشمن کے قریب پہنچے، ان پر فائرنگ شروع ہو گئی اور آگے بڑھنے والوں پر پتھر گرائے جانے لگے۔ کافی نقصان اٹھانے کے بعد روسیوں کو اپنے مخبروں پر شبہ ہوا کہ شاید یہ بھی مسلمانوں سے ملے ہوئے ہیں۔

اب ان جنگوں کی نگرانی اور منصوبہ بندی روسی جنرل گریب کر رہا تھا۔ اسے باوثوق ذرائع سے معلوم ہو چکا تھا کہ امام شامل اور مجاہدین کس طرح یہ جنگیں لڑ رہے ہیں۔ آدمیوں کی کمی کی پوری ہوتی رہتی ہے اور کہیں سے اسلحہ بھی ملتا رہتا ہے اور بالآخر یہ معما بھی حل کر لیا گیا۔ ترکی کا نمبردار ان کی خفیہ مدد کر رہا تھا اور وہیں سے اسلحہ بھی پہنچ رہا تھا اور رضاکار بھی حاصل ہو رہے تھے۔ جو مسلمان زخمی یا بیمار ہو جاتے تھے انہیں ترکی بھیج دیا جاتا تھا۔ یہ ترکی ملک نہیں، داغستان کا ایک شہر تھا۔

جنرل گریب نے فیصلہ کیا کہ وہ اس رابطے کو ختم کر دے گا۔

مجاہدین نے پُل پہلے ہی توڑ دیے تھے اور پُلوں کے بغیر جنرل گریب اپنی فوجوں کو اپنی منصوبہ بندی کے ماتحت حرکت میں نہیں لاسکتا تھا۔ اس نے پلوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بظاہر جن پلوں پر وہ کام کروا رہا تھا مجاہدین ان کی مزاحمت کرنے لگے اور دوسری طرف پلوں کی تیاری کا کام خاموشی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا کیونکہ ادھر مجاہدین کی طرف سے کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس طرح روسی فوج نے ان راستوں پر بھی قبضہ کرلیا جہاں سے مجاہدین کو کمک پہنچتی رہتی تھی۔

اب اخالگو روسیوں کے محاصرے میں آچکا تھا۔ حالانکہ روسی بھی خاصا نقصان اٹھا چکے تھے اور انہیں بھی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ مجاہدین کی کارروائیاں اور بیماریاں، ان پر دو طرف سے حملے ہو رہے تھے لیکن مسلمانوں کو اپنے حلیف علاقے سے رابطہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے بہت نقصان پہنچا۔ وہ فرار کی راہیں تلاش کر رہے تھے، غاروں میں پناہ لے رہے تھے۔

جنرل گریب کو یہ خوشی تھی کہ اس محاصرے میں امام شامل بری طرح پھنس چکے ہیں اور اب انہیں یا تو گرفتار کر لیا جائے گا یا وہ ختم ہو جائیں گے۔ اس نے ہر طرف سے فوجی دباؤ بڑھا دیا اور فرار کے راستوں کی مکمل ناکہ بندی کر دی۔

ترکی کے نمبردار جمالہ نے بیچ میں پڑ کر مفاہمت کی گفتگو شروع کی اور جنرل گریب سے کہا کہ وہ امام شامل سے مصالحت کرلے۔

جنرل گریب نے جواب دیا۔ ”میں نے فیصلہ کن حملے کا ارادہ کرلیا ہے اور اب جو حملہ ہوگا وہ کسی نتیجے کے بغیر ختم نہیں ہوگا۔ اس جنگ میں یا تو امام شامل ہمیں تباہ و برباد کر دیں گے یا پھر ہم انہیں اس لائق نہیں چھوڑیں گے کہ وہ آئندہ کوئی جنگ لڑسکیں۔“

ترکی کے نمبردار جمالہ نے پوچھا۔ ”اگر میں امام شامل سے بات کروں تو مفاہمت اور مصالحت کی شرائط کیا ہوں گی؟“

جنرل گریب نے کہا۔ ”امام شامل وعدہ کریں کہ وہ روسی حکومت کی مکمل اطاعت اختیار کر رہے ہیں۔ پہلی اور آخری شرط یہی ہوگی اور اس شرط کی منظوری کے بعد امام شامل اپنے بیٹے جمال الدین کو بطور یرغمال ہمارے حوالے کریں گے۔“

27 جولائی 1838ء کو مذاکرات شروع ہوئے اور کچھ دیر کے لیے روسی توپ خانے نے گولہ باری بند کر دی۔

امام شامل نے جنرل گریب پر واضح کر دیا کہ اس ایک شرط پر مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ گولہ باری دوبارہ شروع ہو گئی اور جنرل گریب نے امام شامل کو پیغام بھیجا۔ ”آپ اب ایک مفتوح کی حیثیت سے بات کریں۔“

امام شامل نے جواب دیا۔ ”ہمیں یہ شرط منظور نہیں ہے۔“

اس طرح گفتگو جاری رہی۔ دونوں ایک دوسرے کی بات ماننے کو تیار نہ تھے۔ گولہ باری کبھی تو رک جاتی اور کبھی شروع ہو جاتی اور امام شامل اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اس طرح وہ اپنی قلعہ بندیوں میں بھی مشغول تھے۔

درمیان میں کمیت ماہو پڑ گئے۔ یہ شملیتی کے قاضی تھے۔ انہوں نے بھی مصالحت کی بات کی لیکن جنرل گریب اپنی ضد پر قائم رہا۔ آخر امام شامل نے 12 اگست کو اپنا ایک سفیر روسی ہیڈکوارٹر بات چیت کے لیے بھیجا اور ایک بار پھر گولہ باری رک گئی لیکن بات آگے نہیں بڑھی۔ امام شامل کا نمائندہ دلیلوں سے ثابت کر رہا تھا کہ جب تک یہ جنگ جاری ہے، نہ کوئی مفتوح ہے اور نہ کوئی فاتح اس لیے گفتگو برابری کی سطح پر ہوگی اور جس طرح امام شامل پر جنرل گریب اعتماد نہیں کر رہا ہے اور امام شامل کے بیٹے جمال الدین کو یرغمال کے طور پر طلب کر رہا ہے، اسی طرح امام شامل بھی روسی جنرل پر اعتماد نہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے اور وہ بھی یرغمال کے طور پر کچھ طلب کریں گے اور بات کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو جائے گی۔

یوں ہی گفتگو ہوتی رہی اور گولہ باری کبھی رک جاتی اور کبھی جاری ہو جاتی، یہاں تک کہ جنرل گریب نے جھنجلا کر امام شامل کو 16 اگست کو یہ الٹی میٹم بھیجا کہ اگر امام شامل نے اپنے بیٹے کو یرغمالی کی حیثیت سے نہ بھیجا تو 17 اگست کی صبح بھرپور حملہ کر دیا جائے گا۔

اب گفتگو ختم ہو گئی اور مجاہدین بھی مقابلے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

17 اگست کو جنگ چھیڑ دی گئی اور ایک خوفناک معرکے کے بعد روسی فوج کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ روسیوں کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔ ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس معرکے میں سرخائی خان کو شہادت نصیب ہوئی۔

روسیوں کو کمک پہنچتی رہی اس لیے ان کا نقصان زیادہ محسوس نہیں ہوتا تھا جبکہ مسلمانوں کو کہیں اور سے مدد نہیں مل رہی تھی اور ادھر ادھر مسلمانوں کی بکھری ہوئی لاشیں زندہ بچ جانے والوں کو افسردہ کر رہی تھیں۔ شہیدوں کی لاشوں پر عورتیں اور بچے بھی چیخ رہے تھے اور یہ مجاہدین کو الگ پریشان کر رہے تھے۔

آخر ایک بار پھر جنرل گریب نے امام شامل کو پیغام بھیجا کہ اگر وہ اپنے بیٹے جمال الدین کو ترکی کے نمبردار جمالہ کی

تحویل میں دے دیں اور ہتھیار ڈال دیں تو گولہ باری روک دی جائے گی۔

امام شامل نے مہلت حاصل کرنے کے لیے جنگ بندی اس شرط پر قبول کی کہ وہ اپنے بیٹے جمال الدین کو ترکی کے نمبردار جمالہ کو دے دیں گے۔ اس کے بعد جنگ نہیں ہونی چاہیے۔

تین دن بعد امام شامل کا بیٹا ترکی کے نمبردار جمالہ کے حوالے کر دیا گیا لیکن امام شامل کے ہتھیار نہ ڈالنے کو جواز بنا کر بھرپور حملہ کر دیا گیا لیکن اس بار روسیوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ دوسری طرف سے انہیں کوئی جواب نہیں ملا۔ فصیلیں خالی پڑی تھیں۔ آبادی میں بس کچھ لوگ نظر آئے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ بظاہر لڑائی ختم ہو چکی تھی مگر روسی فوج دو دن تک بڑی چوکنا رہی اور ایک ہفتے بعد اخالگو پر ان کا قبضہ مکمل ہو گیا۔

روسی فوج نے اسی دن کے محاصرے اور مزاحمت کے دوران اپنے پچیس افسران اور چار سو ستاسی سپاہی ہلاک کروا لیے۔ ایک سو چوبیس افسر اور دو ہزار دو سو اکانوے سپاہی زخمی ہوئے۔ تین ہزار کے لگ بھگ بیماری کی نذر ہو گئے۔

روسیوں کو سرخالی چٹان کی لاش تو مل گئی تھی مگر امام شامل کا کہیں کوئی پتا نہ تھا۔ ان کی لاش کی تلاش کی جا رہی تھی کیونکہ فرار کی ساری راہیں بند کی جا چکی تھیں اور کہیں سے بھی یہ اطلاع نہیں ملی تھی کہ امام شامل کہیں دیکھے گئے ہیں لیکن یہ معما ناقابلِ فہم تھا کہ زندہ یا مردہ امام شامل کا کوئی پتا نہ تھا۔

روسیوں کو سات سال پہلے بھی غمری کے معرکے میں امام شامل کے بچ کر نکل جانے کا علم تھا اور اس بار پھر وہی صورت حال تھی۔

لیکن امام شامل کے بغیر یہ فتح روسیوں کے لیے بہت بڑی خوشی کا سبب بن گئی۔ ماسکو میں بھی جشن منایا گیا۔ امام شامل کا بیٹا بھی ماسکو پہنچا دیا گیا۔ جنرل گریب کا یہ خیال تھا کہ اگر بالفرضِ محال امام شامل زندہ بھی بچ گئے ہیں تو اب ان کی حیثیت ایک مفرور جیسی ہوں جو قانون سے بچتا پھر رہا ہو اور یہ آوارہ گرد امام شامل روسی حکومت کے لیے خطرہ نہیں رہے گا۔

امام شامل نے مایوسی کے بعد اپنی ایک بیوی، ایک بچے اور چند انتہائی قریبی ساتھیوں کو لیا اور اوپر چٹانوں میں پناہ لی۔ یہ 21 اگست کی رات تھی۔ ایک رات اور ایک دن اس چٹان میں پناہ لینے کے بعد دوسری رات ایک دریا کے کنارے پہنچے۔ وہاں انہوں نے لکڑیاں جمع کیں اور ان سے ایک کشتی تیار کی۔ کشتی پر مصنوعی انسانی ڈھانچے بٹھا کر کشتی کو دریا میں بہا دیا۔ یہ کشتی دریا کے بہاؤ میں تیزی سے آگے روانہ ہوئی۔

راستوں کی ناکہ بندی کرنے والی فوج نے اس کشتی کا پیچھا کیا اور اس پر فائرنگ شروع کر دی۔ جیسے ہی فوج نے راستہ چھوڑا، امام شامل دریا کے کنارے کنارے ایک پہاڑی ڈھلان کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں ایک روسی مورچا موجود تھا۔ اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ مقابلے میں ان کا بیٹا زخمی ہو گیا اور دوسری طرف روسی لیفٹیننٹ مارا گیا۔ امام شامل نے نہایت تیزی سے وہ دریا عبور کیا اور پہاڑ کے دوسری طرف اتر گئے۔

اب ان کے سامنے دریائے اشیلطا کا پل تھا۔ بہت بڑی بڑی چٹانیں تھیں اور ان چٹانوں کے نیچے سے دریا گزرتا تھا۔ چٹانوں پر شمشیر رکھ کر دریا عبور کیا۔ دریا کے اس پار غداروں کی چھوٹی سی پارٹی آتی دکھائی دی۔ اس پارٹی نے ان پر کئی فائر کیے۔

امام شامل نے اپنے ساتھیوں کو منع کیا۔ ”ان سے مقابلہ نہ کیا جائے کیونکہ جوابی فائرنگ سے آواز زیادہ گونجے گی اور خطرات بڑھ سکتے ہیں۔“ پھر امام شامل نے چیخ کر غداروں سے کہا۔ ”غمری کے لوگو! فکر نہ کرو، ہم دوبارہ ملیں گے۔“

اس کے بعد وہ غائب ہو گئے۔ اب ہر طرف سکون تھا اور روسیوں کو امام شامل کا کوئی پتا نہ تھا۔ روسی لیفٹیننٹ کی موت اور غداروں کے مقابلے میں بھی کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے مقابلے پر امام شامل تھے۔

جنرل گریب نے امام شامل کو اب اتنا حقیر اور بے وقعت سمجھ لیا تھا کہ اس نے رسماً امام شامل کی گرفتاری یا سر کی قیمت صرف تین سو روبل مقرر کی۔

لیکن شہنشاہ نکولائی کو اپنے جنرلوں اور مشیروں کی رائے سے کلی اتفاق نہیں تھا۔ جب اس کے سامنے یہ روداد رپورٹ کی شکل میں پیش کی گئی تو اس نے اس رپورٹ کے حاشیے پر لکھا۔ ”بہت خوب کہ امام شامل بچ نکلے مگر میں اس کی سازشوں کی طرف سے مطمئن نہیں۔ بظاہر اس کا اثر رسوخ اور وسائل ختم ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اب کیا ہوگا۔“

پہلے روسی حکومت نے امام شامل کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر تین سو روبل انعام مقرر کیا تھا، بعد میں اس میں اضافہ کر دیا گیا اور تین ہزار روبل مقرر کیے گئے۔

چھ ماہ تک ہر طرف سناٹا چھایا رہا اور روسی حکومت مفتوحہ علاقوں پر اپنا نظم و نسق مضبوط کرتی رہی۔ پہلے ان پر روسیوں کو مسلط کیا گیا لیکن بعد میں مقامی لوگوں کو سزا دینے کے لیے غنڈوں اور بدمعاشوں کو ان پر مسلط کر دیا گیا اور اس طرح اپنے ہی بھائی بند اپنوں پر ظلم و ستم ڈھانے لگے۔

ابھی تک جو لوگ امام شامل اور روسیوں میں کوئی فرق نہیں کر رہے تھے، اب یہ فرق واضح ہونے لگا اور انہیں امام شامل کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

امام شامل اپنے مریدوں کے ساتھ اچانک پھر نمودار ہوئے اور اس بار ان کی کارروائیوں میں پہلے سے زیادہ برق رفتاری پائی جاتی تھی۔ پچاس ساٹھ میل کا علاقہ ان کی کارروائیوں کے زیرِ اثر تھا۔ کل تک جو لوگ امام شامل کے خلاف تھے، آج وہ ان کا ساتھ دے رہے تھے۔

اسی دوران مقامی روسی وفاداروں میں اَن بن ہونے لگی۔ ایک غدار روسی حکام کی نظروں میں زیادہ اثر اور اختیار حاصل کرنے کے لیے دوسرے کی کاٹ کرنے لگا لیکن جو سیدھے سچے تھے وہ اپنی وفاداری پر انحصار کرتے رہے۔ ان میں حاجی مراد کا نام سرِفہرست تھا۔ انہوں نے روسیوں کی وفاداری میں امام شامل کے خلاف عملاً کارروائیاں کی تھیں اور کئی جگہ روسیوں کو حاجی مراد کی وجہ سے امام شامل پر برتری حاصل ہوئی تھی۔ ایک دوسرا مقامی حاکم احمد خان، حاجی مراد سے حسد کرتا تھا۔ اس حسد نے مخاصمت کی شکل اختیار کر لی اور احمد خان نے روسیوں کے کان بھرنا شروع کر دیے کہ حاجی مراد در پردہ امام شامل کا ساتھ دے رہا ہے اور امام شامل کو جو کامیابیاں حاصل ہوئیں یا ہوں گی، ان میں حاجی مراد کی مدد کسی نہ کسی طور ضرور موجود ہوگی۔

گو کہ حاجی مراد روسیوں کے نزدیک انتہائی قابلِ اعتماد آدمی تھے مگر احمد خان مسلسل شکایتیں کرتا رہا اور حاجی مراد کے خلاف روسیوں کے کان بھرتا رہا۔ حاجی مراد کی خاموشی اور احمد خان کی حاجی مراد کے خلاف چغل خوری اور جادو بیانی کارگر ثابت ہوئی۔ حاجی مراد کی ذات مشتبہ قرار پائی اور روسیوں کی نظر میں حاجی مراد غدار ٹھہرے۔ شاید اسی بات کو مرزا غالب نے اپنے ایک شعر میں خوب اچھی طرح بیان کیا ہے۔

ہو گئی ہے غیر کی جادو بیانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

احمد خان نے اپنی چرب زبانی کی وجہ سے آدیریا کی حکومت حاصل کر لی تھی اور اس علاقے میں تعینات میجر لازاروف سے احمد خان کے تعلقات زیادہ استوار ہو گئے تو احمد خان اسے حاجی مراد کے خلاف کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

دوسری طرف جنرل کلنگنو کو بالواسطہ حاجی مراد کے خلاف کیا جا رہا تھا۔

پرانی مثل کے مصداق کہ اگر گیلی لکڑیوں پر آگ رکھ کر سو پھونکیں ماری جائیں تو وہ بھی جلنے لگیں گی۔ میجر لازاروف نے پریشان ہو کر حاجی مراد کو طلب کر لیا اور ان سے سوال جواب شروع ہو گئے۔ میجر لازاروف نے امام شامل کے حوالے سے باتیں شروع کیں۔ ''حاجی مراد! ہم چھ ماہ پہلے جس فتنے کا سر کچل چکے تھے، آج وہ پھر پہلے سے زیادہ آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو گیا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ایسا کیوں ہوا؟''

حاجی مراد نے بات سمجھنے کی کوشش کی اور دریافت کیا۔ ''کہیں آپ کی مراد امام شامل سے تو نہیں؟''

میجر لازاروف نے کہا۔ ''ہاں، میں شامل کی ہی بات کر رہا تھا۔ کیا تم بھی اسے امام مانتے ہو؟''

حاجی مراد نے جواب دیا۔ ''ایک ہمارے یا آپ کے ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ اسے ایک زمانہ امام شامل کہتا ہے یا مانتا ہے۔''

میجر لازاروف معنی خیز نظروں سے حاجی مراد کو دیکھتا رہا پھر نظریں جھکا کر دریافت کیا۔ ''تمہاری نظروں میں شامل اتنا وقیع اور باوقار کب سے ہو گیا؟''

حاجی مراد نے جواب دیا۔ ''اس وقت بات میری نہیں، زمانے کی ہو رہی ہے۔ جن لوگوں نے شامل کو امام کا درجہ دیا ہے، وہی ان کے لیے جانیں دے رہے ہیں اور روسی حکومت کے خلاف مزاحمتیں کر رہے ہیں۔''

میجر لازاروف نے جنرل کلنگنو کا نام لیا۔ ''مجھے تو تمہارے بارے میں کوئی شبہ یا شکایت نہیں ہے مگر جنرل کلنگنو نے تم پر شبہ ظاہر کیا ہے کہ تم در پردہ امام شامل کی مدد کر رہے ہو۔''

حاجی مراد کو اس جھوٹے الزام پر غصہ آیا۔ ''جنرل کلنگنو میری وفاداری پر شبہ کر رہا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ اس نے امام

شامل کے خلاف جو کامیابیاں حاصل کیں، ان میں میری سوجھ بوجھ کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ میں نے حمزاد بیگ کو روسیوں کی وفاداری میں قتل کروا دیا اور اس کا مجھے یہ صلہ دیا جا رہا ہے کہ میں جنرل کلنکو کی نظر میں غدار ہوں۔"

میجر لازاروف نے حاجی مراد کی خدمات کا اعتراف کیا۔ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ماضی میں تمہاری وفاداریاں ہمارے بہت کام آئیں لیکن کبھی کبھی انسان بھٹک بھی جاتا ہے۔ ایک ایسا شخص جسے اس حد تک بیکار اور ناکارہ کر دیا گیا ہو کہ وہ آوارہ اور سرگرداں اپنی جان بچاتا پھر رہا ہو اور پھر اچانک پہلے سے زیادہ طاقتور ہو کر نمودار ہو جائے تو صاحبانِ بصیرت یہی کہیں گے کہ اس کے پیچھے کوئی بڑا ہاتھ ضرور ہے۔"

حاجی مراد کو غصہ آ رہا تھا کہ وہ جتنی زیادہ صفائی پیش کر رہے تھے، میجر لازاروف اتنا ہی انہیں متہم کر رہا تھا۔ حاجی مراد نے غصے میں کہا۔ "جنرل کلنکو سے کہیں کہ پہلے وہ ہماری غداریوں کے ثبوت اکٹھا کریں، اس کے بعد ہم سے بات کریں۔"

حاجی مراد نے غصے میں جانا چاہا تو میجر لازاروف نے انہیں روک لیا۔ "تم اس وقت تک نہیں جا سکتے جب تک بے گناہ ثابت نہ ہو جاؤ۔"

حاجی مراد نے پوچھا۔ "تم یہ اپنی مرضی سے کر رہے ہو یا جنرل کلنکو کے حکم سے یہ ہو رہا ہے؟"

میجر لازاروف نے جواب دیا۔ "مجھے حکم تو اوپر سے ہی ملا ہے لیکن میں خود بھی اپنا شبہ دور کرنا چاہتا ہوں اور اگر مجھے یہ یقین ہو جاتا کہ تم اس انکشاف کے بعد موقع پا کر فرار نہیں ہو جاؤ گے تو میں کبھی بھی تمہیں حراست میں نہ لیتا۔"

حاجی مراد نے غصے میں پاؤں پٹخے۔ "تم زیادتی کر رہے ہو اور اپنے ایک وفادار کو حلقۂ وفاداری سے نکل جانے کی ترغیب دے رہے ہو۔"

میجر لازاروف نے کہا۔ "اگر تم واقعی ہمارے وفادار تھے تو تمہیں ہر حال میں ہمارا وفادار رہنا تھا مگر میں کافی دیر سے تمہاری باتوں سے غداری کی بو محسوس کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد میجر لازاروف نے حاجی مراد کو اپنے آدمیوں کے حوالے کر دیا اور انہیں حکم دیا کہ اس کو فی الحال حراست میں رکھا جائے اور حاجی مراد سے کہا۔ "تحقیقات کے بعد اگر تم وفادار نکلے تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا اور امید بھی یہی ہے کہ آخرکار تمہاری وفاداریاں ثابت ہو جائیں گی۔"

حاجی مراد کو بظاہر حراست میں لیا گیا تھا مگر عملاً وہ گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جنرل کلنکو کو اطلاع دے دی گئی کہ حاجی مراد کو غداری کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اب بتایا جائے کہ کیا کیا جائے۔

جنرل کلنکو کی طرف سے حکم ملا۔ "حاجی مراد کو وہاں سے فوراً ہٹا کر گرفتار کر لیا جائے کیونکہ وہ ایک چلتا پرزہ انسان ہے اور کسی وقت بھی فرار ہو سکتا ہے۔ اگر وہ فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے گولی مار دی جائے۔"

اب حاجی مراد کے ساتھ یہ سلوک ہوا کہ انہیں رسیوں سے جکڑ دیا گیا اور ایک توپ سے باندھ کے شورا روانہ کر دیا گیا۔ تقریباً پینتالیس آدمی ان کی نگرانی پر مامور تھے۔

شورا حاجی مراد کو قید کر دینے کے لیے بہترین جگہ تھی۔

حاجی مراد کو ایک افسر اور پینتالیس سپاہی رسیوں سے جکڑ کر اور توپ سے باندھ کر روانہ ہوئے تو حاجی مراد نے میجر لازاروف سے ایک ملاقات کرنا چاہی۔ انہیں جواب دیا گیا کہ جب تم بے گناہ ثابت ہو جاؤ گے تو میجر لازاروف سے ملاقات کروا دی جائے گی۔

اب حاجی مراد جس ذہنی کرب سے دوچار تھے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ہمیشہ غیروں کا وفادار رہنے والا شخص اور اپنوں کو نقصان پہنچانے والا انسان جرمِ بے گناہی میں قید کر دیا جائے تو وہ اپنے بارے میں کیا سوچے گا اور اس کی ماہیتِ قلبی کیا صورت اختیار کرے گی۔ حاجی مراد اپنے ماضی پر شرمندہ تھے اور اب وہ امام شامل کو حق بجانب قرار دے رہے تھے۔

انہیں ایک غدار کی حیثیت سے جب اپنے ہی لوگوں کے سامنے سے گزارا گیا تو حاجی مراد یہ سوچ سوچ کر کڑھتے رہے کہ جن لوگوں کا انہوں نے ہمیشہ ساتھ دیا، انہوں نے ان کی وفاداری کا یہ صلہ دیا کہ رسیوں سے جکڑ کر توپ سے باندھ دیا اور اپنوں کے سامنے سے گزارا اور دوسری طرف امام شامل بھی انہیں غدار اور ضمیر فروش سمجھتے رہے۔ اب حاجی مراد کے اندر ایک ایماندار، محبِ وطن اور محبِ اسلام مجاہد بیدار ہو چکا تھا۔ ان پینتالیس سپاہیوں کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہ تھی۔

دورانِ سفر ایک برف پوش پہاڑی علاقے سے گزرتے ہوئے حاجی مراد نے سپاہیوں سے شکایت کی۔ "تم لوگ

رسیوں سے جکڑ کر بھی مطمئن نہیں ہو اور توپ سے باندھ رکھا ہے۔ اس سے مجھے چلنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میری رسّی کا ایک سرا توپ سے الگ کر دیا جائے۔ اس کی جگہ دو آدمی رسیوں کے دونوں سرے پکڑے رہیں اور میں ان دونوں کے درمیان سفر کرتا رہوں۔"

سپاہیوں کو بھی خیال ہوا کہ حاجی مراد پر زیادتی کی جا رہی ہے۔ انہوں نے انہیں توپ سے آزاد کیا اور رسیوں کے دونوں سرے دو سپاہیوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور ان دونوں کے درمیان حاجی مراد چلنے لگے۔

حاجی مراد کی نظریں اردگرد کا جائزہ لیتی رہیں اور یہاں تک کہ وہ ایک ایسے پہاڑی راستے سے گزرے جس کے ایک طرف نشیب میں برف ہی برف جمی ہوئی تھی۔ حاجی مراد کی نظر میں فرار کے لیے یہ مناسب جگہ تھی۔ انہوں نے اچانک ایک جھٹکے سے دونوں سرے کھینچے۔ دونوں سپاہی گر گئے اور ان کے ہاتھوں سے رسیوں کے سرے چھوٹ گئے اور حاجی مراد برف پر پھسلتے ہوئے نیچے غائب ہو گئے۔

روسی سپاہی حاجی مراد کو گولی مار دینا چاہتے تھے مگر وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے اور نیچے کھڈ میں اترنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ دوسرے راستوں سے نیچے پہنچنا بہت دشوار تھا اور اس کے لیے ہفتوں کا سفر درپیش تھا۔

لڑھکتے ہوئے حاجی مراد نشیب میں ایک جگہ ٹک گئے تو انہیں اپنی ٹانگ بیکار محسوس ہوئی۔ انہوں نے کھڑے ہو کر چلنے کی کوشش کی تو زخموں نے انہیں بے حال کر دیا اور وہ گر گئے۔ ایک ٹانگ بالکل کام نہیں کر رہی تھی اور اس میں تکلیف بھی بہت زیادہ تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اسے ٹٹول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ ٹوٹ چکی ہے اور جوڑ سے خون جاری ہے۔ یہاں پڑے رہنے سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ انہوں نے ہمت سے کام لیا اور گھسٹ گھسٹ کر اپنا سفر شروع کیا۔

کافی دیر بعد ان کے سامنے مویشیوں کا ایک باڑا آیا۔ باڑے کے مالک نے ایک زخمی کو باڑے میں داخل ہوتے دیکھا تو وہ ان کے قریب آیا اور پوچھا۔ "تم کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

حاجی مراد نے جسم سے لپٹی ہوئی رسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "پہلے مجھے آزاد کرو اس کے بعد میں بتاؤں گا کہ میں کون ہوں۔"

انہیں رسیوں سے آزاد کیا تو مویشیوں کے باڑے کے مالک نے انہیں جراح کے حوالے کیا۔ اسے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی شخص ہے اور روسی حکومت سے تعلق رکھتا ہے۔ روسی حکومت کے باغی کو پناہ دینا اور اس کا علاج کروانا انتہائی خطرناک جرم تھا مگر آدمی محب وطن اور اسلام دوست تھا۔ اس نے حاجی مراد کو چھپا دیا اور علاج کرواتا رہا۔

حاجی مراد نے اپنے حال پر اس کی نوازشیں دیکھیں تو اپنا تعارف کروا دیا اور کہا۔ "اب میں صحت یاب ہونے کے بعد سیدھا امام شامل کے پاس جاؤں گا اور بدمعاش روسیوں سے جنگ کروں گا کیونکہ وہ یہی زبان سمجھتے ہیں۔"

صحت یاب ہونے کے بعد حاجی مراد امام شامل کی تلاش میں جنگلوں میں نکل گئے۔ اس سے پہلے امام شامل کو معلوم ہو چکا تھا کہ حاجی مراد پر غداری کا الزام لگایا گیا ہے اور انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے پھر یہ خبر مشہور ہوئی کہ حاجی مراد روسیوں کو چکمہ دے کر فرار ہو گئے۔

اب امام شامل کو بھی تشویش ہوئی کہ حاجی مراد کہاں غائب ہو گئے۔ مویشیوں کے باڑے کے مالک نے امام شامل کے آدمیوں کو مطلع کیا کہ حاجی مراد، امام شامل سے ملنا چاہتے ہیں۔ امام شامل کے آدمی حاجی مراد پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھے۔ انہیں شبہ تھا کہ کہیں یہ بھی روسیوں کی کوئی چال نہ ہو اور وہ حاجی مراد کے ذریعے امام شامل تک پہنچنے کی تدبیر کر رہے ہوں۔

لیکن امام شامل کو یقین تھا کہ یہ واقعات کسی سازش کا حصہ نہیں ہیں۔ انہیں حاجی مراد کی صلاحیتوں کا اندازہ تھا اور اسے وہ اپنی خوش قسمتی قرار دے رہے تھے کہ حاجی مراد نے امام شامل کے ساتھ جنگِ آزادی لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔

امام شامل نے حاجی مراد کو مطلع کر دیا کہ وہ ان سے ملاقات کر سکتے ہیں۔

دونوں کی ملاقات ہوئی تو امام شامل نے کہا۔ "ہم دونوں ماضی کا ذکر نہیں کریں گے۔ تم بھی بھول جاؤ اور اسے میں نے بھی بھلا دیا۔ اب ہم دونوں مل کر روسیوں کے خلاف جہاد کریں گے۔"

(جاری ہے)

ماخذات

سرگزشت مجاہدین، مولانا غلام رسول مہر۔ امام شامل، کیپٹن محمد حامد۔ تاریخ بخارا، بخارا کے امیر کی سرگزشت۔ تاتاریوں کی یلغار، عبداللہ لبیب۔ عثمان بطور (قازقوں کی داستان)، گوشت پوست کے لباس



شاکا

دوسرا حصہ

نازیہ کامران کاشف

جب ڈاکٹر وینزو کافر نامی جزیرے پر پراسرار اموات کی وجہ جاننے کے لیے آیا تو اس کا سامنا کئی عفریتوں سے ہوا... جن کے خاتمے کے لیے شاکا جیسی پراسرار طاقت نے ایک دنیا سے دوسری دنیا کا سفر کیا... چار صدیوں پر پھیلی یہ کہانی بار بار دہرائی جاتی رہی جس کے بعد چند سائنس دانوں کی ایک بھیانک غلطی نے اس دنیا کو ایک بہت بڑے خطرے سے دوچار کر دیا مگر... اس بار کوئی پراسرار طاقت ان کی مدد کے لیے ان کے ساتھ نہ تھی اور انہیں ایک بار پھر شاکا جیسی اسرار بھری ہستی کو ڈھونڈنا تھا چاہے کتنا ہی مشکل سفر ہو جاتا... گزشتہ عہد کے ڈاکٹر وینزو کی ڈائری میں لکھے تحیر انگیز راز انہیں دوسری دنیا کا رستہ دکھا رہے تھے لیکن شاکا تک پہنچنا اب اتنا آسان بھی نہ تھا...

چودھویں صدی کی اندھیری راتوں سے جنم لینے والی

ایک لرزہ خیز داستان

Year 2020

Russia News Office-Moscow

صوفیہ نے کار پارکنگ میں لگائی اور گاڑی لاک کر کے آفس کی بلڈنگ کی طرف بڑھ گئی۔ گیٹ پر لگے خودکار سسٹم نے اس کے شناختی کارڈ کو اسکین کیا اور دروازہ کھل گیا۔ پانچ بجے کے بعد عام طور پر آفس بند ہو جایا کرتے تھے مگر خبروں کا چینل ہونے کی وجہ سے ان کا آفس کبھی خالی نہیں ہوتا تھا۔ صبح کی ڈیوٹی دینے والے اپنے فرائض انجام دے کر جاتے تو رات کی ڈیوٹی دینے والے اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے آموجود ہوتے۔

وہ سر کے اشارے سے سب کو ہیلو کرتی ہوئی اپنی میز پر پہنچی۔ اپنا بیگ میز پر رکھ کر اس نے انٹرکام پر کافی آرڈر کی اور کرسی پر سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ آج کا دن بہت مصروف گزرا تھا۔ وہ صبح سے کارخانوں اور ان سے نکلنے والے زہریلے مواد پر رپورٹ بنانے کے لیے نکلی ہوئی تھی۔ اسے فیلڈ رپورٹنگ ہمیشہ ہی تھکا دینے والا کام لگتی تھی۔ تھوڑی دیر بند آنکھوں کے ساتھ کنپٹیاں سہلانے کے بعد وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

اس کی کمپیوٹر اسکرین پر پرچیاں چپکی ہوئی تھیں۔ جیک جو کہ اس کا باس بھی تھا، ہمیشہ اسی طرح اس کے لیے اہم پیغامات اور آنے والے دن کے کام کی لسٹ کمپیوٹر اسکرین پر چسپاں کر کے چلا جاتا تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے وہ چٹیں اتاریں اور اہم پوائنٹس اپنی ڈائری میں نوٹ کرنے لگی۔ وہ رشیا نیوز چینل کی سب سے قابل رپورٹر تھی۔ اپنا کام اسے بے حد عزیز تھا۔ وہ اپنی نوکری سے بہت خوش تھی اور نہایت کم عرصے میں تیزی سے اوپر آنے والے رپورٹرز میں سے ایک تھی۔

اس نے اپنی زندگی کا ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا اور اسی میں سے ایک ہیری سے تعلق استوار کرنا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا یہ خواب ہیری ہی پورا کر سکتا ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ ہیری میں کوئی کمی تھی۔ وہ اپنے اور ہیری کے رشتے سے بہت خوش تھی۔ آگے چل کر اسے ہیری کی آئی ٹی ایکسپرٹیز سے بھی بہت فائدہ پہنچنے والا تھا اور اس کے علاوہ چینل میں وہ اس کا پارٹنر بھی ہونے والا تھا۔ ہیری کی پہنچ حکومت کے اہم لوگوں تک بھی اور اس کا اندازہ اسے اس کے واسٹوک ریسرچ سینٹر میں تعیناتی کے بعد ہی ہو گیا تھا۔ ہیری سے منسوب ہونے کی وجہ سے وہ بہت سے اہم حکومتی اہلکاروں کی گڈبکس میں آ چکی تھی اور یہ اس کی ترقی کے لیے بہت اہم تھا۔

"کافی۔" اینڈریو نے کافی کا کپ اس کی ڈیسک پر رکھا اور اپنے ہاتھ میں دوسرا کپ تھامے اس کی ڈیسک پر ہی براجمان ہو گیا۔

"مگر میں نے تو کافی کینٹین سے آرڈر کی تھی۔" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بھویں اچکا کر بولی۔

"میں بھی کینٹین سے ہی جا کر لایا ہوں۔ خود نہیں بنائی۔ دو دن ہو گئے تھے تم سے بات کیے ہوئے اور ویسے بھی تمہارا پسندیدہ ویک اینڈ آنے والا ہے۔ جس کے آتے ہی تم دوبلنے کے لیے غائب ہو جاتی ہو۔" اینڈریو مسکرایا۔

صوفیہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے ہاتھ بڑھا کر کافی کا کپ اٹھا لیا۔

"ویسے کیا دیکھا تم نے ہیری میں؟ کیا وہ تمہیں بور نہیں لگتا؟ اس کے پاس پروگرامنگ پر بات کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا موضوع بھی ہوتا ہے؟" وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

اس کی سفید رنگت، ہری آنکھوں اور لال بالوں کا امتزاج اسے بہت ساری لڑکیوں سے ممتاز بناتا تھا۔ اس پر اس کا لمبا قد اور متناسب جسم گویا وہ ایک مکمل تخلیق تھی۔ حسن کے ساتھ ذہانت اور خوداعتمادی نے اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیے تھے۔

"تم ہیری سے جلنے لگے ہو۔" وہ ہنس پڑی۔

"میں بھلا اس سے کیوں جلنے لگا؟ مجھے وہ بھی تمہارے ساتھ نظر نہیں آیا۔ اس کا کام اسے اتنا مصروف رکھتا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ ویک اینڈ بھی نہیں گزارتا۔ سوچو، کسی اچھے ریسٹورنٹ میں ہیری کے ساتھ کھانا کھانے کے بجائے تم اپنے والد سے ملنے ان کے زرعی فارم پر چلی جاتی ہو۔" اسے اس کی رومانوی زندگی پر افسوس ہوا تھا۔

صوفیہ ہنس پڑی۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اپنے والد سے ملنے کے بجائے ہیری سے ملنے ہی جایا کرتی ہے اور یہ بھی کہ وہ اس کے ساتھ ویک اینڈ پر کیوں نہیں ہوتا تھا لیکن یہ انتظار اب زیادہ لمبا نہیں تھا۔

ڈیڑھ سال کے بعد ہیری اپنا کام ختم کر کے ہمیشہ کے لیے اس کے پاس آنے والا تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں مل کر صوفیہ کا نیوز چینل شروع کرتے اور چین سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کرتے۔

"کیا تمہیں نہیں لگتا کہ جس پیشے سے تمہارا تعلق ہے، تمہارے شوہر کا تعلق بھی اسی پیشے سے ہونا چاہیے تاکہ وہ تمہارے کام پر اعتراض نہ کرے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں تم اپنے کام کو لے کر بہت مخلص ہو۔ یہ تمہارا جنون ہے اور تم اس کو کبھی ختم نہیں کرنا چاہو گی۔ اگر ہیری کو آگے چل کر تمہاری

اس مصروفیت بھری زندگی پر اعتراض ہوا تو پھر تم کیا کرو گی؟" اینڈریو آج نہ جانے کیوں عجیب عجیب باتیں کر رہا تھا۔

"ہم دونوں اپنی زندگیوں کے اہم فیصلے خود کر سکتے ہیں۔ آگے جو ہوگا وہ اسی وقت دیکھا جائے گا۔ پہلے سے ان سب چیزوں کے بارے میں سوچ کر پریشان ہونے پر میں یقین نہیں رکھتی۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ تمہیں اچانک میری اور ہیری کی نجی زندگی میں اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے۔" وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اگر کبھی ہیری تمہیں مایوس کرے تو یاد رکھنا کہ اینڈریو ہمیشہ تمہیں اپنے راستے میں کھڑا ملے گا۔" وہ سنجیدگی سے کہتا ہوا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

صوفیہ کی آنکھوں میں حیرانی تیر گئی۔ اینڈریو پچھلے تین سالوں سے ... نیوز چینل میں بطور نیوز اینکر کام کر رہا تھا اور وہ بھی صوفیہ کی طرح تیزی سے نمایاں ہوا تھا۔

اینڈریو سے اس کی اچھی دوستی تھی مگر اینڈریو اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے، اس کا اندازہ صوفیہ کو آج پہلی دفعہ ہوا تھا۔

وہ تھوڑی دیر حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور پھر سر جھٹک کر اپنا فون اٹھا لیا۔

اب جبکہ وہ اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکی تھی تو اپنے ذہن کو غیر متعلقہ باتوں پر پریشان کر کے اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہتی تھی۔ ہیری سے شادی اس کے لیے بہت فائدہ مند تھی۔

اسے موبائل پر حکومتی ادارے کی ای میل موصول ہو چکی تھی۔ جس میں اس ہفتے اسے ہیری سے ملنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اسے تین دن کے بعد ماسکو سے لاڈی واسٹوک کی فلائٹ لینا تھی جس کی بکنگ بھی کروا دی گئی تھی اور وہاں سے اسے چارٹرڈ جہاز کے ذریعے واسٹوک کے قریبی فوجی اڈے پر لے جایا جاتا تھا اور وہیں سے وہ مکمل چیکنگ کے بعد واسٹوک روانہ ہوتی تھی۔ یہ سارے اخراجات ہیری اور حکومتی اداروں کے درمیان طے پاتے تھے۔

ماسکو سے لاڈی واسٹوک کی فلائٹ کا دورانیہ ساڑھے آٹھ گھنٹے پر محیط تھا اور اس کے بعد مزید دو گھنٹے کی ایک اور فلائٹ بغیر آرام کیے لینا ایک تھکا دینے والا عمل تھا۔ صوفیہ نے ٹکٹ کی تفصیلات دیکھ کر موبائل ایک طرف رکھ دیا۔

اس ویک اینڈ پر ہیری کی سالگرہ بھی تھی۔ اسے کیک وغیرہ لے جانے کی اجازت نہیں تھی اور ویسے بھی واسٹوک کا بٹلر فریڈ بہترین کیک بنا لیتا تھا۔ نہ ہی وہ ہیری کے لیے کوئی تحفہ ساتھ لے جا سکتی تھی کیونکہ اس کا تمام سامان موبائل سمیت فوجی ہیڈ کوارٹر میں ضبط کر لیا جاتا تھا اور اس کی واپسی پر اسے دیا جاتا تھا۔ لہٰذا ہیری کی سالگرہ کو خاص بنانے کے لیے اس نے لال رنگ کا ایک شرٹی گاؤن منتخب کیا تھا۔ ہیری کو اس پر لال رنگ بہت پسند تھا۔ اسے کپڑے ساتھ لے جانے کی اجازت تھی۔

اس نے کمپیوٹر آن کر کے چیک کو چھٹیوں کی تفصیلات کے حوالے سے ای میل کی اور بیگ اٹھا کر آفس سے باہر نکل آئی مگر کون جانتا تھا کہ ہیری سے ہونے والی یہ ملاقات اس کی زندگی سے سکون نام کا لفظ ختم کرنے والی تھی۔

☆☆☆

Year 2020

Vostok Research Centre

وہ چاروں اس وقت جوشوا کی لیب میں موجود تھے۔ جوشوا کے لیے گئے تجربے کو اڑتالیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ وہ بندر جس پر جوشوا نے تجربہ کیا تھا، پہلے سے زیادہ چست اور طاقتور لگ رہا تھا۔ اس کی جسمانی ساخت میں واضح تبدیلی آئی تھی۔

اس کا قد بھی بڑھ رہا تھا۔ گزشتہ اڑتالیس گھنٹوں میں اس بندر کی خوراک میں دو گنا اضافہ ہوا تھا۔ وہ پوری طرح چاق و چوبند تھا۔ ہیری کی تیار کی گئی رپورٹ کے مطابق بندر کے جسم میں دوڑتے خون میں کوئی انفیکشن ظاہر نہیں ہوا تھا۔ جوشوا نے بندر سے کچھ دماغی سرگرمیاں بھی کروائی تھیں اور حیرت انگیز طور پر بندر ان تمام سرگرمیوں میں کامیاب رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جسمانی طور پر طاقتور کرنے کے ساتھ ساتھ یہ ویکسین انسان کو بہترین دماغی صلاحیتوں سے بھی متعارف کروانے والی تھی۔

شمشیر نے اینٹی باڈی تیار کرنا شروع کر دی تھی۔ جوشوا کے اس کامیاب تجربے سے اس کے کام کو بھی ایک نئی رفتار ملی تھی مگر حتمی نتائج تک پہنچنے کے لیے اسے اب بھی انسانی تجربے کا انتظار تھا۔

جس طرح اس بندر کو ویکسین لگانے کے بعد اڑتالیس گھنٹے کے لیے زیر مشاہدہ رکھا گیا تھا، اسی طرح جوشوا کو بھی ویکسین لگنے کے اڑتالیس گھنٹوں تک اسی لیب میں بند رہنا تھا۔ جوشوا اس تجربے کے لیے تیار تھا۔

"کیا اب تم ہمیں یہ بتانا چاہو گے کہ تم نے یہ ڈی این اے کہاں سے حاصل کیے؟" جیکال نے ہمیشہ کی طرح اپنے ذہن میں کلبلاتا وہ سوال دہرایا۔

"لیب میں موجود اس سیف میں ہیری ڈائری اور

ایک باکس رکھا ہے۔ اگر دوران تجربہ مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو ساری تفصیلات اس ڈائری میں موجود ہیں۔ یہ اس لاک کا کوڈ ہے جو میں بطور امانت تمہیں بتا رہا ہوں۔" جوشوا نے ایک لفافہ جیکال کی طرف بڑھایا۔ جیکال نے وہ لفافہ اپنے لیب کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

"تجربہ ہونے کے بعد میں اڑتالیس گھنٹے اسی لیب میں گزارنا چاہوں گا لہٰذا اس سیف کو میرے مرنے سے پہلے نہ کھولا جائے۔ اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو تم لوگوں کو اس ڈائری اور باکس کی ضرورت نہیں پڑے گی لیکن اگر یہ تجربہ ناکام ہو جاتا ہے تو میری وصیت ہے کہ اس ڈائری اور باکس میں موجود چیزوں کو ضائع کر دیا جائے۔"

"کیا تم تیار ہو؟" شمشیر نے ویکسین لگانے کی اجازت چاہی۔

جوشوا اثبات میں سر ہلا کر اسٹریچر پر لیٹ گیا۔ جیکال اور شمشیر نے اس کے ہاتھوں اور پیروں کو کلپس لگانا شروع کر دیے۔ یہ تجربے کے لیے بہت ضروری تھے۔ جوشوا کے لیٹنے کے بعد شمشیر نے اس کے وائٹلز چیک کرنا شروع کیے۔ اس کا بلڈ پریشر اور ہارٹ بیٹ بالکل نارمل تھی۔ اپنی طرف سے کلیئر کا سائن دینے کے بعد اس نے ہیری کی طرف دیکھا۔

ہیری کے سامنے لگی اسکرینوں پر جوشوا کے جسم میں موجود ایک ایک نس کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ ہیری نے انگوٹھے سے "اوکے" کا نشان بنایا اور شمشیر نے سر ہلایا۔

اس نے احتیاط سے وورٹیکس کمرے سے ایک شیشی نکالی اور اسے سرنج میں بھرنے لگا۔ جوشوا نے اسے سرنج بھرتے دیکھ کر ایک لمبی سانس لی۔ آج وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا امتحان دینے جا رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا جوا تھا جس میں ہارنے کا مطلب تھا کہ وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔

جیکال غور سے جوشوا کو دیکھ رہا تھا۔ آج سے ڈیڑھ سال پہلے اس نے جوشوا کے ساتھ مل کر ان ڈی این ایز پر کام کرنا شروع کیا تھا۔ جوشوا نے جب اسے ان خاص ڈی این ایز کے نمونے فراہم کیے تھے تو جیکال کو انہیں دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ڈی این ایز کئی سو سال پرانے ہیں۔ ان کو کارآمد بنانے میں جوشوا کے ساتھ ساتھ جیکال کا بھی ہاتھ تھا لیکن جیکال اب تک اس بات سے بے خبر تھا کہ یہ نمونے آخر جوشوا کے پاس کہاں سے آئے تھے اور یہ کس جاندار کے نمونے تھے؟

اس نے ریسرچ کے دوران کئی دفعہ جوشوا سے اس بارے میں معلوم کرنا چاہا مگر جوشوا ہمیشہ ہی بات کو ٹال دیتا تھا۔ اس نے اپنے طور پر بھی کافی ریسرچ کی تھی مگر وہ ان نمونوں کا ماخذ تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ جوشوا نے اتنا تو بتا دیا تھا کہ یہ ڈی این ایز دیومالائی خصوصیات رکھتے تھے اور ویکسین سے نہ صرف ان کی قوم کو فائدہ ہوتا بلکہ وہ لوگ بھی ایک دائمی زندگی کی شروعات کر سکتے تھے۔ اس حیرت انگیز ایجاد میں اس کا نام شامل ہونا اس کے لیے باعث فخر تھا۔

"اجازت ہے؟" شمشیر اسٹریچر کے قریب پہنچ کر ان سب سے اجازت لے رہا تھا۔

ان تینوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ ہیری کی نظریں مسلسل اسکرین پر لگی تھیں۔ جیکال، جوشوا کے اسٹریچر کے پاس ہی کھڑا تھا۔

"ہیومن ٹرائل 001۔" جیکال نے ہاتھ میں پکڑے ریکارڈر کا بٹن دبا کر یہ الفاظ دہرائے۔

شمشیر نے لمحے بھر کو آنکھیں بند کیں اور پھر اس نے سرنج کی سوئی جوشوا کے بازو میں اتار دی۔ جوشوا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنے جسم کو غیر متوقع ردعمل کے لیے تیار کرنے لگا۔ اچانک اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی نسوں میں خون کی جگہ گرم لاوا انڈیل دیا ہو۔ اسے بے انتہا جلن محسوس ہوئی۔ اس کے جسم کے ہر مسام سے پسینا بہنے لگا۔

"جوشوا کا بلڈ پریشر بڑھ رہا ہے۔" ہیری اسکرین دیکھ کر چلایا۔

جوشوا کے جسم نے تیزی سے جھٹکے لینے شروع کیے اگر اسے کلپس نہ لگے ہوتے تو وہ یقیناً اب تک نیچے گر چکا ہوتا۔

شمشیر بھاگتا ہوا اینٹی باڈیز کے وورٹیکس کمرے کی طرف بڑھا۔ لیب جوشوا کی فلک شگاف چیخوں سے گونج اٹھی۔ اس کے جسم کی نسیں پھٹنا شروع ہو گئی تھیں۔

"جوشوا..... جوشوا..... ہمت کرو۔" جیکال اس کے اوپر جھک کر چلایا۔

"اس کے دل کی دھڑکن بڑھ رہی ہے۔ جلدی کرو شمشیر!" ہیری نے چلا کر شمشیر کو آواز دی۔

شمشیر نے اینٹی باڈیز کو سرنج میں اتارا مگر وہ خود بھی اس اینٹی باڈی کے نتائج کے بارے میں یقین نہیں تھا کیونکہ بندر کے جسم پر اس طرح کا کوئی ری ایکشن نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ اس اینٹی باڈی کا تجربہ بندر پر کر چکا ہوتا تو تب اسے اس کے کام کرنے کا سو فیصد یقین ہوتا۔

شمشیر بھاگتا ہوا اسٹریچر تک آیا اور اس سے پہلے کہ وہ یہ سرنج جوشوا کے جسم میں اتار کر اسے اس تکلیف سے بچاتا، جیکال نے اسے دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔

"رک جاؤ، کیا کر رہے ہو تم؟" جیکال چلایا۔

"تم کیا کر رہے ہو؟" شمشیر اٹھ کر کھڑا ہوا۔

"ابھی جوشوا کے جسم نے پوری طرح ویکسین کو قبول نہیں کیا ہے۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔" جیکال بولا۔

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ جوشوا کی جان کو خطرہ ہے۔ اس کی حالت تو دیکھو۔" ہیری چلایا۔

جوشوا کا جسم ابھی تک جھٹکے لے رہا تھا مگر اب اس کی چیخیں تھم چکی تھیں۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔

"دیکھو تم دونوں اس طرح کے تجربات سے نہیں گزرے مگر میں اس طرح کے تجربے کئی دفعہ اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھ چکا ہوں۔ اگر تم نے جوشوا کے جسم میں یہ اینٹی باڈی اتار دی تو اس کے جسم میں ہونے والی تبدیلیاں رک جائیں گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اینٹی باڈی اتاری ایکشن کر جائے۔ جوشوا کے جسم کو اس ویکسین کو قبول کر لینے دو۔ اینٹی باڈی لگانے سے جوشوا کی موت واقع ہو سکتی ہے۔" جیکال نے انہیں سمجھایا۔

"اگر ہم نے جوشوا کو نہیں بچایا تو ہم حکومت کو کیا جواب دیں گے؟" شمشیر اب تک کشمکش میں تھا۔

"یہ اینٹی باڈی اس کے جسم میں اتارنے کے بعد تو تم جوشوا کو جواب دینے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم تجربہ ہے۔ معمولی سی غلطی بھی ہم سب کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ جوشوا نے کہا تھا کہ ویکسین لگانے کے بعد ہمیں پندرہ منٹ تک انتظار کرنا ہے۔ ہم سب کو اس کی دی ہوئی ہدایات یاد رکھنی چاہئیں۔" جیکال تحمل سے بولا۔

ہیری دوبارہ کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھ گیا مگر اس کی نظریں جوشوا پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ شمشیر بھی ہونٹ بھینچے اسٹریچر کے پاس کھڑا تھا۔

پانچ منٹ کے اس جان لیوا انتظار کے بعد جوشوا کی دھڑکن نارمل ہونا شروع ہوئی۔ آہستہ آہستہ جوشوا کا بلڈ پریشر بھی اپنی اصل حالت میں واپس آ رہا تھا۔

دس منٹ کے بعد اس کے جسم نے جھٹکے لینا بند کر دیے تھے لیکن اس کی کھلی آنکھیں اب بند ہو چکی تھیں۔ شمشیر نے فکرمندی سے جیکال کی طرف دیکھا۔

"فکر مت کرو۔ اسے کچھ نہیں ہوا۔ اس کے جسم نے ویکسین کو قبول کر لیا ہے۔" جیکال بولا۔

اور تقریباً پندرہ منٹ کے بعد جوشوا کے منہ سے جھاگ نکلنا بھی بند ہو گیا تھا۔ اب وہ گہری نیند کی حالت میں تھا۔ اس کا جسم پرسکون تھا۔

جیکال نے ہیری کی طرف دیکھا۔

"سب کچھ نارمل ہے۔" ہیری نے اسکرین پر نظریں دوڑاتے ہوئے جوشوا کے وائٹلز پر نظر ڈالی۔

"گڈ۔ اب ہمیں جوشوا کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔" جیکال مسکرایا۔

"کیا اب یہ کلپس کھول دیں؟" شمشیر بولا۔

"نہیں، ابھی نہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ ہوش میں آنے کے بعد جوشوا کس طریقے سے برتاؤ کرے گا۔ لہٰذا احتیاطاً کلپس کو لگے رہنے دو۔" جیکال اطمینان سے بولا۔

جوشوا کی آنکھیں بند تھیں۔ کسی کو خبر نہیں تھی کہ ان بند آنکھوں کے پیچھے کون سا طوفان چھپا تھا۔

واسٹوک ریسرچ سینٹر میں کیا جانے والا یہ تجربہ ان سب کی زندگیوں میں کیا تباہی لے کر آنے والا تھا۔

☆☆☆

Year 1723

Jungdaal-Parallel Universe

شرقال کو ان کے آنے کی خبر ہو چکی تھی۔ یہ شیمی جنگوں کا سب سے بڑا قبیلہ تھا۔ جھیلوں اور جھرنوں سے گھرا ہونے کی وجہ سے یہ گھنے درختوں سے مالا مال تھا۔ شرقال کے لوگ اپنے جسموں پر راکھ مل کر ایک سفید تہ چڑھائے رکھتے تھے جو انہیں بری روحوں سے محفوظ رکھتی تھی مگر اس بار یہ راکھ بھی ان کی حفاظت نہیں کر پائی تھی۔ ان کے لوگ جھیلوں کے پاس سے غائب ہو رہے تھے۔ شاکا سے مدد مانگنے کے لیے جانے والے وفد میں شرقال کا سردار زیک بھی شامل تھا۔ اس نے بھی باقی قبائل کی طرح ان عفریتوں سے خود ہی نمٹنے کی کوشش کی تھی مگر وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ مصیبت آنے پر ہمیشہ شاکا کے پاس دوڑتے تھے۔ جنگدال کے سارے سردار طاقتور اور بہادر تھے۔ انہیں اپنے قبائل کے مسائل اور مصیبتوں سے نمٹنا اچھی طرح آتا تھا۔ ماضی میں زیک نے بھی ایک دو عفریتوں کا خاتمہ کیا تھا مگر معاملات سنگین تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جنگدال پر عفریتوں کی فوج نازل ہوئی ہے۔ یا تو روحیں ان سے ناراض ہو چکی تھیں یا جنگدال بہت بڑے حملے کی زد میں تھا۔ زیک کو آس پاس کے قبائل سے بھی ایسی ہی شکایات سننے کو ملی تھیں اور آپس میں مشورے کے بعد ہی وہ شاکا کے پاس پہنچے تھے۔

شرقال کے لوگ بے چینی سے شاکا کا انتظار کر رہے تھے اور آتش فشاں کی چنگھاڑ نے انہیں اس کے قریب

ہونے کی اطلاع دی۔ وہ سارے قبیلے کے داخلی راستے پر سر جھکائے کھڑے ہو گئے۔

چند لمحوں بعد ہی وہ آٹھوں استقبال کے لیے داخلی راستے پر نمودار ہوئے۔ شاکا سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ ان ساتوں نے بھی اس کی پیروی کی۔

ان کے پیچھے پیچھے قبیلے کے باقی لوگ بھی اندر داخل ہوئے تھے۔ شاکا قبیلے کے وسط میں بنے سردار کے چبوترے پر جا بیٹھا۔ زیک اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے ساتوں بھائی چبوترے کے اردگرد کھڑے ہو کر پہرا دینے لگے۔

”سردار شاکا! کیا ہمارا علاقہ عفریتوں سے پاک ہو چکا ہے؟“ زیک نے سوال کیا۔

شاکا نے ایک گہری نظر ان سب پر ڈالی۔ وہ سب امید بھری نظروں سے اپنے سردار کی طرف سے خوشخبری کے منتظر تھے۔

”نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔“ شاکا بولا۔

وہ سارے بے چینی سے اپنے سردار کی طرف دیکھنے لگے۔

”مگر......“ زیک نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ شاکا نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کروا دیا۔

”جنتدال کو ہمیشہ سے ہی عفریتوں کا سامنا رہا ہے اور مجھ سمیت تم سب نے ان عفریتوں کو ہمیشہ شکست دی ہے مگر اس دفعہ یہ بہت زیادہ تعداد میں ہیں۔ چڈکال کے آخری کونے سے نکلے عفریت بھی جنتدال کا راستہ ڈھونڈ چکے ہیں۔ ان میں ایسے عفریت بھی شامل ہیں جو... طاقت یا ہتھیار سے ختم نہیں ہوں گے۔“ شاکا کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

ان سب کے چہروں پر پریشانی نظر آنے لگی۔

”سردار شاکا! آپ نے کیا سوچا ہے پھر؟“ زیک آگے کا لائحہ عمل جاننا چاہتا تھا۔

”بستی جنگلوں کے تمام سرداروں کو اکٹھا کرو۔ میں کل تک یہیں ہوں۔ یاد رکھو، طاقت ...... ذہانت اور صحیح لائحہ عمل کے بغیر کھوکھلی ہے۔ ہمیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا۔“ شاکا نے یہ کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

وہ سارے خاموشی سے اس چبوترے کے پاس سے ہٹ گئے۔ زیک نے چند لڑکوں کو اشارہ کیا اور وہ سر ہلا کر قبیلے کے اطراف میں پھیلے جنگل کی مختلف سمتوں میں دوڑ گئے۔ انہیں سرداروں کو اکٹھا کرنا تھا۔

قبیلے کے وسط میں موجود الاؤ میں لکڑیاں ڈال کر آگ کو مزید بھڑکایا جا رہا تھا۔ شاکا آنکھیں بند کیے روحوں سے رابطے کے عمل میں تھا جبکہ اس کے ساتوں پہرے دار چوکنا انداز میں قبیلے کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔

☆☆☆

Year 1723

Capiz-Philippines

ریٹزو نے سارا دن جنگل سے جمع کیے گئے نمونوں پر کام کیا تھا۔ کچھ مٹی کے نمونے، جہاں اسے جانوروں کے پیروں کے نشان نظر آئے تھے اور ایسے ہی آدھ کھائے پودے اور گھاس پھوس جنہیں وہ جمع کرتا آیا تھا مگر اسے کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ گزشتہ رات اس نے جنگل میں جس پرندے کے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز سنی تھی، وہ پرندہ بھی اس رات جنگل پر نہیں اترا تھا۔ یا تو یہ اس پرندے کا علاقہ نہیں تھا یا وہ ان کی موجودگی کو محسوس کر کے اس رات وہاں سے چلا گیا تھا۔

کاپز کے لوگ اس پرندے کو دیکھنے کے باوجود بھی رات کے اندھیرے کی وجہ سے اس کا صحیح حلیہ بیان کرنے سے قاصر تھے۔ اس نے اپنی کھوج کی شروعات انہی علاقوں سے کرنے کا فیصلہ کیا جہاں اس بڑے پرندے کو کثرت سے دیکھے جانے کے شواہد ملے تھے۔ کاپز کے شمالی علاقے سمندر قریب ہونے کی وجہ سے کالی چٹانوں سے بھرے پڑے تھے۔

یہ چٹانیں چھوٹے چھوٹے غاروں پر مشتمل تھیں مگر یہ غار اتنے چھوٹے تھے کہ یہاں انسانوں کا رہنا ناممکن تھا۔ ان چٹانوں میں عام طور پر چھوٹے جانور جیسے خرگوش یا سانپ وغیرہ کے بل کثرت سے پائے جاتے تھے۔ یہ علاقے بھی ہریالی سے بھرے ہوئے تھے مگر یہاں بڑے درختوں کے بجائے چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ریٹزو نے آج وہیں جانے کا فیصلہ کیا تھا اور اب اسی فیصلے پر عمل کرتے ہوئے وہ اور لورین، لوکس کی بگھی میں سوار شمالی علاقے کی طرف سفر کر رہے تھے۔ آج پورے چاند کی رات تھی لہٰذا انہیں اندھیرے کی فکر نہیں تھی لیکن ریٹزو نے احتیاطاً اپنے ساتھ لالٹین رکھوا لی تھی۔

گاؤں سے ایک گھنٹے کی مسافت طے کرنے کے بعد انہیں کالی چٹانیں نظر آنا شروع ہو گئیں۔ ریٹزو نے بگھی رکوا دی اور نیچے اتر آیا۔ آگے کا سفر وہ پیدل ہی طے کرنا چاہتا تھا۔ لورین نے تمام ضروری سامان ایک ٹوکری میں رکھا ہوا تھا۔ وہ تینوں چٹانوں کی طرف بڑھ گئے۔ یہ ایک اونچی

چٹان تھی جس پر کھڑے ہوکر ڈھلان میں موجود سمندر کو صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ سمندر پر شام اتر رہی تھی مگر اب بھی اتنا اجالا باقی تھا کہ ریئزو اچھی طرح اس علاقے کا جائزہ لے سکے۔ وہ تھوڑی دیر ان چٹانوں پر گھومتا رہا۔ یہاں بھی اس نے مختلف نمونے اکٹھے کیے۔ لورین اس کے ساتھ ہی تھی البتہ لوئس ایک طرف بیٹھا سمندر کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہورہا تھا۔

"درندے کے آنے سے پہلے یہ علاقہ رونق سے بھرپور تھا۔ ہمارے گاؤں کے لوگ یہاں دیر تک مچھلیاں پکڑتے تھے مگر اب دوپہر ڈھلتے ہی لوگ یہاں سے روانہ ہوجاتے ہیں۔" لورین کی آواز میں اداسی تھی۔ وہ ساحل کو حسرت سے تک رہی تھی۔

"میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ کافو کی رونق دوبارہ لوٹ آئے گی اور تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ چلو، میں تمہیں ساحل تک لے چلتا ہوں۔" وہ اس کے قریب آکر بولا۔

"مجھے اس بات کا یقین ہے لیکن میں ساحل پر نہیں اترنا چاہتی۔ نیچے جانے میں کافی وقت لگ جائے گا۔" وہ مسکرائی۔

"میں جلد ہی یہاں کے لوگوں کو اس بلا سے نجات دلا دوں گا۔" ریئزو نے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھا۔

"کیا آپ یہاں سے جلدی واپس جانا چاہتے ہیں؟" لورین کی آواز میں اداسی تھی۔

ریئزو نے چونک کر لورین کی طرف دیکھا۔ "کیا تم نہیں چاہتیں کہ کافو پہلے کی طرح پرسکون ہوجائے؟"

"بالکل چاہتی ہوں مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

ریئزو دم بخود ہوا۔ وہ اپنی پسندیدگی کا اظہار کررہی تھی۔ تو کیا وہ بھی ریئزو کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی تھی؟

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ میں یہاں سے اکیلا واپس نہ جاؤں۔" وہ معنی خیزی سے مسکرایا۔

اسے اظہار کردینا مناسب لگا تھا۔ آنے والے دنوں میں وہ اس درندے کا کھوج لگا کر اس کا خاتمہ کردیتا اور یہاں سے دارالحکومت روانہ ہوجاتا۔ وہ اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پہلے ہی وہ اپنی جوانی کا سنہرا دور تعلیم اور ریسرچ پر لگا چکا تھا۔ اسے اب شریک حیات کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی مگر پینتیس کی عمر کو پہنچنے تک اس کے ماں باپ اس دنیا سے چل بسے تھے۔ اپنے کام کی وجہ سے وہ سماجی تقریبات سے بھی دور رہتا تھا لہٰذا کسی خاتون کے اتنا قریب نہیں جاسکا تھا کہ اسے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا سوچتا۔ لورین کو دیکھتے ہی اس کے دل نے شدت سے اسے زندگی میں شامل کرنے کی خواہش کی تھی۔

مگر یہاں بھی ریئزو کی ازلی جھجک آڑے آگئی تھی۔ وہ خود پہل سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا اور لورین سے بات کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔ لورین نے بالآخر خود ہی اظہار کردیا تھا تو وہ بھی ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

لورین اس کی بات پر مسکرا کر خاموش ہوگئی۔ ریئزو نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہم دارالحکومت میں ایک نئی زندگی شروع کریں گے لورین!" ریئزو پُرامید لہجے میں بولا۔

"اہم۔۔۔ اہم۔۔۔" لوئس نے اس کی پشت پر آکر اپنا گلا کھنکھارا۔

لورین نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا مگر اب وہ شرما رہی تھی۔

"میں معافی چاہتا ہوں کہ میں ایک اہم لمحے کے دوران مداخلت کررہا ہوں مگر اندھیرا تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اگر یہاں کا کام ختم ہوگیا ہے تو ہمیں چلنا چاہیے۔ یہ علاقہ خطرے سے خالی نہیں۔" لوئس سنجیدگی سے بولا۔

"ہاں، ہمیں نکلنا چاہیے۔" ریئزو نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے کوئی خاص شواہد نہیں ملے تھے۔ وہ تینوں بھی گاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ فضا ایک تیز چنگھاڑ سے گونج گئی۔ وہ جہاں تھے وہیں جم گئے۔ چنگھاڑ کے ساتھ ہی پروں کی پھڑپھڑاہٹ بھی واضح طور پر سنائی دی تھی۔

"جلدی کرو، اس چٹان کی اوٹ لے لو۔" ریئزو نے ایک بڑی چٹان کی طرف اشارہ کیا اور وہ تینوں بھاگتے ہوئے اس چٹان کے پیچھے جا چھپے۔

وہ جو بھی درندہ تھا، چٹانوں کے نچلی طرف ڈھلان پر موجود تھا۔ چنگھاڑ ایک بار پھر سنائی دی۔ ان کے چہروں پر خوف کے سائے لہرانے لگے۔ وہ درندہ جو ایک عرصے سے کافو کے لوگوں کا شکار کررہا تھا، آج ان کے سامنے آنے والا تھا۔

ریئزو نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور احتیاط سے چٹان کی اوٹ لے کر نیچے جھانکنے کی کوشش کی۔ چٹانیں ڈھلان کی صورت میں ساحل تک جارہی تھیں۔ درندہ انہی چٹانوں میں موجود کسی غار سے باہر نکلا تھا۔

ریزو کو کسی لڑکی کی پشت نظر آئی۔ وہ ساحل کے قریب کھڑی تھی۔ اس کا جسم برہنہ تھا مگر جسم کی کھال میں نیلاہٹ تھی۔ ریزو تیزی سے نیچے بیٹھا۔

"یہ تو کوئی وہم نہیں لگ رہا۔" ریزو بڑبڑایا۔

اب وہ تینوں اس لڑکی کو دیکھ سکتے تھے مگر وہ ان کی طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ لوئس کی آنکھوں میں حیرت تیر گئی۔ اس وقت کون سی لڑکی برہنہ ہو کر ساحل پر آنے کی جرأت کر سکتی تھی۔

لورین کے چہرے پر حیرت کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی تھی۔ لورین نے کچھ کہنا چاہا مگر ریزو نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی چھٹی حس کسی خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔

اچانک ان کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ ان کے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔

وہ لڑکی ایک بار پھر چنگھاڑی اور اس کے چنگھاڑتے ہی اس کے جسم کا اوپری حصہ نچلے دھڑ سے الگ ہو کر ہوا میں بلند ہوا اور اوپری دھڑ کے ہوا میں بلند ہوتے ہی اس کے بازوؤں کے نچلے حصے سے چمگادڑ جیسے لمبے اور بڑے پر نکل کر ہوا میں لہرائے۔

اب اس لڑکی نے ہوا میں بلند ہونا شروع کیا۔ اچانک وہ پلٹی اور ریزو کو اپنی روح نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس لڑکی کا چہرہ بہت بھیانک تھا۔ اس کے منہ سے باہر نکلے وہ ان گنت لمبے دانت اور خوفناک لال آنکھیں کسی کو بھی اس کی ایک جھلک دکھاتے ہی موت کی نیند سلا دینے کے لیے کافی تھیں۔ شکر تھا کہ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا ورنہ وہ تینوں اس کی نظروں میں بہ آسانی آ جاتے اور اس کا شکار بن جاتے۔ وہ تھوڑی دیر تک اسی طرح ادھر ادھر پر مار کر چنگھاڑتی رہی۔ شاید اسے ان کی موجودگی محسوس ہو رہی تھی لیکن اچانک ہی وہ وہاں سے اونچی پرواز بھر کر جنگلوں کی طرف غائب ہو گئی۔ ریزو نے رکی ہوئی سانس بحال کی اور لوئس کے سفید پڑتے چہرے پر نظر ڈالی۔

ریزو نے اس کا کندھا ہلا کر اسے ہوش دلایا اور لورین کی طرف پلٹا مگر لورین بے ہوش ہو چکی تھی۔ ریزو نے شکر ادا کیا کہ لورین نے بے ہوشی سے پہلے چیخ نہیں ماری تھی ورنہ ان سب کی موت یقینی تھی۔ ریزو نے لوئس کو لورین کو سنبھالنے کا اشارہ کیا اور ایک بار پھر چٹان سے پیچھے جھانکا۔

اس بلا کا دھڑ ابھی تک وہیں موجود تھا اور اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ ریزو سانس روکے دوبارہ نیچے بیٹھ گیا۔ کیا پتا یہ دھڑ بھی پہرا دے رہا ہو اور ان کی موجودگی کے بارے میں اس کو مطلع کر دے۔

ریزو نے لوئس کو فوری طور پر وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ لوئس نے لورین کو گود میں اٹھایا اور وہ دونوں احتیاط سے چلتے ہوئے اس چٹانی علاقے سے باہر نکل آئے۔

یہی عقل مندی تھی کہ انہوں نے جیپ چٹانوں سے کافی دور کھڑی کی تھی ورنہ گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز ان کی موت کا پروانہ جاری کرنے کے لیے کافی تھی۔ انہوں نے لورین کو جیپ میں لٹایا اور گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔

ریزو ابھی تک سوچنے سمجھنے کی حالت میں نہیں تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ آج تو رات کی تاریکی نے انہیں بچا لیا تھا ورنہ ریزو کی بندوق بھی انہیں اس بلا سے نہ بچا پاتی۔

☆☆☆

Year 2020

Vostok Research Center

جوشوا کو ویکسین کی ڈوز دیے بارہ گھنٹے بیت چکے تھے مگر وہ اب تک بے ہوش تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن اور خون کا دوران نارمل تھا۔ ہیری گزشتہ رات سے ایک منٹ کے لیے بھی اسکرین کے سامنے سے نہیں ہلا تھا۔ جوشوا کی حالت دیگر اسٹاف سے خفیہ رکھا گیا تھا۔

شمشیر، جوشوا کی لمبی بے ہوشی کی وجہ سے پریشان تھا مگر جیکال اطمینان سے جوشوا کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا۔

اور بالآخر بارہ گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد جوشوا کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اسے آہستہ آہستہ ہوش آ رہا تھا۔ ان لوگوں نے ابھی تک اسے اسٹریچر پر ہی لٹا رکھا تھا۔ یہ احتیاط کسی بھی غیر متوقع رد عمل سے بچنے کے لیے کی گئی تھی۔ تھوڑی دیر کوشش کرنے کے بعد جوشوا آنکھیں کھولنے میں کامیاب ہو گیا مگر اسے اپنے حواسوں میں لوٹنے میں کچھ وقت لگا تھا۔

"جیکال..... شمشیر!" اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کلپس کی وجہ سے وہ ناکام رہا۔

"یہ..... یہ کیا؟" اس نے خود کو جکڑے دیکھ کر سوال کیا۔

"جوشوا! اب کیسا محسوس کر رہے ہو تم؟" جیکال نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کیوں، مجھے کیا ہوا تھا؟" وہ اب تک الجھن میں تھا۔

شمشیر نے پریشانی سے جیکال کی طرف دیکھا۔ جیکال نے ہیری کو اشارہ کیا۔ ہیری نے "سب او کے ہے"

کا اشارہ کیا۔ جوشوا کا دماغ پوری طرح کام کر رہا تھا۔

''ہم نے تمہیں ویکسین لگائی تھی۔ اس کے بعد تم بارہ گھنٹے بے ہوش رہے ہو۔'' جیکال نے کھل کر بات کرنے کا ارادہ کیا۔ جوشوا کوئی عام انسان نہیں تھا۔ اس کے اعصاب مضبوط تھے۔ جبھی وہ یہ جھٹکا برداشت کر گیا تھا اور اب جتنا جلدی ممکن ہو اسے ہوش دلانا ضروری تھا۔

جوشوا کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اس کے ذہن میں وہ سارے مناظر فلم کی طرح چلنے لگے۔ اس نے بے اختیار دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی۔

''اوہ، یہ تو کھولو۔'' وہ جھنجلایا۔

جیکال اور شمشیر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے آزاد کرو ان تجسس سے۔'' وہ ان کی پریشانی بھانپ کر بولا۔

جیکال نے آگے بڑھ کر کلپس کھول دیے۔ جوشوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہیری بھی کمپیوٹر اسکرین کے سامنے سے اٹھ کر اسٹریچر کے پاس آ گیا۔

''کیا محسوس کر رہے ہو؟'' ہیری نے اسے اپنا جسم دباتے دیکھ کر سوال کیا۔

جوشوا کوئی جواب دیے بغیر اسٹریچر سے اتر کر کھڑا ہو گیا اور اب وہ چل پھر کر دیکھ رہا تھا۔ وہ تینوں خاموش کھڑے اس کی حرکات پر غور کرتے رہے۔

''حیرت انگیز۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''تم جانتے ہو تا مجھے نوجوانی میں ایک حادثے کی وجہ سے اپنے گھٹنے کی سرجری کروانا پڑی تھی اور میری بائیں ٹانگ چلتے وقت بے انتہا تکلیف کرتی تھی۔'' وہ ان تینوں کو دیکھ کر مخاطب ہوا۔

انہوں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مجھے اس درد کا شائبہ تک محسوس نہیں ہو رہا اور یہ دیکھو...'' اس نے اپنے بازو ان کے سامنے کیے جہاں واضح طور پر پٹھوں کی نشوونما دیکھی جا سکتی تھی۔

ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ جوشوا کی جسمانی ساخت کمزور تھی مگر اس وقت وہ کسی پہلوان کی طرح طاقتور لگ رہا تھا۔

''اوہ..... حیرت انگیز۔'' جیکال نے آگے بڑھ کر اس کے بازو تھامے۔

''یعنی کہ ہم کامیاب ہو گئے۔'' شمشیر کا چہرہ فرط جذبات سے لال ہو رہا تھا۔

جوشوا نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''اس خوشی میں وائن ہو جائے؟'' ہیری کو ہمیشہ کی

پچاس سالہ شفاعت صاحب ہوٹل کی لابی میں اپنی بیگم کے ساتھ بیٹھے تھے۔ سامنے ہی ایک لفٹ میں انہوں نے ایک خاتون کو اوپر جاتے دیکھا جن کے ساتھ دس بارہ سال کی ایک بچی بھی تھی۔ چند منٹ بعد ہی وہ خاتون لفٹ میں واپس آتی دکھائی دیں لیکن اب ان کے ساتھ جو بچی تھی، وہ صرف دو ڈھائی سال کی تھی۔

شفاعت صاحب اپنی بیگم کو اس طرف متوجہ کرتے ہوئے بولے۔ ''کیا خیال ہے بیگم! اگر تم بھی ان خاتون کے ساتھ اس لفٹ میں ایک چکر لگا آؤ تو کیا ہی اچھا ہو۔''

(مرسلہ: امبر ناز، سکھر)

☆☆☆

فراز صاحب نے ایک روز بازار سے گزرتے وقت سر اٹھا کر دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گئے۔ سامنے ایک باربر شاپ پر بورڈ لگا تھا۔

''صرف دس روپے میں بال کٹوایئے۔''

''بھئی کمال ہے۔'' فراز صاحب بے یقینی سے بڑبڑائے۔ ''اتنے کم پیسوں میں حجامت کیسے ہو سکتی ہے؟''

اچانک ان کی نظر برابر کی دکان پر پڑی۔ وہ بھی باربر شاپ تھی اور اس پر بورڈ لگا تھا۔

''دس روپے میں کٹوائے گئے بال یہاں درست کیے جاتے ہیں۔''

(مرسلہ: پرویز علی، سرگودھا)

☆☆☆

کتابوں کی دکان میں کافی دیر سے موجود خاتون اچانک کاؤنٹر پر پہنچیں اور بولیں۔ ''آپ کا کمپیوٹر کی کتابوں کا شعبہ کس طرف ہے؟''

بڑی سی دکان کے مالک نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان اونچی شیلفوں کے پیچھے۔'' پھر اس نے خوش خلقی سے پوچھا۔ ''کیا آپ کو کسی خاص چیز کی تلاش ہے؟''

''جی ہاں۔ اپنے شوہر کی۔'' خاتون نے جواب دیا۔

(مرسلہ: لائبہ شاہ زیب، کراچی)

طرح وائن یاد آئی۔

"ضرور، ضرور۔ آج تو میں بھی پیوں گا۔ بلکہ مجھے بہت بھوک بھی لگی ہے۔ تم فریڈ سے کہہ کر کھانا اور وائن یہیں منگوا لو۔" جوشوا کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کا سب سے بڑا خواب پورا ہو چکا تھا اور وہ اپنے جسم میں الگ طرح کی توانائی دوڑتی محسوس کر رہا تھا۔

"مگر تمہارا تجربہ خفیہ رکھنا ہے۔" ہیری چونکا۔

"اب کچھ بھی خفیہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میرا تجربہ کامیاب ہو چکا ہے۔ میں آج ہی حکومت سے رابطہ کر کے ویکسین کے کامیاب تجربے کی اطلاع دیتا ہوں۔" جوشوا بولا۔

اس کے رویے میں بھی واضح تبدیلی آئی تھی۔ وہ پہلے والا خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والا جوشوا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جو بہت دن تک صرف کافی اور بسکٹ پر زندہ رہ سکتا تھا، اب بھوک اور کھانے کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کا یہ رویہ ان سب کے لیے بھی حیران کن تھا۔

ہیری انٹرکام کی طرف بڑھ گیا۔ فریڈ کو کھانا لانے کی ہدایات دے کر وہ دوبارہ جوشوا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تمہیں نہیں لگتا کہ تم حکومت کو بتانے میں جلدی کر رہے ہو؟ تم نے بندر پر تجربے کے بعد اڑتالیس گھنٹے انتظار کیا تھا۔" جیکال بولا۔

"اڑتالیس گھنٹے میں اس بندر کے جسم میں مثبت تبدیلی ہی دیکھنے کو ملی تھی اور اس وقت میں بندر کی ذہنی اور جسمانی حالت کو محسوس نہیں کر سکتا تھا مگر اب میں خود کو بہت طاقتور محسوس کر رہا ہوں۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ یہ توانائی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اب مزید دیر نہیں کرنا چاہتا۔ یہاں بیٹھ کر اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمیں اس ویکسین کو فوجیوں کے جسموں میں منتقل کرنا شروع کر دینا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیا ہماری اس کامیابی کو رشک سے دیکھے اور یہ کام پورا کرتے ہی میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں تاکہ اس نئی زندگی کو بھرپور طریقے سے گزار سکوں۔" وہ کوئی اور ہی جوشوا تھا۔ اس میں پہلے جیسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ سارے خاموشی سے اس کی بات سنتے رہے۔

لیب کے دروازے سے منسلک کیمرے کی اسکرین پر فریڈ کی تصویر ابھری۔ وہ کھانے کی ٹرالی لیے کھڑا تھا۔ جوشوا نے اٹھ کر لیب کے خودکار دروازے کا بٹن دبا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ فریڈ ٹرالی گھسیٹتا اندر آیا۔ پورے بارہ گھنٹے اس لیب میں بند رہنے کے بعد بالآخر ہیری نے اسے انٹرکام کر کے کھانا لانے کو کہا تھا۔ اس کی تجسس طبیعت اسے کل رات سے ہی یہاں آنے کے لیے اکسا رہی تھی اور جب ہیری نے انٹرکام کر کے کھانا لانے کو کہا تو وہ اپنے مددگاروں کو بھیجنے کے بجائے خود ہی چلا آیا۔

اسے شک ہو رہا تھا کہ یہاں کوئی بم بنایا جا رہا ہے مگر لیب پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد اسے شدید مایوسی ہوئی۔ یہ لیب تو باقی لیبز کی طرح ہی تھی۔ پھر یہ سب کل سے یہاں بند ہو کر کیا کر رہے تھے اور کیوں اس بات کو اتنا خفیہ رکھا گیا تھا؟

وہ ایک طرف رکھی میز پر کھانا لگانے لگا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اسے دیکھ کر یہ چاروں خاموش ہو گئے۔ وہ ٹرالی خالی کر کے جانے کے لیے پلٹا مگر اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ جوشوا، جوشوا نہیں تھا۔ وہ بدل چکا تھا۔ اس کا کمزور جسم اس وقت کسی پہلوان کے جسم کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ اس کے قد کاٹھ میں بھی واضح تبدیلی دیکھی جا سکتی تھی۔

"کیا ہوا، ٹھہرے کیوں ہو؟" جیکال اسے جوشوا کی طرف متوجہ پا کر بولا۔

"نہیں، کچھ نہیں۔ کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں؟" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

ہیری نے نفی میں سر ہلا کر اسے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ ٹرالی گھسیٹتا باہر نکل آیا۔ لیب کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بند دروازے کو تکتا رہا اور پھر لیب کی راہداری میں ٹرالی گھسیٹتا ہوا چلنے لگا۔

"یہ... یہ کیسے ہوا؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا یہ کوئی دوائی ہے؟ جوشوا اتنا طاقتور کیسے ہو گیا؟ کیا یہ آبِ حیات ہے؟ اس کی تو مجھے بھی ضرورت ہے... مجھے بھی چاہیے۔" وہ خود کلامی کرتے ہوئے بڑبڑایا۔ اس کے ذہن نے ایک بڑا منصوبہ ترتیب دینا شروع کر دیا تھا جو اس کے لیے صرف تباہی ہی لے کر آنے والا تھا۔

☆☆☆

Year 1723

Capiz-Philippines

ریزو نے ایک نظر لورین کے چہرے پر ڈالی اور دوبارہ کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ لورین سمندر سے واپس لوٹنے کے بعد بہت خوفزدہ تھی اور اسے اسی خوف کی وجہ سے بخار نے آ لیا تھا۔ فلیس، لورین کی طبیعت خرابی کی وجہ سے پریشان ضرور ہوا تھا مگر ریزو نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ لورین صبح تک بالکل تندرست ہو گی۔ اس نے لورین کو سکون کا انجکشن لگا دیا تھا اور وہ اسی انجکشن کے زیر اثر گہری نیند

سو رہی تھی۔

لورین نے نیند کا غلبہ طاری ہونے سے پہلے ریزو سے اس رات اپنے کمرے میں رکنے کی درخواست کی تھی جسے ریزو نے بالآخر قبول کرلیا تھا۔ وہ لائبریری سے اپنی کتابیں اٹھا کر لورین کے کمرے میں آگیا۔ لوئس بھی اسی کمرے میں ایک طرف بستر بچھائے سو رہا تھا لیکن ریزو کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ آج جو اس نے دیکھا تھا وہ ناقابل یقین تھا۔ وہ گاؤں والوں کو کیسے یقین دلاتا جبکہ وہ خود اب تک بے یقینی کی کیفیت میں تھا۔ وہ کافی دیر کتابیں کھنگالتا رہا مگر اس طرح کے جاندار کی تفصیل کسی کتاب میں موجود نہیں تھی۔ اس نے بیزاری سے ہاتھ میں پکڑی کتاب ایک طرف رکھی اور اٹھ کر کافی بنانے چل دیا۔ ابھی اسے بہت کام کرنا تھا۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ وہ آتش دان کے پاس رکھی کرسی پر آ بیٹھا۔ کافی نے واقعی جادو جیسا کام کیا۔ وہ خود کو بہت چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔

"تو کیا ہوا اگر اس بلا کی تفصیل کسی کتاب میں نہیں لکھی۔ میں لکھتا ہوں اس پر کتاب۔ بلکہ اپنے شکار کی داستان تحریر کرتا ہوں۔" اس نے ذہن سے کام کرنا شروع کیا۔

اس نے اپنی ڈائری اٹھائی اور کل رات کے شکار کی تفصیلات اپنی ڈائری میں نوٹ کرنے لگا اور پھر اچانک ہی اس کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ اس نے خالی صفحہ کھولا اور اس بلا کا خاکہ تیار کرنے لگا۔ اس خاکے کے ذریعے وہ گاؤں والوں اور دارالحکومت کے لوگوں کو دکھا سکتا تھا کہ ان کے اوپر کیا خطرہ منڈلا رہا ہے اور آگے چل کر اس مخلوق پر مزید ریسرچ بھی کر سکتا تھا۔

اس کی ماہر انگلیاں تیزی سے اس صفحے پر خاکہ تیار کرنے میں مصروف تھیں اور وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ موت اس کی بو سونگھتے ہوئے گاؤں میں داخل ہو چکی ہے۔

وہ گزشتہ رات بھی اپنے شکار کا انتظار کرتی رہی مگر وہ جھیل کی طرف نہیں آئے تھے۔ وہ خود ہی جنگل سے نکل کر گاؤں کی طرف آ نکلا۔ گاؤں سنسان پڑا تھا۔ اس نے اپنی لال آنکھیں چاروں طرف گھمائیں۔ اسے شکار کی تلاش تھی۔ آج وہ اپنی بھوک مٹا کر ہی یہاں سے جانے والا تھا۔

ریزو کو خاکہ تیار کرتے ہوئے عجیب سے احساس نے گھیرا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نہ جانے کیوں ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہوئی تھی۔ وہ کھڑکی کی طرف آیا اور پردے کو ذرا سا ہٹا کر باہر جھانکا مگر اگلے ہی لمحے وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔ فلپس کے گھر سے کچھ دور موجود کنویں کے پاس کوئی دیو قامت مخلوق کھڑی تھی۔ اس کے سر پر الجھے سینگوں کا جال تھا۔ جسم پر جگہ جگہ بال اگے تھے مگر پسلیوں پر تو اس کی تھی نہ کھال۔ اس کی گردن پر سیہہ کی طرح بڑے بڑے کانٹے اگے تھے۔ منہ کسی بھیڑیے سے مشابہت رکھتا تھا مگر اس کی چمکتی اور بڑی آنکھیں اسے وحشت ناک بنا رہی تھیں۔ ہاتھ اور پاؤں کی انگلیاں کسی درخت کی ٹہنیوں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ اس کے چلنے سے عجیب سی دھمک پیدا ہو رہی تھی۔ وہ منہ سے رال ٹپکاتا ہلکی آواز میں غرا رہا تھا۔

اچانک وہ فلپس کے گھر کی سمت پلٹا۔ ریزو نے جلدی سے پردے کا کونا چھوڑا اور کھڑکی کے ساتھ لگ کر سانس روک لی مگر وہ اس بلا کے اپنی طرف بڑھتے قدموں کی دھمک واضح طور پر سن سکتا تھا۔ شاید وہ اسے دیکھ چکی تھی۔

اچانک اسے کھڑکی کے شیشے پر اس بلا کا سایہ نظر آیا اور ریزو کو اپنی موت کا یقین ہو چلا۔

☆☆☆

Year 1723

Jungdaal-Parallel Universe

شاکا پچھلے دو گھنٹے سے آنکھیں بند کیے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ وہ آج روحوں سے ان عفریتوں کے خاتمے کا طریقہ پوچھنے آیا تھا۔ شرقال میں اس کا سامنا جس عفریت سے ہوا تھا، اس کے بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہر جگہ طاقت نہیں چلے گی۔ گزشتہ کچھ دنوں میں اس کا سامنا طرح طرح کے عفریتوں سے ہوتا رہا تھا۔ وہ جنگل میں اکثر ہی رات جنگ کر جنگدال آیا کرتے تھے اور انہیں صرف طاقت سے ہی ختم کیا جا سکتا تھا۔ وہ [illegible] اور [illegible] سے بھرے بھیجے خون آشام درندے اکثر ہی شاکا کے غضب کا نشانہ بنتے تھے اور ان سب کو مارنا اس کے لیے بہت آسان تھا مگر وادنس والا عفریت خون بھی مانگ رہا تھا۔ اسے پکڑنے اور ختم کرنے کا طریقہ یقیناً کچھ اور تھا۔ شرقال میں اپنے قیام کے دوران وہ باقی سرداروں سے بھی ملا تھا اور اس بار اس نے عفریتوں کے حلیے اور حملے کے طریقے جاننے کی کوشش کی تھی۔ اسے یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ ہر سردار الگ حلیہ بتاتا تھا اور حملے کے طریقے بھی الگ تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جنگدال پر عفریتوں کی مختلف اقسام نے حملہ کیا تھا۔ روحوں سے پچھلی ملاقات میں اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ کسی نے بدکال کا دروازہ کھولا تھا اور یہ سارے عفریت وہیں سے آ رہے تھے مگر باقی تفصیلات جانے بغیر وہ ہمیشہ کی طرح ان کے خاتمے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔

شرقال سے تمام معلومات اکٹھی کرنے کے بعد اس نے شاکال واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ اب وہ روحوں سے بات کیے بغیر اگلا قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا اور اسی وجہ سے آج وہ گھنے درختوں اور بادلوں سے گھرے جنگل کے وسط میں موجود ہزاروں سال پرانے اس برگد کے نیچے آبیٹھا تھا جہاں روحیں اس سے ملاقات کے لیے آتی تھیں۔ اس کے ساتوں بھائی اسی جنگل کی حدود میں پہرا دے رہے تھے۔ روحوں سے ملاقات کے دوران وہ کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کرتا تھا۔

جنگل میں رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ غفراش کی آواز پر شاکا نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ غفراش اڑتا ہوا اسی برگد پر آبیٹھا۔ غفراش کی چنگھاڑ اس بات کا اشارہ تھی کہ روحیں شاکا سے ملنے آرہی ہیں۔ اچانک شاکا کو بادلوں نے گھیر لیا۔ شاکا نے گہری سانس لے کر گردن کو ہلکا سا خم دیا۔ بادلوں کے مرغولے سے سرسراتی ہوئی آوازیں بلند ہوئیں جو سرگوشیوں میں بدلتی گئیں اور بالآخر وہ بادل سائے کی صورت اختیار کر کے شاکا کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

وہ ایک بار پھر روحوں سے رابطے میں کامیاب رہا تھا۔

”کیا چاہتے ہو؟“ سائے سے سرسراتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

”جنگل پر نازل ہونے والی مصیبتوں کے نام، ان کے کام اور ان کے خاتمے کا طریقہ۔ بدکال کا دروازہ کھولنے والے کا نام اور پتا۔“ شاکا کو ایک ہی دفعہ بولنے کی اجازت تھی لہٰذا اس نے ایک ہی سانس میں سارے سوال دہرا دیے۔

سایہ سرسرایا اور چکر کی طرح گردش کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ یہ چکر تھمنے لگا اور پھر شاکا کے سامنے روشنی کا ایک ہالہ نمودار ہوا مگر سایہ اپنی جگہ پر دوبارہ قائم ہو گیا۔

شاکا نے اپنی نظریں روشنی کے ہالے پر گاڑ دیں۔ وہاں وینڈیگو کی تصویر ابھری۔

”پہلا عفریت وینڈیگو ہے۔“ سائے سے سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔ ”یہ جسمانی طور پر انسان سے بڑا ہے۔ اس کا منہ بھیڑیے کی طرح ہوتا ہے۔ اس کی غذا انسانی گوشت اور خون ہے۔ یہ درختوں سے گھرے علاقے میں چھپ کر رہتا ہے۔ اسے مقابلہ کر کے ہرایا جا سکتا ہے۔ یہ انسان پر حملہ کرتے ہوئے اکثر اپنے الجھے سینگ پیٹ میں گھونپ دیتا ہے لہٰذا اس کے سینگوں سے بچنا ہوگا۔“

شاکا کہنا چاہتا تھا کہ وہ اب تک ان گنت وینڈیگوز کا خاتمہ کر چکا ہے مگر خاموش رہا۔ اگر وہ بول پڑتا تو روحوں سے اس کا رابطہ ختم ہو سکتا تھا۔

اچانک روشنی کے ہالے پر ایک برہنہ عورت کی تصویر ابھری۔ اس کا جسم نیلا تھا۔ اچانک اس کا اوپری دھڑ نچلے دھڑ سے الگ ہو کر ہوا میں بلند ہوا اور چمگادڑ کی طرح ہوا میں اڑنے لگا۔ اس کے دانت کسی خون آشام بلا کی طرح باہر نکل آئے تھے۔ نچلا دھڑ الگ ہونے کے باوجود اپنی جگہ کھڑا رہا۔

”مانانگل!“ سائے سے آواز ابھری۔ ”یہ سمندری علاقوں کے قریب رہنا پسند کرتی ہے اور رات کو ہی شکار کے لیے نکلتی ہے۔ اس کی غذا حاملہ عورتیں اور رحم میں موجود بچے ہیں۔ یہ اپنی زبان لمبی کر کے اس کے ذریعے عورتوں کا دل نکال کر کھا جاتی ہے اور ایسا ہی یہ ماں کے پیٹ میں موجود بچوں کے ساتھ کرتی ہے۔ نئے شادی شدہ جوڑوں کو ڈرانا اس کا مشغلہ ہے۔ اگر سورج نکلنے سے پہلے اس کے نچلے دھڑ پر لہسن اور نمک کا سفوف بنا کر چھڑک دیا جائے تو اس کا اوپری دھڑ اپنے نچلے دھڑ سے واپس جڑنے میں ناکام ہو جاتا ہے اور سورج نکلتے ہی دونوں دھڑ جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔ اس پر کوئی اور ہتھیار اثر نہیں کرتا۔“

ہالے پر تیسری تصویر ابھری۔ جھیل کے کنارے کوئی شخص بیٹھا وائلن بجا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اچانک اس نے سفید گھوڑے کی شکل اختیار کی اور جھیل میں کود گیا۔

”یہ کون ہے؟“ سایہ سرسرایا۔ ”یہ پانی کی روح ہے۔ یہ جھیل یا ٹھہرے پانی کے آس پاس کے علاقوں میں رہتا ہے۔ یہ وائلن بجا کر انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ آواز انسانوں پر طلسم طاری کر دیتی ہے اور یہ انہیں جھیل میں ڈبو کر مار ڈالتا ہے۔ یہ اکثر سفید گھوڑے کی شکل میں بھی جھیل کے آس پاس گھومتا نظر آتا ہے۔ جو بھی اس پر سوار ہو جائے، یہ اسے لے کر جھیل میں کود جاتا ہے۔ اس کا طلسم توڑنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس کا نام لے کر اسے تین بار پکارا جائے اور اسے ختم کرنے کے لیے چاندی کی دھات کو پگھلا کر اس جھیل کی تہ میں بچھا دیا جائے جہاں یہ رہتا ہے۔“

شاکا نے ایک گہری سانس لی۔ شرقال کے جنگلوں میں اس کا سامنا اسی عفریت سے ہوا تھا۔

ہالے پر اب چوتھی تصویر ابھر رہی تھی۔ یہ ایک دیوقامت مکڑی تھی جس کے سر کی جگہ ایک عورت کا سر لگا تھا مگر عورت کی شکل انتہائی کریہہ تھی۔

"جورو گوموا!" ساحرے نے بولنا شروع کیا۔ "یہ آبشاروں کے درمیان بنے غاروں میں رہتی ہے اور آس پاس گھومنے والے لوگوں کو جال پھینک کر اپنے لیے پنجوں میں پھنسا لیتی ہے۔ یہ انسانوں کا سر چبا کر ان کا دھڑ آبشار کے پانی میں بہا دیتی ہے۔ اس سے لڑنا ناممکن ہے کیونکہ اس کا جال بہت مضبوط ہوتا ہے۔ اسے مارنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ جب یہ انسان کو جال میں پھنسا کر اپنی طرف کھینچ رہی ہو تو وہ انسان لکڑی کا تنا اپنے ہاتھ میں پکڑنے اور اس کے سر چبانے سے پہلے وہ تنا اس کے منہ میں گھسا دے۔"

ہالے پر اب پانچویں تصویر ابھری تھی۔ یہ ایک عورت کی تصویر تھی جس کا جسم سانپ جیسا تھا۔

"شیمیا... دیکھنے میں خوبصورت مگر بے حد خطرناک۔ یہ صرف بچوں کو کھانا پسند کرتی ہے اور انہیں سالم نگل جاتی ہے۔ یہ جنگلوں سے ملحقہ گاؤں کی سرحدوں پر بلوں میں رہنا پسند کرتی ہے۔ اس پر کوئی ہتھیار اثر نہیں کرتا۔ صرف اس کی آنکھیں نکالنے سے ہی اس کی موت واقع ہوتی ہے۔"

اب ہالے پر ایک چیتے اور بھیڑیے جیسا انسانی جسم تصویر ہوا تھا۔ وہ دو پیروں پر کھڑا تھا۔ اس کے جسم پر بال نہیں تھے۔ آنکھیں کالے رنگ کی تھیں اور ناک تک پھیلی ہوئی تھیں۔ زبان سانپ کی طرح باہر نکلی ہوئی تھی۔ اس کا قد بھی چھوٹا تھا۔

"چوپاکابرا! یہ انسانوں اور پالتو جانوروں کا خون پیتا ہے۔ یہ گھنے جنگلوں میں رہتا ہے۔ اس کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ اسے مارنے کے لیے اس کا نرخرہ ادھیڑنا کافی ہوتا ہے۔ اس کے جسم کے باقی حصوں کا گوشت سخت ہوتا ہے اور صرف اس کا نرم نرخرہ ہی اس کی موت کا سبب بنتا ہے۔"

ہالے نے ساتویں تصویر واضح کی۔ یہ انسان نما ایک گلی سڑی لاش تھی جس کے جسم سے گوشت پھٹ کر لٹک رہا تھا۔

"اما لاجنگ۔ یہ جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھا رہتا ہے اور انسانی خون پینے کے لیے حملہ کرتا ہے۔ ان سے بچنے کے لیے زگ زیگ بھاگنا چاہیے کیونکہ اما لاجنگ صرف سیدھی سمت میں ہی چل سکتا ہے۔ اس پر بھی کوئی ہتھیار اثر نہیں کرتا بلکہ کاٹنے یا مارنے سے یہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوجاتا ہے اور دوبارہ حملہ کرتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے درخت پر بھی چھپا جاسکتا ہے۔ اسے پانی سے خوف آتا ہے اور اسے ڈبو کر ہی مارا جاسکتا ہے۔"

ہالہ غائب ہوگیا تھا۔ شاکا نے ساحرے کی طرف دیکھا۔

"جنڈال میں اب تک صرف یہی عفریت اترے ہیں۔ ان کی تعداد ابھی کم ہے مگر یہ تعداد بڑھ سکتی ہے۔ بدکال کا دروازہ جب تک بند نہیں ہو جاتا یہ اسی طرح آتے رہیں گے۔ بدکال کا دروازہ زمین پر کھولا گیا۔ لہٰذا اسے بند کرنے کے لیے تمہیں ان کی دنیا میں ہی اترنا ہوگا۔ تمہیں وہاں سفر کرنے کا دروازہ معلوم ہے۔ یہ عفریت وہاں بھی اتر رہے ہیں مگر ان کی تعداد ابھی زمین پر کم ہے کیونکہ زمین پر جانے سے پہلے انہیں جنڈال سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ بدکال کا دروازہ بند کرنے کے بعد تمہیں اس کا بھی خاتمہ کرنا ہوگا جس نے یہ دروازہ کھولا ہے۔ ورنہ آنے والے وقتوں میں وہ مزید تباہی لا سکتا ہے۔ یہ ہے دروازہ کھولنے والی کی شبیہ۔"

روشنی کا ہالہ ایک بار پھر نمودار ہوا۔ شاکا نے اس چہرے کو یادداشت میں محفوظ کیا۔

"اس دروازے کو بند کرنے کے لیے تمہیں کافر جانا ہوگا۔" سایہ یہ بول کر غائب ہو چکا تھا۔

شاکا کے ارد گرد چھائے بادل چھٹ رہے تھے۔ اسے اس کے سارے سوالوں کے جواب مل چکے تھے۔ اب اسے آنے والے وقت کے لیے لائحہ عمل تیار کرنا تھا اور پھر بدکال کا دروازہ کھولنے والے کا خاتمہ۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ عفراش اڑ کر اس کے کندھے پر آ بیٹھا۔

"میں آ رہا ہوں۔" وہ اپنے سامنے پھیلے گھنے جنگل کو دیکھ کر مسکرایا۔ عفریتوں کے خاتمے کا وقت آ پہنچا تھا۔

☆☆☆

Year 2020

Vostok Research Centre

جوشوا نے ویکسین کی کامیابی کی خبر حکومت کو دے دی تھی۔ اس نے خود پر کیے گئے تجربے کی مکمل رپورٹ تیار کر کے ہیڈ آفس بھجوائی تھی اور ایک دن کے بعد اسے روسی افواج میں شامل اہم افسران کی لسٹ بھیجی گئی تھی جو ویکسین کی ڈوز لینے کے لیے سب سے پہلے بھیجے جا رہے تھے۔ یہ 220 فوجیوں پر مشتمل ایک گروہ تھا جنہوں نے کئی اہم مشنز پر کام کیا تھا۔ اتنی جلدی لسٹ مل جانے کا مطلب تھا کہ روسی حکومت اپنا ہوم ورک مکمل کر کے بیٹھی تھی۔ گزشتہ ایک دن میں جوشوا کے قد اور جسمانی ساخت میں مزید تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں اور وہ پہلے سے زیادہ طاقتور لگ رہا تھا۔

وہ چاروں بہت خوش تھے۔ انہوں نے یہ مشن متعینہ مدت سے پہلے ہی مکمل کر لیا تھا اور وہ ان فوجیوں کو ڈوز دینے کے بعد واسٹوک سے ہمیشہ کے لیے جانے والے تھے۔

فوجیوں کے ساتھ ان کا میڈیکل اسٹاف بھی آ رہا تھا جو جوشوا سے ٹریننگ لینے کے بعد ویکسینیشن کا مرحلہ خود سر انجام دیتا۔

جوشوا نے رات کو ہی ساری تیاری مکمل کر لی تھی۔ ان تینوں نے لیب سیٹ کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔ دوسری صبح جہاز فوجیوں کو لے کر پہنچنے والا تھا کیونکہ واسٹوک میں جگہ محدود تھی لہٰذا فوجیوں کو پچاس، پچاس افراد کے چار گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ویکسین لگنے اور ہوش میں آنے کے عمل کے بعد سو افراد کو واپس ہیڈ کوارٹر روانہ کر دیا جاتا اور پھر دوسرے گروہ کو ویکسین لگانے کی تیاری شروع کی جاتی۔ اس عمل کو سکون سے مکمل کرنے کے لیے ششیر نے لیب اسسٹنٹس کی مدد سے ایک خاص وارڈ ترتیب دیا تھا جہاں پچاس جدید ٹیوب اسٹریچر موجود تھے۔ فوجیوں کو ویکسین لگانے کے بعد ہوش آنے تک اسی وارڈ میں زیر مشاہدہ رکھا جانا تھا۔ اسی مد میں ضروری سامان کی ایک لسٹ بھی ہیڈ کوارٹر بھیجی گئی تھی جو آنے والے فوجیوں کے ساتھ روانہ کیا جا رہا تھا۔ ہیری بھی ششیر کے ساتھ رات بھر وارڈ کی تیاری میں مصروف رہا۔ تمام فوجیوں کے وائٹلز پر نظر رکھنے کے لیے ان سب کی ٹیوبز کا مین سسٹم سے منسلک ہونا ضروری تھا۔

فریڈ کا کام بھی بڑھ گیا تھا اور وہ کچن میں بوکھلایا بوکھلایا گھوم رہا تھا۔

جیکال اور جوشوا ویکسین کی شیشیاں تیار کر رہے تھے۔ ابتدائی طور پر انہیں تین سو شیشیاں تیار کرنا تھیں۔ باقی کام واسٹوک سے جانے کے بعد بھی ہو سکتا تھا۔

"تم نے اب تک نہیں بتایا کہ یہ کس جاندار کا ڈی این اے ہے؟" جیکال نے ویکسین ٹیوبز کو وورٹیکس مکسر میں ڈال کر اس کا سوئچ آن کر دیا۔

"یہ راز کی بات ہے مگر تمہیں بتا رہا ہوں۔ یہ کسی ایک جاندار کا ڈی این اے نہیں۔ میں نے مختلف ڈی این ایز کو ملا کر ہی یہ فارمولا تیار کیا ہے۔" جوشوا ہاتھ میں پکڑی ٹیوب کو ہلا کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب؟" جیکال پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یہ فارمولا مجھے میرے دادا کی لیب سے ملے تھے۔ ان کے ریسرچ پیپرز کے مطابق یہ ہمارے پرکھوں کی ریسرچ ہے جو سترھویں صدی میں کچھ طاقتور جانداروں پر ریسرچ کر رہے تھے اور انہوں نے ان کے ڈی این اے محفوظ کر لیے تھے مگر ان کے محفوظ کیے گئے

ڈی این ایز الگ الگ جانداروں کے تھے۔ ہمارے بزرگ صدیوں سے ان ڈی این ایز کو کارآمد بنانے کے لیے تگ ودو میں مصروف تھے لیکن میں نے کسی ایک پر تجربہ کرنے کے بجائے ان کو مکس کر کے کارآمد بنانے کا سوچا۔ میں پچھلے پندرہ سالوں سے ان ڈی این ایز پر محنت کر رہا تھا اور ڈیڑھ سال پہلے چند مہلک بیماریوں کے علاج بھی دریافت کیے۔ جب روسی حکومت نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے ان کے سامنے بھی ریسرچ پیپرز رکھے تھے مگر مجھے اسے کارآمد بنانے کے لیے ایک مکمل ٹیم اور ایک جدید لیب کی ضرورت تھی اور پھر تم سب کی مدد سے آج ہم اس قابل ہوئے ہیں۔'' وہ اسے تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔

''اوہ، حیرت انگیز۔ لیکن وہ کون سے جاندار تھے جو اتنے طاقتور تھے؟ میرا مطلب یہ ہے کہ سترھویں صدی میں انسانوں اور جانوروں کے علاوہ اور کون سی مخلوقات تھیں دنیا میں؟ یقیناً ڈائنو سارز اس وقت تک ختم ہو چکے تھے۔'' جیکال اب بھی الجھن کا شکار تھا۔

''تمہیں یہ ساری تفصیلات اس ڈائری میں ملیں گی جو میں نے اپنے پردادا کی لیب سے حاصل کی تھی۔ لیکن ابھی ہمارے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں تمہیں وہ ساری چیزیں دکھاؤں لہٰذا تمہیں تھوڑا انتظار کرنا ہوگا۔ اگر ہم ویکسین کے اس مرحلے کو کامیابی سے حل کر لیتے ہیں تو یہاں سے جانے سے پہلے میں تم سب کو ان ڈی این ایز کی ایک تفصیلی بریفنگ دے کر جاؤں گا۔'' وہ مسکرایا اور جیکال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا تجسس مزید بڑھ گیا تھا۔

''جوشوا ہماری لیب بالکل تیار ہے۔'' ہیری لیب میں داخل ہوا۔

''بہترین۔ کیا تم نے مین کمپیوٹر کو ساری ٹیوبز سے کنیکٹ کر کے دیکھ لیا ہے؟'' جوشوا نے پوچھا۔

''ہاں۔ سب کچھ بالکل صحیح کام کر رہا ہے۔'' وہ انٹرکام کا بٹن دباتے ہوئے بولا۔

اگر تم کافی منگوا رہے ہو تو میرے لیے بھی منگوا لو، بلکہ ہم تینوں کے لیے منگواؤ۔'' جیکال بولا۔

''شمشیر کہاں ہے؟'' جوشوا نے پوچھا۔

''وہ ابھی ویکسین کی شیشیاں تیار کر رہا ہے تاکہ اگر کسی کو ری ایکشن ہو جائے تو اس پر بروقت قابو پایا جا سکے۔'' یہ کہہ کر وہ انٹرکام پر کافی کا آرڈر دینے لگا۔

''مجھے نہیں لگتا کہ ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔''

جیکال پرجوش تھا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ ہر انسان کا جسم الگ طرح سے ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ ہمیں پہلے سے ہر طرح کے نتائج کو مدنظر رکھتے ہوئے احتیاطی تدابیر اختیار کرنا ہوں گی۔'' جوشوا بولا اور ان دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کل صوفیہ بھی آ رہی ہے۔'' ہیری مسکراتے ہوئے بولا۔

''اوہ، ان حالات میں تمہیں اسے یہاں نہیں بلانا چاہیے تھا۔ ویسے بھی ہم دو سے تین دن بعد یہاں سے ہمیشہ کے لیے جانے ہی والے ہیں۔'' جیکال بولا۔

''مجھے اسے دیکھے ہوئے تین ہفتے ہو گئے تھے اور اس دفعہ میں بھی اس کے ساتھ ہی روانہ ہو کر اسے سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔'' ہیری کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ دونوں ہنس پڑے۔

''لیکن تمہارے پاس وقت کہاں ہوگا کل اس سے ملنے کا؟'' جیکال نے اسے یاد دلایا۔

''کوئی بات نہیں۔ اسے دیکھنے کی خوشی اور پھر یہاں سے ایک ساتھ جانے کی خوشی کے لیے مجھے ایک دن کی مصروفیت بہ خوشی قبول ہے۔'' ہیری بولا اور وہ دونوں ہنس پڑے۔

لیب کے دروازے پر فریڈ کافی کی ٹرالی لیے حاضر ہوا۔ ہیری نے آگے بڑھ کر خودکار دروازے کا بٹن پریس کر دیا۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ فریڈ ٹرالی لے کر اندر داخل ہوا۔ اس نے کافی کے برتن میز پر لگاتے ہوئے کن انکھیوں سے جوشوا کو دیکھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ قدآور اور طاقتور لگ رہا تھا۔ جب سے اس نے جوشوا کو دیکھا تھا وہ خود ہی انہیں چائے، کافی پہنچانے آ رہا تھا۔

''ویسے یہاں سے جانے سے پہلے ایک ایک ویکسین ہمیں بھی لگا دینا۔'' ہیری نے جوشوا کو مخاطب کیا۔ جوشوا نے لبوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ جو اپنی ترنگ میں فریڈ کی وہاں موجودگی کو بھول گیا تھا، چونک کر خاموش ہو گیا۔

مگر فریڈ کے کانوں میں اس کے یہ جملے پڑ چکے تھے۔

''اچھا تو یہاں ویکسین کی تیاری ہو رہی تھی جو انسانوں کو طاقتور بنا رہی ہے۔'' اس نے دل میں سوچتے ہوئے کن انکھیوں سے دور شیلف پر رکھی ان ٹیوبز کو دیکھا۔ وہ بھی جوشوا کی طرح طاقتور بننا چاہتا تھا۔ بچپن سے اسے اس کے چھوٹے قد اور سوکھے جسم کی وجہ سے مذاق کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔

''لیکن یہ سائنس دان تو اس کو یہ ویکسین لگانے سے رہے۔'' اس نے مایوسی سے سوچا۔ مگر وہ بھی واشنگٹن میں تعیناتی کا فائدہ اٹھائے بغیر یہاں سے

جانے والا نہیں تھا۔ اسے ہر حالت میں اپنے لیے ویکسین کی ایک شیشی حاصل کرنا تھی۔ اس کے ذہن نے ایک منصوبہ تیار کرنا شروع کر دیا اور وہ آج رات ہی اس پر عمل کرنے والا تھا۔

☆☆☆

Year 1723

Capiz-Philippines

اچانک کہیں سے لکڑیاں گرنے کی آواز آئی تھی اور وہ سایہ کھڑکی کے پاس سے غائب ہو گیا۔ ریزو نے رکی ہوئی سانس بحال کی اور کچھ دیر ساکت کھڑا رہا مگر سایہ دوبارہ نمودار نہیں ہوا۔

بالآخر اس نے ہمت کر کے کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کنویں اور اس کے اطراف کا علاقہ خالی پڑا تھا۔ ریزو تھوڑی دیر وہیں کھڑا باہر کے حالات کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اس نے باہر جا کر دیکھنے کا ارادہ کیا۔ گو کہ یہ بہت بڑا خطرہ تھا مگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھا رہ سکتا تھا۔ اس نے ایک نظر لورین اور لوئس پر ڈالی اور خاموشی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

اس نے اپنی بندوق اٹھائی اور اسے اچھی طرح چیک کرنے کے بعد وہ باہر نکل آیا۔ باہر ویرانی اور خاموشی کا راج تھا۔ ریزو کو خوف محسوس ہوا مگر وہ اس خوف پر قابو پاتے ہوئے احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔

گاؤں میں کوئی نہیں تھا۔ وہ دبے قدموں محتاط انداز سے مختلف جگہوں پر اس عفریت کو تلاش کرتا رہا مگر وہ کہیں موجود نہیں تھا۔ اس نے جنگل کے کنارے کی باڑھ تک جانے کا ارادہ کیا مگر یہ ارادہ اسے خودکشی کے مترادف لگا۔ لہٰذا وہ عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے واپس گھر کے اندر آ گیا۔ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کسی بلا کا مقابلہ کرنے سے بہتر تھا کہ وہ ایک مناسب لائحہ عمل ترتیب دے اور مکمل تیاری کے ساتھ اس کا سامنا کرے۔

وہ بلا شاید لکڑیوں کی آواز سن کر وہاں سے جا چکی تھی۔ اس نے اپنی بندوق اپنے کمرے میں واپس رکھی اور دوبارہ لورین کے کمرے میں آ گیا۔ اپنی ڈائری اٹھا کر اس نے ادھورے خاکے پر نظر ڈالی۔ ابھی تو اس نے پچھلی بلا کی تصویر بھی مکمل نہیں کی تھی اور یہاں دوسری بلا وارد ہو چکی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گاؤں ایک سے زیادہ خون آشام بلاؤں کی لپیٹ میں تھا۔ معاملات اس کی سوچ سے زیادہ گمبھیر تھے۔ اسے جلد از جلد دارالحکومت سے مدد طلب کرنی چاہیے۔ یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ان بلاؤں کی تعداد کتنی ہے۔ اس نے صبح ہوتے ہی دارالحکومت خط لکھنے کا ارادہ کیا اور نہ جانے کتنی دیر اسی طرح سوچوں میں گم رہنے کے بعد نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی۔

اس کی آنکھ لوئس کی آواز سے کھلی جو اسے بُری طرح جھنجوڑ رہا تھا۔

"ڈاکٹر ریزو... ڈاکٹر ریزو!" لوئس گھبرایا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ آنکھیں ملتا ہوا سیدھا ہو بیٹھا۔

"جلدی چلیں۔" وہ تیزی سے بولا۔

"کہاں چلوں؟" ریزو پر اب تک نیند کا غلبہ تھا۔

"باہر...... اس بلا نے رات کو ایک گاؤں والے کو مار ڈالا ہے۔" لوئس نے تیزی سے اپنی بات مکمل کی اور ریزو ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بیڈ پر نظر ڈالی۔ لورین وہاں موجود نہیں تھی۔

"لورین کدھر ہے؟" وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"سب باہر موجود ہیں۔ آپ جلدی سے آ جائیں۔" لوئس کمرے سے باہر نکل گیا۔

ریزو نے اپنا کوٹ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ کنویں کے پاس رش لگا ہوا تھا۔ وہ مجمع کو چیرتا ہوا درمیان میں آیا۔ وہاں ایک ادھڑی ہوئی لاش پڑی تھی اور چند لوگ اس کے قریب بیٹھے رو رہے تھے۔ ریزو نے کوٹ کی جیب سے رومال نکال کر منہ پر رکھ لیا۔ لاش کی حالت بہت خراب تھی۔ لورین اور فلپس بھی ایک طرف پریشان کھڑے تھے۔

"کیسے ہوا یہ؟" اس نے ساتھ کھڑے لوئس کے کان میں سرگوشی کی۔

"صبح جب لوگ کنویں پر پانی بھرنے کے لیے آئے تو اصطبل کے پاس یہ لاش پڑی ملی۔ ہم سب کی آنکھ اسی چیخ سے کھلی۔ آپ شاید رات کو دیر سے سوئے تھے اس لیے گہری نیند میں تھے۔" لوئس آہستگی سے بولا۔

"ڈاکٹر ریزو! ہماری مدد کریں۔" ایک آدمی روتا ہوا ریزو کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ مجمع کی توجہ ریزو کی طرف مبذول ہو گئی۔ وہ ابھی تک منہ پر رومال رکھے ہوئے تھا۔ اس نے جلدی سے رومال ہٹا کر واپس کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

"مجھے آپ سب کے دکھ کا پوری طرح اندازہ ہے۔ آپ لوگوں کو بہت جلد اس بلا سے چھٹکارا مل جائے گا۔ میں دارالحکومت کو خط لکھ کر مزید مدد بلا رہا ہوں۔ میری آپ سب سے درخواست ہے کہ میرے ساتھ تعاون کریں اور

رات کے وقت گھروں سے باہر نہ نکلیں۔" وہ ان سب سے مخاطب ہوا۔

"جارج گھوڑوں کو پانی ڈالنا بھول گیا تھا۔ میں اسے روک بھی رہی تھی مگر وہ باہر نکل گیا۔" لاش کے پاس بیٹھی عورت روتے ہوئے بولنے لگی۔

لورین نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا اور اب وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔ ریزو نے جارج کی لاش کو دیکھا۔ آج اس لاش کی جگہ وہ بھی ہوسکتا تھا۔ شاید لکڑیاں گرنے کی وجہ سے اس بلا کی توجہ ریزو سے ہٹ کر جارج کی طرف مبذول ہوگئی تھی۔ جب وہ بندوق لے کر باہر نکلا تو وہ بلا گھوڑوں کے اصطبل میں موجود تھی۔ یہ سوچتے ہی ریزو کو جھرجھری آئی۔

"اس لاش کو تدفین سے پہلے کسی طرح میری ڈسپنسری میں لے آؤ۔ اسے دفنانے سے پہلے میں اس کا پوسٹ مارٹم کرنا چاہتا ہوں۔ گاؤں والوں کو سمجھانا تمہاری ذمے داری ہے۔" وہ لوئس کے کان میں یہ کہہ کر ڈسپنسری کی طرف بڑھ گیا۔

ڈسپنسری کے اندر داخل ہوکر اس نے گہری گہری سانسیں لینا شروع کردیں۔ وہ بہت دیر سے خود کو روکے ہوئے تھا۔ اسے ابکائی آئی تھی۔ وہ ڈسپنسری سے ملحقہ غسل خانے میں داخل ہوگیا۔ تھوڑی دیر اپنے جسم پر پانی بہاتے رہنے کے بعد اسے سکون ملا۔ وہ تازہ دم ہوکر باہر آگیا۔ اس کے استری شدہ کپڑے ایک طرف رکھے تھے۔ شاید لورین ڈسپنسری میں آئی تھی اور اس کے نہانے کی آواز سن کر اس کے کپڑے وہاں رکھ گئی تھی۔ وہ کپڑے پہننے لگا۔

لوئس اب تک نہیں آیا تھا۔ اسے گاؤں والوں کو منانے میں وقت لگ رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم ان کے لیے نئی چیز تھی۔ وہ لوئس کا انتظار کرنے لگا۔ اچانک ڈسپنسری کا دروازہ کھول کر لورین اندر داخل ہوئی۔

"یہ آپ کا ناشتا۔" وہ ناشتے کی ٹرے میز پر رکھ کر واپس جانے لگی۔

"ٹھہرو، مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنا ہے۔" ریزو سنجیدگی سے بولا۔

لورین خاموشی سے اسے تکنے لگی۔

"میں نے کل رات یہاں ایک خوفناک بلا کو دیکھا۔ وہ اس بلا سے بالکل الگ تھی جیسی ہم نے سمندر کے کنارے دیکھی تھی۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کیا مطلب؟" لورین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

جواباً ریزو نے اسے گزشتہ رات ہونے والے تمام واقعات بتادیے۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ کالز پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔" وہ رونے لگی۔

"دیکھو، یہ ہمت ہارنے کا وقت نہیں ہے۔ ہمیں مل کر اس مصیبت کا حل نکالنا ہوگا۔ میں گاؤں والوں کو یہ باتیں بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ دارالحکومت سے مدد مانگنا ضروری ہوگیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ایک ہفتے میں ہمیں وہاں سے بھی مدد مل جائے گی۔ تب تک ہم سب کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔" وہ اسے روتے دیکھ کر سمجھانے لگا۔

اسی وقت لوئس تین لوگوں کی مدد کے ساتھ جارج کے مردہ جسم کو اٹھائے ڈسپنسری میں داخل ہوا۔ ریزو نے لاش کو اسٹریچر نما تختے پر لٹانے کا اشارہ کیا۔

"میری ڈائری اور کچھ ضروری سامان تمہارے کمرے میں ہے، وہ بھجوادو اور جب تک میں نہ کہوں، ڈسپنسری میں داخل مت ہونا۔" وہ لورین کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ لوگ بھی جاسکتے ہیں۔ لوئس! تم یہیں رکو۔" اس نے باقی لوگوں کو ہدایات دیں اور وہ سب ڈسپنسری سے باہر نکل گئے۔

ریزو نے ڈسپنسری میں رکھا ایک لکڑی کا بکس اٹھایا اور اسے کھول کر اس میں سے کچھ اوزار نکال کر اسٹریچر پر رکھنے لگا۔ لوئس خاموشی سے اسے یہ کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ تمام ضروری آلات نکالنے کے بعد اس نے بکس بند کردیا پھر اس نے ریک پر رکھا محدب شیشہ اٹھایا اور جارج کے جسم پر لگے زخموں کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے بعد اس نے اوزاروں کی مدد سے جارج کے زخم کھول کر دیکھے اور شیشے کی پلیٹ پر کچھ نمونے اکٹھے کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے ان تمام زخموں کو سی دیا۔

لوئس کے لیے یہ سب کچھ نیا تھا۔ وہ اشتیاق اور حیرانی سے اسے یہ کام کرتے دیکھتا رہا۔

"اب تم جارج کا مردہ جسم اس کے گھر والوں کے حوالے کرآؤ۔" وہ کام ختم کرکے ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

لوئس سر ہلا کر باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ انہی تین افراد کی مدد سے جارج کا جسم وہاں سے اٹھا کر لے گیا تھا۔ ریزو نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ جارج کے جسم کی حالت نے اس کے اعصاب شل کردیے تھے۔

(باقی حصہ اگلے ماہ)

خوابوں کے جزیرے میں خود کو قید کرنے والے محبت

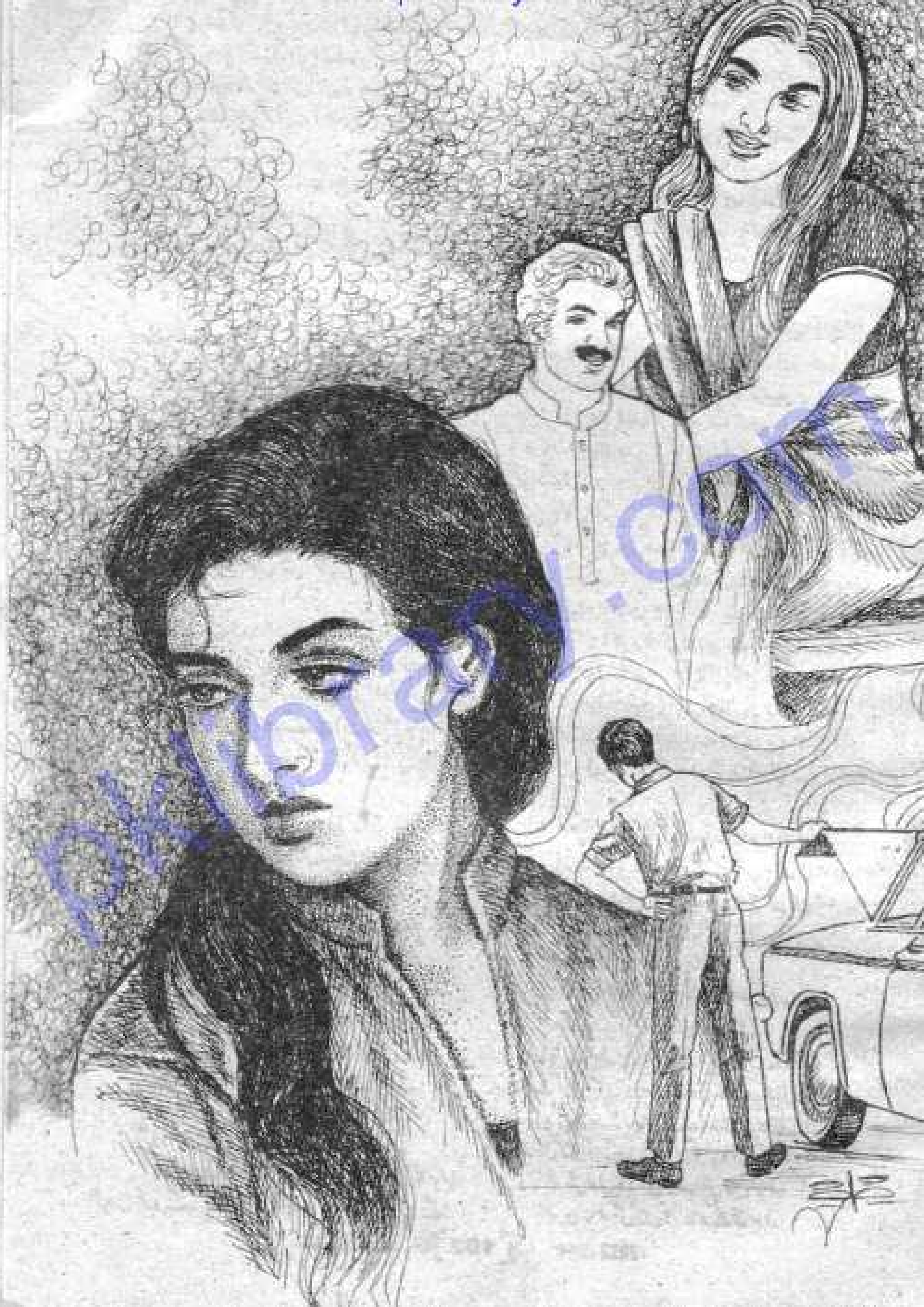
کے دیوانوں کی انا پرستی کی دل خراش داستان

کایا کلپ

اقبال

کبھی کبھی ہم کہیں کی تنہائی کو خود ہی خود سے دور کر دیتے ہیں... لیکن جب اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو دل اسے دوبارہ پانے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ جیسے ان دونوں نے کیا... جب آسانی سے ایک دوسرے کی دسترس میں تھے تو خود ساختہ شرائط کی جال میں خود کو قید کر لیا اور جب حالات نے کروٹ بدلی تو ان کے درمیان صدیوں کی مسافت حائل ہو گئی... جن کی سوچ اور دھڑکن بس اپنے محبوب کی ذات کا احاطہ کیے رکھتی تھی... انہیں موسم کے تغیر کی بھی کوئی پروانہ تھی... انہیں تو بس اپنے محبوب کی باتوں کا بھرم رکھنا تھا سو رکھ لیا مگر... کیا خبر تھی کہ انہیں اپنی ذات اور جذبوں کا بھرم رکھنا کتنا مشکل ہو جائے گا... کبھی جھیل کا پانی اور جھرنوں کا ترنم سکون کا باعث بنتا تھا۔ اب یہی جھیل کا پانی اور جھرنوں کا ترنم آنکھوں میں پانی بھر لاتا ہے کیونکہ جب زندگی کے سب سے بڑے خواب کو خود ہی توڑ دیا جائے تو نہ کوئی عہد قائم رہ پاتا ہے اور نہ ہی وفا کی ڈوری کسی کو باندھے رکھ سکتی ہے۔





عابد نے کار اسٹارٹ کی۔ اس کے برابر میں فرحان بیٹھا ہوا تھا۔ عابد اسی کو لینے ائرپورٹ آیا تھا۔

عابد نے کار حرکت میں لاتے ہوئے پوچھا۔ ”فون پر تم نے آنے کا تو بتایا مگر آنے کی وجہ نہیں بتائی۔ کہیں میری یاد تو نہیں......“

”آیا تو کسی اور وجہ سے ہوں لیکن تمہاری یاد بھی آ گئی۔ تم نے پوچھا، کس فلائٹ سے آ رہے ہو تو میں نے بتا دیا لیکن اس لیے نہیں بتایا تھا کہ تم مجھے لینے کے لیے آنے کی زحمت کرو۔“

”زحمت؟“ عابد نے آنکھیں نکالیں۔ ”تمہیں لینے کے لیے آنا زحمت ہے؟“

فرحان ہنس دیا۔

”یار! ٹیکسی سے کسی ہوٹل میں چلا جاتا۔“

”ٹیکسی...... ہوٹل؟“ عابد نے پھر آنکھیں نکالیں۔ ”یعنی تم نے سمجھا تھا کہ تیرا دوست عابد کمبخت مر گیا ہے۔“

”یہ بات نہیں یار! ایسا ہے وہ خیال میرے ذہن میں کیسے آ جاتا کہ تم نہیں ہو۔ یہ سمجھتا تو فون کیوں کرتا۔“

”تو اب تم ہوٹل میں نہیں، میرے بنگلے میں رہو گے۔“

”غالباً اکیلے ہی رہ رہے ہو گے۔ تمہارے والدین تو آنجہانی ہو چکے۔ کوئی بہن بھائی بھی نہیں۔ اگر شادی کر لی ہوتی تو مجھے اس کی اطلاع ضرور دیتے بلکہ اصرار کرتے کہ میں تمہاری شادی میں شرکت کے لیے آؤں۔“

”ظاہر ہے۔“ عابد نے کہا۔ ”اب بتاؤ کہ آنا کیسے ہوا؟“

”کوئی کام شروع کروں گا۔“

”یہ کایا پلٹ کیسے ہو گئی؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ تمہیں کوئی کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ورثہ اتنا مل چکا ہے کہ زندگی بھر عیش سے زندگی گزار سکتے ہو۔“

”اب کسی وجہ سے کام کرنا ضروری ہو گیا ہے۔“

”کیا اب کچھ عیاشی میں لٹا بیٹھے ہو؟“

”فضول خیال آیا ہے تمہیں۔ شراب، سگریٹ، سوسائٹی گرلز سے مجھے دلچسپی نہیں۔ عیاشی سے مجھے کیا نسبت؟“

”تو پھر کوئی کام کرنے کا خیال کیسے آیا؟“

”شاید سگریٹ کی وجہ سے۔“ فرحان مسکرایا۔

”کیا مطلب...... سگریٹ کی وجہ سے کیسے؟“

”ذرا لمبی کہانی ہے۔ فرصت سے سناؤں گا۔“

”چلو فرصت سے سنا دینا۔ ابھی یہ تو بتاؤ کہ کام کیا شروع کرو گے۔ غالباً کنسٹرکشن کا کام شروع کرو گے۔ بہت اچھے آرکیٹیکٹ ہو۔“

”وہی ارادہ ہے۔ تم اپنی سناؤ۔“

”بیوی کی تلاش میں ہوں۔“

”کیا؟“ فرحان پھر ہنس پڑا۔ ”تلاش میں کیوں؟“

”میں ایسی بیوی چاہتا ہوں جسے پہلے اچھی طرح سمجھ لوں۔ دو گرلز فرینڈ تو پہلے بنا چکا ہوں لیکن اندازہ ہوا کہ وہ صرف لوٹنا چاہتی تھیں مجھے لہٰذا ان سے جان چھڑائی۔ آج کل ایک تیسری گرل فرینڈ کو آزما رہا ہوں۔“

”گویا فلرٹ کر رہے ہو؟“

”ہرگز نہیں۔ سنجیدگی سے دوستی کر رہا ہوں اور یہ گرل فرینڈ شاید میری خواہش کے مطابق ہو۔“

”اور کاروبار کیسا چل رہا ہے؟“

”فرسٹ کلاس۔“ عابد نے جواب دیا۔ ”خیر، یہ بات چھوڑو۔ کچھ اور یاد آ گیا مجھے۔ تم کنسٹرکشن کا کام شروع کرو گے نا؟“

”ہاں۔“

”یار! میرے ایک دوست کا انتقال ہو گیا، کوئی آٹھ ماہ پہلے۔ شادی کے ایک مہینے بعد ہی کینسر میں مبتلا ہو کر دنیا سے جا چکا ہے۔ اس کی بیوہ شارہ اب اس کا کام سنبھالے ہوئے ہے لیکن ناتجربہ کاری کی وجہ سے نقصان میں جا رہی ہے۔ تم اگر اس کی کچھ مدد کر سکو تو بڑا اچھا ہو۔“

”میں اپنا کام شروع کروں گا یا اس کی مدد کروں گا؟“

”ارے بس کچھ وقت اسے دے دیا کرنا۔ تم تجربہ کار ہو۔ اس کی مدد کرو گے تو وہ شاید سنبھال لے گی اپنا کام۔ ذہین تو وہ ہے۔“

”تم عمر بھی ہو گی۔ شادی کے ایک ماہ بعد بیوہ ہوئی ہے۔“

”ہاں۔“ عابد نے کہا۔ ”بیس بائیس سال کی ہو گی۔ ویسے تو بہت اسمارٹ اور ایکٹو ہے لیکن کنسٹرکشن میں ناتجربہ کاری کے باعث مار کھا رہی ہے۔“

”صورت شکل کی کیسی ہے؟“

”بہت خوبصورت تو نہیں لیکن خوبصورت ہے۔“

”دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتی؟“

عابد نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”وہ میرے دوست سے بہت محبت کرتی تھی۔ دوسری شادی کا اسے خیال بھی نہیں آتا۔ شاید کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد نارمل ہو جائے۔ ابھی تو وہ شادی نہیں کرے گی۔ تم اس کی مدد ضرور کرو یار!“

”خیر مل لوں گا۔ کوئی فیصلہ ابھی نہیں کر سکتا۔“

”میری خاطر بھی نہیں؟“ عابد کچھ خفا ہوا۔

فرحان نے ہنس کر اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میری اس سے ملاقات تو کرواؤ۔"

کار کی رفتار سست ہونے لگی۔

"کیا گھر آ گیا تمہارا؟" فرحان نے پوچھا۔

"ہاں۔" عابد نے کار ایک بنگلے کے پھاٹک پر روک دی اور ہارن دیا۔

چوکیدار نے پھاٹک کھولا۔ کار اندر داخل ہونے لگی۔

عابد نے بات جاری رکھی۔ "چار ملازم ہیں۔ چوکیدار، مالی، ایک خانساماں اور ایک گھریلو کام کاج کے لیے لیکن وہ کار چلانا بھی جانتا ہے۔ اس سے کسی وقت شوفر کا کام بھی لے لیتا ہوں۔"

کار برآمدے کے سامنے رک گئی۔ ایک آدمی برآمدے سے اتر کر کار کے قریب آیا۔

"ڈکی میں دو سوٹ کیس ہیں۔" عابد نے کار سے اتر کر اس سے کہا۔ "وہ میرے کمرے میں لے آؤ۔"

"جی صاحب!" وہ ملازم ہی تھا۔

عابد فرحان کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ "آج کی رات تو میرے ساتھ ہی سونا۔ کل میں تمہارے لیے کمرا ٹھیک کروا دوں گا۔ ابھی تو تم شاور لے کر تازہ دم ہو جاؤ۔ دو گھنٹے بعد کھانے کا وقت ہو جائے گا۔ کھانے کے بعد میں اپنے دفتر چلا جاؤں گا۔" عابد نے کہا۔ "تم آج آرام کرنا یا اپنے کاروبار کی مزید منصوبہ بندی کرنا۔"

"مجھے فوری طور پر ایک کار خریدنا ہے۔"

"کل میں تمہیں شاروا سے ملاؤں گا اور کل ہی کار بھی خرید لی جائے گی۔"

"میں نے اپنا اکاؤنٹ یہاں کے بینک میں ٹرانسفر کروا دیا ہے۔ کل ہی وہاں بھی جانا ہوگا۔"

"کل ہی سب کام ہو جائیں گے۔ ابھی تو تم باتھ روم کا راستہ پکڑو۔"

فرحان اپنا ایک سوٹ کیس کھولنے لگا۔

☆☆☆

دوسرے دن فرحان سب سے پہلے تو بینک کے کام سے فارغ ہوا۔ اس کے بعد عابد کے ساتھ شاروا سے ملنے اس کے دفتر گیا۔ عابد نے ان دونوں کا تعارف کرایا۔

"یہ سند یافتہ آرکیٹیکٹ ہے۔" عابد نے شاروا کو بتایا۔ "یہ خود ہی اپنا کام شروع کرنے کے لیے یہاں آیا ہے لیکن میں نے اس سے کہا ہے کہ یہ تمہاری مدد ضرور کرے۔"

شاروا لگ بھگ بائیس سال کی اسمارٹ اور دلکش لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی جیسے رچی بسی ہوئی تھی۔ اس نے فرحان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں فرحان صاحب؟"

"پہلے تو مجھے یہ معلوم ہو کہ آپ کو کس قسم کی مشکلات لاحق ہیں؟"

"ایک مشکل تو یہ ہے کہ کئی افراد میری پیمنٹس روکے ہوئے ہیں۔ دوسری پریشانی یہ ہے کہ بعض کنسٹرکشن کمپنیاں میرے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے لگی ہیں۔ جب تک میرے شوہر زندہ تھے، وہ ان سب معاملات سے نمٹنا خوب جانتے تھے۔ تیسری میری ایک پریشانی یہ ہے کہ جو صاحب میرے شوہر کے زمانے سے ان کے اسسٹنٹ رہے ہیں، وہ اب مجھے نادان سمجھ کر مالی معاملات میں خورد برد کرنے لگے ہیں۔ ان چند ماہ میں میرا سرمایہ ایک تہائی کم ہو چکا ہے۔"

فرحان نے کہا۔ "آپ کا جو سرمایہ ڈوب چکا ہے، وہ تو ڈوب چکا۔ اب آپ خود کو یہ باور کرائیں کہ اب نئے سرے سے کام شروع کر رہی ہیں۔ رہی رکی ہوئی پیمنٹس کی بات، تو ان لوگوں کو نوٹس ایشو کیے جاتے ہیں جس کے لیے کمپنی کے لیگل ایڈوائزر کو کام کرنا ہوگا۔ تیسرے آپ مجھے ان کمپنیوں کا نام بتائیں جو آپ کے کام میں رکاوٹ ڈال رہی ہیں۔"

"میں ساری تفصیلات آپ کو کل تک مہیا کر دوں گی۔"

"اب آپ کو میرا مشورہ یہ ہے کہ پندرہ دن تک آپ کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈالیں گی۔"

"آپ کو ایک بات بتانے سے رہ گئی۔" شاروا نے کہا۔ "لیگل ایڈوائزر صاحب میری کمپنی کے حالات دیکھ کر مجھ سے معذرت کر چکے ہیں۔ یعنی استعفا دے چکے ہیں۔"

"ہوں۔" فرحان نے سر ہلایا اور کچھ سوچ کر بولا۔ "مجھے اپنی کمپنی کے لیے کارکنوں کا انتخاب تو کرنا ہے۔ انہی لوگوں میں سے کچھ لوگوں کا انتخاب میں آپ کی کمپنی کے لیے بھی کر دوں گا۔ آج ہی اخبار میں اس کے لیے اشتہار دینے والا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ انٹرویوز آپ کے آفس میں ہی کر لیتے ہیں۔ آپ کا دفتر بہت اچھا اور بڑا بھی ہے۔"

"یہ سب میرے شوہر کے ذوق کی وجہ سے ہے۔ آپ لوگوں کو انٹرویو کے لیے یہاں بلا سکتے ہیں۔"

ان باتوں کے دوران میں عابد بالکل خاموش رہا۔

"اب مجھے کل تک کے لیے اجازت دیجیے۔" فرحان نے کہا۔

"شاروا!" عابد پہلی بار بولا۔ "تم میرے دوست پر

مکمل احترام کر سکتی ہو۔"

"اس سلسلے میں مجھے آپ کا شکریہ تو ادا کرنا ہی چاہیے، عابد بھائی!" شازیہ مسکرائی لیکن حساس لوگ اندازہ کر سکتے تھے کہ اس کی مسکراہٹ میں "مسکراہٹ" نہیں تھی۔

باہر نکل کر فرحان نے عابد سے کہا۔ "یہ لڑکی مجھے ایسی لگی جیسے سورج مکھی کا خوبصورت زرد پھول۔"

"ہاں، شوہر کے بعد سے بہت اداس رہنے لگی ہے۔" عابد نے کہا پھر رک کر بولا۔ "اس کے معاملات تم سنبھال لو گے نا؟"

"میرے خیال میں کچھ زیادہ پیچیدہ معاملات نہیں ہیں۔ وہ اس میں نئی ہے اس لیے زیادہ پریشان ہے۔"

وہ دونوں کار میں جا بیٹھے۔

"اب تمہاری کار کا بندوبست کرنا ہے۔"

"ہاں، کنوینس کے بغیر کام کیسے چلے گا؟"

"اس کا دفتر خاصا بڑا ہے۔ کیوں نہ تم بھی اپنا دفتر وہیں بنا لو۔ اس کے قریب رہو گے تو اس کی ہمت بھی رہے گی۔"

"اس بارے میں سوچنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے، سوچ لو۔ ابھی کار کے لیے چلیں یا اخبار کے دفتر؟ شوروم یہاں سے قریب ہے۔"

"تو پھر پہلے وہیں چلو۔" عابد نے اپنی گھڑی دیکھی۔

عابد نے کار ایک شوروم کے سامنے روکی۔ کار کا معاملہ طے ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ دوسرے دن فرحان کو مل جاتی۔ اس کے بعد ایک انگریزی اور ایک اردو اخبار کے دفتر جا کر اشتہارات دے گئے۔ اس کے بعد عابد نے فرحان کو اپنے گھر پر ڈراپ کر دیا۔ اس نے ملازمین سے کہہ دیا تھا کہ فرحان کو بھی اس گھر کا مالک سمجھیں۔

فرحان نے کھانا کھایا پھر اپنے کمرے میں گیا جو ملازمین نے اس کے لیے ٹھیک کر دیا تھا۔ اس کے سوٹ کیس اور دوسرا سامان بھی وہاں پہنچا دیا تھا۔ فرحان نے اپنا والٹ تکیے کے نیچے رکھا پھر کپڑے تبدیل کر کے بستر پر لیٹا اور والٹ سے ایک تصویر نکال کر دیکھنے لگا۔ وہ تصویر ایک خوبصورت لڑکی کی تھی جسے دیکھتے ہوئے فرحان کے چہرے پر مسکراہٹ کا تاثر تھا۔

"دیبا!" وہ زیر لب بولا۔ "تم ضرور ذوالفقار کے پاس گئی ہو گی اور اس سے میرے بارے میں پوچھا ہو گا۔"

عابد کی طرح ذوالفقار بھی فرحان کا بہت اچھا دوست تھا۔ دیبا اس سے مل چکی تھی۔

☆☆☆

دیبا کے استفسار پر ذوالفقار کا جواب سن کر دیبا نے کہا۔ "وہ کب گیا ہے؟"

"کل۔"

"حیرت ہے۔ اتنا اچھا دوست ہے وہ میرا اور مجھ سے مل کر نہیں گیا، نہ فون پر بتایا۔ آخر وہ اچانک گیا کیوں ہے؟"

"تمہارے نام ایک خط مجھے دے گیا ہے۔" ذوالفقار نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ممکن ہے اس نے اس میں تمہیں کچھ بتایا ہو۔"

دیبا نے جلدی سے لفافہ چاک کیا اور اس میں سے ایک کاغذ نکال کر پڑھنے لگی۔

"دیبا! تم نے کہا تھا نا کہ جو کچھ نہ کرتا ہو اور جس کی اپنی کوئی پہچان نہ ہو، اس کی عزت کوئی لڑکی نہیں کرتی اور جب عزت نہ کرتی ہو تو اس کے دل میں اس کے لیے پیار بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے میں نے اچانک یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اب میں کچھ بن کر ہی واپس لوٹوں گا اور تمہیں بتاؤں گا کہ مجھے کس لڑکی سے محبت ہے۔۔۔ فرحان!"

دیبا نے ذوالفقار سے کہا۔ "یہ تو اس میں لکھا ہی نہیں ہے کہ وہ کب واپس آئے گا؟"

"یہ اس نے مجھے بھی نہیں بتایا۔ کیا خط میں بھی کچھ نہیں لکھا؟"

"نہیں۔" دیبا نے جواب دیا پھر اپنا موبائل سنبھالتے ہوئے بولی۔ "فون پر پوچھتی ہوں۔"

"فون بند ملے گا۔" ذوالفقار نے کہا۔ "وہ وہاں دوسرا فون استعمال کرے گا اور جو نمبر تمہارے پاس ہے، وہ یہاں آ کر ہی استعمال کرے گا۔"

"تمہیں بھی اس نے اپنا دوسرا نمبر نہیں بتایا؟"

"نہیں۔" ذوالفقار نے جواب دیا۔ "وہ چاہتا ہے کہ واپس آنے سے پہلے یہاں پر کسی سے رابطہ نہیں رکھے گا۔"

"یہ تو عجیب بات ہے۔"

ذوالفقار خاموش رہا۔

دیبا پھر بولی۔ "وہ وہاں جا کر کیا کرے گا؟"

"وہ آرکیٹیکٹ ہے۔ یہی کام کر سکتا ہے۔"

"وہ کام کیا یہاں نہیں ہو سکتا؟"

"یہاں زیادہ اسکوپ نہیں ہے۔"

دیبا چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔ "زمانہ بہت تیزی سے بدلتا رہتا ہے۔ جو کچھ آج ہے، وہ کل نہیں ہو گا اور جو کل ہو گا، وہ پرسوں نہیں ہو گا۔"

"یہ تو ہے۔" ذوالفقار نے اس کی تائید کی۔

"میں اسے بہت مس کروں گی۔ اچھا...... بائے!"

دیا چلی گئی اور گھنٹا بھر بعد ہی اپنی دوست زینت سے ملی اور اس سے بھی اسی قسم کی باتیں کیں جو ذوالفقار سے کر چکی تھی۔

"وہ میرا بہت اچھا دوست ہے۔" باتوں کے آخر میں دیا نے کہا۔ "حیرت ہے کہ مجھے بتائے بغیر چلا گیا۔ میں اسے بہت مس کروں گی۔"

"تم اس سے محبت تو نہیں کرنے لگیں؟" زینت مسکرائی۔

"پاگل ہوئی ہو...... وہ بس دوست ہے میرا۔"

"ایسا نہیں ہے کہ تم اس سے شادی کرلو۔"

"اس کا تو کوئی امکان ہی نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"اس کے پاس پیسا تو بہت ہے لیکن وہ کوئی کام نہیں کرتا۔ اس نے اپنی کوئی شناخت نہیں بنائی ہے۔ میں تو کسی ایسے لڑکے سے شادی کروں گی جس کی کوئی پہچان ہو اور اگر وہ سیلف میڈ ہو تب تو بہت ہی اچھا ہے۔ خیر...... سنو۔ مجھے ملازمت مل گئی ہے۔"

"تو پہلی ملازمت کیوں چھوڑ دی تھی؟"

"اس میں ترقی کے امکانات نہیں تھے اور میں اپنی زندگی میں کچھ خاص کرنا چاہتی ہوں۔ اب مجھے لارڈز انٹر پرائز میں نوکری ملی ہے جہاں میں اپنی صلاحیت سے ترقی بھی کرسکتی ہوں۔"

"یہ تو ہے۔ لارڈ انٹر پرائز بہت بڑا ادارہ ہے۔"

"تمہاری شادی کب ہو رہی ہے...... امتحانات کے بعد؟ لڑکا پسند کرلیا ہے تم نے؟"

"یہ تو میں نے اپنے والدین پر چھوڑ دیا ہے۔"

"میں تو اپنی پسند کی شادی کروں گی۔"

"تو پسند کرو کسی کو۔"

"جب میرے مزاج کے مطابق لڑکا ملے گا تو وہ مجھے پسند آہی جائے گا۔" دیا نے ہنس کر کہا۔

"اچھا، اب میں تو اسٹڈی کروں گی۔ تم بھی جا کر آرام کرو۔ ملازمت پر کب سے جاؤ گی؟"

"کل سے۔"

ان باتوں کے بعد دیا اپنے گھر آگئی۔ وہ ایک خوبصورت مکان میں اکیلی ہی رہتی تھی جو اس کے مرحوم والد نے ترکے میں چھوڑا تھا۔ اس کی والدہ ایک سال پہلے انتقال کر چکی تھیں۔

وہ گھر جا کر بستر پر لیٹی تو پھر فرحان اس کے خیالوں میں آگیا۔ وہ اس کے لیے ایک بہت ہی پیارا اور سمجھ دار دوست تھا۔ دیا کے خیال میں اس کی صرف ایک ہی کمی تھی کہ وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اس نے اپنی کوئی پہچان نہیں بنائی تھی ورنہ بہت ممکن تھا کہ دیا کو اس سے محبت ہو جاتی۔

☆☆☆

دوسرے دن فرحان کو کار مل گئی۔

ناشتے کے دوران میں عابد نے اس سے کہا۔ "شاردا سے ملنے تو جاؤ گے نا؟"

"وعدہ کرلیا ہے تو جاؤں گا اور اسی کے کام سے جاؤں گا۔"

"میں نے فون پر شاردا سے بات کی ہے۔ وہ تیار ہے کہ تم اس کے آفس کے چار کمرے استعمال کرلو۔"

"فی الحال میں ایک کمرے سے بھی کام چلا لوں گا۔ انٹرویوز وہیں لوں گا۔"

"جیسا تم چاہو۔ تمہاری کار آگئی ہے۔ تم چلے جاؤ۔ میں اپنے دفتر جاؤں گا۔"

"میں یہ پوچھنا بھول گیا کہ وہ کس وقت دفتر میں بیٹھتی ہے؟"

"دس بجے بیٹھتی ہے۔"

"تمہیں تو ابھی اپنے دفتر جانا ہوگا؟"

"ہاں۔"

"دس بجنے میں ابھی کافی وقت ہے۔ میں اب کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جاؤں گا۔ فی الحال مجھے کوئی اور کام نہیں ہے۔"

عابد کے جانے کے بعد فرحان بستر پر جا لیٹا اور دیا کی تصویر نکال کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب میں اپنی کوئی شناخت بنا کر ہی لوٹوں گا، دیا! تمہاری محبت ہی نے مجھے ایک ڈگر پر ڈالا ہے۔"

دیا اسے پچھلی بار ایک ہوٹل میں ہونے والی تھیٹر پارٹی میں ملی تھی اور اس کے دل کو بھا گئی تھی۔

ساڑھے نو بجے کے بعد وہ گھر سے روانہ ہوا۔ دس بج کر دس منٹ پر وہ شاردا کے دفتر میں داخل ہو رہا تھا۔ فرحان اس کے سامنے کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے بہت ہلکی سی بو محسوس ہوئی۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا لیکن اس کے دوستوں میں شراب پینے والے دوست بھی تھے۔

تو یہ شراب بھی پیتی ہے۔ فرحان کو خیال آیا اور اس نے وہ فائل اپنی طرف کرلی جو شاردا نے اس کی طرف

بڑھائی تھی۔

فرحان نے وہ فائل کھولی ہی تھی کہ شاروا نے ایک اور فائل اس کی طرف بڑھائی۔ "یہ تین درخواستیں آئی ہیں، آپ کے اشتہارات کی وجہ سے۔"

"اوہو...... اتنی جلدی۔"

"بیکاری کا زمانہ ہے فرحان صاحب اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ دھکے کھاتے پھر رہے ہیں۔ کل تک تو بہت درخواستیں آجائیں گی۔ عابد بھائی نے مجھ سے بات کی تھی۔ آپ میرے دفتر کے چار کمرے استعمال کر سکتے ہیں۔"

"مجھے عابد نے بتایا تھا۔" فرحان نے کہا۔ "اس سے میں نے کہا تھا کہ فی الحال میرے لیے ایک ہی کمرا کافی ہوگا لیکن ابھی خیال آیا کہ دو کمروں کی ضرورت پڑے گی۔"

"جیسا آپ چاہیں۔"

"یہ درخواستیں میں بعد میں دیکھوں گا۔ پہلے آپ کی فائل دیکھ لوں۔"

"دیکھ لیجیے۔ آپ نے کہا تھا کہ میں کچھ دن کے لیے سارے کام روک دوں۔ اس لیے آج میں کچھ لوگوں کو ملازمت سے برطرف کرنے والی ہوں۔"

"بہتر ہوگا کہ آج آپ کسی کو برطرف نہ کریں۔ میں ان سب کے انٹرویو بھی لوں گا۔ ان میں کچھ تو کام کے آدمی بھی ہوں گے۔ ان کو برطرف کرنا مناسب نہیں۔"

"سب کچھ میں آپ پر چھوڑ رہی ہوں۔"

فرحان سر ہلا کر شاروا کی فائل دیکھنے لگا۔ بیس منٹ میں ہی اس نے سارے کام سمجھ لیے۔

"ہوں۔" فرحان نے سر اٹھا کر شاروا کی طرف دیکھا۔ "میں نے کہا تو یہ تھا کہ سب معاملات سمجھنے کے بعد میں آپ کو مشورے دوں گا لیکن اب میرا فیصلہ ہے کہ پہلے میں ان لوگوں کے انٹرویو لے لوں جو ابھی آپ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ کیا میں انہیں ابھی ایک ایک کر کے یہاں بلا دوں؟" پھر مزید کہا۔ "کیا وہ سب جانتے ہیں؟"

"کیا؟"

"معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی کچھ......" لفظ "بو" کہتے ہوئے فرحان رکا پھر بولا۔ "کچھ مہک محسوس کی تھی۔"

"جی۔" شاروا عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ "میں ڈرنک کرنے لگی ہوں۔ دفتر کے بھی لوگ سمجھنے لگے ہیں۔"

"آپ برا نہ مانیں تو بتا دیجیے کہ آپ کب سے پینے لگی ہیں؟"

"شوہر کے انتقال کے بعد سے۔" شاروا نے سنجیدگی سے کہا اور دراز سے گلاس نکال کر اس کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا پھر بولی۔ "اگر آپ پسند کریں تو آپ کے لیے بھی......"

"جی نہیں۔" فرحان نے جلدی سے کہا۔ "میں تو سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ میں عرض کروں گا کہ انٹرویوز کے دوران میں آپ گلاس کو ہاتھ بھی نہ لگائیں۔"

"میں یہ پہلا گلاس تو ختم کر لوں۔ ابھی دو تین ہی گھونٹ لیے ہیں۔ پورا گلاس ختم کیے بغیر زیادہ دیر کے لیے رک گئی تو میری طبیعت خراب ہو سکتی ہے۔" شاروا نے کہا پھر اسے جیسے کوئی خیال آ گیا۔ وہ جلدی سے بولی۔ "ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میں اپنے چیمبر میں چلی جاتی ہوں۔ ملازمین کو بلا کر آپ یہیں ان کے انٹرویو لے سکتے ہیں۔"

فرحان کو یہ کچھ اچھا نہیں لگا لیکن شاروا نے گھنٹی بجائی اور چپراسی اندر آ گیا۔ فرحان سوچتا ہی رہ گیا اور شاروا نے ایک پیڈ پر کچھ لکھتے ہوئے چپراسی سے کہا۔ "میں یہاں کام کرنے والوں کے نام لکھ رہی ہوں۔ ان سب سے کہہ دو کہ یہ......" اس نے فرحان کی طرف اشارہ کیا۔ "ان سے کچھ بات چیت کریں گے۔ وہ ایک ایک کر کے آئیں۔ میں جس ترتیب سے نام لکھ رہی ہوں، انہیں اسی ترتیب سے اندر آنا ہوگا۔" چپراسی سے یہ کہتے کہتے اس نے نام بھی لکھ لیے تھے۔ اس نے وہ کاغذ چپراسی کو دیتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے چیمبر میں جا رہی ہوں۔"

"جی میڈم!" چپراسی کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

شاروا اپنا گلاس سنبھالتی ہوئی کھڑی ہوئی۔ "ان کا انٹرویو لیتے ہوئے آپ میری کرسی پر بیٹھ جائیں گے۔"

فرحان نے طویل سانس لی۔ "نہیں، میں یہیں بیٹھے بیٹھے بات کر لوں گا۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" شاروا نے کہا اور ایک دروازے کی طرف بڑھ گئی جو اس کے چیمبر میں کھلتا ہوگا۔

فرحان کو یہ سب اچھا نہیں لگا۔ شاروا نے اسے جیسے اپنا ملازم سمجھ لیا تھا کہ وہ اس کے "احکام" کی تعمیل کرے۔ فرحان نے جھنجلاہٹ اس لیے ضبط کی کہ وہ اپنے عزیز دوست عابد کے ذریعے شاروا سے ملا تھا۔

پہلا آدمی جو کمرے میں آیا وہ آپریشن منیجر تھا۔ فرحان نے اس کا نام پوچھ کر شاروا کی دی ہوئی فائل میں سے وہ کاغذ اپنے سامنے کیا جس پر شاروا نے اس کی آٹھ ماہ کی کارکردگی لکھی ہوئی تھی۔

فرحان نے اس سے صرف دس منٹ سوال کیے پھر

مارکیٹنگ منیجر، سیلز منیجر کے علاوہ ایک آدمی اور آیا جو دفتر کی صفائی ستھرائی کے لیے کام کرتا تھا۔ اس کام میں ایک گھنٹے سے بھی کم وقت لگا پھر فرحان نے چپراسی کو بلا کر اس سے کہا۔

"اپنی میڈم کو اطلاع دے دو کہ میں نے کام ختم کرلیا ہے۔"

"جی بہتر۔" چپراسی چلا گیا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی اور جانب سے بھی شاردا کے چیمبر میں داخلہ ممکن تھا۔ دو منٹ بعد ہی چیمبر کا دروازہ کھلا اور شاردا باہر آگئی۔ فرحان نے اس کی چال میں خفیف سی ڈگمگاہٹ محسوس کی۔ "کیا رہا فرحان صاحب؟" اس نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جو صاحب مالی معاملات میں خورد برد کرتے رہے ہیں، انہیں اور سیلز منیجر کو برطرف کردیں باقی لوگوں پر کوئی الزام نہیں لگایا جاسکتا اور ہاں، مارکیٹنگ منیجر کو بھی۔۔۔ آٹھ ماہ میں ان کی کارکردگی بہت ناقص رہی ہے۔ یہ دونوں اگر کام نہیں کریں گے تو باقی لوگ کیا کرسکتے ہیں۔"

شاردا نے سر ہلایا۔ "میں انہیں آج ہی برطرف کردوں گی۔"

"نادہندگان کمپنیوں کے نام میں نے دیکھ لیے ہیں۔ ان کو نوٹس جاری کرنے کے لیے لیگل ایڈوائزر کی ضرورت ہے۔ میں جب اپنے لیے لوگوں کے انٹرویو لوں گا تو آپ کے لیے بھی ایسے تین افراد منتخب کرلوں گا۔۔۔۔ اور ہاں، آپ کے سیکریٹری کے لیے بھی۔"

"میں اس کام کے لیے کوئی لڑکی رکھنا چاہوں گی۔"

"میں اس کا بھی خیال رکھوں گا۔"

"آپ کے لیے جو درخواستیں آئی ہیں، وہ بھی دیکھیں آپ نے؟"

"اتنا وقت ہی کہاں ملا۔"

"تو اب دیکھ لیجیے۔"

"وہ میں اب گھر جا کر دیکھوں گا۔ ابھی تو آپ مجھے اپنا سارا دفتر دکھا دیجیے اور مجھے جو کمرے دینا چاہتی ہیں، وہ بھی دکھا دیں۔"

"آیئے۔" وہ کھڑی ہوگئی۔

فرحان اس کے ساتھ اٹھا۔ شاردا نے اسے پورا آفس دکھا دیا۔

فرحان نے کہا۔ "جہاں میٹنگز ہوتی ہیں، وہاں دوبارہ چلیے۔"

"آیئے۔"

شاردا اسے وہاں لے گئی جہاں وہ جانا چاہتا تھا۔

"چند افراد کی میٹنگ کے لیے یہ ہال بہت بڑا ہے۔ آپ میٹنگ روم کسی اور کمرے میں نہیں بنا سکتیں؟ مجھے جو کمرے آپ دینا چاہتی ہیں، ان میں سے کسی ایک کو؟"

"بالکل ایسا ہوسکتا ہے۔"

"تو یہ ہال آپ میرے لیے وقف کردیں۔ یہاں میں اپنا دفتر بنا سکتا ہوں۔"

"ہال میں!" شاردا نے تعجب کا اظہار کیا۔

فرحان مسکرایا۔ "یہاں میں اپنے اور کارکنان کے لیے کیبنز بنوا لوں گا۔ اس کا ایک دروازہ ایسا بھی ہے جسے میں اپنے دفتر کا داخلی دروازہ بنوا سکتا ہوں۔"

"مجھے خوشی ہوئی کہ آپ یہاں اپنا دفتر بنانے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ آپ کے قریب ہونے سے مجھے بڑی تقویت ملے گی۔ کسی وقت بھی آپ سے کوئی مشورہ کرسکوں گی۔"

"شوق سے۔" فرحان نے کہا۔ "اب مجھے اجازت دیجیے۔"

وہ دونوں جب ہال سے نکل رہے تھے تو شاردا کچھ زیادہ ڈگمگا گئی۔ فرحان نے بے اختیار اسے سنبھالا دیا ورنہ وہ گر ہی پڑتی۔

"سوری!" شاردا نے سنبھلنے کے بعد کہا۔

فرحان کچھ نہیں بول سکا۔ اس کا جسم سنسنا گیا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ اس نے ایک خوبصورت عورت کو تقریباً گود میں سنبھال لیا تھا اور اس کے گداز جسم کا لمس محسوس کیا تھا۔

شاردا اسے چھوڑنے کے لیے دروازے کی طرف آئی۔

گھر کی طرف جاتے ہوئے فرحان کو شاردا کے لمس کے خیال سے کئی بار جھرجھری آئی۔ وہ بمشکل یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک سکا۔ گھر پہنچ کر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر لیٹ گیا۔ دوپہر کے کھانے میں ابھی دیر تھی۔ وہ دیبا کی تصویر نکال کر اسے دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ اسے گزرے ہوئے وہ مناظر بھی یاد آتے رہے جب وہ دیبا سے ملتا رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ سو گیا۔

عابد نے دفتر سے آتے ہی پوچھا۔ "آج کا دن کیسا رہا؟ شاردا سے تو مل آئے ہوگے؟"

"ہاں۔" فرحان نے کہا۔ "میں اس کی مشکلات حل کردوں گا۔ اپنا دفتر بنانے کے لیے میں نے اس کے دفتر کا ایک ہال منتخب کیا تھا لیکن دو ایک بار خیال آچکا ہے کہ میں اس کے اتنا قریب نہ ہوں۔ وہ شراب پیتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن اس سے تمہاری صحت پر کیا اثر

پڑتا ہے؟"

فرحان نے شاردا کے ڈگمگا کر گرنے کا واقعہ سنایا۔

عابد ہنسنے لگا۔ "شراب پینے والے بھی بس......"

فرحان نے اس کی بات کاٹی۔ "میں یہی تو سوچ رہا تھا کہ اس سے دور رہوں۔ کہیں اور ہی دفتر بناؤں۔"

عابد سنجیدہ ہوگیا۔ "یار یار تو ایسا نہیں ہوگا، فرحان! اگر تمہارے دماغ میں کوئی اور بات آئی ہے تو میں اسے غلط کہوں گا۔ شاردا کے کردار پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی۔ وہ جان بوجھ کر اس طرح نہیں گری ہوگی۔"

فرحان سوچ میں پڑ گیا۔

عابد پھر بولا۔ "تم اپنے کام کے ساتھ ساتھ اس کے مشیر بھی بنے رہو گے تو مجھے اس لیے خوشی ہوگی کہ اس کا شوہر میرا بہت پیارا دوست تھا۔"

"تم اتنے اصرار سے یہ بات کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہے۔ مجھے بھی یہ خیال ہے کہ اس کے دفتر کا وہ ہال میرے لیے بہت مناسب ہے۔ اس قسم کی جگہ شاید آسانی سے نہ مل سکے جبکہ یہ تو گویا مل ہی گئی ہے۔"

"تو اسے ضرور اپنا دفتر بناؤ۔"

"تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کرو۔"

"میں اس میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"کسی اچھے کارپینٹر سے ملوادو جو کل ہی سے وہاں کیبن بنانے کی تیاری شروع کردے۔"

"میں کسی کارپینٹر کو نہیں جانتا۔ ہاں، میرا ایک جاننے والا ٹھیکے داری کرتا ہے۔ چائے پینے کے بعد اس کے پاس لے چلتا ہوں۔ وہ ضرور تمہیں کسی اچھے کارپینٹر تک پہنچادے گا۔"

"میں جلدی سے شاور لے لوں۔ پھر چائے پی کر چلتے ہیں۔"

عابد نے سر ہلادیا اور فرحان نے باتھ روم کا رخ کیا۔

☆☆☆

ذوالفقار کچھ ہی دن پہلے ایک کالج میں لیکچرار ہوگیا تھا۔ دیا اس کالج کے سامنے ٹہل رہی تھی۔ اسے انتظار تھا کہ کالج کا وقت ختم ہونے پر ذوالفقار کالج سے نکلے تو وہ اس سے فرحان کے بارے میں پوچھے۔ اس کام کے لیے اس نے اپنے دفتر سے ایک دن کی چھٹی لی تھی۔

ذوالفقار نے کالج سے نکل کر اسے دیکھا تو اس کے قریب جاکر بے اختیار بولا۔ "خیریت؟"

"تمہارا ہی انتظار کررہی تھی۔" دیا نے مسکرا کر کہا۔

"آج بہت شدت سے فرحان یاد آرہا تھا۔ میں نے سوچا شاید اس سے تمہارا رابطہ ہو۔"

"بالکل نہیں دیا!"

"صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ فرحان سے کس طرح رابطہ ہوسکتا ہے؟"

"مشکل ہے۔"

"وہاں تمہارا کوئی جاننے والا نہیں ہے؟"

"دو تین ہیں، کیوں؟"

"تم ان سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ فرحان کا پتا لگائیں؟"

"دیا! وہ بہت بڑا شہر ہے۔ فرحان کو کیسے ڈھونڈا جاسکتا ہے؟"

"آرکیٹیکٹ ہے وہ۔"

"وہاں اور بھی آرکیٹیکٹ ہوں گے۔ وہاں فرحان نے اتنی جلدی تو شہرت حاصل نہیں کی ہوگی کہ لوگ اسے جاننے لگیں۔"

"تو کوئی صورت نہیں ہے؟" دیا نے مایوسی سے کہا۔

"تم اس کے لیے بہت ہی بے چین ہو۔"

"وہ میرا بہت پیارا دوست ہے۔ میں اس کی کمی محسوس کررہی ہوں۔"

"مجبوری ہے دیا! اس نے تمہارے خط میں بھی لکھا ہوگا۔ مجھ سے تو اس نے کہا تھا کہ جب وہ کچھ بن جائے گا، تبھی واپس آئے گا۔"

"اچھا!" دیا کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"اس کے کچھ اور دوست بھی ہیں یہاں۔ تم ان سے بھی مل چکی ہو۔ فرحان شاید انہیں کچھ بتا گیا ہو۔ ان سے معلوم کرو۔"

"تم اس کے بہت قریبی دوست ہو۔ جب اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا تو کسی اور کو بھی کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ خیر تم ان کے پتے بتاؤ۔ مل کر دیکھوں گی ان سے۔ میں ان کے صرف ناموں سے واقف ہوں۔"

ذوالفقار نے اسے چار دوستوں کے پتے بتائے۔

"اچھا، اب میں چلتی ہوں۔" دیا نے پتے نوٹ کرکے کہا۔

اسی دن وہ اپنی دوست زینت سے بھی ملی۔ "آج دل کچھ اداس ہے زینت! کہیں گھومنے چلو۔"

"مجھے ایک گھنٹے بعد گھر میں کچھ کام ہے۔ کہیں جاؤں گی تو واپسی میں دیر ہوجائے گی۔ یہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

زینت کے باپ نے بڑا خوبصورت بنگلا بنوایا تھا۔ زینت نے اسے اپنے پاس بٹھالیا اور ملازم سے کریم کافی بنانے کے لیے کہا۔

''آج تم دفتر نہیں گئیں؟'' اس نے دیبا سے پوچھا۔

''دل بجھا اداس تھا اس لیے چھٹی کرلی۔''

''دل کیوں اداس تھا، کوئی خاص وجہ؟''

''کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے میرے ساتھ۔'' دیبا نے کہا پھر پوچھا۔ ''ایک گھنٹے بعد تمہیں گھر میں کیا کام ہے؟''

''ڈیڈی آجائیں گے ایک گھنٹے میں۔ ان سے اپنی شادی کے بارے میں بات کرنا ہے۔ ابھی میرے امتحانات بھی نہیں ہوئے لیکن گھر میں شادی کی بات چل گئی ہے۔ میں اسے روکنا چاہتی ہوں۔ ممی سے تو بات کرچکی ہوں۔ وہ کہتی ہیں کہ اپنے ڈیڈی سے بات کرو۔ وہ زیادہ بے چین ہیں میری شادی کے بارے میں۔''

''تم نے تو کہا تھا کہ تمہاری شادی کے بارے میں تمہارے گھر والے جلدی نہیں کریں گے۔''

''میں اب بھی یہی کہتی ہوں لیکن اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے تعلیم سے بہت دلچسپی ہے۔ کالج کے بعد میں کوئی اسکول کھولنا چاہتی ہوں۔''

''یہ اچانک تمہیں اسکول کی کیوں سوجھ گئی؟''

''اچانک نہیں سوجھی۔ میری یہ خواہش بہت دن سے ہے۔ تم سے آج پہلی بار ذکر کیا ہے۔''

''عجیب شوق ہوا ہے تمہیں۔'' دیبا نے ہنس کر کہا۔

''بس ہے۔'' زینت بھی ہنس دی۔ ''میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ اسکول کا افتتاح کسی شہرت یافتہ شخص سے کرواؤں گی۔''

''کوئی نام ہے ذہن میں؟''

''کئی نام ہیں لیکن ایک نام میں زیادہ دلچسپی ہے۔''

''وہ کون ہے؟''

''وقار عالم!''

''یہ کیا کرتا ہے؟''

''ارے، یہ تم پوچھ رہی ہو؟ حالانکہ دو ماہ سے اس کے ادارے میں ملازم ہو۔''

''لارڈ انٹرپرائز کا مالک؟''

''اسی کی بات کررہی ہوں۔''

''مجھے اس کا خیال اس لیے نہیں آیا کہ میں نے اب تک اس کی شکل نہیں دیکھی۔''

''دو ماہ میں اسے نہیں دیکھا؟'' زینت کو حیرت ہوئی۔

''ہاں۔ اس نے اپنے لیے ایک ایسا کمرا منتخب کیا ہے جس کے دو دروازے ہیں۔ ایک دروازہ تو دفتر میں کھلتا ہے، دوسرا ایسا ہے کہ وہ ادھر ہی سے آتا جاتا ہے۔ دو ماہ میں اس نے دفتر کا ایک راؤنڈ بھی نہیں لگایا۔ دفتر کے چند خاص آدمیوں کے علاوہ کوئی بھی اس کے کمرے میں نہیں جاتا۔ ایسے روپے کا مالک تو کوئی مغرور شخص ہی ہوسکتا ہے۔''

''میں نے اپنے کالج میں اس کا ذکر سنا تھا۔ ایک لڑکی بتارہی تھی کہ وہ بہت اسمارٹ نوجوان ہے۔''

''تمہارے کالج میں اس کا ذکر کیسے آگیا؟''

''وہ ہمارے کالج کا ٹرسٹی ہے۔''

''تو تم نے اسے دیکھا تو ہوگا؟''

''جب سے میں اس کالج میں ہوں، وہ ایک بار بھی وہاں نہیں آیا۔''

''عجیب بات ہے۔ کیسا ٹرسٹی ہے وہ۔''

''اس کی اسی پراسراریت کی وجہ سے تو میں چاہتی ہوں کہ اسی سے اپنے اسکول کا افتتاح کرواؤں۔''

''ضروری تو نہیں کہ تمہارے ڈیڈی تمہارے لیے اسکول کا بندوبست کرہی دیں۔''

''کردیں گے۔'' زینت نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ڈیڈی نے میری کوئی خواہش پوری نہ کی ہو۔''

''لیکن اگر وہ کوئی مغرور انسان ہے تو شاید تمہارے اسکول کا افتتاح کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔''

''کوشش کرلینے میں کیا حرج ہے۔ چار دن بعد اسے دیکھ بھی لوں گی۔''

''کیسے معلوم ہوا ہے؟''

''پرنسپل نے سبھی طلبا کو بتایا ہے کہ اس اتوار کو وہ کالج ضرور آئیں۔ وہ طلبا سے خطاب کرے گا۔ میرے ساتھ تم بھی چلی چلنا۔''

''میرا تمہارے کالج سے کیا تعلق؟''

''اس کی پروا نہ کرو۔ کوئی دھیان نہیں دے گا اور تم میرے ساتھ جو ہوگی۔ کالج کے سبھی لڑکے لڑکیاں میری عزت کرتے ہیں۔''

زینت ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی۔

''تم کہہ رہی ہو تو چلی چلوں گی۔'' دیبا نے ہنس کر کہا۔ ''اس بہانے اپنے ادارے کے مالک کو دیکھ بھی لوں گی۔''

''ہاں، مجھے مشورہ بھی دینا کہ مجھے اس سے اپنے اسکول کا افتتاح کروانا ٹھیک لگے گا؟''

''اس کی تقریر سے اندازہ ہوجائے گا کہ وہ کس قسم کا

آدمی ہے۔ انسان کی باتوں سے اس کے کردار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔"

"میں جانتی ہوں کہ تمہیں یہ فن خوب آتا ہے۔ لوگوں کی باتوں سے ان کے کردار کو سمجھ لیتی ہو۔ اس لیے بھی کہہ رہی ہوں کہ میرے ساتھ چلنا۔"

اسی وقت ملازم ان کے لیے کافی لے آیا۔ کافی پینے کے دوران میں زینت نے فرحان کا ذکر چھیڑ دیا۔

"کچھ پتا چلا اس کا؟" اس نے دیبا سے پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں۔" دیبا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "آج ذوالفقار نے مجھے اس کے چند دوستوں کے پتے دیے ہیں۔ شام کو وہ ایک سے ملوں گی۔ شاید فرحان کسی کو کچھ بتا گیا ہو۔"

"ذوالفقار اس کا سب سے زیادہ قریبی دوست ہے۔ فرحان نے جب اسے نہیں بتایا تو کسی اور کو کیوں بتائے گا۔"

"دیکھتی ہوں، کیا ہوتا ہے۔"

باہر سے کسی کار کے رکنے کی آواز آئی۔

"اوہ۔" زینت نے بے اختیار کہا۔ "ڈیڈی جلدی آگئے۔"

☆☆☆

دو ماہ میں فرحان نے نہ صرف شاردا کا دفتر سیٹ کر دیا بلکہ اپنا دفتر بھی تیار کر لیا اور اسے ایک بہت بڑا بنگلا بنانے کا کنٹریکٹ بھی مل گیا۔ بنگلا کیا، اچھا خاصا محل تھا جو پانچ ہزار گز پر بننا تھا۔ اس کے لیے فرحان کے مارکیٹنگ منیجر نے بہت محنت کی تھی۔ اس کا نقشہ ظاہر ہے کہ فرحان نے ہی بنایا تھا۔ اس بنگلے کے لیے فرحان نے بحیثیت آرکیٹیکٹ خود پریزنٹیشن دی تھی اور اس کی منظوری کے بعد اس کی تعمیر جلد از جلد مکمل کرانے کے لیے اس نے آپریشن منیجر کو سمجھا دیا تھا اور اس نے بھی سارے انتظامات بہت تیزی سے مکمل کرائے تھے۔

عابد نے فرحان کے اس خیال کی تائید کی تھی کہ اس پروجیکٹ کی تکمیل اس کی کنسٹرکشن کمپنی کو بہت تیزی سے مقبول کر دے گی۔ فرحان کی خواہش بھی یہی تھی کہ اس کی کمپنی کو دوسری کمپنیوں کی فہرست میں پہلا مقام مل جائے۔

اپنے اس خواب کو آنکھوں میں بسائے وہ دیبا کو بھی اپنے خوابوں میں بسائے ہوئے تھا۔ اسے وہ رات تو بار بار یاد آتی تھی جب ذوالفقار اسے اپنے ساتھ اس پروگرام میں گھسیٹ لے گیا تھا۔ وہاں بارہ بجتے ہی ہنگامہ مچ گیا تھا۔ آرکسٹرا نے ایک جدید ترین اور مست کر دینے والی دھن چھیڑ دی تھی۔ بلند آہنگ قہقہے آرکسٹرا کی تیز دھن میں دبے دبے سے معلوم ہو رہے تھے۔

فرحان نے خود کو ان ہنگاموں سے دور رکھا تھا۔ وہ ایک پودے کے قریب کھڑا ان لوگوں کا تماشا دیکھ رہا تھا جو آپے سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ ذوالفقار ڈگمگاتے قدموں سے فرحان کے قریب آیا اور اسے زبردستی سگریٹ دے کر چلا گیا۔

اس نے سگریٹ کے ٹکڑے کر کے قریبی پودے کے پیچھے پھینک دیے۔ اسی وقت اسے اپنے قریب ہی ایک نسوانی ہنسی سنائی دی۔ وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ خوبصورت لڑکی فرحان کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس رہی تھی۔ فرحان نے محسوس کیا کہ وہ نشے میں نہیں تھی۔

"محترمہ! کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں؟" فرحان نے مسکرا کر پوچھا۔

"مجھے آپ کی حرکت پر ہنسی آئی ہے۔" لڑکی نے قریب آتے ہوئے کہا۔

"کیا میں نے کوئی بے تکی حرکت کی ہے؟" فرحان کی مسکراہٹ قائم رہی۔

"میں کچھ دیر سے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ آپ یہاں کے ماحول سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ سگریٹ بھی آپ نے اس طرف پھینک دیا۔"

"میں سگریٹ بھی نہیں پیتا۔"

"میں نے دیکھا تھا۔ کوئی دے گیا تھا آپ کو۔ کوئی دوست ہی ہوگا؟"

"جی ہاں۔ وہی مجھے یہاں گھسیٹ بھی لایا ہے۔"

"جب آپ سگریٹ نہیں پیتے تو لی کیوں تھی؟"

"دوست کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ مجھے اس ہنگامے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔" لڑکی نے کہا۔ "مجھے میری ایک دوست زینت یہاں لے آئی ہے اور اب اس ہنگامے میں نہ جانے کہاں گم ہو گئی ہے۔"

"یہاں سب مست الست ہیں۔ کسی کو کسی کی پروا نہیں۔ سب اپنی اپنی دھن میں ہیں۔"

"اسی لیے میں بور ہو رہی تھی۔ آپ اور میں گویا ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ کیوں نہ ہم دونوں کسی میز پر جا بیٹھیں۔"

"کوئی حرج نہیں۔" فرحان کو وہ لڑکی اچھی لگی تھی۔

وہ دونوں ایک خالی میز پر جا بیٹھے۔

"میرا نام دیبا ہے۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

فرحان نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنا نام بتایا۔

"ہم دونوں کا مزاج شاید بڑی حد تک ایک سا ہے۔ کیوں نہ ہم دوست بن جائیں۔"

فرحان نے ہنس کر کہا۔ "اتنی دیر تک باتیں کرنے کے بعد ہم دوست تو بن چکے ہیں۔"

"گڈ! تو اب ہم میں تکلف نہیں ہونا چاہیے۔ ایک دوسرے کو آپ کے بجائے تم کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

"اچھی بات کی تم نے۔"

دیبا نے ارد گرد ماحول کی طرف اشارہ کیا پھر بولی۔ "تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ ہم دونوں بہت اچھے دوست بن جائیں گے۔"

"تم مجھے اس لیے اچھی لگی ہو کہ خود کو اس ماحول سے الگ تھلگ رکھا ہے۔" فرحان نے کہا۔ "اس ماحول میں رہنے والے زیادہ ترقی نہیں کر سکتے۔ خود فراموشی انسان کو ترقی کی طرف نہیں لے جا سکتی۔"

"تمہاری یہی باتیں تو مجھے اچھی لگ رہی ہیں۔"

اسی وقت ایک ڈگمگاتی ہوئی لڑکی قریب آئی اور دیبا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "آخر تم نے...... تم نے ڈھونڈ ہی لیا...... بوائے فرینڈ؟"

"بوائے فرینڈ!" دیبا نے منہ بنایا۔ "یہ بات مجھے اچھی نہیں لگتی۔ اب اس کا مطلب کچھ اور ہی لیا جانے لگا ہے۔ یہ میرے دوست ہیں، صرف دوست۔"

"میرا نام فرحان ہے۔" فرحان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم شاید دیبا کی دوست زینت ہو؟"

"چلو...... اب اٹھو...... تین بجنے والے ہیں۔" زینت کے لہجے میں بھی لکنت تھی۔

"پچھلے سال تم نے زیادہ نہیں پی تھی۔" دیبا نے کہا۔ "آج زیادہ پی گئی ہو۔ میں تمہارے ساتھ اس شرط پر جاؤں گی کہ تمہاری کار میں ڈرائیو کروں گی۔ تم تو کہیں ایکسیڈنٹ کر بیٹھو گی۔"

پھر زینت منہ بنا کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ فرحان نے دیبا سے پوچھا۔ "تمہاری کار نہیں ہے کیا؟"

"میرے پاس کسی بھی قسم کی کنوینس نہیں ہے۔" دیبا نے سنجیدگی سے کہا پھر زینت سے بولی۔ "تم اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دو گی۔"

"ان کی کار میں ڈرائیو کروں گا۔" فرحان نے دیبا سے کہا۔ "ان کو ڈراپ کرنے کے بعد ان کی کار انہی کے گھر پر چھوڑ دی جائے گی۔"

"تم زحمت میں پڑ جاؤ گے۔"

"دوستوں میں ایسی باتیں نہیں ہونا چاہئیں۔"

دیبا مسکرا دی۔

فرحان اپنے موبائل پر ذوالفقار سے رابطہ کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد بولا۔ "کہاں ہو تم۔ مجھے تو لے آئے اور خود نہ جانے کہاں گم ہو۔ بس، اب چلو۔ تین بجنے کو ہیں۔"

"اچھا، آتا ہوں۔"

فرحان نے موبائل بند کر دیا۔

دیبا نے زینت کو سنبھال کر اٹھایا اور وہ چاروں ہوٹل سے نکلے۔ دیبا نے زینت کو سنبھال کر اس کی کار کی پچھلی نشست پر بٹھایا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھی۔ دیبا ہی نے زینت کے گھر کا راستہ بھی بتایا تھا۔ زینت تو آنکھیں بند کیے خاموشی کے ساتھ نیم دراز رہی تھی۔ راستے میں فرحان نے دیبا اور ذوالفقار کا تعارف کرایا۔ ان دونوں میں رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا۔ کار دیبا نے اپنے گھر کے سامنے رکوائی۔

"ہاؤس مینٹنگ فرحان!" دیبا نے کار سے اترتے ہوئے کہا۔ "تم نے گھر تک بھی پہنچایا۔ تھینک یو۔"

"دوستوں میں شکریہ ادا کرنے کا میں قائل نہیں۔" فرحان نے ہنس کر کہا۔ دیبا بھی ہنس دی اور پھر بائے بائے کہہ کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

"اچھی لڑکی ہے۔" ذوالفقار نے تبصرہ کیا۔

"جس طرح تم مجھے وہاں لے گئے تھے، اسی طرح اس کی دوست زینت اسے اپنے ساتھ گھسیٹ کر لے گئی تھی۔"

فرحان کار اسی وقت حرکت میں لایا جب دیبا نے گھر میں داخل ہو چکی تھی۔

"پسند آئی تمہیں؟" ذوالفقار نے پوچھا۔

"تم نے ابھی خود کہا کہ وہ اچھی لڑکی ہے۔"

"پہلے تو تمہیں کوئی لڑکی اچھی ہی نہیں لگتی تھی۔"

"کوئی اچھی ہوتی تو اچھی لگتی۔"

"تو دل آ گیا اس پر؟"

فرحان ہنس کر اس کا سوال ٹال گیا۔

جلد ہی ذوالفقار کا گھر آ گیا۔ اسے ڈراپ کر کے فرحان نے اپنے گھر کی راہ لی۔ اس کے دماغ میں دیبا چکرا رہی تھی۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا جب زینت، دیا کو اپنے کالج لے گئی۔

"عجیب سا لگ رہا ہے یہاں۔" دیا نے کہا۔ "سبھی میرے لیے اجنبی ہیں۔"

"تم بھی سب کے لیے اجنبی ہو لیکن کسی کی مجال نہیں کہ مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھے۔"

"غالباً تم اس کالج کے طلبا میں سب سے بڑے گھرانے کی لڑکی ہو۔"

اس وقت اسٹیج سے اعلان کیا جا رہا تھا کہ اب مسٹر وقار عالم خطاب فرمائیں گے۔ وقار اسٹیج پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے درمیان سے اٹھ کر مائیک کی طرف جانے لگا۔

دیا بولی۔ "آج پہلی بار دیکھ رہی ہوں میں اپنے ادارے کے مالک کو۔"

"ہے نا بہت ہینڈسم؟"

"ہینڈسم تو بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مزاج کا کیسا ہے۔ میں تو اسے مغرور سمجھتی ہوں۔ اس نے کبھی دفتر کا راؤنڈ نہیں لگایا۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ تم اسے مغرور سمجھو۔"

"بظاہر تو یہی سمجھا جا سکتا ہے۔"

زینت پھر کچھ کہتی لیکن وقار عالم نے بولنا شروع کر دیا تھا۔

"وقت انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتا ہے اس لیے میں نے کسی تمہید کے بغیر بات شروع کر دی ہے تاکہ میرا وقت ضائع ہو نہ آپ کا وقت برباد ہو۔ میں نے زندگی میں کبھی تقریر نہیں کی۔ آج یہ پہلا موقع ہے اور وہ اس لیے کہ یہ میرے والد کا حکم تھا جو مجھ سے پہلے اس درس گاہ کے ٹرسٹی تھے اور یہاں تقریر کرنے آتے تھے لیکن اب کسی وجہ سے وہ وہیل چیئر کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں کیونکہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا اس لیے وقت ہی کے بارے میں چند جملے کہوں گا۔ جو وقت ضائع کرتا ہے، کامیابی اس کی زندگی سے دور رہتی ہے۔ اگر اس کے باوجود آپ کوئی کامیابی حاصل کر لیں تو اس پر بھی یہ سمجھیں کہ اگر آپ نے وقت برباد نہ کیا ہوتا تو کامیابیاں اس سے کہیں زیادہ ہوتیں جو آپ حاصل کر چکے ہوتے ہیں لہٰذا وقت کی قدر کیجیے۔ اپنا یہ سرمایہ ضائع نہ ہونے دیں۔ کام کریں...... مسلسل کام کریں۔ آج میں نے جو مقام حاصل کیا ہے، وہ وقت کی قدر کر کے اور کام کر کے حاصل کیا ہے۔ آپ بھی اپنا کوئی مقام بنا سکتے ہیں۔ بس، مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔"

وہ مائیک سے ہٹنے ہی والا تھا کہ ہر طرف تالیاں بجنے لگیں۔

وقار عمارت سے باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ لڑکے لڑکیاں اس کی طرف جھپٹے۔ "سر! آٹوگراف...... سر! آٹوگراف۔"

وقار مڑا۔ اس کے چہرے پر کبیدگی کا تاثر تھا۔

"آپ لوگ آٹوگراف لینے میں اپنا اور میرا وقت ضائع کریں گے۔ ابھی میں نے جو تقریر کی ہے، شاید بھاڑ جھونکا ہے۔ میرا آٹوگراف آپ کی زندگی میں کامیابیاں نہیں لا سکتا۔ وہ آپ کو صرف کام کرنے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔"

اس کی طرف جھپٹنے والے طلبا ٹھٹک کر رک گئے۔

شوفر نے وقار کی کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا تھا۔ وقار کار میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ دو لڑکیاں اس کے قریب پہنچ گئیں۔ وہ زینت اور دیا تھیں۔ "ایکسکیوز می سر!" زینت بولی۔

وقار نے سر گھما کر دیکھا۔

"سر! میں ایک اسکول کھولنے والی ہوں۔ میری خواہش ہے اور یہ میری عزت افزائی بھی ہوگی کہ آپ اسکول کا افتتاح کریں۔"

"یعنی اپنا وقت برباد کروں؟ گیٹ لاسٹ!"

دیا بول پڑی۔ "وقت بچانے کی عادت کے ساتھ ساتھ انسانیت کی بھی قدر کریں تو زیادہ اچھا ہوگا۔ آپ نے گیٹ لاسٹ کہہ کر خود کو انسانیت سے دور کر لیا۔ میری دوست نے آپ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ آپ اس کی انا مجروح کریں۔ عزت اس کی ہوتی ہے جو دوسروں کی عزت کرتا ہے لیکن آپ تو انسانیت کی سطح سے......"

زینت نے گھبراہٹ میں دیا کا بازو پکڑ کر کھینچ لے جانا چاہا لیکن دیا نے کھنچتے کھنچتے بھی اپنا جملہ پورا کر دیا۔ "...... نیچے گر گئے ہیں۔"

وقار کار میں بیٹھ گیا۔ شوفر نے تیزی سے اپنی سیٹ سنبھالی اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔ کالج کی انتظامیہ کا ایک لیکچرر زینت پر بگڑ گیا۔ "یہ تم کس بدتمیز لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر آئی ہو۔ یہ ہمارے کالج کی بھی نہیں معلوم ہوتی۔"

"آئی ایم سوری سر!" زینت نے جلدی سے کہا۔

دیا ہونٹ بھینچے کھڑی رہی۔

"جانتی نہیں ہو، وقار صاحب کتنے بڑے آدمی ہیں۔"

"چھوٹے آدمی ہیں۔" دیا نے بے اختیار کہا اور مڑ کر تیزی سے اس طرف بڑھ گئی جہاں زینت نے اپنی کار کھڑی کی تھی۔ اس نے نہ دیکھا، نہ سنا کہ لیکچرر اور زینت میں مزید کیا مکالمے ہوئے تھے۔ وہ کار کی اگلی نشست کا دروازہ کھول کر بیٹھنا چاہتی تھی لیکن دروازہ لاک تھا۔ جلدی گھبرائی

ہوئی زینت قریب آئی۔

''یہ کیا کر بیٹھی ہو تم؟'' اس نے کار کا لاک کھولتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی بھول گئیں کہ یہ اس ادارے کا مالک ہے جس میں تم ملازم ہو۔''

''لعنت بھیجتی ہوں میں اس ادارے پر جس کا مالک انسان کی عزت بھی نہ کرنا جانتا ہو۔ میں کل ہی استعفا دے دوں گی۔''

زینت نے کار اسٹارٹ کر دی۔ دیبا اس کے برابر میں بیٹھ چکی تھی۔

زینت نے کار حرکت میں لاتے ہوئے کہا۔ ''حماقت کرو گی اتنی اچھی ملازمت چھوڑ کر۔''

''میں وہاں نہیں رہ سکتی جہاں انسانیت نہ ہو۔ وہ اپنے کسی ملازم کی بھی عزت نہیں کرتا ہوگا۔ کسی دن اس کا میرا آمنا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔ میں اس سے بچنا چاہتی ہوں۔''

زینت نے اسے بہت سمجھایا لیکن دیبا نے دوسرے دن ہی استعفا دے دیا۔ اسی دن اس نے اخبار میں اپنی تصویر بھی دیکھی۔ وہ اس موقع کی تصویر تھی جب وہ اور زینت وقار کی کار کے پاس اس سے باتیں کر رہی تھیں۔ باتیں کیا کر رہی تھیں، بس چند جملوں کا تبادلہ ہوا تھا۔

اس تصویر نے ایک اور ہی گل کھلایا۔ دوسرے دن دفتر جانے سے پہلے وقار نے بھی وہ تصویر دیکھی اور دیکھتا رہ گیا۔ اسے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ اسے خود دفتر کے لیے روانہ ہو جانا چاہیے۔

اس کے والد وہیل چیئر پر بیٹھے اس کے قریب آئے۔

''کیا آج دفتر نہیں جاؤ گے؟''

وقار نے چونک کر کہا۔ ''جاؤں گا ڈیڈ! آپ مجھے ایک بات بتائیں۔''

''پوچھو۔''

''کیا میں انسانیت کی سطح سے گرا ہوا شخص ہوں؟''

''یہ خیال کیوں آ گیا؟'' وقار کے ڈیڈ نے تعجب سے پوچھا۔

وقار نے گزشتہ روز کا واقعہ سنا دیا اور اخبار کی تصویر بھی دکھائی۔ دیبا کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''یہ ہے وہ لڑکی جس نے مجھ سے اس قسم کے جملے کہے۔'' یہ وہ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ دیبا نے کیا کہا تھا۔

''ہوں۔'' ڈیڈ کے چہرے پر گہری سنجیدگی دکھائی دی۔ وہ بولے۔ ''تم نے گیٹ لاسٹ کہہ کر غلطی کی تھی اور اس لڑکی نے تم سے جو کچھ کہا، وہ ٹھیک کہا۔ دیکھو بیٹا! کام کرنا بہت اچھی بات ہے۔ میں نے ادارے کو جہاں چھوڑا تھا، اسے تم اپنی محنت اور کام سے آسمان کی طرف لے جا رہے ہو لیکن کام کے علاوہ بھی دنیا کی کچھ اقدار ایسی ہوتی ہیں جن کا انسان کو خیال رکھنا چاہیے۔ ان اقدار میں انسانیت کا درجہ سب سے بلند ہے۔''

''جی۔'' وقار نے آہستہ سے کہا۔ ''ڈیڈ! میں آئندہ اس کا خیال رکھوں گا۔''

''اس تصویر میں صرف یہ لکھا ہے کہ دو لڑکیاں وقار عالم کے قریب۔''

''جی۔''

''معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں لڑکیاں کون ہیں؟''

وقار نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''جی، معلوم تو ہو جائے گا۔ اسی کالج کی ہوں گی۔ کالج کی انتظامیہ کے کسی شخص کو فون کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے۔''

''تو معلوم کرنا۔ خاص طور سے اس لڑکی کے بارے میں۔ اس کا فون نمبر بھی معلوم کرنا، اگر ہو سکے تو۔''

''اس سے کیا ہوگا، ڈیڈ؟''

''میں اس لڑکی سے ملنا چاہوں گا جس نے تمہارے سینے میں انسانیت کا بیج بو دیا ہے۔''

''کیا آپ اسے فون کریں گے؟''

''ہاں۔'' ڈیڈ نے کہا۔ ''میں نے کہا نا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں اسے چائے پر گھر میں ہی مدعو کروں گا۔''

وقار باپ کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔

''اب تمہیں دفتر جانا چاہیے۔''

''جی ڈیڈ!'' وقار کھڑا ہو گیا۔

اس دن وقار تیس منٹ کی تاخیر سے دفتر پہنچا۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے اپنے سیکریٹری کو طلب کیا اور اسے اخبار کی تصویر دکھاتے ہوئے بولا۔

''یہ دونوں اسی کالج کی ہوں گی جہاں کل میں تقریب کے لیے گیا تھا۔''

''نہیں سر! دوسری لڑکی......'' اس نے تصویر میں دیبا کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ تو ہمارے ادارے میں کام کرتی تھی۔ ابھی ابھی استعفا دے کر گئی ہے۔ مجھے جی ایم صاحب سے معلوم ہوا ہے۔''

''اچھا۔'' وقار سوچنے لگا پھر بولا۔ ''میں اس کا استعفا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم خود جی ایم سے لے کر فوراً آؤ۔''

''بہتر۔'' سیکریٹری چلا گیا۔

وقار اپنی ریوالونگ چیئر کو ادھر ادھر گھمانے لگا۔ اس کی

یہ حرکت اس کے اضطراب کی غمازی کر رہی تھی۔ سیکریٹری جلد ہی واپس آ گیا۔

"بہت سخت جملہ لکھا ہے اس نے استعفے میں۔" سیکریٹری نے ایک کاغذ وقار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

وقار نے وہ پڑھا، لکھا تھا۔ "میں اس ادارے میں کام نہیں کرنا چاہتی جس کے مالک کو لفظ "انسانیت" کے شاید معنی بھی معلوم نہ ہوں۔ میں کوئی وضاحت نہیں کروں گی۔ بس، میرا استعفا فوراً منظور کیا جائے۔ منظور نہیں کیا جائے گا تو بھی میں اب دفتر نہیں آؤں گی۔"

استعفے ہی سے وقار کو معلوم ہو سکا کہ اس لڑکی کا نام دیبا تھا۔

سیکریٹری بولا۔ "اس بارے میں جی ایم صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"ضرورت نہیں ہے ملنے کی۔ ان سے کہہ دینا کہ یہ استعفا منظور نہیں کیا جائے۔"

"اس نے لکھا ہے کہ استعفا منظور نہ ہونے کی صورت میں بھی وہ اب دفتر نہیں آئے گی۔"

"پڑھ چکا ہوں میں۔" وقار نے سیکریٹری کو گھورتے ہوئے کہا۔ "تم سے جو کہا گیا ہے، وہ کرو۔"

"او کے سر!"

سیکریٹری تیزی سے چلا گیا۔ دیبا کا استعفا وقار نے اسے دے دیا تھا تاکہ وہ جی ایم کو واپس کر دیا جائے۔

☆☆☆

فرحان کو گھر میں جب بھی تنہائی ملتی، ماضی کی یادیں اس کے دماغ میں امڈ آتیں۔ اسے دیبا سے دوسری ملاقات بھی یاد آتی جو اتفاقیہ ہوئی تھی۔

تیسرے پہر کے بعد وہ کار میں ذوالفقار کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ ایک شاپنگ پلازا کے سامنے سے گزرتے ہوئے ذوالفقار نے اسے چونکا دیا۔

"دیبا۔" اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

فرحان نے جلدی سے ادھر دیکھا۔ دیبا کوئی چھوٹا موٹا سامان خرید کر باہر نکل رہی تھی۔ فرحان نے جلدی سے کہا۔ "پلیز ذوالفقار! تم اتر جاؤ کار سے۔ ٹیکسی کر لینا۔"

ذوالفقار ہنسا۔ "لفٹ دو گے اسے؟"

"میں تو اس دن سے اس کے گھر کے چکر کاٹ رہا ہوں۔" فرحان نے کار روک دی تھی۔ "پلیز، ذلفی!"

"محبت زندہ باد۔" ذوالفقار ہنستا ہوا کار سے اتر گیا۔

فرحان نے شیشے میں دیکھا، دیبا مخالف سمت میں جا رہی تھی۔ اس سڑک پر یوٹرن لینا آسان نہیں تھا لیکن فرحان نے کسی نہ کسی طرح یہ کام کر ہی لیا۔ اب وہ دوسری طرف کی فٹ پاتھ کے قریب سے آگے بڑھ رہا تھا۔ آگے بس اسٹاپ تھا۔ دیبا شاید وہیں جا رہی تھی۔

فرحان بس اسٹاپ آنے سے پہلے دیبا کے قریب پہنچ گیا۔

"ہیلو دیبا!" وہ قدرے بلند آواز میں بولا۔

دیبا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور مسکراتی ہوئی کار کی طرف آئی۔ فرحان نے کار روک دی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" فرحان نے پوچھا۔

"ابھی تو بس اسٹاپ ہی کی طرف جا رہی ہوں۔ گھر کا ارادہ ہے۔"

"میں نے تمہیں شاپنگ پلازا سے نکلتے دیکھا تھا۔ آؤ بیٹھو، میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔"

دیبا بے تکلفی سے فرحان کے برابر کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ فرحان نے کار چلا دی۔

دیبا بولی۔ "مجھے کئی بار تمہارا خیال آ چکا ہے۔ بہت غصہ آیا تھا مجھے خود پر۔ میں نے نہ تو تمہارا موبائل نمبر لیا تھا، نہ اپنا تمہیں دیا تھا۔"

"مجھے بھی افسوس تھا اس کا۔ تمہارا نمبر میرے پاس ہوتا تو میں تمہیں فون کر چکا ہوتا۔"

"گھر آ جاتے۔ وہ تو تم نے دیکھا ہی تھا۔"

"بس، کوئی خیال تھا ذہن میں کہ گھر نہیں آیا۔"

"خیال ایک ہی ہو سکتا ہے کہ میں یہ نہ سوچوں کہ تم میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔" دیبا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کچھ ایسی ہی بات تھی۔" فرحان نے کسی قدر جھینپ کر کہا۔

"نہیں ہونا چاہیے تھی۔ ہم ایک ہی ملاقات میں اچھے دوست بن گئے تھے۔"

"ہاں۔" فرحان نے کہا۔ "وہ ملاقات بہت اچھی تھی۔ مجھے بعد میں یوں لگتا رہا کہ ایک چمکیلا ستارہ میرے قریب سے گزر گیا۔"

"باتیں اچھی کرتے ہو۔ اسی لیے تو تم مجھے یاد آتے رہے۔ مجھے تمہارا یہ جملہ اب بھی یاد ہے کہ آگے کے بجائے پیچھے جانے کو ترقی کہنا مضحکہ خیز ہے۔"

"بس، یوں ہی بک بک کر لیتا ہوں۔ تم اپنا موبائل نمبر بتاؤ۔ ان باتوں میں آج شاید پھر اس کا خیال نہ رہے۔"

دیبا نے اپنا موبائل نمبر بتایا۔

فرحان بولا۔ ''اس طرح یاد کب رہے گا؟'' اس نے اپنا موبائل نکال کر دیبا کی طرف بڑھایا۔ ''اس میں لکھ دو۔''

دیبا نے ایسا ہی کیا اور فرحان سے اس کا نمبر پوچھ کر اپنے موبائل میں سیو کر لیا۔

''تم کس کے ساتھ رہتی ہو؟'' فرحان نے پوچھا۔

''ایک بوڑھی ملازمہ کے ساتھ۔''

''کیا مطلب...... ملازمہ کے ساتھ؟''

''ہاں۔'' دیبا کسی قدر افسردگی کے ساتھ سنجیدہ ہوئی۔ ''والدین اس دنیا سے جا چکے ہیں۔ ورثے میں بس ایک گھر مل گیا ہے۔ گزر اوقات کے لیے ایک معمولی سی ملازمت کرتی ہوں۔''

''معمولی ملازمت میں ملازمہ کو کیا دے پاتی ہوگی؟''

''وہ گھر میں اس وقت کی ملازم ہے جب میں بہت چھوٹی تھی۔ اسے کھانے اور کپڑے کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بوڑھی تھی جب ہمارے گھر میں ملازم ہوئی تھی۔ مجھے کوئی اچھی ملازمت مل گئی تو اس کا زیادہ خیال رکھ سکوں گی۔''

''تو کسی اور ملازمت کی تلاش میں بھی ہو؟''

''ہاں۔ میں ترقی کرنا چاہتی ہوں۔'' دیبا نے کہا پھر ہنس کر بولی۔ ''پیچھے کی طرف نہیں، آگے کی طرف ترقی۔''

فرحان ہنس دیا۔ ''تم نے میرا جملہ رٹ لیا ہے۔''

''اچھا جملہ ہے نا۔'' دیبا نے کہا پھر پوچھا۔ ''تم کیا کرتے ہو؟''

''مزے کرتا ہوں۔'' فرحان ہنسا۔

''کیا مطلب؟''

''میرے حالات تمہارے حالات کے برخلاف ہیں۔ میرے والدین کا بھی انتقال ہو چکا ہے لیکن والد اتنا چھوڑ گئے ہیں کہ مجھے کوئی کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔''

''تعلیم کتنی حاصل کی ہے؟''

''سند یافتہ آرکیٹیکٹ ہوں۔''

''پھر تو تمہیں کچھ کرنا چاہیے۔ انسان اپنا کوئی مقام تو بنائے۔ صرف پیسا ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔''

''مجھے کوئی دلچسپی نہیں اپنا مقام بنانے سے۔ لو، تمہارا گھر بھی آ گیا۔''

فرحان نے کار روک دی۔

''آؤ، کافی پی کر جانا۔'' دیبا نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''اس وقت نہیں۔'' فرحان نے کہا۔ ''پھر کسی دن بن بلائے آؤں گا۔ ویسے کل کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''سوری فرحان! کل میں مصروف ہوں۔''

''دفتر سے چھٹی کے بعد ملو۔''

''کل میں دفتر تو جاؤں گی ہی نہیں۔ چھٹی لے لی ہے۔ ایک ذاتی کام ہے۔''

''ایسا کیا کام آن پڑا؟''

''میں نے کہا نا کہ ذاتی کام ہے۔'' دیبا نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''ویسے فون پر تو رابطہ رہے گا۔ کسی دن کہیں مل بیٹھنے کا پروگرام بنا لیا جائے گا۔''

''اچھا جیسا تم کہو۔''

فرحان کا جی تو چاہا تھا کہ اس کے گھر میں چائے، کافی پیے اور اس سے باتیں کرے لیکن اس نے سوچا تھا کہ دیبا یہ نہ سمجھ لے کہ وہ اس کا دیوانہ ہوتا جا رہا ہے۔ دیبا کے گھر سے وہ ذوالفقار کے گھر پہنچا جہاں وہ موجود تھا۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ دیبا اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی۔ اسے اس وقت بھی اپنا دوست فرحان یاد آ رہا تھا۔ اس کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کے ان خیالات کا سلسلہ موبائل فون کی گھنٹی سے ٹوٹا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا کہ زینت ہی کی کال ہوگی لیکن اسکرین پر اسے ایک اجنبی نمبر دکھائی دیا۔ یکایک اسے خیال آیا کہ فرحان نے اسے اپنے نئے نمبر سے فون کیا ہے۔ اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو!''

''بیٹی! دیبا بول رہی ہو؟'' ایک اجنبی آواز سنائی دی۔

وہ حیران ہوئی کہ اسے بیٹی کہنے والا کون ہو سکتا ہے؟

''جی۔'' وہ بولی۔ ''میں دیبا ہی بول رہی ہوں۔''

''بیٹی! میں وقار کا والد بول رہا ہوں۔''

دیبا حیران ہوئی۔ وقار کے باپ کو اسے فون کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور اسے اس کا نام اور فون نمبر کیسے معلوم ہوا؟

دوسری طرف سے آواز آتی رہی۔ ''یقیناً تم حیران ہو رہی ہوگی کہ میں نے تمہیں فون کیوں کیا جبکہ تم میرے بیٹے کو بہت کھری کھری سنا چکی ہو۔ تم نے اس کی کمپنی سے استعفا بھی دے دیا ہے لیکن وہ اس نے منظور نہیں کیا۔ وہ مجھے سارا واقعہ سنا چکا ہے اور اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہے جس کی وجہ سے تم نے اسے بہت کچھ کہہ ڈالا تھا۔ تم نے اسے بہت اچھا سبق دیا ہے۔ میں تم سے بہت خوش ہوں

بیٹی! میری خواہش ہے کہ تم سے ملوں۔ میں چاہتا ہوں کہ وقار میرے سامنے تم سے معافی مانگے۔ تم کل شام کی چائے میرے گھر پر پینا پسند کرو تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔''

دیا نے دم بخود رہ جانے والی کیفیت میں سب کچھ سنا۔ اس کے ذہن میں یہ بھی آیا کہ وہ وقار کا باپ ہونے کے ناتے اس کے لیے ایک بزرگ ہے۔ اس نے انہیں سلام کیا۔

''جیتی رہو۔'' وقار کے باپ نے کہا۔ ''خوشیاں ہمیشہ تمہارے قدم چومیں۔ میری بات کا جواب دو۔ کیا تم کل شام کو میرے گھر آؤ گی؟''

جواب دیتے ہوئے دیا ہچکچا گئی۔

دیا کی خاموشی پر وقار کے باپ نے مزید کہا۔ ''میں تم پر کوئی دباؤ تو نہیں ڈال سکتا بیٹی! لیکن تم نے انکار کیا تو مجھے افسوس ضرور ہوگا۔''

''آپ میرے بڑے ہیں، بزرگ ہیں۔'' دیا نے کہا۔ ''میں بڑوں کی بات نہ ماننا اچھا نہیں سمجھتی۔ میں حاضر ہو جاؤں گی۔''

''خوش رہو۔ کل شام پانچ بجے میں تمہارا انتظار کروں گا۔ وقار تو کبھی کبھی بہت رات تک مصروف رہتا ہے۔ اس پر صرف کام کی دھن سوار رہتی ہے لیکن میں اس سے آج ہی کہہ دوں گا کہ وہ کل شام گھر پر رہے۔''

''جی۔'' دیا اور کچھ نہیں کہہ سکی۔

''تم نے وقار کا گھر دیکھا ہے؟''

''جی نہیں۔''

''تو میں تمہیں پتا بتائے دیتا ہوں۔''

''جی بتائیے۔''

وقار کے باپ نے پتا بتایا جو دیا نے لکھ لیا۔ اس بات چیت کے بعد دیا نے فوراً زینت کو فون کیا اور اسے ساری بات بتائی۔

''واہ۔'' زینت نے بے اختیار کہا۔ ''یہ تو بڑی بات ہے کہ تمہارے ادارے کا مالک شرمندہ ہے اور تم سے معافی مانگنا چاہتا ہے۔ تم اس کے باپ کے فون کی لاج رکھو۔''

''وقار کا سامنا کرتے ہوئے مجھے جھجک ہوگی۔''

''لیکن تمہیں جانا چاہیے۔''

''میرا استعفا منظور نہیں کیا گیا ہے لیکن میں دفتر تو نہیں جاؤں گی۔''

''نہ جانا لیکن وقار کے گھر ضرور جانا۔''

''تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

''مناسب نہیں ہوگا۔ صرف تمہیں مدعو کیا گیا ہے۔ دوسرے کل شام کو ایک صاحب ڈیڈی سے ملنے آرہے ہیں۔ وہ کوئی عمارت فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ ڈیڈی چاہتے ہیں کہ میں اس عمارت میں فوراً اسکول کھول لوں۔''

''تو کالج کا کیا ہوگا؟''

''میں کالج کے بعد اسکول جایا کروں گی۔ فی الحال وہاں کے لیے کسی کو پرنسپل بھی رکھا جاسکتا ہے۔ ڈیڈی سے میری بات ہوچکی ہے۔ میں فی الحال اسکول کی سیکنڈ شفٹ شروع کروں گی۔''

''مجھے موقع ملا تو میں وقار سے تمہارے اسکول کے افتتاح کی بات بھی کروں گی۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوگا۔'' زینت نے خوش ہوکر کہا۔ ''اگر وقار نے افتتاح کیا تو میرا اسکول جلد ہی مشہور ہو جائے گا۔''

''جب وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے تو افتتاح کی بات بھی مان جائے گا۔''

''اچھا اب کل بتاؤں گی کہ وہاں کیا باتیں ہوئیں۔''

''ضرور بتانا۔''

دیا نے رابطہ منقطع کیا اور اس خیال سے مسکرانے لگی کہ وقار سے اس کی باتوں کا کوئی منفی نتیجہ نہیں نکلا بلکہ اسے مثبت کہا جاسکتا تھا۔

دوسرے دن اسے کوریئر ملا جو اس کے دفتر سے بھیجا گیا تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا۔ اس میں اس کا استعفا اور جی ایم کا مختصر خط تھا۔

''دیا! تمہارا استعفا صاحب (وقار عالم) نے مسترد کردیا ہے۔ انہی کے حکم سے میں تمہیں یہ واپس کررہا ہوں۔ دفتر ضرور آنا۔''

اس تحریر کے نیچے جنرل منیجر کے دستخط اور ادارے کی مہر تھی۔

دیا بڑبڑائی۔ ''آج تو نہیں جاؤں گی۔'' ویسے بھی دفتر کا آدھا وقت گزر چکا تھا۔

شام کو وہ وقار کے گھر پہنچ گئی۔ برآمدے ہی میں وقار اس کا منتظر تھا۔ غالباً باپ ہی نے اسے حکم دیا ہوگا کہ وہ دیا کو ریسیو کرے۔

''سوری دیا!'' وقار نے کہا۔ ''میں اپنے رویے پر شرمندہ ہوں۔''

''چھوڑیے سر! رات گئی، بات گئی۔''

وقار اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ وہاں وہیل چیئر

پر جو شخص موجود تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے والد ہیں...... اور ڈیڈی یہ......"

"دیبا ہیں۔" اس کے والد نے مسکرا کر اس کی بات پوری کر دی اور پھر دیبا سے کہا۔ "آؤ بیٹی! مجھے خوشی ہوئی کہ تم آگئیں۔ آؤ بیٹھو۔"

دیبا اور وقار بیٹھ گئے۔ دیبا نے اس کے باپ کو سلام کیا تھا اور دعائیں لی تھیں۔

"سب سے پہلے تو تم دیبا سے معافی مانگو۔" وقار کو باپ سے حکم ملا۔

"مانگ چکا ہوں، ڈیڈی!"

"میرے سامنے مانگو۔"

"ارے اب چھوڑیے بھی انکل!" دیبا بولی۔

لیکن وقار نے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور دیبا کی طرف دیکھتے ہوئے "سوری" کہا۔

"تم بہت ہی اچھی لڑکی ہو دیبا! تم میرے بیٹے کے ذہن میں انقلاب لے آئی ہو۔ لو چائے پیو۔ میں نے پہلے سے سب تیاری کروالی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم آؤ گی۔"

تپائی پر چائے کے ساتھ اور نہ جانے کیا کیا تھا۔

"بہت تکلف کروا ڈالا آپ نے۔" دیبا بولی۔

"کچھ بھی نہیں۔ شروع کرو۔"

دیبا نے ایک پلیٹ اٹھا کر وقار کے والد کو دی۔ دوسری پلیٹ وقار کو دینا چاہتی تھی کہ وہ "ایکسکیوزمی" کہہ کر اٹھ گیا۔ اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔ وہ موبائل کی کال ریسیو کرتے ہوئے وسیع ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں چلا گیا جہاں سے اس کی آواز اس کے والد یا دیبا کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

"بس یہ ہے۔" وقار کے والد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دو موبائل اس کی جیب میں رہتے ہیں۔ ایک پر بات ختم نہیں ہوتی کہ دوسرا موبائل بجنے لگتا ہے۔ ہر کال کسی نہ کسی کام کے بارے میں ہوتی ہے۔ کام اور بس کام۔ مشین بن کر رہ گیا ہے۔ اسی لیے شادی کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ شادی سے کام کا حرج ہوگا لیکن اب میں اس کی زندگی میں تبدیلی لانا چاہتا ہوں۔"

"بے شک۔" دیبا نے کہا۔ "کچھ وقت انسان اپنے آپ کو بھی دے۔"

"اچھی بات کہی تم نے۔ میں ان دنوں اس کی شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔"

"لڑکیاں دیکھ رہے ہوں گے ان کے لیے؟"

"ہاں...... اچھا یہ تو بتاؤ کہ تمہارے بزرگ کون کون ہیں؟"

"اسے آپ میری بدقسمتی کہہ لیجیے کہ میرا کوئی بزرگ نہیں۔" دیبا نے جواب دینے کے بعد اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

وقار کے والد نے افسوس کا اظہار کیا پھر کہا۔ "وہ ہوتے تو میں ان سے کچھ خاص باتیں کرتا۔"

"خاص باتیں...... میں بھی تو ہوں؟"

"ابھی تم نے کہا تھا کہ میں اس کے لیے لڑکیاں دیکھ رہا ہوں۔"

"جی۔"

"لیکن مجھے ان میں سے کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔"

"آپ کس قسم کی لڑکی چاہتے ہیں؟"

"بالکل تمہارے جیسی۔"

دیبا چپ رہ گئی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ یہ بات کس طرف جانے والی ہے۔ اس کا یہ خیال درست بھی ثابت ہوا۔ وقار کے والد بولے۔ "تم وقار کی شریکِ زندگی بن جاؤ تو کیسا رہے گا۔"

دیبا پہلے تو کچھ ہچکچائی پھر بولی۔ "چونکہ میں بزرگوں کے سائے سے محروم ہوں اس لیے ہر قسم کی بات بڑی بے تکلفی سے کہہ ڈالتی ہوں۔"

"کہہ ڈالو۔"

"میں شادی اس شخص سے کروں گی جسے اچھی طرح سمجھ لوں اور جو مجھے اچھی طرح سمجھ لے۔ وہ شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں اگر فریقین ایک دوسرے سے پوری طرح واقف نہ ہوں۔ وقار کو میں نے آج دوسری بار دیکھا ہے اور انہوں نے بھی مجھے دوسری بار دیکھا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے مزاج سے پوری طرح آشنا نہیں۔"

"تو آشنائی بڑھائی جائے۔ میں یہ کب چاہتا ہوں کہ تم فوری طور پر میری بات مان لو۔ یہ بالکل درست کہا تم نے کہ فریقین کا ایک دوسرے کے مزاج سے پوری طرح آشنا ہونا چاہیے۔ تم اس کے لیے خاصا وقت لو۔ ہفتہ بھر، پندرہ دن، ایک مہینا یا اس سے بھی کچھ زیادہ۔"

"کیا آپ نے اپنے بیٹے سے بھی اس بارے میں بات کی ہے؟"

"ذکر کر چکا ہوں۔ بہت مضبوط الفاظ میں اس سے کہہ چکا ہوں کہ وہ خوش قسمت ہوگا جسے دیبا اپنا شریکِ زندگی بنا لے۔"

"انہوں نے کیا جواب دیا؟"

”بالکل وہی جو تم نے دیا ہے اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے، وہ بھی اس سے کہہ چکا ہوں۔ تم دونوں ایک دوسرے سے ملو، جلو۔ ایک دوسرے کو سمجھو۔ تم میں سے کوئی ایک بھی مطمئن نہیں ہوا تو میں اس شادی کی موافقت نہیں کروں گا۔“

وقار اس وقت ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں کھڑا موبائل پر کسی سے محو گفتگو تھا۔

☆☆☆

فرحان وہ شام تو بھول ہی نہیں سکتا تھا جب وہ اور دیبا شہر کی خوبصورت جھیل کے کنارے ایک بنگلے سے لگے جوس پیتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

”تھوڑی دیر میں سورج غروب ہونے والا ہے۔“ دیبا نے جھیل کے پار سورج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اتفاق سے ہمارا شہر سمندر کے پاس نہیں ہے۔ طلوع و غروب آفتاب کا منظر تو وہاں دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ لوگ تو عام طور پر کہتے ہیں کہ سورج پانی میں ڈوبنے والا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ آسمان کا سنہری تھال پانی کے اس پار گم ہونے والا ہے۔“

”تمہارے ایسے ہی جملے تو مجھے یاد رہتے ہیں فرحان! تمہاری اسی خوبی کی وجہ سے میں تمہاری دوست بنی ہوں۔“

”اور باقی سب خیریت ہے۔“ فرحان ہنسا۔

”کیا مطلب؟“

”تم بس میرے جملے ہی یاد کرتی رہتی ہو۔“

”تو اب کوئی اور بات کرتی ہوں۔“ دیبا مسکراتے ہوئے بولی۔ ”کئی بار سوچا تھا کہ تم سے پوچھوں گی لیکن دوسری باتوں میں بھول جاتی ہوں۔“

”تو اب پوچھ لو۔“

”تم کبھی اپنی بیوی کے ساتھ نظر نہیں آئے۔ نہ کبھی اس کا ذکر کیا۔“

”جب بیوی ہی نہ ہو تو اس کا ذکر کیسا؟“

”تو کسی لڑکی سے محبت کرتے ہو؟“

”ہاں، بہت خوبصورت ہے وہ۔“ فرحان نے کہا۔ ”لیکن میں آج تک اس سے اظہار محبت نہیں کر سکا۔“

”کتنی خوبصورت ہے وہ؟“

”الفاظ اس کی خوبصورتی کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ بس تعریف کر سکتا ہوں اس کی۔ اس کے ہونٹ مجھے دیکھتے ہوئے شرارے لگتے ہیں اور جب وہ ہنستی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے دہکتے ہوئے الاؤ میں موتیا کے پھول چٹکنے لگے ہوں۔“

”تو تم اس کے حسن سے اتنا مرعوب ہوئے ہو کہ اظہار محبت بھی نہیں کر سکے۔“

”مرعوب تو نہیں ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ وہ مسترد نہ کر دے۔ تم اندازہ لگاؤ کیا وہ مجھے قبول کرے گی؟“

”یہ میں کیسے کہہ سکتی ہوں فرحان! میں نے اسے دیکھا تک نہیں ہے۔ دیکھ بھی لوں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اصل بات تو مزاج کی ہوتی ہے۔“

”فرض کرلو کہ وہ تمہارے جیسی ہے۔“ فرحان نے کسی قدر دھڑکتے دل کے ساتھ کہا۔

”کیا تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“

”دلی خواہش تو یہی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں قبول نہیں کرے گی۔“

فرحان کو اپنا دل بیٹھتا ہوا سا لگا۔ ”کیوں؟“

”تم نے بتایا نا کہ وہ میرے جیسی ہے۔“

”تو؟“

”میں تو کسی ایسے شخص سے شادی کروں گی جو سیلف میڈ ہو۔ اس کا کچھ نام ہو، کچھ پہچان ہو اور تم میں یہ خوبیاں نہیں ہیں۔ آرکیٹیکٹ ہو کر بھی کچھ نہیں کرتے۔ تمہیں کوئی بھی کام کرنا چاہیے۔ اپنی کوئی پہچان بناؤ، اپنا کوئی مقام بناؤ۔ اس کے بغیر کوئی کسی کی اتنی عزت نہیں کرتا کہ وہ عزت محبت میں تبدیل ہو جائے۔“

فرحان کا دل ڈوب گیا۔

”چلو۔“ دیبا نے مڑتے ہوئے کہا۔ ”ویسے بھی ہم نے یہاں کافی وقت گزار لیا۔“

”ہوں۔“ فرحان نے محسوس کیا کہ اس کے لیے کچھ بولنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔

جب وہ دونوں کار میں وہاں سے روانہ ہوئے تو دیبا بولی۔ ”اچانک تم چپ سے ہو گئے۔“

”تم نے بات ہی ایسی کی۔“

”کیا بات؟“

”تمہارا خیال ہے کہ وہ مجھے قبول نہیں کرے گی۔“

”ہاں۔“ دیبا نے کہا۔ ”اگر وہ مجھ جیسی ہے تو تمہیں قبول نہیں کرے گی۔ میں بتا چکی ہوں کہ میں کس قسم کے آدمی سے شادی کرنا پسند کروں گی۔“

ذرا دیر خاموشی رہی۔

”تم پھر چپ ہو گئے۔“ دیبا بولی۔ ”کیا میری بات بری لگی؟“

فرحان نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”یہی

سوچنے لگا تھا کہ میں اپنا کوئی مقام کس طرح بنا سکتا ہوں۔"

"سوچو اور پھر اس پر عمل بھی کرو۔"

دیا کو اس کے گھر پر ڈراپ کر کے فرحان جب اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو کھویا کھویا سا تھا۔

"کیا بات ہے؟" ذوالفقار اتفاق سے وہاں موجود تھا۔ "اتنا وقت گزار کر آئے ہو اس کے ساتھ...... تمہیں تو خوش نظر آنا چاہیے تھا۔"

"بات کچھ ایسی ہی ہو گئی کہ میرا دل ڈوب رہا ہے۔"

فرحان نے کہا اور پھر وہ ساری باتیں بتا دیں جو دیا نے کی تھیں۔

ذوالفقار بولا۔ "میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اس کا کوئی ایسا بوائے فرینڈ ہے جو اس کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔"

"یہ بات تم نے اس دن کی تھی جب اس نے اپنی پرسنل مجبوری کی بات کی تھی۔"

"ہاں۔"

"اور اس دن میں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ وہ کسی بوائے فرینڈ سے ملنے نہیں گئی تھی۔ وہ گریٹ بے ڈیلی اور وہ ایک یتیم خانے میں گئی تھی۔ اس نے یتیم بچوں کے ساتھ خاصا وقت گزارا تھا۔ ان میں پھول اور مٹھائیاں تقسیم کی تھیں۔"

"اس سے تو واقعی......" ذوالفقار کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

فرحان اپنے خیالوں میں ڈوب گیا۔ اس نے ذوالفقار سے بات مکمل کرنے کے لیے نہیں کہا۔

فرحان نے دوسری صبح ایک ٹریول ایجنسی کو فون کر کے فلائٹس کے بارے میں معلومات حاصل کیں پھر ایک فلائٹ میں اپنے لیے سیٹ ریزرو کرائی۔ فلائٹ میں اس وقت دیر تھی۔ فرحان نے ایک مختصر خط دیا کے نام اور چند سطریں ذوالفقار کے نام لکھیں۔

"ڈیئر ذوالفقار! معاف کرنا۔ تم سے ملے بغیر اس شہر سے جا رہا ہوں۔ اب اسی وقت واپس لوٹوں گا جب کچھ بن جاؤں گا۔ میں اپنا فون نمبر بھی بدل لوں گا۔ میں اب کسی سے بھی رابطے میں رہنا نہیں چاہتا۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے۔ ایک خط دیا کے نام تمہیں دے کر جا رہا ہوں۔ اسے دے دینا۔

تمہارا...... فرحان۔"

کچھ دیر بعد فرحان نے دونوں خط ایک لفافے میں رکھ کر ذوالفقار کے پتے پر کوریئر کر دیے۔ اپنی کار گھر پر ہی چھوڑی اور اپنے دو سوٹ کیس کے ساتھ ایک ٹیکسی میں ائرپورٹ روانہ ہو گیا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ اس شہر سے پرواز کر چکا تھا۔

☆☆☆

دیبا دفتر پہنچی ہی تھی کہ اسے وقار نے اپنے کمرے میں بلایا۔

"تم نے استعفا ای میل کر دیا؟"

"جی۔"

"میں ابھی اسے فون کرتا ہوں کہ استعفا منظور کرلیا جائے۔"

"لیکن میں کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہتی ہوں۔"

"ضروری نہیں کہ یہیں کرو۔ میں آج ہی ایک اور کمپنی میں تمہارا بندوبست کردوں گا۔ وہ بھی میری کمپنی سے کمزور نہیں ہے۔ وہاں تمہیں یہاں سے دگنی تنخواہ ملے گی۔"

"ایسا کیوں کرنا چاہتے ہیں آپ؟"

"یہ میں اس لیے چاہتا ہوں کہ آئندہ کوئی تمہیں میرے ساتھ دیکھے تو یہ نہ کہہ سکے کہ میں اپنی کمپنی کی ایک ملازم کے ساتھ گھوم رہا ہوں۔"

"کبھی۔" دیبا خفیف سا مسکرائی۔

"دوسری کمپنی کا مالک میرا اچھا دوست ہے۔ میں اس سے ابھی فون پر بات کرچکا ہوں۔ تمہیں ابھی اس کے نام ایک پرچہ لکھ کردوں گا۔ تم ابھی جاکر اس سے مل لینا۔"

وقار جواب کا انتظار کیے بغیر پرچہ لکھنے لگا۔

"یہ لے جاؤ۔" اس نے پرچہ دیبا کو دیتے ہوئے کہا۔ "اور اب تم مجھے آپ کہہ کر مخاطب نہیں کروگی بلکہ تم کہوگی۔ اب ہم دوست ہیں۔ شام سے ہم اپنی دوستی کا آغاز کریں گے۔" اس نے ایک اچھے ...... ریسٹورنٹ کا نام لیا۔ "چھ بجے تک وہاں پہنچ جانا۔"

"جیسا آپ کہیں۔"

"پھر آپ؟"

دیبا ہنسی۔ "تم کہنے کی عادت پڑنے میں کچھ وقت تو لگے گا۔"

"کوشش کرنا کہ یہ عادت جلد ہوجائے۔" وقار مسکرایا۔ "بس اب جاؤ۔"

"میں چاہوں گی کہ وہ ملازمت کل سے جوائن کروں۔"

"میں ابھی اس بارے میں بھی اپنے دوست کو فون کردیتا ہوں۔ ابھی جاکر اس سے مل تو لو۔"

دیبا پرچہ لے کر وہاں سے روانہ ہوگئی۔ اس کے دماغ میں خلفشار تھا۔ وہ الجھن میں تھی۔ کیا اس کے اور وقار کے مزاج میں ہم آہنگی ہوسکے گی؟ وہ دفتر پہنچ کر وقار کے دوست سے ملی۔ وہاں اس کا اپائنٹمنٹ لیٹر پہلے سے تیار تھا۔ دوست کو وقار کا فون بھی موصول ہوچکا تھا کہ دیبا اگلے دن سے دفتر آنا شروع کرے گی۔

وہاں سے دیبا اپنے گھر روانہ ہوگئی۔ خاصی دیر آرام کرنے کے بعد اس نے زینت کو فون کیا۔ "کالج کے بعد فوراً مجھ سے ملو۔"

"کوئی اور پیشرفت؟"

"ہاں۔"

وقار کے والد سے ملاقات کی تفصیل وہ زینت کو بتا چکی تھی۔

"کالج کے بعد میں گھر جاکر کچھ دیر بعد تمہارے پاس آؤں گی۔" زینت نے کہا۔

"کوئی حرج نہیں۔"

دوپہر کو کھانے کے بعد دیبا نے پھر اس وقت تک آرام کیا جب تک زینت نہیں آگئی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "ضرور کوئی خوشگوار بات ہوئی ہے۔"

دیبا نے اسے اس دن کی ساری بات بتادی۔

سب کچھ سن کر زینت نے کہا۔ "میں تمہیں مبارک باد دیتی ہوں۔ تم ایسے ہی شخص کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتی تھیں جو اپنا کوئی مقام رکھتا ہو، جس کا کوئی نام ہو۔ کیا وقار ویسا نہیں ہے؟"

"ویسا تو ہے لیکن بات مزاج کی بھی تو ہے۔ وہ مشین کی طرح کام کرنے کا عادی ہے۔ کیا مجھے وقت دے سکے گا؟ آج مجھے بہت ہی شدت سے فرحان یاد آرہا ہے۔ وہ ہوتا تو میں اسے بھی صورت حال بتاتی۔ میرا وہ پیارا دوست صحیح طور سے میری راہنمائی کرتا۔"

"چند ملاقاتوں میں وقار کو تم بھی سمجھ لوگی۔ اس معاملے میں کسی مشورے کی ضرورت نہیں۔ تم بہت بھولی ہو دیبا! اور نہ جانے کتنی لڑکیاں اس سے شادی کی خواہش مند ہوں گی۔"

"ان لڑکیوں کو وقار کی صرف دولت نظر آرہی ہوگی۔" دیبا نے سوچتے ہوئے کہا۔ "دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"اس سے ملنا تو شروع کرو۔"

دیبا نے سر ہلادیا۔

شام کو وہ اس ریسٹورنٹ میں تھی جہاں وقار نے اسے بلایا تھا۔ وہ چھ بجنے میں پانچ منٹ پر ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اسے کوفت ہوئی کہ وقار پندرہ منٹ کی تاخیر سے آیا۔

"سوری دیبا!" اس نے آتے ہی کہا۔ "عین وقت پر ایک بزنس مین کا فون آگیا تھا۔"

’’لیکن وقت کی پابندی بھی ضروری ہے۔‘‘ دیبا نے بے جھجک کہا۔

’’میں سوری تو کر چکا ہوں.... کچھ پیا تم نے؟‘‘

’’ابھی تو کچھ نہیں منگوایا۔‘‘

وقار نے فوراً اشارے سے ایک ویٹر کو بلایا اور پھر دیبا سے پوچھ کر جوس منگوائے۔

’’انسان سے زندگی بہت سے مطالبے کرتی ہے۔‘‘

’’تمہارے خیال میں وہ کیا ہیں؟‘‘

’’وقت کی پابندی، وعدے کا پاس، ترقی کے لیے کوشاں رہنا لیکن کچھ وقت اپنے آپ کو بھی دینا اور ہاں— جھوٹ بھی نہ بولنا۔‘‘

’’جھوٹ تو میں بھی نہیں بولتا لیکن ترقی کے لیے کوشاں رہنے میں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وقت کی پابندی نہیں ہو پاتی۔‘‘

’’بعض اوقات نا؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ وقار نے کہا۔ ’’میری اس وقت کی تاخیر کو بھی تم بعض اوقات میں سے ایک وقت سمجھ لو۔‘‘

دیبا ہنس دی۔

’’بہت دلکش ہنسی ہے تمہاری۔‘‘ وقار نے کہا۔

’’تمہارے اس جملے نے مجھے اپنے ایک بہت پیارے دوست فرحان کی یاد دلا دی۔ اس نے اپنی محبوبہ کی ہنسی کے بارے میں ایک خوبصورت جملہ کہا تھا۔‘‘

’’وہ کیا تھا؟‘‘

’’اب وہ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ شاعرانہ سا جملہ تھا۔‘‘

’’کبھی اس سے ملواؤ۔‘‘

’’بہت دن ہوئے، وہ اس شہر سے کہیں چلا گیا۔ واپس آئے گا تو تم سے ملواؤں گی۔‘‘

’’اچھے دوست ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔‘‘

’’میں اسے کبھی نہیں بھولتی۔‘‘

’’اچھے دوستوں کو بھولنا بھی نہیں چاہیے۔ کبھی اس لڑکی سے ملی تو ہوگی جس سے وہ محبت کرتا ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ دیبا نے کہا۔ ’’ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔‘‘

’’ایک بات یاد آئی۔ تمہاری وہ دوست اسکول کب کھول رہی ہے؟‘‘

’’پہلے تو اس نے سوچا تھا کہ امتحانات کے بعد کھولے گی لیکن حالات کچھ اس طرح بدلے کہ فوراً ہی کچھ ہو گیا۔ کل سے ہی کھلے گا اس کا اسکول۔‘‘

’’افتتاح کون کر رہا ہے؟‘‘

’’شاید اس کے والد کریں۔ اسے کوئی ایسا آدمی ملا ہی نہیں جیسا وہ چاہتی تھی۔‘‘

ان باتوں کے دوران میں جوس پی لیا گیا تھا۔

’’کیوں نہ کہیں گھومیں؟‘‘ وقار بولا۔

’’کہاں گھومیں گے؟‘‘

’’ایسے ہی...... بس ادھر اُدھر...... میں نے فیصلہ کیا تھا کہ آج تمہارے ساتھ ڈیڑھ گھنٹا گزاروں گا۔ ابھی تو آدھا گھنٹا بھی نہیں ہوا۔‘‘

دیبا تیار ہو گئی۔ بل ادا کر کے وہ وہاں سے نکلے اور کار میں بیٹھ کر ایک طرف چل پڑے۔

’’آج موسم بھی خوشگوار ہے۔‘‘ وقار بولا۔

’’کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ دل کا موسم اچھا ہو تو بھی موسم اچھے لگتے ہیں۔‘‘

’’بات تو پتے کی ہے۔‘‘

اسی وقت وقار کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے موبائل نکالا۔

’’اوہ!‘‘ موبائل کی اسکرین دیکھتے ہوئے اس کے منہ سے نکلا۔

’’کون ہے؟‘‘ دیبا پوچھ بیٹھی۔

’’آفس سیکریٹری ہے میرا۔‘‘ اس نے جواب دیتے ہوئے کال ریسیو کی۔ ’’ہاں...... کیا بات ہے؟ اچھا— تو—— اور...... کیا وقت طے پایا ہے؟‘‘

وقار نے اپنی گھڑی دیکھی۔ ’’دو گھنٹے...... چلو ٹھیک ہے۔ میں ایک گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔ کیا نام بتایا تم نے ہوٹل کا؟ ہاں، وہاں تو میں ایک گھنٹے سے بھی پہلے پہنچ جاؤں گا۔‘‘ اس نے موبائل بند کر کے جیب میں ڈالا اور دیبا سے بولا۔ ’’سوری دیبا! ایک بہت ضروری کام آ پڑا ہے۔ ایک امریکن بزنس مین آیا ہوا تھا کئی دن سے۔ میں ایک ڈیل کے سلسلے میں اس سے ملاقات کرنا چاہتا تھا لیکن وہ دوسرے لوگوں میں اتنا گھرا ہوا تھا کہ اس سے میری ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ اب وہ دو گھنٹے بعد امریکا واپس جا رہا ہے۔ کئی کروڑ ڈالرز کی ڈیل کا معاملہ ہے۔ اس نے ابھی میرے سیکریٹری کو فون پر بتایا ہے کہ میں جلد از جلد اس سے ملنے پہنچ جاؤں۔ آج گھومنے کا پروگرام کینسل کرنا پڑے گا۔ تمہیں میں تمہارے گھر پر ڈراپ کر کے چلا جاؤں گا۔‘‘

دیبا کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ وہ چپ رہ گئی۔

وقار نے پھر موبائل نکالا اور کسی سے رابطہ کیا۔ دیبا نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے سیکریٹری کو کچھ

ہدایات دے رہا تھا۔

دیبا کو اس کے گھر پر کار سے اتارتے ہوئے اس نے کہا۔ ''اب کل ملاقات ہوگی۔ میں دوپہر کو فون کروں گا تمہیں۔ ٹھیک ہے؟''

''ہوں۔'' دیبا نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وقار کی کار فراٹے بھرتی ہوئی نکل گئی۔

دیبا نے اپنے گھر میں داخل ہوتے ہی زینت کو فون کیا اور اسے وقار سے ملاقات کا سارا واقعہ بتایا پھر بولی۔ ''اس نے میرے ساتھ وقت گزارنے کے لیے ڈیڑھ گھنٹے کا وقت نکالا تھا لیکن گھنٹے بھر کا بھی ساتھ نہیں رہا۔ اس کے لیے بزنس ہی سب کچھ ہے زینت اس سے میرا نباہ مشکل ہوگا۔''

''فضول بات۔'' زینت نے کہا۔ ''صرف ایک واقعے کی وجہ سے جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔ بات کروڑوں کے بزنس کی ہے۔ اسے موقع نہیں گنوانا چاہیے تھا۔ تمہیں اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔''

''تم بھی اس کی طرف دار نکلیں۔'' دیبا نے منہ بنایا۔

''طرف داری کی بات نہیں ہے۔ معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ اگر کسی وقت وہ معمولی سی بات کے لیے تمہیں نظر انداز کردے تو بھی فوری طور پر کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ وقت گزرنے دو۔ آدمی کو اپنا مزاج تبدیل کرنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ نہیں بدلے گا۔''

''پھر وہی جذباتی بات۔ میں کہتی ہوں کہ مرد کا مزاج تبدیل کرنے کے لیے عورت کو بھی اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ تم بھی اسے اشاروں کنایوں میں سمجھاؤ کہ کیا درست ہے اور کیا غلط ہے۔''

دیبا نے اکتائے ہوئے انداز میں فون بند کردیا۔

☆☆☆

جس اسکول کا افتتاح ہونے والا تھا، اس کے سامنے ایک سڑک بننا تھی لیکن ابھی اس کی ابتدائی تیاری کی گئی تھی۔ روڑے اور بجری بچھا کر کسی وجہ سے اس دن کام روک دیا گیا تھا جس سے فائدہ اٹھایا گیا۔ دبیز دریاں بچھا کر ان پر قالین بچھائے گئے تھے اور قالینوں پر مہمانوں کے لیے کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ بیشتر مہمان آچکے تھے لیکن کچھ کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ زینت بڑی سرگرمی سے انتظامات کا جائزہ لے رہی تھی۔

دیبا اس وقت مسکرادی جب وقار نے زینت کی پشت پر اس کے قریب جاکر کہا۔ ''ایکسکیوزمی!''

زینت چونک کر مڑی اور وقار کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔

''سر! آپ؟''

دیبا وقار کے ارادے سے واقف تھی لیکن اس نے سوچا تھا کہ زینت کو سرپرائز ملے تو اچھا لگے گا۔ وہ وقار کے پیچھے کھڑی تھی۔

''میں نے سوچا، اس موقع پر شرکت تو کرہی لوں۔'' وقار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ افتتاح اپنے والد سے کرائیں گی۔''

''اب اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سر!'' زینت جلدی سے بولی۔ ''میں ابھی اپنے والد کو بتاتی ہوں کہ آپ آگئے ہیں۔''

''ارے نہیں۔ آپ.....'' وقار کو جملہ ادھورا چھوڑنا پڑا کیونکہ زینت بڑی بے قراری سے اس کرسی کی طرف بڑھ گئی تھی جہاں اس کے والد بیٹھے تھے۔

''اچھا لگا۔'' دیبا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

وقار بھی مسکرادیا۔

کئی فلیش گن چمک رہی تھیں۔ رپورٹرز آئے ہوئے تھے۔ زینت اور اس کے والد تیزی سے وقار کے قریب آئے۔

''بڑی عزت افزائی کی آپ نے۔'' زینت کے والد نے کہا۔

''میں اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔'' وقار نے کہا۔

زینت نے دیبا کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''تم سے میں اچھی طرح نمٹوں گی۔ مجھے بے خبر رکھا تم نے۔ سر نے تمہیں تو بتادیا ہوگا۔''

وقار نے زینت کے والد سے کہا۔ ''آپ بزرگ ہیں۔ افتتاح آپ ہی کیجیے۔''

''جی نہیں۔'' زینت کے والد نے کہا۔ ''میری بیٹی کی خواہش پوری ہوگی تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔''

جلد ہی مہمان پورے ہوگئے اور وقار نے ربن کاٹ کر اسکول کا افتتاح کیا۔ تالیاں بجنے لگیں۔ اس کے بعد مہمانوں کی تواضع کی گئی۔

وہاں سے واپسی پر دیبا نے وقار سے کہا۔ ''زینت بہت خوش ہوئی اور خوش تو میں بھی ہوئی کہ تم نے میری کوفت کا ازالہ کردیا۔''

''کوفت؟''

''ہاں۔'' دیبا نے کہا۔ ''کل تم اچانک مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔''

”میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ......“

”وہ مجھے یاد ہے۔“ دیبا نے اس کی بات کاٹی۔ ”لیکن انسان کو صرف دولت کے لیے نہیں، اپنے لیے بھی جینا چاہیے۔ بڑی بات ہے کہ تم نے زینت کا دل رکھ لیا۔“

”مجھے بھی خوشی ہوئی ہے اس سے۔“

”اچھا کام کر کے انسان کو وہ خوشی حاصل ہوتی ہے جو دولت کے حصول سے نہیں ملتی اور پھر تمہارے پاس کوئی کمی تو نہیں پیسے کی۔“

”خیر، ابھی تو میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں گا۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آج اتنا ہی وقت نکال سکوں گا۔ کل ہم جھیل پر چلیں گے۔ وہاں کشتی پر سیر کریں گے۔“

”مجھے بہت اچھا لگے گا۔“

دیبا کو اس کے گھر ڈراپ کر کے وقار چلا گیا۔ دیبا بہت خوش تھی۔ رات کو زینت اس سے ملنے آئی اور اس سے لپٹ گئی۔

”تم نے بڑا اچھا کام کرایا۔“

”میں نے نہیں کرایا۔“ دیبا نے کہا۔ ”خود وقار ایسا کرنا چاہتے تھے۔ وہاں سے واپسی پر وقار سے مختصر باتیں ہوئیں لیکن میں نے دو ایک جملے چپکا ہی دیے۔“

”ایسا کرتی رہیں تم تو اسے دیبا بنانے میں کامیاب ہو جاؤ گی جیسا بنانا چاہتی ہو۔“

”کل جھیل پر جانے کا پروگرام ہے۔ کشتی کی سیر کی جائے گی۔“

”بس کسی طرح بھی اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارو۔“

”چند دن بعد وہ بیرون شہر بھی جانے والے ہیں۔ ملازمت کا معاملہ نہ ہوتا تو میں بھی ان کے ساتھ جاتی۔ ویسے وہ ایک ہی دن کے لیے تو جا رہے ہیں۔“

زینت کچھ دیر باتیں کر کے چلی گئی۔ دوسرے دن دیبا آفس سے فارغ ہونے کے بعد عمارت سے نکلی تو وقار کار لیے اس کا منتظر تھا۔ کار میں وہ دونوں جھیل پہنچے۔ وقار نے کرائے کی ایک کشتی لے لی۔

جھیل کی سیر کرتے ہوئے دیبا نے کہا۔ ”اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ رہنے کی عادی ہو جاؤں گی۔ تم ایک دن کے لیے بھی شہر سے جاؤ گے تو میں تمہاری کمی محسوس کروں گی۔“

”چند دن بعد جاؤں گا۔“

”جاؤ گے تو۔“

”بہت ہی ضروری کام ہے۔ اب تم کیوں گی کہ......“

”میں کچھ نہیں کہوں گی۔“ دیبا نے اس کی بات کاٹی۔ ”میں نے یہ تو کبھی نہیں کہا کہ کام چھوڑ دو۔ کام تو انسان کو کرتے رہنا چاہیے۔ اس کے بغیر انسان اپنی شناخت قائم نہیں رکھ سکتا۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ انسان کام ہی کا ہو کر نہ رہ جائے۔ پیسا کمانے کی مشین نہ بنے۔ اپنے لیے بھی جیے اور دوسروں کے لیے بھی۔“

”کوشش تو کر رہا ہوں خود کو بدلنے کی۔“

ان دونوں کے درمیان مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔

کشتی کی سیر کے بعد جب وہ کار میں وہاں سے روانہ ہوئے تو وقار بولا۔ ”ہاں، میں تمہیں ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا۔“

دیبا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وقار نے کہا۔ ”میں نے تمہیں جہاں ملازم کرایا ہے، وہ میرا بہت پرانا دوست ہے۔ کل اس کی شادی ہے۔ اس میں شرکت کرنا ہے۔ تم بھی چلنا۔“

”تم تو ایسی تقریبات میں شرکت ہی نہیں کرتے جن میں وقت ضائع ہو؟“

”تم ہی تو سبق دے چکی ہو کہ ہمیں دوسروں کے لیے بھی جینا چاہیے۔ تمہاری اس بات سے پہلے میں واقعی اس قسم کی تقریبات میں شرکت نہیں کرتا تھا۔ بس فون پر مبارک باد دے دیا کرتا تھا۔“

”خوشی ہوئی مجھے یہ سن کر۔“ دیبا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس قسم کی تقریبات میں تعلقات بھی بڑھتے ہیں اور کسی وقت کسی سے کوئی بڑا کام بھی نکل جاتا ہے۔“

”میں دوسروں پر بھروسا کرنے کا قائل نہیں رہا۔ خود ہی سوچ کر اقدام کرتا رہا ہوں لیکن اب تم نے کہا ہے تو کروں گا۔“

”مجھے پھر خوشی ہوئی کہ تم میرے خیالات سے اتفاق کرنے لگے ہو۔“

”اب تم مجھے ہمیشہ اپنے مزاج کے مطابق پاؤ گی۔“

”کس وقت چلنا ہے؟“

”رات کو پونے دس بجے میں تمہیں پک کرلوں گا۔“

”میں تیار رہوں گی۔“

ڈراپ کرتے وقت وقار نے دیبا کو ایک گفٹ دیا۔

”یہ کیا؟“

”میری طرف سے تمہارے لیے پہلا تحفہ۔“

"وہ کیا؟"
"گھر جا کر دیکھنا۔"
"پھر سسپنس؟" دیبا ہنسی۔
وقار مسکرا کر رہ گیا۔
دیبا نے گھر جا کر وہ سب کچھ نکالا جو شاپر میں تھا۔ ایک قیمتی ساڑی اور سچے موتیوں کا ہار تھا۔ پہلے تو وہ سب کچھ دیکھتی رہ گئی پھر اس نے زینت کو فون کیا۔ وہ اسے اپنے اور وقار کے بارے میں سب کچھ بتاتی تھی۔
دوسرے دن رات کو وقار اسے لینے آیا تو وہ اسی کی دی ہوئی ساڑی میں ملبوس تھی۔
وقار نے اسے بڑی محبت سے دیکھا۔ "بہت اچھی اور باوقار لگ رہی ہو۔"
"اگر میں تمہاری پسندیدگی کا شکریہ ادا کروں تو تم کہو گے کہ یہ تو اپنائیت کی بات نہیں ہوئی۔"
وقار ہنس دیا اور کار آگے بڑھ گئی۔
وہ شہر کا سب سے بڑا اور خوبصورت ہال تھا۔
وہاں ایک ایسا واقعہ بھی پیش آیا کہ دیبا ششدر رہ گئی۔ استقبالیہ کمیٹی نے انہیں سب سے آگے کی رو کے ایک بڑے صوفہ سیٹ پر بٹھایا۔ اس رو کی ساری نشستیں بھر چکی تھیں۔ وہ صوفہ ان ہی دونوں کے لیے خالی تھا۔ اسٹیج پر دولہا دلہن موجود تھے اور اسٹیج پر نکاح خواں چڑھ رہا تھا۔
"ہم بالکل صحیح وقت پر پہنچے ہیں۔" وقار نے کہا۔ "تم نے ایک خاص بات محسوس کی؟"
"کیا؟"
"آگے کی اس رو تک آتے آتے بہت سی نگاہیں تم پر جم کر رہ گئی تھیں۔ جتنی بھی خواتین یہاں موجود ہیں، ان میں تم سب سے نمایاں ہو۔"
"تم کہہ رہے ہو تو ایسا ہی ہوگا۔" دیبا کی مسکراہٹ شرمیلی سی تھی۔
مہمانوں کو اس وقت مشروب پیش کیا جا رہا تھا۔ نکاح کے مرحلے شروع ہوئے۔ نکاح ہوتے ہی مہمان اسٹیج پر چڑھے اور دولہا کو گلے لگا کر مبارک باد دینے لگے۔
"مبارک باد دینے کے لیے ہم بھی چلیں؟" دیبا بولی۔
"ہم تقریباً آخر میں چلیں گے بلکہ بالکل آخر میں۔"
"آخر میں کیوں؟"
"دیکھنا۔"
"سسپنس؟"
وقار مسکرایا۔

مبارک باد دینے والوں کی تعداد اتنی تھی کہ ایک گھنٹا گزر گیا۔ جب دولہا تھک کر بیٹھ چکا تو وقار، دیبا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا۔ اس کے ہاتھوں میں دو بڑے پیکٹ تھے۔ ان میں سے ایک اس نے دیبا کو دیا۔
"یہ تم دلہن کے ہاتھ میں دو گی۔"
پھر ایسا ہی ہوا۔ مبارک باد کے ساتھ دونوں نے تحائف دیے۔
کسی طرف سے آواز آئی۔ "کیا کھانا شروع کروا دیا جائے؟"
وقار نے فوراً مائیک اپنے ہاتھ میں لیا۔ "کھانے سے قبل میں مہمانوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"
ہال میں خاموشی چھا گئی۔ سب نظریں وقار کی طرف تھیں۔
"خواتین و حضرات!" وقار نے بولنا شروع کیا۔
"آج میرے بہت ہی پیارے دوست کی شادی ہوئی ہے۔ اس موقع پر آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ چار دن بعد آپ سب لوگ یہاں پھر تشریف لائیں۔" وقار نے تاریخ بھی بتائی پھر بولا۔ "دو دن بعد میں بیرون شہر جا رہا ہوں اگلی شام کو واپس آ جاؤں گا اور اس سے اگلی شام کو میری انگیجمنٹ ہوگی۔"
دیبا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"یہ ہیں میری ہونے والی منگیتر۔" وقار نے دیبا کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کیا۔ دیبا بوکھلا سی گئی۔ ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔ دولہا فوراً اٹھا اور وقار کے ہاتھ سے مائیک لے کر بولا۔ "میں بھی آپ سب دوستوں کو اپنے دوست کی طرف سے اس تقریب میں شرکت کی دعوت دیتا ہوں۔" ہال میں تالیوں کا شور بڑھ گیا۔
"آؤ۔" وقار نے دیبا کا ہاتھ پکڑ کر اسٹیج سے اترتے ہوئے کہا۔
صوفے پر بیٹھتے ہی دیبا نے کہا۔ "وقار! یہ اچانک تم کیا کر بیٹھے؟"
"تمہارے لیے یہ یقیناً اچانک ہوگا لیکن میں نے کل ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ میں اپنے والد کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے لیے تمہارا انتخاب کیا۔ میں تمہیں پوری طرح سمجھ چکا ہوں، دیبا!"
دیبا گنگ ہو کر رہ گئی۔ وہ یہ نہ کہہ سکی کہ میں نے تمہیں ابھی پوری طرح نہیں سمجھا۔
اسی رات کو دیبا نے زینت کو فون کر کے ساری بات بتائی۔
"واہ۔" زینت نے کہا۔ "کیا میں تمہیں وہ شام آنے سے پہلے مبارک باد دے سکتی ہوں۔"

"میرا دماغ تو منتشر ہو گیا ہے۔ میں ابھی اسے اپنے مزاج کے بہت قریب نہیں لا سکی ہوں۔"

"تو کیا ارادہ ہے؟"

"ابھی تو مجھے سوچنے کے لیے مناسب وقت نہیں ملا۔ کل میں اس سے بات کروں گی۔ یہ تقریب کسی طرح کینسل بھی کی جاسکتی ہے۔"

"احمقانہ بات۔" زینت نے کہا۔ "وہ تمہارے آئیڈیل کے مطابق ہے۔"

"لیکن مزاج کے مطابق نہیں ہے۔"

"تم اس تقریب کے بعد بھی اپنی کوششیں جاری رکھ سکتی ہو۔"

"پھر حالات مشکل ہو جائیں گے۔"

"بہت عرصہ ہوا تم نے ایک بار کہا تھا کہ مشکلات کا سامنا کرنا تمہیں پسند ہے۔"

دیبا نے رابطہ منقطع کیا اور ٹہلنے لگی۔ اس وقت اسے پھر فرحان یاد آ گیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس سے مشورہ کرے لیکن وہ اس معاملے میں بے بس تھی۔ فرحان سے رابطے کا کوئی راستہ اس کے سامنے نہیں تھا۔

☆☆☆

کار ائرپورٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیونگ عابد کر رہا تھا۔ اس نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے فرحان سے کہا۔ "تم گیارہ ماہ بعد اپنے شہر کی طرف لوٹ رہے ہو۔"

"ہاں، عابد!" فرحان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور آج میں بہت خوش ہوں۔"

"جس کی دو وجہ ہیں۔ ایک تو تم نے اتنے کم عرصے میں ناقابلِ یقین کامیابیاں حاصل کی ہیں اور دوسرے یہ......"

"میری اس شاندار کامیابی کی بنیاد ابتدا میں ہی پڑ گئی تھی۔" فرحان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" عابد نے اتفاق کیا۔ "کئی ہزار گز پر محیط شاندار بنگلا تمہاری شہرت کا سبب بنا تھا۔"

"میں آج تم سے شاروا کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"شاروا کے بارے میں؟"

"ہاں۔ اگر تم برا نہ مانو تو میں کہوں گا کہ تم اس سے شادی کر لو۔"

عابد نے حیرت سے کہا۔ "یہ عجیب خیال تمہارے دماغ میں کیسے آیا؟"

"وہ تنہائی کے باعث شدت سے ذہنی طور پر منتشر ہوتی جا رہی ہے۔ مانا کہ وہ اپنے مرحوم شوہر سے بہت محبت کرتی تھی لیکن بچھڑ جانے والے کو زندگی بھر یاد رکھنا بڑا مشکل ہے۔ وہ محبت کے حصار سے بڑی حد تک نکل آئی ہے۔ وہ اپنا دفتر چھوڑ کر خاصا وقت میرے دفتر کے کمرے میں گزارنے لگی ہے۔ میری طرف اس کا جھکاؤ بھی بہت بڑھ جاتا ہے۔ اگر میں ذرا بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتا تو وہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی۔ دو مہینے سے میں اس کی وجہ سے خاصا پریشان رہا ہوں۔ ایک بار تو سوچا تھا کہ میں اپنا دفتر وہاں سے کہیں اور منتقل کر لوں لیکن صرف دو وجہ سے رکا رہا۔ ایک تو مجھے اب واپس لوٹنا تھا، دوسرے میری عدم موجودگی میں وہ اپنی کمپنی کو پھر ڈبو دے گی جسے میں نے بڑی مشکل سے سہارا دیا ہے۔ وہ اب پھر غلط فیصلے کرنے لگی ہے۔ میں ہی اسے غلطیوں سے روک رہا ہوں لیکن میری عدم موجودگی میں نہ جانے کیا ہو۔"

"تم واپس تو آؤ گے نا؟"

"ہاں آؤں گا۔ میں اپنی کمپنی چھوڑ تو نہیں سکتا لیکن واپسی پر......"

"دیبا تمہارے ساتھ ہوگی۔"

"مجھے تو خاصا یقین ہے۔ وہ جیسا شوہر چاہتی ہے، وہ اسے نہیں مل سکتا۔ مجھے وہ بہت پسند کرتی ہے۔ مجھ میں اسے صرف یہی نظر آتی تھی کہ میں کچھ کرتا نہیں تھا۔ میں نے اپنا کوئی مقام نہیں بنایا تھا لیکن اب میں ویسا بن چکا ہوں جیسا وہ چاہتی ہے۔ میں شاروا کو نہیں اپنا سکتا۔ اگر تم اس سے شادی کر لو گے تو......"

"مجھے اس کام کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہے۔ میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔"

"میں اسے اتنا ٹرینڈ کر چکا ہوں کہ اگر اس کا ذہنی انتشار ختم ہو جائے تو اسے تمہاری مدد کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔"

"لیکن اس کا شوہر میرا بہت عزیز دوست تھا اس لیے میں نے شاروا کو کبھی ایسی نظر سے نہیں دیکھا۔"

"تو اب دیکھو۔ وہ تمہاری ایک اچھی ساتھی ثابت ہوگی۔"

"مجھے اس بارے میں بہت سوچنا پڑے گا۔"

"بس یہ خیال رکھنا کہ شاروا تباہی سے بچ جائے گی۔"

"تم کب تک واپس آؤ گے۔" عابد نے کار روکی۔

"جلد از جلد آنے کی کوشش کروں گا۔"

"اس دوران میں تمہاری کمپنی......"

"مجھے دو بہت قابلِ اعتبار آدمی مل گئے ہیں۔ وہ

سنبھال لیں گے سارا کام۔"

وہ دونوں کار سے اتر آئے تھے۔ کار کی ڈکی اور کار کے اندر فرحان کے تین سوٹ کیس تھے۔ دو میں اس کا اپنا سامان تھا اور تیسرے میں دیبا کے لیے تحائف تھے۔ وہ سامان جہاز کے کیبن میں چلا گیا۔

فرحان کے ڈیپارچر لاؤنج میں جانے تک وہ عابد سے شاردا کے بارے میں باتیں کرتا رہا پھر جب اسے ڈیپارچر لاؤنج میں جانا تھا تو دونوں گلے ملے۔

"میں بے چینی سے تمہارا انتظار کروں گا۔"

"میں کہہ تو چکا ہوں کہ جلد از جلد آؤں گا۔"

فرحان ڈیپارچر لاؤنج میں چلا گیا اور ایک جگہ بیٹھ کر دیبا کے ساتھ گزارا ہوا وقت یاد کرنے لگا۔ وہ بہت پُرامید تھا اس لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی تھی۔ جب مسافر جہاز میں جانے لگے تو فرحان بھی اٹھا۔ اس نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیا تھا۔ طیارے نے پرواز کی اور جب مسافروں نے اپنے اپنے جسم سے بیلٹ الگ کی تو فرحان کے دائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص نے اپنے بریف کیس سے ایک فائل نکال کر اپنی گود میں کھول لی۔

فرحان اب بھی دیبا کے خیالوں میں ڈوبا رہا۔ کبھی کبھی طائرانہ نظر دوسرے مسافروں پر بھی ڈال لیتا تھا۔ اسے عجیب سا لگا کہ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا نوجوان بدستور فائل پڑھ رہا تھا اور کہیں کہیں کوئی لفظ یا پیراگراف انڈر لائن کرتا جا رہا تھا۔

طیارے میں لائٹ ناشتا صرف ہوئے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا جس کے تھوڑی دیر بعد فرحان کے برابر میں بیٹھے ہوئے نوجوان نے کافی منگوائی تھی جسے رکھے رکھے آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔

فرحان سے رہا نہ گیا تو وہ بولا۔ "آپ کی کافی تو غالباً ٹھنڈی ہو چکی ہوگی۔"

مسافر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کافی کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ "مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ دراصل یہ بہت ضروری ہے کہ میں اسے سفر کے دوران میں ہی پڑھ لوں۔ گھر جا کر مجھے اس کا جواب بھی لکھنا ہے اور صبح ہوتے ہی اسے کوریئر بھی کرنا ہے۔" پھر اس نے ائیر ہوسٹس سے دوسری کافی لانے کے لیے کہا۔

"وہ بھی ٹھنڈی ہو جائے گی۔" فرحان نے کہا۔ "اگر آپ اپنی ضروری فائل میں الجھے رہے۔"

"اب تو دو صفحے رہ گئے ہیں۔ سفر بھی ختم ہونے والا ہے۔"

"غالباً کوئی بزنس فائل ہے؟"

"جی ہاں۔" جواب دے کر وہ پھر فائل دیکھنے لگا۔

جب کافی آئی تو وہ اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ اس نے فائل بند کر کے بریف کیس میں رکھ لی اور کافی کا ایک گھونٹ لیا۔

"کیا بزنس ہے آپ کا؟" فرحان نے پوچھا۔

"لارڈ انٹرپرائزز کا نام سنا ہو شاید آپ نے؟"

"وہ تو اس شہر میں ہے جہاں ہم جا رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔ وہ میرا ہی ادارہ ہے۔ مجھے وقار عالم کہتے ہیں۔"

"خوشی ہوئی لارڈ انٹرپرائزز کے کرتا دھرتا سے مل کر۔"

فرحان نے مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "میرا نام فرحان ہے۔ میری ایک کنسٹرکشن کمپنی ہے۔"

وقار نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "کمپنی کا نام؟"

فرحان نے نام بتایا۔

"خوب۔" وقار مسکرایا۔ "کل میں لیپ ٹاپ پر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اتفاق سے ایک ویب سائٹ نظر آئی۔ لکھا تھا کہ شہر کی پانچ کنسٹرکشن کمپنیوں میں آپ کی کمپنی سرفہرست ہے۔"

"عنایت ہے اس کی۔" فرحان نے چھت کی طرف انگلی اٹھائی۔

"کیا دوسرے شہر میں بھی اس کی برانچ کھولنے کا ارادہ ہے؟"

"جی نہیں۔" فرحان نے کہا۔ "میں اسی شہر کا باشندہ ہوں۔ گیارہ ماہ قبل اس شہر میں گیا تھا جہاں سے ہم چلے ہیں۔ اب میں پرانے دوستوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ کچھ دن بعد واپس لوٹوں گا۔ کمپنی تو اسی شہر میں ہے۔"

"گیارہ ماہ میں اتنی کامیابی قابل رشک ہے۔"

"محنت اور لگن بہت کچھ ایسا کرا دیتی ہے۔"

"پرسوں ایک لڑکی سے میری انگیجمنٹ ہے۔ کیا آپ میری اس تقریب میں آنا پسند کریں گے؟"

"آپ بلا رہے ہیں تو ضرور آؤں گا۔"

وقار نے اپنا کارڈ نکال کر اس کی پشت پر ہال کا نام اور پتا لکھ کر فرحان کو دیتے ہوئے کہا۔ "ساڑھے آٹھ نو بجے کے درمیان تشریف لائیے گا۔"

"ضرور۔" فرحان نے کارڈ پر ایک نظر ڈال کر جیب میں رکھ لیا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی انگیجمنٹ کے بارے میں ایک نجی سوال کرنا چاہتا ہوں جس کا آپ جواب نہ دینا چاہیں تو نہ دیجیے گا۔"

"فرمائیں۔"

"آپ کی شادی آپ کے گھر والوں نے ارینج کی ہے یا......"

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔" وقار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگرچہ اس میں میرے والد کا بھی کچھ ہاتھ ہے لیکن یہ تو لو میرج ہوگی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا ہے۔"

"تو آپ کی ہونے والی بیگم صاحبہ آپ کو ریسیو کرنے ایئرپورٹ آئیں گی؟"

"کوئی بھی نہیں آئے گا۔" وقار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے اطلاع یہ دی تھی کہ رات کی فلائٹ سے آؤں گا لیکن جا رہا ہوں شام کی فلائٹ سے۔ ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ سرپرائز دینا چاہتا ہوں لیکن یہ غیر معمولی سوال کیوں کیا؟"

"میں آپ کی پسند دیکھنا چاہتا تھا۔"

"اسے آپ ایجنسی کی شام کو دیکھ لیجیے گا۔ کیا آپ کی بیگم آپ کو ریسیو کرنے آئیں گی؟"

"ابھی میری شادی نہیں ہوئی لیکن میرا گھر تو وہیں ہے۔ میں نے فون پر اپنے شوفر سے کہہ دیا ہے۔ وہ گاڑی لے کر آئے گا۔"

"یہی میں نے کیا ہے۔ شوفر کو تاکید بھی کی ہے کہ وہ والد صاحب کو بھی نہ بتائے۔ میں اپنی ہونے والی منگیتر کے علاوہ والد صاحب کو بھی سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔"

"تو آپ لوگوں کو چونکانے کے شوقین ہیں؟"

وقار نے ہنس کر کہا۔ "آپ یہ کہہ سکتے ہیں لیکن یہ میرا شوق نہیں ہے۔ زندگی میں پہلی بار ایسا کررہا ہوں۔"

"چونکانا تو میں بھی چاہتا ہوں کسی کو...... ویسے میرا ایک دوست ضرور ایئرپورٹ آئے گا۔ میں نے اسے فون پر اطلاع دے دی تھی۔"

انہی باتوں کے دوران میں طیارہ لینڈ کرگیا۔

☆☆☆

ایئرپورٹ پر وقار اور فرحان ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ فرحان کو ذوالفقار ریسیو کرنے آیا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں تمہاری کار میں تمہارے گھر چلوں گا۔ میں اسکوٹر اس لیے نہیں لایا کہ اس پر تمہارا سامان نہیں لادا جاسکتا تھا۔"

"بہرحال گیارہ ماہ بعد تم سے مل کر اچھا لگ رہا ہے۔"

"مجھے تم سے ایک شکایت ہے کہ تم نے مجھ سے رابطہ نہیں رکھا۔"

"اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تم بے اختیاری میں دیا کو بتادو۔ میں اسے سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ اس سے ملاقات تو شاید ہوئی ہوگی تمہاری؟"

"مجھ سے کیا، وہ تمہارے سبھی جاننے والوں سے ملتی رہی ہے۔ ہر ایک سے تمہارے بارے میں پوچھتی رہی ہے۔ بہت مس کیا ہے اس نے تمہیں۔"

"اب نہیں کرے گی۔"

"ہوں۔" ذوالفقار سنجیدہ رہا۔

فرحان اب بھی دیا کے خیالوں میں گم تھا۔ اس نے ذوالفقار کی سنجیدگی کا قطعی نوٹس نہیں لیا۔ شوفر کار لے آیا تھا۔ تینوں سوٹ کیس اس میں رکھ دیے گئے۔ فرحان نے شوفر کو پچھلی نشست پر بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ ذوالفقار اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

"ان گیارہ مہینوں میں تم کیا کرتے رہے؟" اس نے فرحان سے پوچھا۔

فرحان نے اسے سب کچھ بتادیا اور بولا۔ "اب میں ویسا بن چکا ہوں جیسا دیا چاہتی تھی۔"

"ہوں۔"

اس وقت فرحان نے پہلی مرتبہ اس کی غیر معمولی سنجیدگی نوٹ کی اور اس سے اس کے بارے میں استفسار کیا۔

"گھر چل کر اطمینان سے بتاؤں گا۔" ذوالفقار، شوفر کی موجودگی میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"دیا تو ٹھیک ہے نا؟"

"بہت ٹھیک ہے، خوش ہے۔"

"مجھ سے مل کر اور خوش ہوگی۔"

"ہوں۔"

"تمہاری یہ ہوں ہوں مجھے بور کررہی ہے۔"

ذوالفقار پھیکے سے انداز میں مسکرادیا۔

گھر پہنچ کر ذوالفقار نے کہا۔ "تم شاور لے کر فریش ہوجاؤ پھر باتیں کریں گے۔"

"یہ ایک فیشن سا بن گیا ہے کہ سفر کے بعد لوگ فریش ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ میں بالکل فریش ہوں۔ سوا دو گھنٹے کا ہوائی سفر کسی تکان کا سبب نہیں بنتا۔"

ایک ملازم نے انہیں کافی پیش کی۔

"تم نے ایک اہم معاملے میں بھی دیر کردی ہے۔"

"کس اہم معاملے میں؟"

"دیا کے معاملے میں۔"

"اب اس دیر کی تلافی ہوجائے گی جب میں کھانے کے بعد اس کے گھر جاؤں گا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھونچکا رہ جائے

گی۔ وہ ابھی گھر میں رہ رہی ہے نا؟‘‘

’’ہاں، لیکن کچھ دن میں اس کا گھر تبدیل ہونے والا ہے۔‘‘

’’کوئی بہت اچھی ملازمت مل گئی ہے کیا اسے؟‘‘

’’ملازمت تو اچھی مل گئی ہے لیکن گھر کی تبدیلی کی وجہ ملازمت نہیں ہوگی۔‘‘

’’پھر؟‘‘

’’وہ اپنے ہونے والے شوہر کے گھر چلی جائے گی۔‘‘

’’اس دن میں اپنا گھر بھی دلہن کی طرح سجاؤں گا۔‘‘

’’اس دن تو تمہیں اپنا یہ گھر اجاڑ لگنے لگے گا۔‘‘

’’پاگل ہو گئے ہو کیا؟ دیبا کے ہوتے ہوئے مجھے اپنا گھر اجاڑ کیوں لگے گا؟‘‘

’’اس لیے کہ وہ یہاں نہیں آئے گی۔‘‘

’’کیا وہ چاہے گی کہ میں اس کے لیے دوسرا گھر بنواؤں؟‘‘

ذوالفقار سنجیدگی سے چند لمحے فرحان کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ’’وہ اپنے شوہر کے گھر جائے گی جس سے اس کی منگنی ہونے والی ہے۔‘‘

’’کیا؟‘‘ فرحان کے ہاتھ سے کافی کی پیالی گرتے گرتے بچی۔

’’ہاں۔‘‘ ذوالفقار نے کہا۔ ’’تم نے بہت دیر کر دی ہے فرحان! اعلان کیا جا چکا ہے کہ پرسوں اس کی منگنی ہو جائے گی۔‘‘

فرحان کو سکتہ سا ہو گیا۔ ذوالفقار نے نظریں جھکا لیں۔

’’تم بہت دلخراش مذاق کر رہے ہو مجھ سے۔‘‘ فرحان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

’’یہ مذاق نہیں ہے، فرحان!‘‘ ذوالفقار نے سنجیدگی سے کہا۔ ’’اسے ایسا شخص مل گیا ہے جیسا شوہر وہ چاہتی تھی۔‘‘

اب فرحان اس کا منہ تکنے لگا۔

’’میں جانتا تھا کہ تمہیں شاک لگے گا۔‘‘ ذوالفقار نے کہا۔ ’’لیکن یہ ضروری بھی تھا کہ میں تمہیں بتا دوں۔‘‘

فرحان کا چہرہ فق پڑ گیا تھا۔ اس نے گھٹی گھٹی سی آواز میں پوچھا۔ ’’دیبا خوش ہے؟‘‘

’’اسے خوش ہونا ہی چاہیے۔ اسے اس کی پسند مل گئی ہے۔‘‘

’’کس سے ہو رہی ہے اس کی منگنی؟‘‘ فرحان کی آواز ڈوبتی ہوئی سی تھی۔

’’بہت بڑا ادارہ ہے، لارڈ انٹرپرائز...... اس کے مالک سے اس کی منگنی ہو رہی ہے۔‘‘

فرحان چونک پڑا۔ ’’وقار عالم سے؟‘‘

’’تم اسے کیسے جانتے ہو؟‘‘

’’وہ ابھی میرا اہم سٹر تھا۔ اس نے مجھے اپنی منگنی میں مدعو بھی کیا ہے۔‘‘

’’تم وہاں جا سکو گے؟‘‘

’’میرا تو کلیجا پھٹ جائے گا منگنی کا منظر دیکھ کر۔‘‘

’’کیا میں اسے فون پر بتا دوں کہ تم آ گئے ہو؟‘‘

’’تم نے ابھی کہا تھا کہ وہ خوش ہے۔‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’تو پھر اسے نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں آ گیا ہوں۔‘‘ فرحان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

’’تمہیں ایک چانس لینا چاہیے۔ میں ابھی اسے فون پر بتاتا ہوں۔‘‘

’’ہرگز نہیں۔‘‘ فرحان نے سختی سے کہا۔ ’’میرے لیے یہ کافی ہے کہ وہ خوش ہے۔‘‘

’’تمہارا کیا ہوگا؟ تم اسے دل و جان سے چاہنے لگے تھے۔‘‘

’’اب بھی چاہتا ہوں۔‘‘

’’تو پھر؟‘‘

’’تو پھر کچھ نہیں۔ اس کی خوشی میری خوشی ہے۔ محبت بے غرض ہوتی ہے۔ شادی اس کے لیے کوئی شرط نہیں۔‘‘

’’تم سر سر کر جیو گے۔‘‘

’’جی تو لوں گا اس کی خوشیاں دیکھنے کے لیے۔‘‘

’’تم ان نیچرل باتیں کر رہے ہو۔ غیر فطری باتیں۔‘‘

’’یہ تم اس لیے کہہ سکتے ہو کہ تمہیں کسی سے محبت نہیں ہوئی۔ تم نہیں جانتے کہ محبت کیا ہوتی ہے۔‘‘

’’تم اس کی خوشی کیسے دیکھو گے جب اس سے ملو گے بھی نہیں۔‘‘

ذوالفقار نے بہت چاہا کہ فرحان دیبا سے فوری طور پر ملے لیکن وہ نہیں مانا۔ اسی بات پر اڑا رہا کہ دیبا کی خوشی میں میری خوشی ہے۔

’’اس کی منگنی میں جاؤ گے؟‘‘

’’اس بارے میں کوئی فوری فیصلہ نہیں کر سکتا۔ سوچوں گا۔‘‘

ذوالفقار نے تھک ہار کر اس موضوع پر بات ختم کر دی۔

ذوالفقار کے جانے کے بعد فرحان نے وہ سوٹ کیس کھولا جس میں دیبا کے لیے قیمتی تحائف تھے۔ وہ سب کچھ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے لیکن اس نے انہیں چھلکنے نہیں دیا، ضبط کر گیا اور پھر سوٹ کیس بند کرتے ہوئے سوچا کہ وہ یہ تحائف اسے اس کی شادی کے موقع پر

دے گا۔

دوسرا دن بھی اس نے گھر ہی میں گزارا۔ تیسرا پہر ہو چکا تھا جب اسے جھیل یاد آئی جہاں اس نے دیبا کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ اس نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا اور تیار ہونے لگا۔ کار کی چابی سنبھال کر وہ کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ ذوالفقار کا فون آیا۔

''ہاں زلفی!'' فرحان نے کال ریسیو کی۔

''آج کا دن کیسا گزرا؟'' ذوالفقار نے پوچھا۔

''گھر میں ہی رہا۔'' فرحان نے جواب دیا۔ ''اب اگر تم دو تین منٹ بعد فون کرتے تو گھر میں نہیں ہوتا۔''

''کہیں جا رہے ہو؟''

''ہاں۔ جھیل کی طرف جانے کو دل چاہ رہا ہے۔''

''سوچا تھا کہ اگر تم گھر پر ہی ہو تو تمہاری طرف نکل آؤں۔''

''اگر ملنے کو جی چاہ رہا ہے تو رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ اس وقت تک میں لوٹ آؤں گا۔''

''اچھا تو جاؤ۔ میں رات کو آؤں گا۔''

''میں انتظار کروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ فرحان موبائل جیب میں ڈال کر گھر سے نکلا۔ جھیل تک پہنچنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا۔ وہ اسی جنگلے پر دونوں ہاتھ رکھ کر مغرب میں جھکتے ہوئے سورج کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے وہ باتیں یاد آ گئیں تھیں جو دیبا سے سورج کے بارے میں ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر افسردگی تھی اور وہ خود اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا کہ خود کو پوری طرح سنبھالنے میں اسے کتنا وقت لگے گا۔

تقریباً ایک گھنٹا اسے وہاں کھڑے کھڑے گزر چکا تھا کہ اسے عقب سے کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی جو اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ تیزی سے مڑا۔

وہ دیبا تھی جو ہنس ہنس کر وقار سے باتیں کرتی ہوئی اسی طرف آ رہی تھی۔

فرحان کے جی میں آئی کہ وہ وہاں سے بھاگ نکلے لیکن وہ ایسا کر نہیں سکا۔ اس کے پیر جیسے من من بھر کے ہو گئے تھے۔

پھر دیبا نے بھی اسے دیکھ لیا۔ وہ چونکی پھر اس کے چہرے پر خوشی کا تاثر ابھرا۔ وہ وقار کا ہاتھ چھوڑ کر دوڑتی ہوئی فرحان کی طرف آئی۔ قریب آ کر وہ فرحان سے لپٹ ہی گئی۔

''مجھے کچھ بتائے بغیر کہاں چلے گئے تھے تم؟ ایسے دوست بنے تھے میرے کہ میرا کچھ خیال ہی نہیں آیا تمہیں۔ میں تو تمہارے تمام جاننے والوں سے مل رہی ہوں۔ ان سے پوچھتی رہی ہوں کہ تم کہاں چلے گئے ہو۔ کسی سے مجھے کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ میں تمہیں بہت مس کر رہی تھی۔ آخر کہاں غائب ہو گئے تھے تم؟'' وہ فرحان سے لپٹی ہوئی بولتی ہی چلی گئی۔

فرحان نے بہ آہستگی اسے خود سے الگ کیا۔ وقار کے سامنے دیبا کا خود سے اس طرح لپٹنا اسے خجالت میں مبتلا کر گیا تھا۔

''جواب کیوں نہیں دیتے؟'' جذباتی ہو جانے والی دیبا نے فرحان کا گریبان پکڑ لیا۔

''ایک ضروری کام سے گیا تھا۔'' فرحان بہ مشکل بول سکا۔

اس وقت تک وقار ان کے قریب آ گیا تھا۔

''وقار!'' دیبا جیسے چونک کر اس سے مخاطب ہوئی۔ ''یہ ہے وہ میرا بہت اچھا دوست جس کا ذکر میں تم سے کر چکی ہوں اور فرحان...... یہ ہیں میرے ہونے والے منگیتر، وقار عالم...... میں تم سے اچھی طرح لڑوں گی فرحان کہ تم مجھے بتائے بغیر غائب ہو گئے تھے اور اب آئے ہو تو اطلاع تک نہیں دی۔ تم بہت اچھے موقع پر آئے ہو۔ کل میری منگنی ہے۔ اس میں تمہیں آنا ہے۔''

''کسی دوسرے کو بھی بولنے کا موقع دو دیبا!'' وقار نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''تم سے پہلے میں انہیں اپنی منگنی میں مدعو کر چکا ہوں۔''

''کب؟'' دیبا نے حیرت سے پوچھا۔

''فلائٹ میں ملاقات ہوئی تھی ان سے۔''

''اور تم نے مجھ سے ذکر بھی نہیں کیا۔''

''سفر میں لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ان ملاقاتوں کا ذکر بھی کیا جائے۔ ہاں، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہی وہ تمہارے دوست ہیں جن کا تم ذکر کر چکی ہو تو میں ضرور تمہیں بتاتا بلکہ فلائٹ ہی میں ان کو بھی بتا دیتا کہ ان کی دوست سے ہی میری منگنی ہو رہی ہے۔''

''تم چپ چپ کیوں کھڑے ہو؟'' دیبا، فرحان کی طرف پلٹی۔

''یہ کیا بولیں۔'' وقار نے کہا۔ ''تم ہی بولے جا رہی ہو۔''

''اس لیے بولے جا رہی ہوں کہ مجھے غصہ آ رہا ہے ان حضرت پر۔''

"چلو اب غصہ تھوک دو تاکہ یہ بھی کچھ بولیں۔"

فرحان بولا۔ "دیبا! بتایا تو ہے کہ ایک ضروری کام سے جانا پڑ گیا تھا۔"

"چلو، اس ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" دیبا نے اشارہ کیا۔

جھیل سے بہ مشکل نصف فرلانگ کے فاصلے پر ایک ریسٹورنٹ کھولا گیا تھا۔

وہ تینوں ریسٹورنٹ کی طرف بڑھے ہی تھے کہ دیبا نے چونکتے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ذوالفقار صاحب کہاں غائب ہیں؟"

"ذوالفقار!" فرحان نے حیرت سے کہا۔ "کیا اسے یہاں ہونا چاہیے تھا؟"

"انہوں نے ہی تو فون کر کے مجھے یہاں بلایا ہے۔" دیبا نے جواب دیا۔ "فون پر کہا تھا کہ وہ جھیل پر ہیں اور مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں سمجھی تھی کہ انہیں شاید تمہارے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے جو وہ مجھے بتانا چاہتے ہیں لیکن بات اب سمجھ میں آ رہی ہے۔ وہ مجھے اس طرح تم سے ملا کر سرپرائز دینا چاہتے ہوں گے۔"

فرحان، ذوالفقار کی اس حرکت پر جھنجلا گیا لیکن کچھ بولا نہیں۔ ریسٹورنٹ میں وقار اور فرحان کی پہلی بار ملاقات کی بات چھڑ گئی اور وقار نے دیبا کو بتایا کہ فرحان کی کنسٹرکشن کمپنی نے بہت کم وقت میں بہت کامیابیاں حاصل کی ہیں۔

"شاندار۔" دیبا نے خوش ہو کر کہا۔ "یہ ہوئی نا بات۔ چلو، میری ایک بات کا تم پر اثر تو ہوا۔"

"کس بات کا؟" وقار نے پوچھا۔

"پیسے کی تو کمی نہیں ان کے پاس لیکن یہ کچھ کرتے نہیں تھے اور میں کہتی تھی کہ انہیں اہمیت اس بات کو دینا چاہیے کہ اپنی کوئی شناخت بنائی جائے، کوئی بڑا کام کیا جائے۔ کسی لڑکی سے محبت کرتے ہیں یہ حضرت!" وہ یکا یک فرحان سے مخاطب ہوئی۔ "اب بھی اس سے اظہارِ محبت کرو گے یا نہیں؟"

"اب مجھے دیر ہو چکی ہے۔ اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اب میں اس کی زندگی میں انتشار نہیں لانا چاہتا۔ میرے لیے اب خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ خوش رہے۔"

"بہت اچھی سوچ ہے آپ کی۔" وقار بولا۔ "محبت کو اتنا ہی بے غرض ہونا چاہیے۔ وہ محبت ہی نہیں جس میں خلوص نہ ہو۔"

"لیکن......" دیبا بولی۔ "کیا وہ اپنی ہونے والی شادی سے خوش ہے؟"

"بہت خوش دیکھا ہے میں نے اسے۔"

"تو یہاں آنے کے بعد اس سے ملاقات ہو چکی ہے؟"

"ہاں۔"

کچھ دیر بعد وہ دونوں وہاں سے روانہ ہوئے۔ چلتے چلتے دیبا نے فرحان سے کہا کہ وہ اس کی منگنی میں ضرور آئے۔

☆☆☆

ذوالفقار بروقت فرحان کے گھر پہنچ گیا تھا لیکن فرحان آدھے گھنٹے کی تاخیر سے آیا۔

"اتنی دیر لگا دی؟" ذوالفقار نے کہا۔ "مجھ سے تو کہا تھا کہ......"

"چلو کھانا کھا لیں۔" فرحان نے اس کی بات کاٹ دی۔

ذوالفقار نے محسوس کیا کہ فرحان بہت سنجیدہ تھا۔ کھانے کے دوران میں بھی وہ چپ چپ سا رہا۔ بہت کم بات کی اور وہ بھی بہت رسمی سی جبکہ ان کا تعلق رسمی نہیں تھا۔

کھانے کے بعد جب وہ لاؤنج میں جا کر بیٹھے تو فرحان نے کہا۔ "ذلفی احمق نے بہت غلط کیا۔"

"میں تمہارے موڈ کی خرابی سے سمجھ گیا تھا کہ تمہارا نزلہ مجھ پر گرے گا۔ دیبا نے بتا دیا ہوگا کہ میں نے ہی اسے وہاں بلایا تھا۔"

"مجھ سے ملانے کے لیے؟"

"ہاں۔"

"میں نے تمہیں منع کیا تھا۔"

"مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرے اور تمہاری زندگی جہنم بن کر نہ رہ جائے۔"

"جہنم تو اب بنے گی ورنہ میں وہ ایک دن میں ہی واپس جا کر اپنی کنسٹرکشن کمپنی سنبھالتا لیکن اب کل مجھے اس کی منگنی میں شریک ہونا ہے۔"

"اگر اس نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو اسے وقار کی منگیتر بنتے دیکھ کر تمہارے دل پر آرے چلیں گے۔ تم مان کیوں نہیں لیتے کہ تم اسے فراموش نہیں کر سکو گے، تڑپتے رہو گے۔"

فرحان کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ ریسٹورنٹ میں دیبا نے اس کا نمبر لے لیا تھا اور وہ کال اسی کی تھی۔

"اتنی جلدی کیا تھی اور باتیں کرنے کی۔" فرحان نے ہنس کر کہا۔ "ریسٹورنٹ میں اتنی باتیں تو ہو چکی ہیں۔"

"میں وقار کے سامنے تم سے وہ بات نہیں کر سکتی تھی۔"
"دیا! ایسی کیا بات ہے؟"
"تم نے مجھ سے رابطہ نہ رکھ کر مجھے بہت ستایا ہے۔"
"وہ کیسے؟"
"میں تمہیں مس کرتی رہی ہوں۔ تم ہوتے تو میں تم سے مشورہ کرتی۔"
"کس بارے میں؟"
"وقار سے منگنی کے بارے میں۔"
"وقار کے بارے میں کوئی بات کرنی ہے؟"
"ہاں۔ اگرچہ کل ہی اس سے میری منگنی ہے لیکن میں جب بھی تنہا ہوتی ہوں، خود کو بہت کنفیوز محسوس کرتی ہوں۔ وقار میں میری خواہش کے مطابق بہت سی خوبیاں ہیں لیکن اس پر ہر وقت کام کی دھن سوار رہتی ہے۔ اس نے کام کے علاوہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے وقت نکالنے پر آمادگی تو ظاہر کر دی ہے لیکن میرے خیال میں اس نے اپنے والد کے دباؤ پر ایسا کیا ہے۔ شادی کے بعد وہ اپنی پرانی روش پر لوٹ جائے گا۔ اسے میری نہیں، صرف اپنے کام کی پروا رہے گی۔"
"بلاوجہ وقت سے پہلے مایوسی کا شکار ہو رہی ہو اور یہ اس کے باپ کا کیا قصہ ہے؟"
دیا نے وہ سب کچھ بھی بتا دیا۔ ذوالفقار بڑے غور سے فرحان کی باتیں سن رہا تھا اور اندازہ لگا رہا تھا کہ دوسری طرف سے دیا کیا کہہ رہی ہوگی۔
فرحان کہہ رہا تھا۔ "میں مان لیتا ہوں کہ اس نے باپ کے اشارے پر خود کو بدلا ہے لیکن اسے دباؤ مت سمجھو۔ باپ کی نصیحت سمجھ کر وہ اس پر عمل کر رہا ہے۔"
"میں کنفیوز ہوں فرحان! خود کو بدلنے کے باوجود وہ کسی وقت مجھے نظر انداز کر کے اپنے بزنس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کے لیے میری کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔"
"کوئی بھی انسان خود کو فوری طور پر یکسر نہیں بدل سکتا۔ آہستہ آہستہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ دیا! تمہیں وقار سے اچھا شوہر ملنا مشکل ہے۔"
یہ جملہ سن کر ذوالفقار کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ اسے فرحان پر غصہ آیا تھا۔
"اچھا۔" دیا نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اس قسم کی باتیں مجھے زینت نے بھی سمجھائی تھیں لیکن وہی باتیں تمہاری زبان سے سن کر مجھے کچھ اطمینان ہو رہا ہے۔"
"وقت ثابت کر دے گا کہ میں نے تمہیں غلط نہیں سمجھایا۔"

وفا

دلی اجڑی تو قلعہ معلی کا سامان اونے پونے میں نیلام ہونے لگا۔ روسا جاتے اور اپنی حویلیوں کے لیے کوڑیوں کے مول خرید لاتے۔
ایک ہندو جاگیردار کے منشی نے مالک سے کہا۔
"حویلی میں فانوس نہیں، وہاں ایک فانوس پڑا ہے، لے آتے ہیں۔"
جاگیردار ساتھ ہو گیا۔ سب کچھ دیکھا، آہ بھری اور منشی سے کہا۔ "واپس چلو۔"
منشی نے کہا۔ "سرکار! یہ فانوس تو تقریباً مفت ہی مل رہا ہے۔ یہ تو خرید لیجیے۔"
جاگیردار نے کہا۔ "جس سامان نے اپنے آقا سے وفا نہیں کی، ہم سے کب وفا کرے گا۔"
(مرسلہ: مہتاب احمد، حیدرآباد)

"اگر تم میرے کنفیوژن سے اتفاق کرتے تو میں کل منگنی نہیں کرتی۔"
"ایسی احمقانہ بات کو اپنے ذہن سے دور رکھو۔"
"تمہاری بات تو میں مانوں گی ہی۔ تم سے اچھا اور مخلص دوست میری زندگی میں کبھی نہیں آیا۔"
"زینت جو ہے۔"
"تمہاری بات اور ہے۔ اچھا، کل تم سے تقریب میں ملاقات ہوگی۔"
"میں آؤں گا۔"
دیا نے رابطہ منقطع کر دیا۔
فرحان نے موبائل رکھا ہی تھا کہ ذوالفقار بول پڑا۔
"کچھ تو میں سمجھ گیا ہوں کہ دیا سے تم نے کیا باتیں کی ہیں اور دیا نے کیا کہا ہوگا لیکن میں تمہاری زبانی سننا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ تم جھوٹ نہیں بولو گے۔"
"جب تم نے کافی حد تک سمجھ ہی لیا ہے تو میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔"
فرحان نے سب کچھ بتا دیا۔
ذوالفقار جھنجلا کر بولا۔ "پاگل ہو گئے ہو تم...... اس وقت تمہارے ایک اشارے پر دیا اس منگنی سے انکار کر دیتی۔"
"اور میں زندگی بھر خود کو ملامت کرتا رہتا۔ سمجھ لیا کہ میری محبت بے غرض نہیں۔"

''میں تمہارا یہ فلسفہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔''

''میں پھر وہی بات کہوں گا کہ تم جانتے ہی نہیں کہ محبت کیا ہوتی ہے۔''

''اب میں چلتا ہوں۔'' ذوالفقار کھڑا ہو گیا۔

''ناراض ہو گئے؟'' فرحان پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''تم سے ناراض کیسے ہو سکتا ہوں۔ بس، غصے میں ہوں۔''

''کل اس کی منگنی میں تم بھی چلو۔''

''مجھے تو جانا ہی ہے۔ تمہارے یہاں آنے سے پہلے دیبا مجھے اپنی منگنی میں بلا چکی ہے۔''

''تو میرے ساتھ ہی چلنا، وقت پر آ جانا۔''

''آ جاؤں گا۔''

فرحان اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں کچھ نہ کچھ کہتا ہوا اسے چھوڑنے کے لیے بیرونی دروازے کے باہر تک گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن نو بجے رات کو وقار اور دیبا کی منگنی اتنے شاندار طریقے سے ہوئی جیسے شادی ہوئی ہو۔ منگنی کے بعد کھانے کا انتظام بھی تھا۔ وقار اور دیبا مہمانوں کی تواضع میں لگے ہوئے تھے۔ دیبا زیادہ تر خواتین کی طرف متوجہ تھی جبکہ وقار مردوں کا خیال رکھ رہا تھا۔

فرحان نے جلد ہی اپنی پلیٹ ایک طرف رکھ دی۔ اس کی وجہ سے ذوالفقار نے بھی ایسا ہی کیا اور پھر فرحان کا بازو پکڑ کر بولا۔ ''ذرا میرے ساتھ آؤ۔''

''کہاں؟''

''آؤ تو۔''

ذوالفقار اسے مہمانوں سے کچھ دور لے گیا۔

''تمہیں آئینہ دکھاؤں؟'' ایک جگہ رک کر ذوالفقار نے کہا۔

''کیوں؟''

''چہرہ زرد ہو گیا ہے۔ تم سے کھانا بھی نہیں کھایا جا سکا۔ جب وقار، دیبا کو انگوٹھی پہنا رہا تھا تو تم آبدیدہ ہو گئے تھے اور کہنا تمہارا یہ ہے کہ دیبا کی خوشی، تمہاری خوشی ہے۔''

''یہ پہلا موقع ہے جس میں تم نے مجھے ایسا دیکھا۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

''ہمیشہ ایسا ہوگا۔'' ذوالفقار نے زور دے کر کہا۔ ''اس کی محبت میں ساری زندگی سلگتے رہو گے۔''

''اگر ایسا ہوا تو وہ بھی میرے لیے ایک لذت ہوگی۔ میرا ضمیر مجھے مطمئن کرے گا کہ میری محبت بے غرض تھی۔''

''دیبا کے بغیر تمہاری زندگی جہنم بن جائے گی۔''

''تم بار بار الفاظ کے فرق سے ایک ہی بات کہے جا رہے ہو اور مجبوراً مجھے بھی اپنا جواب دہرانا پڑ رہا ہے کہ دیبا کی خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔''

''ٹی بی ہو جائے گی تمہیں۔'' ذوالفقار نے دانت پیسے۔

''اب اس کا علاج ہو سکتا ہے۔'' فرحان کی مسکراہٹ پھیکی سی تھی۔

''کینسر بھی ہو سکتا ہے۔'' ذوالفقار کی جھنجلاہٹ بڑھ رہی تھی۔

''مجھے یقین ہے کہ میری وہ موت میرے لیے بڑی خوش کن ہوگی جب دیبا مجھے آخری بار دیکھنے آئے گی۔'' اس وقت فرحان آبدیدہ ہو گیا۔

''بہہ جانے دو آنسوؤں کو...... ضبط نہ کرو...... وہ آنسو اندر تک تباہی مچا دیتا ہے جو آنکھ سے نہیں بہتا۔''

''ختم کرو یہ باتیں۔'' فرحان رومال نکال کر اپنی آنکھیں خشک کرنے لگا۔

ذوالفقار بولا۔ ''ابھی اگر تم دیبا کو بتا دو کہ تم اس سے بے تحاشا محبت کرتے ہو تو وہ یہ منگنی توڑ دے گی۔''

''اگر میں بے اختیاری میں بھی ایسا کر بیٹھا تو زندگی بھر خود کو معاف نہیں کر دوں گا۔''

ذوالفقار نے ایک طویل سانس لی اور واپس مہمانوں کی طرف جاتا ہوا بولا۔ ''میں اب وقار اور دیبا سے اجازت لوں گا۔''

فرحان اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہاں سے واپسی پر فرحان نے ذوالفقار کو اس کے گھر پر اتارا اور اپنے گھر جا کر اس نے فریم کی ہوئی دیبا کی تصویر نکال کر اپنے سامنے رکھ لی۔ اب اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

☆☆☆

اس رات فرحان کو بہت دیر سے نیند آئی تھی۔ صبح اسے جلدی کوئی کام بھی نہیں تھا ورنہ الارم لگا کر سوتا۔ شاید وہ گیارہ بجے تک سوتا رہ جاتا لیکن موبائل کی آواز نے اسے دس بجے سے بھی پہلے جگا دیا۔ اس نے غنودگی کے عالم میں موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالی اور یکلخت پوری طرح بیدار ہو گیا۔ کال دیبا کی تھی۔

''ہیلو جانِ ...... اتنی جلدی ...... کوئی خاص بات؟''

''فوراً جھیل پر آ کر مجھ سے ملو۔'' دیبا کی آواز آئی۔

''خیریت تو ہے؟ ایسی کیا بات ہو گئی کہ......''

"آدھے گھنٹے میں آجاؤ۔" دیبا نے اس کی بات کاٹی۔

"ابھی تو سو کر اٹھا ہوں۔ ناشتا بھی ظاہر ہے کہ نہیں کیا۔"

"تو تیار ہو کر ناشتا کر کے آجاؤ۔"

"تمہاری سنجیدگی اور عجلت نے ذہن اتنا الجھا دیا ہے کہ میں تیاری اور ناشتا بھول چکا ہوں۔ آتا ہوں۔"

ملازمین دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور وہ کار لے کر چل دیا۔ کار تیز رفتاری سے بھی چلائی۔ اس کا دماغ بری طرح الجھ گیا تھا۔ جب وہ کار سے اتر کر جھیل کے بنگلے کی طرف بڑھ رہا تھا تو دیبا وہاں پہلے سے موجود تھی۔

فرحان نے اس کے قریب جاتے ہی کہا۔ "کیا بات ہے دیبا؟ میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بس مجھے ابھی اس لڑکی سے ملواؤ جس سے تم محبت کرتے ہو۔ اس کے بغیر تمہاری زندگی برباد ہو جائے گی۔"

"میں نے ریسٹورنٹ میں بتایا تھا کہ......"

"مجھے یاد ہے جو تم نے بتایا تھا۔" دیبا نے اس کی بات کاٹی۔ "میں سب سنبھال لوں گی۔"

"نہیں دیبا! میں تمہیں اس سے نہیں ملوا سکتا۔"

وہ دونوں بنگلے پر ہاتھ ٹکائے باتیں کر رہے تھے۔

دیبا یکلخت فرحان کی طرف مڑی۔ "تو پھر میں خود ہی اس کو تم سے ملواتی ہوں۔"

"تم کیسے ملوا سکتی ہو...... تم اسے جانتی بھی نہیں۔"

"خوب جانتی ہوں۔" دیبا نے دونوں ہاتھ فرحان کے شانے پر رکھ دیے اور اس سے آنکھیں ملاتے ہوئے بولی۔ "وہ لڑکی میں ہوں۔"

فرحان پہلے تو بھونچکا رہ گیا پھر زبردستی ہنس کر بولا۔ "اچھا مذاق کیا۔"

"میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو کہ یہ مذاق ہے۔" دیبا آبدیدہ ہو گئی۔ "کہو کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں...... کہو کہ تم میری خاطر خود کو زندگی بھر آگ میں نہیں سلگاؤ گے...... کہو فرحان!"

"دیبا! تمہیں اچانک کیا ہو گیا ہے؟" فرحان کے حواس اڑنے لگے۔

دیبا بولی۔ "کل منگنی کے بعد جب سب لوگ کھانا کھا رہے تھے، ذوالفقار تمہیں الگ لے گیا تھا۔ میں نے ستون کی آڑ میں چھپ کر تم دونوں کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ تم میری خوشی کی خاطر زندگی بھر اپنے دل میں آگ بھری رکھنا چاہتے ہو۔"

فرحان دم بخود رہ گیا۔

"کہو...... کہو!" دیبا نے اس کے شانے جھنجوڑ ڈالے۔ "اب بھی کہو کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں...... کہو فرحان، کہو!"

"کیسے کہوں؟" فرحان کی آواز کانپ گئی۔

"جیسے ذوالفقار سے کہہ رہے تھے۔"

"دیبا پلیز۔" فرحان کی آواز بھرا گئی۔ "وقار سے اچھا شریک زندگی تمہیں کبھی نہیں مل سکتا۔ وہ......"

"وہ اب میرے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔" دیبا نے اس کی بات کاٹی۔ "کل میرے لیے تم نے جن جذبات کا اظہار کیا تھا، اس کے بعد تم سے بہتر شریک زندگی مجھے نہیں مل سکتا۔ میں اپنی یہ خواہش کچل کر وقار کی ہو جاؤں گی اگر تم کہہ دو کہ ذوالفقار سے تمہاری باتیں مذاق تھیں اور تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔" دیبا کے گالوں پر آنسو ڈھلک گئے۔

"دیبا!" فرحان نے بے تاب ہو کر اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ "میری زبان پر یہ جملہ نہیں آسکتا کہ مجھے تم سے محبت نہیں۔"

"تو جو جملہ زبان پر آسکتا ہے، وہ کہو۔"

"ہاں۔" فرحان بھی آبدیدہ ہو گیا۔ "مجھے تم سے محبت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ میری زندگی میں کوئی دوسری لڑکی نہیں آئے گی لیکن میں تمہارے اور وقار کے بیچ میں آکر کم ظرف نہیں بننا چاہتا۔"

"تو پھر میں وقار کی ہو کر زندگی بھر آگ میں جلتی رہوں؟"

"ایسا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں سنبھال لوں گا۔"

"نہیں سنبھال سکو گے۔"

"آزما کر دیکھ لینا۔"

"تم میرے نہیں بننا چاہتے؟"

"اب نہیں۔"

دیبا جھٹکے کے ساتھ اس کی آغوش سے نکل گئی۔ "مجھے گھٹ گھٹ کر مرتے دیکھنا چاہتے ہو؟"

"ایسا نہیں ہوگا۔"

"تو پھر دیکھنا کہ اب میری زندگی کس طرح گزرتی ہے۔" دیبا نے کہا اور مڑ کر تیزی سے جانے لگی۔

"دیبا...... دیبا...... سنو...... اس طرح مت جاؤ۔"

لیکن دیبا کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ فرحان نے اس کی طرف لپکنا چاہا لیکن اس لیے رک گیا کہ جو چند افراد اس وقت بھی وہاں تھے، وہ دیکھ لیتے ورنہ جانے کیا سوچتے۔

فرحان نے جلدی سے اپنا موبائل نکال کر دیبا کا نمبر

ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ فرحان نے دیبا کو کار میں بیٹھتے دیکھا جو اسے وقار نے ہی دی ہوئی۔

فرحان تیزی سے اپنی کار کی طرف بڑھا۔ اسی وقت خود اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ کال دیبا کی تھی۔ ”میرا پیچھا مت کرنا فرحان! میں گھر جا رہی ہوں، خودکشی کرنے نہیں جا رہی ہوں۔ اتنی آسان موت اب مجھے گوارا نہیں۔ میں اب وقار کے ساتھ گھٹ گھٹ کر زندگی گزاروں گی۔“

فرحان کے کچھ بولنے سے پہلے دیبا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ فرحان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر انجن اسٹارٹ کیا۔ اتنی دیر میں دیبا کی کار خاصی دور نکل چکی تھی۔ پھر بھی فرحان اس کے پیچھے چل پڑا۔

موبائل کی گھنٹی پھر بجی۔ کال دیبا ہی کی تھی۔ ”میرے پیچھے مت آؤ فرحان! میں تمہاری محبت کی قسم کھاتی ہوں، میں خودکشی کرنے نہیں جا رہی ہوں۔ میں اب تم سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی...... یقین کرو...... ہاں، اگر تم نے میرا پیچھا کیا تو میں اپنی رفتار اتنی بڑھاؤں گی جس سے زیادہ بڑھائی نہیں جا سکتی اور اس صورت میں میرا ایکسیڈنٹ بھی ہو سکتا ہے۔“

رابطہ پھر منقطع ہوا۔ دیبا نے اپنی کار کی رفتار بڑھا دی تھی۔ یہ دیکھ کر فرحان نے بریک لگا کر کار روک دی اور اپنا سر اسٹیئرنگ پر مار دیا۔

جلد ہی دیبا کی کار نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ فرحان کو یہ اطمینان بہرحال حاصل ہو گیا کہ دیبا نے خودکشی کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ وہ اس کی محبت کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتی تھی۔ فرحان کار دوبارہ حرکت میں لایا اور اسے مناسب رفتار سے چلاتا ہوا اپنے گھر پہنچ گیا۔

”صاحب! اب ناشتا لگا دیں؟“ ملازم نے پوچھا۔

”صرف چائے بنا لاؤ۔“ فرحان نے کہا اور اپنے کمرے کا رخ کیا۔ کمرے میں جا کر وہ...... بستر پر لیٹ گیا پھر یکایک اس نے موبائل اٹھایا اور دیبا کا نمبر ملایا۔

”ہاں فرحان!“ دیبا نے کال ریسیو کی۔ ”میں گھر پہنچ گئی ہوں۔ راستے میں وقار کا فون آ گیا تھا۔ وہ گھر پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ لو وہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔“

ذرا سے توقف کے بعد وقار کی آواز آئی۔ ”ہیلو!“

”میں لائن پر ہوں۔“ فرحان نے کہا۔

”ابھی دیبا نے بتایا ہے کہ وہ جھیل پر گئی تھی۔ وہاں اس نے آپ کو بھی بلایا تھا۔ وہ آپ سے اس لڑکی کے بارے میں جاننا چاہتی ہے جس سے آپ محبت کرتے ہیں۔ وہ کسی طرح بھی آپ کو آپ کی محبت دلانا چاہتی ہے لیکن آپ نے اسے اس لڑکی سے ملانے کا وعدہ ہی نہیں کیا۔ وہ بہت اداس بیٹھی ہے۔ بال بکھرے ہوئے ہیں۔ میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ شاور لے کر فریش ہو جائے تو کہیں گھومنے چلیں۔“

”اچھا ہوگا کہ آپ اس کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھیں۔ اس پر وحشت سی طاری ہو گئی ہے کہ میں اسے اس لڑکی سے ملواؤں۔“

”تو ملوا دیجیے۔ حرج کیا ہے؟“

”اس کا وقت گزر چکا ہے۔ میں جھیل کے ریسٹورنٹ میں بتا چکا ہوں۔“

”اچھا، خیر۔“ وقار نے طویل سانس لی۔ ”اس لڑکی کے بارے میں اب آپ جانیں یا دیبا۔ میں اس معاملے میں خاموشی اختیار کر لوں گا۔“

”یہی بہتر ہے۔“

دوسری طرف سے فون ڈس کنکٹ کر دیا گیا۔ فرحان نے موبائل رکھا اور اپنی پیشانی رگڑنے لگا۔ اس کے سر میں خاصا درد ہو گیا تھا۔ دوپہر کو اس نے غسل کر کے برائے نام کھانا کھایا اور پھر لیٹ گیا۔ شام کو ذوالفقار اس سے ملنے آیا۔

فرحان نے کہا۔ ”میں نے دوپہر کو ہی سوچا تھا کہ تمہیں فون کر کے بلاؤں لیکن اس خیال سے رک گیا کہ تم کالج میں اپنے طلبا کو پڑھا رہے ہو گے۔“

”دوپہر کو کیوں بلانا چاہتے تھے؟“

”یہ بتانے کے لیے کہ کل شام ہم دونوں نے جھیل پر جو باتیں کی تھیں، وہ دیبا نے سن لی تھیں۔“

”اوہ!“

”اس نے مجھے جھیل پر بلایا تھا۔“ فرحان نے کہا اور پھر وہاں کا سارا قصہ بھی سنا دیا۔

ذوالفقار سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ رک کر اس نے ٹھنڈی سانس لی پھر کہا۔ ”وقار کے ساتھ وہ اب اپنی زندگی کس طرح گزارے گی فرحان؟“

”یہ سوچ سوچ کر میرا سر پھٹنے لگا ہے۔“

”بہتر ہوگا کہ اب تم دیبا کی بات مان لو۔“

”ہرگز نہیں۔ میں تو چاہوں گا کہ وقار اسے اتنی خوشیاں دے کہ وہ مجھے بھول جائے۔“

”شاید ایسا نہ ہو سکے۔“

فرحان کے مزید کچھ بولنے سے قبل اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

"یہ کون ہوسکتا ہے؟" فرحان اسکرین پر ایک اجنبی نمبر دیکھ کر بڑبڑایا پھر اس نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔ کون صاحب؟"

جواب نے فرحان کو چونکا دیا۔ "میں وقار کا ڈیڈی بول رہا ہوں۔"

"اوہ...... فرمایئے۔"

"تم دیبا کے دوست ہو نا؟"

"جی۔"

"اس کی زبان سے تمہاری تعریفیں سن کر جی چاہنے لگا ہے کہ تم اس وقت میرے گھر آ کر میرے ساتھ چائے پیو۔"

"ابھی؟"

"ہاں۔ اگر کوئی مصروفیت نہ ہو تو۔"

"میں حاضر ہو جاتا ہوں۔" فرحان نے رابطہ منقطع کر کے ذوالفقار کو ساری بات بتائی۔

"تو چلے جاؤ۔" ذوالفقار نے کہا۔

"مجھے لگتا ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔"

"جب جاؤ گے تو معلوم ہو ہی جائے گا کہ کالا ہے یا سفید۔ میں اب چلتا ہوں۔" ذوالفقار کھڑا ہو گیا۔ "فون پر بتانا کہ کالا نکلا یا سفید۔"

☆☆☆

فرحان کا استقبال بھی وقار نے کیا اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ڈرائنگ روم میں لے گیا جہاں دیبا بھی موجود تھی اور وقار کے والد بھی۔

"بہت انوکھا ہے۔" دیبا کا وہ لاکٹ ان کے ہاتھ میں تھا جو دیبا نے منگنی کے موقع پر پہنا تھا۔ فرحان صبح جھیل پر بھی اس کے گلے میں وہ لاکٹ دیکھ چکا تھا۔

"آؤ فرحان میاں!" انہوں نے نظریں اٹھائیں۔ "آؤ بیٹھو۔"

فرحان بیٹھ گیا۔ دیبا نے اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ ویسے اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ فرحان کو وہ ماحول کچھ معنی خیز لگا۔

"فرحان کو بھی دکھایئے ڈیڈی!" وقار نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ضرور۔" وقار کے والد نے لاکٹ فرحان کی طرف بڑھایا۔

"واقعی!" فرحان نے لاکٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ انوکھا بھی ہے۔"

وقار بولا۔ "اس کی چابی الٹی گھما کر دیکھو۔"

فرحان نے لاکٹ کے ایک جانب لگی ہوئی چابی گھماتے ہوئے کہا۔ "لاکٹ میں چابی...... کیا یہ گھڑی کا کام بھی......" وہ یکایک چپ ہو گیا۔

لاکٹ میں سے آواز ابھری تھی۔ "کیا بات ہے دیبا! میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔" وہ آواز فرحان کی تھی۔

پھر دیبا کی آواز سنائی دی۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ بس مجھے اس لڑکی سے ملواؤ جس سے تم محبت کرتے ہو۔ اس کے بغیر تمہاری زندگی برباد ہو جائے گی۔"

لاکٹ فرحان کے ہاتھ سے گر گیا اور آواز بند ہو گئی۔

"یہ ریکارڈر بھی ہے۔" وقار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس نے جھک کر لاکٹ اٹھایا۔ وہ فرحان کے برابر میں بیٹھا تھا۔

"اس میں تم دونوں کی وہ ساری گفتگو ریکارڈ ہے جو جھیل پر کی گئی تھی۔"

فرحان کا چہرہ فق پڑ گیا۔ ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ دیبا نظریں جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے وہ ریکارڈنگ پہلے ہی سنائی جا چکی تھی۔

"فرحان! تم نے ایسا کیوں کیا؟" وقار پھر بولا۔ "محبت تو کسی کو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ یہ کوئی جرم تو نہیں۔"

لیکن فرحان اس وقت خود کو مجرم ہی سمجھ رہا تھا۔

"ہاں البتہ......" وقار کی بات جاری رہی۔ "یہ مناسب نہیں کہا جا سکتا کہ تم نے دیبا سے یہ بات چھپائے رکھی۔"

فرحان گنگ ہو کر رہ گیا۔ وہ ماحول بھی عجیب تھا کہ باتیں بڑے خوشگوار انداز میں کی جا رہی تھیں۔ وقار کے والد بھی مسکرا رہے تھے۔

وقار ہی بولتا رہا۔ "یہ الجھن ضرور ہو گی کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ دراصل میں بہت حساس ہوں، فرحان! جھیل پر دیبا جس انداز میں تم سے لپٹ کر رہی تھی، وہ میرے لیے کوئی بے معنی بات نہیں تھی۔ تم دونوں بہت عرصے بعد ملے تھے۔ اس کے باوجود دیبا کا انداز اتنا والہانہ نہیں ہونا چاہیے تھا پھر بھی میں نے سوچا تھا کہ میرے دماغ میں ہونے والی کلبلاہٹ غلط بھی ہو سکتی ہے لیکن جب ریسٹورنٹ میں تم نے اپنی کسی محبوبہ کے بارے میں بتایا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے تو میرے دماغ کی کلبلاہٹ کچھ بڑھ گئی۔ میں نے سوچا کہ حقیقت کی تہ تک پہنچنا چاہیے۔ منگنی والے دن میں بازار گیا جہاں اس قسم کی چیزیں مل جاتی ہیں، جیسا یہ لاکٹ ہے۔ چشمے اور فاؤنٹین پین میں کیمرے تک لگائے جانے لگے ہیں۔ خاصی چھان پھٹک کے بعد میں نے اس لاکٹ کا

انتخاب کیا۔ یہ میں نے دیبا کو لا کر دیا اور اس سے کہا کہ وہ یہ لاکٹ نہ صرف منگنی والے دن پہنے بلکہ جب بھی گھر سے نکلے، یہ لاکٹ اس کے گلے میں ہونا چاہیے کیونکہ یہ مجھے بہت پسند ہے اور لوگ بھی اس کا انوکھا پن محسوس کریں گے۔ میرا مقصد یہ جاننا تھا کہ جب بھی تم دونوں تنہائی میں ملو تو تم دونوں کی باتوں سے ظاہر ہو جائے کہ میرے دماغ میں ہونے والی کلبلاہٹ غلط ہے یا درست...... فرحان! تم بالکل خاموش کیوں ہو؟ میرا لہجہ کوئی مخالفانہ تو نہیں ہے۔"

"میں اس موقع پر کیا بول سکتا ہوں۔" فرحان کی آواز بھرائی ہوئی اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"یہ تو کہو کہ میں نے کوئی اچھی حرکت نہیں کی۔"

"میں یہ کہنے کی پوزیشن میں کہاں رہا۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ میں آپ دونوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"یہ ممکن ہی نہیں کہ دیبا میرے ساتھ خوش رہ سکے۔ زندگی بھر سمجھوتا کر کے جیتی رہے تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ میں تو خوش ہوں کہ شادی سے پہلے ہی حقیقت سامنے آگئی۔ معاملہ اب برعکس ہو گیا ہے۔ میں تو تم دونوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

پہلی مرتبہ فرحان کی نظریں اٹھیں۔

"کیوں ڈیڈی؟" وقار بولا۔ "کیا میری سوچ غلط ہے؟"

"ہرگز نہیں۔" وقار کے والد اب سنجیدہ نظر آئے۔

اس وقت ایک ملازم نے آکر پوچھا۔ "کیا چائے وغیرہ لگا دی جائے؟"

"پانچ منٹ اور رک جاؤ۔" وقار کے والد نے کہا۔ ملازم چلا گیا۔

"وقار!" وہ بولے۔ "ابتدا تو تمہیں ہی کرنا ہے۔"

"جی۔" وقار اٹھ کر دیبا کے برابر میں جا بیٹھا۔

دیبا کسمسائی۔ وقار نے بڑی محبت سے دیبا کا ہاتھ پکڑا اور اس کی انگلی سے منگنی کی انگوٹھی اتارنے لگا جو اس نے پہنائی تھی۔

"وقار! یہ تم کیا کر رہے ہو؟" فرحان بول پڑا۔

"وہی کر رہا ہوں جو مجھے کرنا چاہیے اور جس کا حکم مجھے اپنے والد سے ملا ہے۔"

"سب ٹھیک ہو رہا ہے فرحان بیٹے!" وقار کے والد نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے مخمل کی ایک ڈبیا نکالی اور کھول کر فرحان کے سامنے کی۔ ڈبیا میں ایک قیمتی اور خوبصورت انگوٹھی چمک رہی تھی۔ "یہ اب تم دیبا کو پہنا دو۔"

"لیکن......" فرحان کچھ پریشان ہو گیا۔

"لیکن ویکن نہیں۔" وقار کے والد نے کہا۔ "میں نے ابھی تمہیں بیٹا کہا ہے۔ کیا تمہارا فرض نہیں کہ میری بات مانو۔"

فرحان کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ وہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اسے اپنی محبت اتنے ڈرامائی انداز میں ملے گی۔

"اٹھو بیٹا!" وقار کے والد پھر بولے۔

فرحان نے وقار کی طرف دیکھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"چلو، اٹھو میرے دوست!" وہ بولا۔ "تمہیں اپنی محبت مبارک ہو۔"

فرحان بہت جھجکتے ہوئے اٹھ کر دیبا کے قریب جا بیٹھا۔ وقار وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ فرحان نے دیبا کو انگوٹھی پہنا دی۔

وقار اور اس کے والد نے تالیاں بجائیں۔ اس وقت دیبا کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے۔

"ارے...... ارے۔" وقار کے والد اپنی وہیل چیئر کو تیزی سے حرکت میں لا کر دیبا کے قریب پہنچے اور اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے دیبا کے وہ دونوں آنسو پونچھے جو اس کے گالوں پر چمک رہے تھے۔

دیبا جلدی سے ان کے قدموں میں جھکی۔

"نہیں۔" وقار کے والد نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا۔ دیبا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فرحان ابھی تک سکتے کی سی حالت میں تھا۔

وقار کے والد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب دیبا کے یہ آنسو خوشی کے آنسو ہیں جو میں نہیں پونچھوں گا۔"

اس وقت ملازم چائے کی ٹرالی لے کر آیا کیونکہ پانچ منٹ گزر چکے تھے۔ ٹرالی میں چائے کے ساتھ ہار پھول بھی تھے۔

"ایکسکیوزمی!" وقار جلدی سے اٹھا۔ "مجھے اس وقت ایک بہت ضروری کال کرنا ہے اور موبائل میں اپنے کمرے میں بھول آیا ہوں۔ ابھی آتا ہوں۔" وہ جانے کے لیے تیزی سے مڑ گیا۔

وقار کے والد ہنس کر بولے۔ "بس یہ ہے اس کی زندگی۔" ان کا اشارہ وقار کی طرف تھا۔

وقار اپنے کمرے میں پہنچ کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اداسی اس کے چہرے پر یکایک پھیل گئی تھی۔ وہ اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کے بعد ہی ڈرائنگ روم میں واپس جانا چاہتا تھا۔

☆☆☆